انیسویں (۱۹) صدی میں

بنگال کا اردو ادب

پروفیسر جاوید نہال

ناشر
اردو رائٹرس گلڈ
۸۱/۱ فیرس لین اسرار منزل، کلکتہ-۱۴

اِنتساب

میں اپنی کتاب ابا مرحوم محمد یعقوب وکیل ہاشم
اوگانوی کے نام معنون کرتا ہوں جو نہ صرف شفیق
باپ تھے بلکہ رحمدل دوست بھی، اور میں جو کچھ
بھی بن سکا ان کی تربیت سے بن سکا۔

فہرست مضامین

نشانِ راہ

بنگال میں اردو ادب کی تاریخ سترہویں صدی عیسوی سے شروع ہوئی ہے۔ اس صدی کی ابتدا ہی میں صوفیائے کرام کی جدوجہد اور کوشش کی وجہ سے پنڈوا، مدنا پور، لکھنوتی اور گوڑ میں اردو کا چلن ہونے لگا تھا اور پیروں اور ان کے نومسلم مریدوں کے درمیان یہی زبان ذریعۂ گفتگو تھی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ بنگال میں صوفیائے کرام کی آمد کا سلسلہ غلام خاندان کے عہد سے شروع ہو گیا تھا۔ اس خاندان کے بانی اور پہلے تاجدار قطب الدین ایبک کے جنرل بختیار خلجی نے لکھنوتی پر بغیر مزاحمت قبضہ کر لیا اور بنگال میں مسلمانوں کی حکومت کی بنیاد رکھی۔ بختیار خلجی کا حملہ تیرہویں صدی عیسوی میں ہوا تھا۔ اس وقت راجہ لکشمن سین حکمراں تھا۔ مسلمانوں کی یورش اور فوج کشی کی خبر پاتے ہی فرار ہو گیا اور اس کی سلطنت مسلمانوں کے قبضہ میں چلی گئی۔ رفتہ رفتہ بنگال میں مسلم فاتحین کے قدم مضبوطی سے جم گئے اور پٹھان حکمرانوں کی سرپرستی اور پشت پناہی کی وجہ سے صوفیائے کرام کو تبلیغ اور اشاعت مذہب کے کام میں آسانی ہوئی۔ اور بنگال کے پس ماندہ اور مظلوم طبقہ کی اکثریت نے بڑی تعداد میں مذہب اسلام قبول کر لیا۔

تبلیغی کام اور اشاعت مذہب میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے

صوفیائے کرام نے تین چار اہم اور کلیدی شہروں میں اپنے مراکز قائم کئے۔ ان شہروں میں وہ بس گئے۔ انھوں نے بنگالیوں کے ساتھ رشتہ ناتہ جوڑا۔ پٹھان سپاہیوں، کاریگروں اور سوداگروں نے بنگالی عورتوں سے شادی کی جس کے باعث شمالی ہند سے آنیوالے پٹھان سپاہیوں اور سوداگروں کی زبان کا بنگلہ زبان پر گہرا اثر مرتب ہوا، اور بتدریج فارسی کے بہت سے الفاظ بنگلہ میں شامل ہوکر اس زبان کا جزو بن گئے۔

مشہور یورپی سیاح ٹیری نے جو سترہویں صدی میں ہندوستان آیا تھا، اپنے سفرنامہ "مشرقی ہند کا سفر" میں لکھا ہے کہ

"یہاں کی زبان بنگلہ ہے لیکن عام بول چال کی زبان انڈوستانی ہے جو کباڑیوں کی زبان ہے"

ٹیری کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سترہویں صدی ہی میں اردو بنگال میں رواج پاگئی تھی لیکن اٹھارہویں صدی کی آٹھویں دہائی میں اسے یہاں ادبی حیثیت حاصل ہوسکی اور مرشدآباد اردو کا پہلا اور اہم مرکز بنا جہاں قدرت اللہ قدرت نواب مخلص علی خاں مخلص اور انشا اور مقدر کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی۔

مرشدآباد، ٹمیابرج، ہوگلی اور کلکتے کے مشہور ادبی مرکز بننے کی ان گنت وجوہ ہیں، مگر سب سے اہم وجہ شمالی ہندوستان کی سماجی اور ثقافتی زندگی کا بحران ہے جس عہد میں ہندوستان کی اس مقبول اور نئی زبان کو فروغ نصیب ہوا وہ عہد انقلابوں کا تھا۔ شمالی ہندوستان کا نظامِ حیات، بیرونی حملوں اور انگریز مرہٹہ اور سکھوں کی فوجی طاقتوں کے بڑھ جانے کی وجہ سے اتھل پتھل ہورہا تھا۔

سلطنت مغلیہ کا چراغ طوفان میں ٹمٹما رہا تھا۔ دلی تاخت و تاراج ہو رہی تھی۔ وہاں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نزاع کے سمے دلی میں موت و حیات کی کشمکش جاری تھی۔ شہریوں کی جان، مال اور آبرو خطرے میں تھی اس پرآشوب دور میں بڑے بڑے سورما کے پاؤں اکھڑ گئے۔ دلی کا حسن لٹ گیا یہ ویران ہو گئی اور اس کے ساتھ شرفا، امرا، شعرا اور ادبا کی محفل بھی اجڑ گئی یہ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں جہاں جس کا سینگ سمایا چل پڑے۔ پہلے لکھنؤ میں ان کی محفل آباد ہوئی۔ پھر عظیم آباد اور مرشد آباد میں ان کے نغمے فضا میں رس گھولنے لگے۔

اجڑی ہوئی اور بدحال دلی اور امرا و شرفا کی ہجرت کی واضح تصویر، مولوی عبدالحق صاحب نے اتاری ہے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ

> اس وقت دلی تاریخ میں خاص حیثیت رکھتی ہے وہ ہندوستان کی جان اور سلطنت مغلیہ کی راجدھانی تھی مگر ہر طرف سے آفات کا نشانہ تھی۔ اس کی حالت اس عورت کی سی تھی جو بیوہ نہیں پر بیواؤں سے زیادہ دکھیاری ہے۔ اولوالعزم تیمور اور بابر کی اولاد ان کے مشہور تخت پر بے جان تصویر کی طرح دھری تھی۔ اقبال جواب دے چکا تھا، ادبار وانحطاط کے سامان ہو چکے تھے اور سیاہ روز زوال گرد و پیش منڈلا رہا تھا۔ بادشاہ دست نگر اور امیر امرا مضمحل و پریشان تھے۔ سب سے اول نادر شاہ کا حملہ ہوا۔ حملہ کیا تھا خدا کا قہر تھا۔ نادر کی بے پناہ تلوار اور اس کے سپاہیوں کی ہوسناک غارت گری نے دلی کو لوٹ کھسوٹ کر مضمحل و پریشان کر دیا

تھا۔ ابھی یہ کچھ سنبھلنے ہی پائی تھی کہ چند سال بعد احمد شاہ درانی کی چڑھائی ہوئی پھر مرہٹوں، جاٹوں اور روہیلوں نے وہ اودھم مچائی کہ رہی سہی بات بھی جاتی رہی۔ غرض ہر طرف خود غرضی، خانہ جنگی، طوائف الملوکی اور ابتری کا منظر نظر آتا تھا۔ یہ دلی کے اقبال کی شام تھی جس کی سحر اب تک طلوع نہیں ہوئی۔ ۵؎"

اس طرح دلی کی تباہی و بربادی کے بعد لکھنو، عظیم آباد اور مرشد آباد میں ادبی محفلیں رنگ پر آتی ہیں اور ان شہروں میں اردو کی بکھری ہوئی زلفیں پھر سنورنے لگتی ہیں۔ مگر بدیشی طاقت کے عروج کے باعث اردو کی محفلیں جلد ہی سونی اگر نہیں تو پھیکی اور بے رنگ ضرور ہو گئیں اور اس زبان کی کشتی بھی ایسٹ انڈیا کمپنی اور مرشد آباد کے نوابوں کی جنگ کے طوفان میں ہچکولے کھانے لگی ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں نواب سراج الدولہ کو شکست ہوئی اور اس غیور اور جیالے نواب کی شہادت نے ہندوستان میں انگریز سوداگروں کی سلطنت کا کا سنگ بنیاد رکھا اور رفتہ رفتہ سارے بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا سکہ چلنے لگا۔ نواب اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی جنگ کا زمانہ اردو زبان اور ادب کے لئے بڑا ناساز گار رہا مگر جب جنگ پلاسی نے انگریزوں کو بنگال کی حکومت عطا کر دی تو ان کی طاقت بڑھنے لگی۔ انھوں نے مرشد آباد کی جگہ کلکتے کو تعمیر کیا۔ کلکتے کی تعمیر اور اس کی وسعت و ترقی، اردو ادب خصوصاً نثر کے نشو و نما اور ارتقا کے لئے بڑا ساز گار ثابت ہوئی اور ڈاکٹر جان بارتھوک گل کرسٹ کے ایما پر گورنر جنرل ولزلی نے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا سنگ بنیاد رکھا جو اردو نثر کے لئے سنگ میل ثابت ہوا۔

اردو ادب خصوصاً نثری ادب کی کوئی تاریخ فورٹ ولیم کالج کے تفصیلی ذکر

۵؎ انتخاب کلام میر، مرتبہ مولوی عبدالحق ص۱۱

کے بغیر مستند اور جامع نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن یہ مقام افسوس ہے کہ اردو نثر کے پہلے اور سب سے بڑے مرکز کا مفصل حال کسی مورخ نے نہیں لکھا اور نہ ہی اردو ادب کی کسی تاریخ میں بنگال کے اردو ادب و زبان کے ارتقا کے متعلق مفصل ذکر ہے۔ گو ہر محقق اور ہر مورخ نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ کلکتہ ہی نے اردو نثر کو بے توجہی کی دنیا سے نکالا اور عوام نے اسے قبول کیا۔ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں کی تالیفات شمالی ہند کے ادبا کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئیں۔ میر امن دلی والے کی باغ و بہار، شیر علی افسوس کی آرائش محفل، حیدری کی توتا کہانی اور قصہ حاتم طائی، میر بہادر علی حسینی کی اخلاق ہندی نہال چند لاہوری کی مذہب عشق کے علاوہ گل کرسٹ کی اردو گرامر ہی پر اردو نثر کے موجودہ عالیشان قصر کی بنیاد پڑی ہے۔ انیسویں صدی کی ان نثری داستانوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

فورٹ ولیم کالج کے ۵۴ سالہ عہد میں قصہ کہانیوں، تاریخ، مذہب و علم و ادب کے موضوعات پر تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں تالیف و تصنیف ہوئیں۔ اس کالج کے بہت ایسے منشیوں کی تخلیقات مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں جن کا ذکر کسی اردو کتاب میں بھی نہیں ملتا اور ان کی حیات اور تالیفات گمنامی کی دبیز چادر میں لپٹی ہوئی ہے میں نے اسی میدان کو اپنی ادبی جولانگاہ بنایا اور حضرت استاذی جناب ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کی ہدایت اور صلاح و مشورے پر عمل کر کے انیسویں صدی کے انہی گمنام اور نامعلوم شاعروں اور ادیبوں کی ان تالیفات و تصنیفات پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جو اب تک ہماری نظروں سے اوجھل تھیں۔ یہ بے حد مشکل کام تھا کیونکہ اس کے قبل بنگال میں جو دو ایک کتابیں تالیف و ترتیب ہوئیں ان میں فورٹ ولیم کالج کے منشیوں کا تفصیلی حال

ترکیا، ان کے نام اور ان کی تالیفات کے سلسلے میں غلط بیانی ہوئی ہے۔ ان میں بیشتر کتابیں ان کے مؤلفین کی جگہ دوسروں سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ انیسویں صدی میں بنگال کے اردو ادب پر یہ تحقیقی مقالہ سپرد قلم کرتے وقت مجھے قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر اساتذۂ محترم کے علاوہ ہندوستان کے مشہور محقق قاضی عبدالودود صاحب پروفیسر آل احمد سرور، جناب مالک رام ایم۔ اے، جناب سعید احمد اکبرآبادی، پروفیسر احتشام حسین صاحبان گراں قدر معلومات بہم نہ پہونچاتے تو شاید میں اس کام کی ذمہ داری نباہنے میں کامیاب نہ ہوتا۔

میں نے اس مقالے میں فورٹ ولیم کالج کے ادبا و شعرا کے علاوہ خاص کلکتے، ہوگلی، مرشدآباد کے ادبا و شعرا کا حال درج کیا ہے۔ بنگال میں اردو زبان کے نشوونما اور ارتقا پر روشنی ڈالنے کی اور تاریخی، سیاسی اور معاشی پس منظر میں شاعروں کے کلام اور ادیبوں کی تخلیقات سے بحث کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں فورٹ ولیم کالج کے بعض ایسے منشیوں اور ان کی تالیفات کا ذکر کیا ہے جو اب تک منظر عام پر نہیں آئے ہیں۔ ان میں منصور علی حسینی، لالہ کھتری رام، نور خاں، نور علی، نثار ناتوی، باسط خاں، قائم خاں اور دیگر بیسیوں منشیوں کی زندگی اور ان کی تالیفات پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

کلکتہ، مرشدآباد اور ہوگلی کے ادیبوں اور شاعروں کے حالات بھی چھان بین کے بعد ہی درج کئے گئے ہیں اور اپنی بساط کے مطابق میں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ جو غلطیاں فورٹ ولیم کالج کے منشیوں، کلکتہ مرشدآباد اور ہوگلی کے شاعروں اور ادیبوں کے متعلق رواج پا گئی ہیں ان کی تصحیح کر دی جائے۔ اس کام میں مجھے سب سے

زیادہ مدد ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ کے اردو مخطوطات کے ذخیرے سے ملی ہے جس کے لئے میں لائبریری کے منتظمین کے شکر گذار ہوں جنھوں نے مخطوطات کی فراہمی میں بڑی معاونت فرمائی۔ ان کے تعاون کے بغیر یہ کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہونچ سکتا تھا۔ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کے علاوہ نیشنل لائبریری (کلکتہ) ولیم کیری لائبریری سیرام پور، بنگو ساہتیہ اکاڈیمی، راجہ رام موہن لائبریری، ہوگلی محسن کالج، ہوگلی امام باڑہ لائبریری اور مولانا آزاد کالج کلکتہ کے کتب خانہ کے علاوہ مرشد آباد کے شاہی کتب خانہ کے عہدیداروں کا ممنون ہوں جن کی مدد کے بغیر ایک قدم آگے بڑھنا میرے لئے دشوار تھا۔

پہلے میں نے انیسویں صدی اور موجودہ عہد کے بنگال کے اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کا فیصلہ کیا تھا چونکہ اس کا کینوس بہت وسیع ہے اور انیسویں صدی کے اردو ادب کی تاریخ ہی کتر بیونت کے بعد تقریباً چھ سو صفحات میں سما سکی ہے لہٰذا میں نے فیصلہ بدل دیا اور سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۶۵ء تک کی تاریخ کی دوسری جلد مرتب کر رہا ہوں۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے اپنے تحقیقی مقالہ کے لئے جو موضوع منتخب کیا تھا اس کا میدان بہت وسیع ہے اور اس میدان میں اتنے نشیب و فراز سے مجھے گذرنا پڑا کہ بسا اوقات اس منزل تک پہونچنے میں پائے استقلال میں لغزش بھی ہوئی مگر میں نے ہمت نہیں چھوڑی مخلص احباب نے ہر قدم پر مجھے سہارا دیا اور میں چھ سال کی طویل محنت اور عرق ریزی کے بعد کئی سو کتابوں کی مدد سے بنگال میں اردو ادب کی ایک ایسی تاریخ لیکر آیا ہوں جو یقیناً آپ کے لئے معلومات افزا ہوگی۔ اور بہت سے ایسے آبدار موتی بھی اس میں آپ کو ملیں گے جو اب تک نظروں سے اوجھل تھے۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ کتابت کی روایت کو میں بدل نہیں سکا اور کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں اور بعض ادیبوں اور شاعروں کا حال بھی رہ گیا ہے جس کی تلافی آئندہ اشاعت میں کر دی جائے گی۔

اگر میں یہ اعتراف نہیں کروں کہ اس کام کی تکمیل پروفیسر پرویز شاہدی مرحوم، پروفیسر عباس علی خاں بیخود، پروفیسر محمد امین، عزیز بھائی ڈاکٹر محمد ظفر ایوب، جناب احمد سعید ملیح آبادی مدیر آزاد ہند، جناب شعیب نثار ہاشمی اور حافظ نظام ایم اے کی مدد کے بغیر ممکن نہیں تھی تو یہ بخل ہوگا۔ ان میں سے بعض صاحبان نے اپنے مشوروں سے مجھے بھٹکنے سے بچایا اور بعض کی مالی امداد نے مجھے ذہنی اور اشاعت کی عملی دشواریوں سے نجات دلائی۔

ان حضرات کے علاوہ میں اپنے عزیز شاگرد پروفیسر اعزاز افضل، اشرف یوسف امولیا راز عظیم، مشتاق احمد بی اے آنرز، منصور عالم اور ابو نصر کا شکر گذار ہوں جنھوں نے بڑی محنت سے پروف پڑھا اور ابو نصر نے رات دن ایک کرکے اشاریہ ترتیب دیا۔ اور میں ان حضرات کے علاوہ ان دوستوں کا بھی شکر گذار ہوں جن کی مخالفت نے میرے دل میں اس کام کو پورا کرنے کے جذبہ کو بیدار رکھا۔

ایم۔ ان حسن ہاشمی
(جاوید نہال)
مولانا آزاد کالج شعبہ اردو، (کلکتہ)

AUTHOR WITH HIS TEACHER AND FRIENDS

(Left to Right)

AIZAZ AFZAL
*
A. A. KHAN BEKHUD
*
JAWAID NIHAL HASHMI
*
PARVEZ SHAHIDI
AND
MUSHARRAF AMOLIA

بائیں سے دائیں
اعزاز افضل
اے۔ اے۔ خان بیخود
جاوید نہال ہاشمی
پرویز شاہدی
اور
مشرف یوسف امولیا

میر حیدر بخش کی ہے نظم خاص　　مثل گوہر ہی جواہر سب کی سب
بندہ نے جب دم پڑھی اسکو ملا　　اسکی ایک تاریخ کہنے کا سبب
شوق سے تاریخ کی اسکی رقم　　تا کریں منظور سب اہل ادب
تب کہا ہاتف نے مجکو خوب ہے　　شعر کا تیرے ہی یاور فضل رب
از سر حق مت گذر اور کر شمار　　ہفت پیکر معدن حسن و طرب

میرزا کاظم علی والا تبار　　وہ ہیں جنکی نظم پر گوہر نثار
شعر ہیں جسکے تعاقب ہی جوان　　وصف اسکا کیا کروں لگے بیان
ہر زبان اسکا ہی گویا ایک کتاب　　در معنی کو ہیں اسے آب و تاب
از رو الطاف اسنے جگر میں　　غور سے اس مثنوی کی سیر کی
بعد تحسین از رہ مہر و صفا　　قطع یہ یوں سلک گوہر کہہ دیا

قطعہ

... جنکا تخلص ہی جوان　　انسے ہندی نظم یکسر یہ ہوئی
جستجو سنکر اہل معنی نے کہا　　مثنوی یوں سلک گوہر یہ ہوئی

عکس ہفت پیکر
حیدر بخش حیدری

PHOTO OF "HAFT PAIKER"
By
HAIDER BUKHSH HAIDERI

BLOCKS ARE PRINTED AT AMOLIA ART PRESS 104 LOWER CHITPUR RD CAL 1
PHONE 44-2107

بر صغیر ہندوستان اور پاکستان میں اُردو ادب کی بہت سی تاریخیں ترتیب پا چکی ہیں، خصوصاً اُردو زبان اور ادب کے نشو و نما پر کئی معیاری کتابیں شائع ہو کر مقبولِ انام بھی ہوئیں مگر اب تک زبان کی ابتدا اور آفرینش کے سوال پر اختلاف باقی ہے۔ حافظ محمود شیرانی کا کہنا ہے کہ سعد سلمان کے وقت اُردو زبان کا جنم پنجاب میں ہوا۔[1] دوسرے محققین کا خیال ہے کہ شمالی ہند میں گو اردو جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں عام بول چال کی زبان بن چکی تھی۔ پھر بھی ادبی زبان کی حیثیت اسے جنوبی ہندوستان میں حاصل ہوئی، اور اردو کا نثری اور شعری ادب آٹھویں صدی ہجری کے آخر میں دکن میں پیدا ہوا۔ اور وہاں سنگلاخ زمین پر اردو کا سخت جان پودا اگا بڑھا اور سایہ دار درخت کی شکل اختیار کر گیا۔

اردو زبان کی ابتدا اور نشو و نما سے متعلق ماہرین لسانیات گارساں دتاسی جارج گریرسن، جیمز اور ڈاکٹر سونیتی کمار چیٹرجی کی رائیں من وعن قبول نہیں کی جا سکتیں کیونکہ تحقیقی کام نے اس کی ایسی کڑیاں پالی ہیں جو ان ماہرین لسانیات کی تحقیق اور رائے سے آگے نکل گئی ہیں۔ اور ان کی رائیں شبہ میں پڑ جاتی ہیں۔ اب تک اس خیال کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں مل سکی ہے کہ محمد بن قاسم کی سندھ پر فوج کشی کے وقت ہی اُردو زبان کا ہیولیٰ تیار ہو چکا تھا۔ ممکن ہے کہ برسوں کی محنت اور عرق ریزی

---

[1] دیکھئے پنجاب میں اُردو۔

کے بعد کوئی ایسی گمشدہ کڑی مل جائے جو تمام شکوک و شبہات دور کر سکے۔ اور اُردو زبان کی پیدائش کے متعلق کوئی حتمی اور فیصلہ کن رائے قائم کی جا سکے۔

اس بحث سے قطع نظر کہ اردو زبان، دلی، پنجاب، دکن، سندھ یا بنگال میں پیدا ہوئی مگر اس خیال سے بعض لوگ ہی اختلاف کرنے کی جسارت کریں گے کہ دلی اور اس کے گرد و نواح کی مغربی ہندی، جو پراکرت شورسینی کی پیداوار ہے، ایک نئی زبان کے سانچے میں ڈھلتی گئی اور بعد میں برج بھاشا، کھڑی بولی، فارسی اور ہندی کے اختلاط سے عوام میں مقبول اور مروج ہوتی گئی اور ہندوستانی یا اردو کہلائی۔

دلی، آگرہ اور اس کے گرد و نواح کا بڑا علاقہ مختلف بولیوں کا سنگم تھا۔ اودھی، قنوجی، راجستھانی، پنجابی، ہریانی اور کھڑی بولی کے، جو مغربی ہندی کی شاخیں تھیں، میل جول سے ایک نئی زبان کا خمیر تیار ہوا۔ یہ بولیاں پنجابی اور راجستھانی سے زیادہ متاثر ہوئی تھیں، اور چونکہ افغان و مغل تاجداروں کے عہد میں دلی، ہندستان کا دل سمجھی جاتی تھی، لہذا رعایا سے براہ راست رابطہ پیدا کرنے اور ان کی زبانیں جاننے کے لئے مسلم حکمرانوں، نوابوں اور جاگیرداروں نے ہندوستانی زبانوں کی خاطر خواہ سرپرستی کی اور حکمراں قوم اور غیر ملکی تاجروں کے میل جول سے دلی اور اس کے گرد و نواح میں مروج زبان کھڑی بولی میں فارسی، ترکی اور عربی کے علاوہ دیگر صوبوں کی بولیوں کے الفاظ شامل ہوتے گئے۔ اس اختلاط سے ایک نئی زبان وجود میں آئی جو رفتہ رفتہ ترقی کی منزلیں طے کرتی گئی اور شروع میں مغربی مشاہیر اور علماء کے یہاں انڈوستان، انڈوستانیکا اور مورس[1] کہلائی۔ اور بعد میں جسے ڈاکٹر گل کرسٹ نے ہندوستانی کا نام دیا۔

[1] ملاحظہ ہو ہندوستان کا لسانیاتی مطالعہ جلد نہم ص ۹

یہی ہندوستانی بتدریج ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیل گئی اور عوام
کی مقبول زبان ہو گئی۔[1]

ہندوستان کی دوسری جدید زبانوں کی طرح اردو کی بھی ترقی کی رفتار
سست تھی۔ بہت دنوں تک یہ بول چال کی زبان رہی۔ اظہار مطالب کے لئے
استعمال ہوتی رہی مگر سولھویں صدی عیسوی کے آخر میں جب ہندوستان کی
سرزمین پر یورپین سیاحوں، اور سوداگروں کے قدم جمنے لگے تو انھیں اس نئی
آسان زبان کو سیکھنے اور پھیلانے کا خیال ہوا۔ اس وقت ہندوستان کے ہر
علاقہ میں یہی زبان تھی جو آسانی سے سمجھی اور بولی جاتی تھی۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اردو شمالی ہند میں پیدا ہوئی۔ عوام میں ذریعۂ
گفتگو بنی رہی، لیکن اسے ادبی قالب میں ڈھالنے والے جنوبی ہند کے وہ مسلمان[2] تھے
جو محمد بن تغلق کے ہمرکاب ہجرت کر کے دولت آباد گئے تھے۔ اگرچہ یک خیال یہ
بھی ہے کہ ۱۳ویں صدی عیسوی میں ریختہ مبہم شکل میں موجود تھی۔ اور امیر خسرو کے
کلام میں اس کی جھلک ملتی ہے۔ مگر اس خیال کی تصدیق نہیں ہو سکی ہے۔ کچھ مکرنیاں
اور پہیلیاں ہیں جو امیر خسرو سے منسوب کی جاتی ہیں اور انھی کی بنیاد پر آب حیات
میں مولانا محمد حسین آزاد نے اردو کی ابتدا سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد
سے بتائی ہے۔

دراصل اردو اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف میں ادبی زبان بن سکی

---

[1] Linguistic Survey of India Vol IX by G. Grierson P.9

[2] دیکھیے Origin & development of Bengali language by Dr Suniti Kumar Chatterjee.

تھی، اور برج بھاشا اور دیگر مقامی زبانوں کی زبردست حریف بنی رہی تھی،
مسلمانوں کی آمد اور ہندوستان میں ان کی حکومت کے قیام کے ساتھ ایک نیا
دور شروع ہوا۔ ایک نئی تحریک کے چراغ سے کئی چراغ جل اٹھے۔ اور ہندی اور
اسلامی کلچر کے میل جول سے مشترکہ اور مخلوط کلچر اور ثقافت کی عالیشان عمارت
کی بنیاد پڑی۔ بھانت بھانت کی ہندوستانی بولیوں میں عربی، فارسی اور ترکی
الفاظ چپکے چپکے داخل ہوتے گئے۔ الفاظ کے اس اختلاط سے اردو کا جنم ہوا مگر
اس کا ارتقائی عمل بے حد سست تھا اور اس کے مقبول انام ہونے اور ادبی
حیثیت اختیار کرنے میں صدیاں لگ گئی تھیں۔ اردو زبان کے سانچے کے تیار ہونے کے
بہت قبل فارسی، عربی اور ترکی الفاظ ہندوستان کی مروجہ بولیوں میں شامل
ہو چکے تھے۔ پندرہویں صدی میں کبیر[۱] کے گیتوں اور دوہوں میں عربی اور فارسی
کے الفاظ ملتے ہیں اور بارہویں صدی میں چندر بردائی کوی کی مشہور مگر اختلافی
تصنیف پرتھی راج راسا[۲] میں بھی فارسی، عربی اور ترکی الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

یہ لکھا جا چکا ہے کہ شروع میں اردو کا ارتقائی عمل بے حد سست تھا۔
چنانچہ سترہویں صدی کی نویں دہائی تک ہی شمالی ہندوستان میں اردو ادبی زبان
بن پائی تھی۔ اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں کہ شمالی ہند سے پہلے سولہویں
صدی کی چوتھی دہائی میں اردو زبان کا ننھا پودا دکن میں لہلہانے لگا تھا اور اسکی

---

[۱] کبیر (بھگت) ہندی کے بہت بڑے کوی مانے جاتے ہیں۔ ان کے گیت اور دوہے گھر گھر گائے جاتے ہیں۔ کبیر کے گیتوں اور دوہوں میں اردو کی بھی جھلک ملتی ہے [۲] پرتھی راج راسا چندر بردئی کوی کی تصنیف کہی جاتی ہے۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی گل کرسٹ نے کیا ہے جس کا مطبوعہ نسخہ ہوگلی محسن کالج لائبریری میں محفوظ ہے۔

! دیکھیے صفحہ سابق !

نازک ڈالیاں رنگ برنگی پھول پتیوں سے سجنے لگی تھیں۔ اس نئی زبان کے لئے فارسی رسم الخط غالباً اس لئے اختیار کیا گیا کہ حکمراں قوم کی زبان عوام میں قبول ہونے لگی تھی۔ فارسی چونکہ سرکاری زبان رہ چکی تھی چنانچہ سرکاری زبان کے سیکھنے اور اس کی سہولت کے پیش نظر ہندو اور مسلمان ادبا اور شعراء نے اپنی مرضی سے اس نئی زبان کو فارسی لپی میں لکھنا شروع کیا ہوگا یہی وجہ ہے کہ اردو پر فارسی کا گہرا اثر ہوا۔ فارسی کی خصوصیات نئی زبان میں پیدا ہوگئیں اور اس کا ادبی سرمایہ بہت کچھ فارسی سے مستعار رہا اور غالباً اسی بنا پر یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے کہ اردو ہندوستان کی ایک جدید زبان ہونے کے باوجود مسلمانوں کی زبان ہے جو کسی حال میں بھی درست نہیں کیونکہ اُردو کے ارتقا میں ہندو ادیبوں اور شاعروں کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا مسلمانوں کا۔

انیسویں صدی اُردو نثر کے لئے مبارک اور سازگار ثابت ہوئی ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے اُردو کا نیا دور شروع ہوا۔ یورپین سوداگروں حاکموں اور ادیبوں کی وجہ سے اردو نثر کو شاعرانہ فضا میں پنپنے کا موقع نصیب ہوسکا اردو نثر نگاری کی باقاعدہ تحریک شروع ہوئی اور نثر کا ابتدائی اسلوب وجود میں آیا۔ مختلف موضوعات پر کتابیں تالیف، تصنیف اور ترجمہ ہوئیں۔ سنسکرت اور فارسی قصے اردو کے سانچے میں ڈھلے۔ ان ابتدائی کہانیوں اور داستانوں میں آسان اور عام فہم زبان لکھی جانے لگی۔ فارسی، عربی اور سنسکرت کے ادق اور نامانوس الفاظ سے پرہیز کیا جانے لگا۔ فارسی لپی کے علاوہ دیوناگری لپی میں بھی کتابیں شائع ہونے لگیں۔

لسانیات کے ماہر ڈاکٹر سونیتی کمار چیٹرجی نے لکھا ہے کہ "مسلمانوں کی ہندوستانی اردو کے نام سے مشہور ہوئی جس کی ترقی حیرت انگیز سرعت سے ہوئی اور فارسی اور عربی کا اسلوب اور طرز اس نے اختیار کیا۔" [۱]

ڈاکٹر چیٹرجی کے اس خیال میں کچھ صداقت تو ضرور ہے لیکن اس سے اس غلط فہمی کو تقویت پہونچتی ہے کہ اردو زبان اصل میں مسلمانوں کی زبان ہے اور اسلامی ماحول کی پروردہ ہے۔ اور مسلم حکمرانوں اور نوابوں کی سرپرستی میں پروان چڑھی مگر یہ حقیقت نہیں ہے کیونکہ شروع ہی سے اُردو کے نشو ونما اور ارتقا میں مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کا برابر کا حصہ رہا ہے۔ اُردو نثر پر گل کرسٹ، ڈاکٹر ولیم، ہنٹر، تامس روبک، فرانسس جیمس کارکرن اور فاربس کا اتنا ہی احسان ہے جتنا میر آمن دلی والے میر شیر علی افسوس، میر بہادر علی حسینی، حیدر بخش حیدری، نہال چند لاہوری، بینی نرائن جہاںؔ، تارنی چرن مترا، راجہ جنم جے مترا، اور راجہ رام موہن رائے کا ہے۔

اصل میں جنوبی ہند کی ترقی یافتہ شکل ہندوستانی آریائی ہندوستان کی لنگو فرینکا ہے۔ یہی زبان تھوڑی سی بدلی ہوئی شکل میں اتر پردیش، بہار، راجستھان پنجاب، کشمیر، دکن اور بنگال کے بعض شہروں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں یہ زبان پھیل چکی ہے۔ علمی و ادبی زبان بن چکی ہے۔ برسہا برس اسکولوں اور کالجوں میں ذریعہ تعلیم اور عدالتی زبان رہی ہے۔ مگر آزادی کے بعد اس زبان کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک ہوا اور ہندی اور اردو کے درمیان خط فاصل کھینچنے کے لئے ہندی میں ادق اور نامانوس الفاظ ٹھونسے جانے لگے، اور اس دیش کی

---

[۱] The origin & development of Bengali language by Dr. Suneeti Kumar Chatterjee P. 121

ہردلعزیز زبان کی کشتی لسانی عصبیت کے طوفان میں ہچکولے کھانے لگی۔ اسی اندھے تعصب کی وجہ سے ہندی عوامی زبان بننے کے بجائے اجنبی سی زبان بنتی جارہی ہے۔ عوام سے اس کا گہرا رشتہ ٹوٹنے لگا۔ اگر تعصب کا طوفان وقت کے ساتھ دب گیا اور ہندی کو آسان بنانے کی تحریک کامیاب ہو گئی تو ہندی اور اردو میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ بس لپیوں کا امتیاز رہ جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ حقیقت میں یہی زبان چاہے آپ اسے ہندی کہہ لیں، چاہے اردو، ہندوستان کی سب سے اہم اور مقبول زبان ہے۔ یہ واحد بولی ہے جو ہندوستان کی قومی زبان کا رتبہ پا سکتی ہے[1]

اس قومی زبان کا گہرا اثر بنگلہ زبان پر بھی ہوا ہے۔ ۱۸ ویں صدی کے دوسرے نصف اور انیسویں صدی کے آغاز میں بنگلہ میں فارسی، عربی اور اردو کے الفاظ خلط ملط ہوتے گئے، اور بنگال میں بنگلہ کے ساتھ اردو زبان کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

سنہ ۱۱۹۳ء میں تراین کے میدان جنگ میں پرتھوی راج چوہان کی شکست اور ہلاکت نے ہندوستان میں مسلمانوں کی عظیم سلطنت کی بنیاد رکھی اور شہاب الدین غوری[2] کے بعد اس کے دست راست جنرل قطب الدین ایبک[3] نے دلی میں غلام

---

[1] ملاحظہ ہو اوریجن اینڈ ڈیولپمنٹ آف بنگالی لنگویج [2] شہاب الدین غوری، حکمراں غور سلطان غیاث الدین کا بھائی تھا۔ دو بار اس نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ پہلی بار اسے شکست ہوئی لیکن دوسری بار راجہ قنوج راجہ جے چند کی مدد اور سازش سے اس نے پرتھوی راج چوہان کو مغلوب کیا۔ پرتھوی راج چوہان کی شکست سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کی تاریخ شروع ہوئی۔ داخلی پھوٹ کی وجہ سے ہندوؤں کے اقتدار کا چراغ صدیوں کے لئے بجھ گیا [3] قطب الدین ایبک غلام خاندان کا پہلا حکمراں اور دہلی سلطنت کا اصل بانی تھا اور اس نے پٹھان حکومت کی بنیادیں ہندوستان میں مضبوط کیں۔

خاندان کی حکومت کا عالیشان قصر تعمیر کیا۔ اور پھر ایبک کے جنرل اختیارالدین بن بختیار خلجی نے بنگال فتح کیا[۱]۔ راجہ لکشمن بغیر لڑے فرار ہوگیا اور گوڑ (لکھنوتی) پر بھی افغانوں کا قبضہ ہو گیا۔ سنارگاؤں، جہانگیر نگر (ڈھاکا) میمن سنگھ اور دوسرے اندرونی علاقوں میں مسلمان پھیلتے چلے گئے۔ اس طرح بنگال میں مسلم کلچر کی جڑ گہری ہوتی چلی گئی۔

فاتح قوم کی زبانیں فارسی اور ترکی تھیں۔ اس لئے ان کی زبانوں کے الفاظ بنگلہ زبان میں شامل ہوتے گئے۔ یہ عمل تیرہویں صدی کے آغاز میں شروع ہوا تھا اور جب ۱۶۰۵ء میں مغل شہنشاہ اکبر ایک وسیع اور عظیم مملکت اپنے جانشین کے لئے چھوڑ کر مرا تو اس وقت ہندو مسلمان، سکھ اور دوسری قوموں کے میل جول اور برادرانہ رشتے کی کوکھ سے ہندوستان میں ایک نیا مخلوط کلچر جنم لے چکا تھا جو انڈو مسلم کلچر کے نام سے مشہور ہوا۔

مغلوں کا عہد ہندوستان کا عہد زریں کہا جاتا ہے، اس عہد میں مشترک تہذیب و ثقافت کا چراغ سارے ہندوستان پر روشنی بکھیر رہا تھا۔ اس نئی تہذیب اور ثقافت سے بنگال کی سماجی زندگی بھی متاثر ہوئی اور نئی تہذیب کے ساتھ نئی زبان بھی رفتہ رفتہ بنگال کے گوشے گوشے میں مروج ہوتی گئی۔ اردو کے توسط سے فارسی عربی اور ترکی الفاظ بنگلہ زبان اور ادب پر محیط ہوتے گئے۔ اس

---

[۱] یہ کہانی ہے کہ اختیارالدین بن بختیار خلجی نے بنگال کے فرماں روا راجہ لکشمن سین کے عہد میں صرف سترہ سواروں کے ساتھ بنگال کو فتح کیا۔ اس فتح کے بعد بنگال کے ایک بڑے حصے پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی تھی اور رفتہ رفتہ مسلمان پورے بنگال اور آسام پر قابض ہوگئے۔

کی مثال بنگلہ زبان کے پہلے نثری شاہکار راجہ پرتاپ دیتو چرتر (راجہ پرتاپ کے فضائل) میں ملتی ہے۔ رام رام باسو کی اس کتاب سے دراصل بنگلہ نثر کی ابتدا ہوتی ہے[1]۔ رام رام باسو نے یہ کتاب سیرامپور مشنری کے ڈرچ رسان فادر ولیم کیری کی ترغیب پر لکھی تھی۔ ان کی اس کتاب میں فارسی، عربی اور ترکی کے ایسے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں جو اب بنگلہ زبان سے نکال دئے گئے ہیں۔ اصل میں یہ کتاب فارسی آمیز بنگلہ میں تصنیف ہوئی تھی

انیسویں صدی میں صرف بنگلہ ہی فارسی، عربی اور ترکی سے متاثر نہ ہوئی تھی بلکہ بہار، یوپی، پنجاب، راجستھان، گجرات، بمبئی، دکن، آسام اور اڑیسہ کی زبانوں پر بھی اس کا گہرا اثر ہوا تھا۔

گو مشرقی ہندوستان کی سبھی زبانوں نے فارسی اور عربی کا اثر قبول کیا ہے لیکن مسلم حکمرانوں اور صوفیائے کرام کے تبلیغی کام کے باعث بنگلہ پر اس کا رنگ گہرا چڑھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں اور انیسویں صدی کے آغاز میں بنگلہ فارسی آمیز ہو گئی تھی" اور اونچے درجہ کے ہندوؤں کے یہاں بھی فارسی آمیز بنگلہ بولی پڑھی اور لکھی جاتی تھی[2]۔

اس فارسی آمیز بنگلہ کا اثر ایک صدی تک قائم رہا لیکن ادب میں اس کی جڑ گہری نہ ہو سکی۔ تقریباً ایک صدی بعد برہمنی پنڈتوں کو فارسی غلبہ کا احساس پریشان کرنے لگا۔ فارسی آمیز بنگلہ اجنبی اور بار سماعت محسوس ہونے لگی۔ اور

---

[1] رام رام باسو سیرام پور مشنری کے ڈرچ رساں فادر ولیم کیری (W. Carey) کے خاص منشی تھے۔ باسو نے ولیم کیری کے ایما پر بنگلہ نثر کی پہلی کتاب راجہ پرتاپ دیتو کا چرتر (The character of Raja Pratap) لکھی جس میں فارسی الفاظ کی کثرت ہے [2] بنگلہ زبان کی ابتدا اور ارتقا ص ۱۴۱

بنگلہ زبان سے ایسے عربی اور فارسی الفاظ نکال دئے گئے جن کے متبادل الفاظ سنسکرت میں موجود تھے۔ بنگلہ کو نئے سانچے میں ڈھال کر نیا روپ دینے کی کوشش گو کامیاب ہوئی مگر اس وقت تک اردو کی وساطت سے فارسی اور عربی کے الفاظ خلط ملط ہو کر اجنبی نہیں رہے تھے اور بنگلہ زبان کا جزو لاینفک بن گئے تھے۔ اب تک بہت سے الفاظ بنگلہ زبان میں رائج ہیں۔ روزمرہ میں مستعمل ہیں۔ ان کے تلفظ، لہجہ اور صوتی انداز میں یقیناً فرق پیدا ہو گیا ہے جو مقامی اثر کا نتیجہ ہے فارسی، عربی اور اُردو کے ایسے الفاظ کی مندرجہ ذیل فہرست سے یہ پتا چل جائے گا کہ اب تک بنگلہ زبان میں فارسی الفاظ روزمرہ استعمال ہوتے ہیں۔

گرفتار، بیمہ، کھاکی (خاکی) امیر، امرا، اوزیر (وزیر) کیفیت، کھاس (خاص) منجور (منظور) کھلت (خلعت) کوتل (قتل) پھوج (فوج) جنم، جخم (زخم) ہجور (حضور) دشمن، بدماش (بدمعاش) تماشا، سردار، مقابلہ، تاریخ، ہمت، شمشیر جمعدار، نگدی (نقدی) تگادہ (تقاضہ) کھنجر (خنجر) شکار، بالش (تکیہ) رسد، فوت، مالک، بادشاہ، مرجا (مرزا) اولاد، جامہ، پوشاک، موسری (مسہری) اوکیل (وکیل) جان (اذان) جوان، انقلاب (انقلاب) جلدی، جاری، دیری تکرار، درکھاست (درخواست) دلیل، دستخط، نقل (نکل) خواب، نالش، فریادی فرار، مجرا، مکدمہ (مقدمہ) روا، رانی، ہوا، رجوع، مسخرہ، تاکید، شناکھت (شناخت) دہقانی، سلیس، حق، حاکم، حاجت، جلسہ، حفاجت (حفاظت) ہنگامہ، شہید، انجیل، ہلدی، عجت (عزت) بندگان، سنار، حروف، اچکن، آتشبازی، کاگج (کاغذ) دستگیر، دستی دار، مستعفی، سکمد، چابک، حکہ (حقہ) ریشمی عطر، حبشی، جانور،

رواج بسلہ (مسالہ) میدہ، ملائی، صراحی، دودھ (سنسکرت) انگریز۔ نہایت،
یونانی، دربان، راضی، ہنسی، خوشی، جواب، خودکاری، نواب، خواہ مخواہ، تعلقدار،
جاگیردار، زمین، زمیندار، غلام، صاحب، بیوی، آب وہوا، مشکل، شروع، مصری،
روشن، لذیذ، ضبط، ضمانت، رنگ، رنگین، اصطبل، جنگی، صابن، مجموعہ دار (جمعدار)
محل نویس، تدبیر، قدرت، خوشنجر، راستہ، راہ، آرام، سخت، آسان، بیش
حرام، حرامزادہ، دنیا، خراب، بدذات، بہادر، منشی، انار، احمق آہستہ، آئین،
قانون، اللہ، رسول، قاضی، کاریگر، قید، قیدی، ختم، خیالی، خام خیال، خالص،
خالی، خوراک، خوشامد، خون، غریب، غیر حاضر، غالیچہ، زردہ، جوہر، جہاں پناہ،
جعلساز، طوفان، طرفدار، دفعدار، قرضدار، درزی، سلائی، دیا سلائی، میدان،
موزہ، موضع، ضلع، نقشہ، نظیر، ناظر، دیوار، شریر، شراب، شادی، سرکاری،
خیرات، سردی، سراغ، صوبہ، سفارش، سادہ، صاف، دستور، واپس،
شیش محل، شہر، راہزن، رعیت، رقم، وداع، دفتر، دفتری، درکار، نابالغ، فصل
پیشاب، پیادہ، بندوق، بندوبست، بدخیال، بدنام، برف، بستی، بازار، باطل
باورچی، بےچارہ، بےادب، بےایمان، بےقاعدہ، بےکار، بےحال، بارود، برباد،
بطن، باورچی، بےچارہ، دانشمال، بےایمان، وثیقہ، بازی گر، مزاج، مزدور،
مشعل، مسند، منصب، محصول، مفت، میعاد، مینار، میت، موکل، یار، وارث،
دلال، نیم، ندرانہ، نواب زادہ، نوابی، نشہ، نہر، نرخ، نشان، نام، نایاب،
نظامت، جادوگر، تحویل، تیروتفنگ، تیغ، ناسوری، نیم خوابی، طلاق، ترازو، ناقص
تعویذ، پیغام، فیصلہ، فرصت، بندش، چالاک، مذاق، پان، پردہ، پیالہ،

قہوہ، نیل، سبز، دستور، مولوی، عالم، فاضل، اکھنو (اکنوں) دریا، سلطان،
شہادت[1]۔

فارسی، عربی اور اردو الفاظ کی یہ مختصر فہرست طویل ہو سکتی ہے کیونکہ پانچو
سے زیادہ الفاظ بنگلہ زبان میں مروج ہیں اور ہندو اور مسلمانوں کے میل جول اور
ایک دوسرے میں گھل مل جانے کی وجہ سے بنگلہ زبان کے علاوہ ہندوستان کے
اس مشرقی خطے میں بھی نئی زبان رواج پا گئی، اور ہندو اور مسلمان بنگالی بڑی تعداد
میں اس نئی آسان اور زود فہم زبان کو پڑھنے اور سیکھنے لگے۔ راجہ رام موہن رائے
راجہ ادمان، راجہ کرشنا، منشی تارانی چرن مترا، کیشپ چندر کرمکار جیسے ادیب
شاعر اور عالم نے اردو کو بنگال میں فروغ دینے کی پوری کوشش کی۔ یہ انھی
عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی انتھک کاوش اور جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ اردو
زبان اب تک بنگال میں نہ صرف زندہ ہے بلکہ مقبول بھی ہے اور یہاں اس زبان
کو کچھ سہولتیں بھی حاصل ہیں۔

بنگال میں کلکتہ، ہوگلی، مرشد آباد، دومٹیا برج اس کے اہم مراکز شمار ہوتے ہیں
کلکتہ کے لوگوں پر تو اردو کا گہرا اور بھرپور اثر ہوا ہے۔ ہندوستان کا یہ سب
سے بڑا شہر شروع ہی سے ایک اہم تجارتی مرکز اور دارالسلطنت رہا ہے۔ کلکتہ
کے تجارتی مرکز اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں ہندوستان کی مستقل راجدھانی
ہونے کے سبب سے صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ ایشیا اور یورپ کی مختلف
اقوام کے افراد یہاں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اس لئے اس شہر میں

---

[1] دیکھئے انیسویں صدی میں بنگلہ ادب کا ارتقا۔ ایس۔ کے۔ ڈے

بنگلہ، اردو اور ہندی کے اختلاط سے ایک الگ مقامی بولی پیدا ہوئی "جو کلکتیا اردو"[1] کے نام سے مشہور ہوئی جو اصل میں کھڑی بولی کی کثیف شکل ہے اور کلکتہ والوں کے لئے محض بول چال کی زبان رہ گئی ہے۔ اس زبان میں بھی اس طرح کوئی ادب پیدا نہ ہو سکا جس طرح "مسلمانی بنگلہ"[2] میں کوئی خاص دیرپا اور اثر انگیز ادب کی تخلیق نہ ہو سکی تھی۔

بنگال میں مسلم حکومت کے قائم ہونے کے قبل ہی صوفیائے کرام کی جماعتیں مختلف علاقوں میں پھیل چکی تھیں۔ ان میں نقش بندی، قلندری، سہروردی، مداری، احمدی چشتی اور قادری خاندان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان صوفیائے کرام نے مختلف اضلاع میں اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ بنگال کی ثقافتی اور سماجی زندگی ان سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ ان جماعتوں کے افراد کا تعلق براہ راست بغداد، ایران، اصفہان، سمرقند اور شمالی ہندوستان سے تھا۔ اس لئے ان کی زبان نہ بنگلہ تھی نہ اردو۔ درحقیقت ان کی زبانیں فارسی، ترکی اور عربی تھیں اور چونکہ شمالی اور جنوبی ہند میں اردو زبان بول چال کی زبان بن چکی تھی، لہٰذا وہ اردو بھی سیکھ گئے ہوں گے اور بنگالیوں کے لئے عربی اور فارسی سے زیادہ آسان اور زود فہم زبان اردو ہی ہو سکتی تھی۔ اردو ہندوستان کی ایک جدید زبان ہونے کے ناتے سے بنگلہ اور ہندی کے قریب تھی۔ ان حالات کے پیش نظر صوفیائے کرام نے آسان ہندوستانی زبان میں تبلیغی کام شروع کیا ہوگا۔ اس طرح اردو بنگال کے اہم

---

[1] کلکتیا اردو اصل میں ابتدائی اردو کی بگڑی شکل ہے صرف کلکتہ میں بولی جاتی ہے، اس کا کوئی ادبی سرمایہ نہیں ہے۔ [2] بنگلہ زبان کی ابتدا اور ارتقا صفحہ ۲۵۶

تبلیغی مراکز میں اپنا رنگ جماتی گئی۔ اندرونی علاقوں میں بھی پھیل گئی اور مریدوں کا ایک بڑا حلقہ اردو کے زیر اثر آیا اور یہی لوگ اُردو داں مولوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی زبان بنگلہ تھی اور اردو کی وساطت سے فارسی اور عربی الفاظ بنگلہ میں شامل ہوتے گئے۔ ان کی بنگلہ پر فارسی اتنی غالب تھی کہ یہ مسلمانی بنگلہ مشہور ہو گئی۔

مسلمانی بنگلہ اصل میں اردو کی بنگالی شکل ہے، صرف فعل بدل گئے ہیں لہجے اور صوت کے اعتبار سے کچھ فرق ہے۔ ڈاکٹر سونیتی کمار چیٹرجی نے اپنی تحقیقی اور مشہور کتاب "بنگلہ کی ابتدا اور ارتقا" میں مسلمانی بنگلہ پر تفصیلی بحث کی ہے مسلمانی بنگلہ کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے گنے چنے ادیبوں اور شاعروں نے بلا تامل فارسی اور اردو کے الفاظ استعمال کئے ہیں[1]۔ مثال کے طور پر پاؤں، رکاب، کان، جامہ زیب، خدا، نماز، عقل، برکت، فضیلت، کرشمہ بدذات، محکوم، شہنشاہ، کرامت، وکالت، چادری، گناہ، امین تن کی جگہ ایسا تیا خدا کارن کی جگہ واسطیر خدا، جیسے بہتیرے الفاظ مسلمانی بنگلہ میں پائے جاتے ہیں، اس لئے یہ مسلمانی بنگلہ کہلائی۔ مرشدآباد، ۲۴ پرگنہ، ہوگلی، بردوان ضلعوں میں اس کا اثر اب بھی تھوڑا بہت باقی ہے مسلم بنگالی ادبا اور شعراء کی زبان ہندو ادبا اور شعراء کی زبان سے کچھ مختلف ہے۔ بنگلہ کے مشہور انقلابی شاعر قاضی نذرالاسلام کے گیتوں اور کویتاؤں میں فارسی کا اثر غالب ہے۔ ان گیتوں اور کویتاؤں میں اردو فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔

---

[1] بنگلہ زبان کی ابتدا اور ارتقا۔ ڈاکٹر سونیتی کمار چیٹرجی ص ۲۲۶۔

سترہویں صدی عیسوی میں عبد الغفور صدیقی نے مسلمانی بنگلہ میں ایک مشہور مثنوی تصنیف کی تھی، جو اس وقت جدید بنگلہ کا شاہکار کہلائی۔ اس جنگ نامہ میں قدیم اور ابتدائی اردو کی جھلک ملتی ہے[1]

جنگ نامہ کے علاوہ بھی دو چار تصنیفات و تالیفات ایسی ہیں جن میں اردو اور فارسی غالب نظر آتی ہے ان کتب کے مطالعہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ اردو شمالی ہند سے نکل کر صرف دکن تک ہی نہ گئی بلکہ صوفیائے کرام کی بدولت بنگال کے مختلف علاقوں میں پہونچ کر اپنا رنگ جما رہی تھی۔ یہ اس کی مقبولیت کا بین ثبوت ہے۔

غلام خاندان کے عہد میں ہی صوفیائے کرام کے ہمرکاب مسلمانوں کے کئی قافلے بنگال پہونچ چکے تھے۔ یہ مسلمان پنڈوا، ہر گلی، بردوان میمن سنگھ، نواکھالی، ندیا، ڈھاکہ اور مرشدآباد میں پھیل گئے۔ ان مسلمانوں کے ساتھ نئی زبان اردو بھی آئی تھی، ایسی حالت میں اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ

"اردو زبان کا سرچشمہ شمالی ہند میں مختلف بولیوں کے میل جول سے پھوٹا۔ دلی اور آگرے میں اس چھوٹے سے چشمے نے دریا کی شکل اختیار کی اور پھر دلی سے اس کی مختلف شاخیں دکن، لکھنؤ، پنجاب، مشرقی ہند یعنی بنگال و بہار، اڑیسہ اور آسام کو پھیل گئیں"[2]

اس طرح تیرہویں صدی عیسوی کے شروع میں ہی اردو زبان غیر واضح شکل میں بنگال پہونچ گئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اردو کو بنگال میں واضح ادبی حیثیت اختیار کرنے میں صدیاں لگ گئیں۔ اور انیسویں صدی کے آغاز میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر اور

---

[1] دیکھئے بنگلہ زبان کی ابتدا اور ارتقا ص ۲۷ [2] ملاحظہ ہو نقش سلیمانی ص۔ از سید سلیمان ندوی

کلرک اپنی ضرورت کے لئے اس نوزائیدہ زبان کی پرورش اور سرپرستی نہ کرتے تو کلکتہ اردو نثر کا سب سے بڑا اور سب سے اہم مرکز کبھی نہیں بن پاتا۔

جس طرح دسویں صدی ہجری کے آغاز میں اردو دکنی بھاشا کے میل جول سے ادبی زبان بننے لگی تھی اس طرح بنگالہ میں اس کا کوئی ادبی ڈھانچہ تیار نہ ہو سکا تھا دکن میں دسویں صدی ہجری میں ہی نثر اور نظم ترقی کرنے لگی تھی اور قلی قطب شاہ نے اردو دکنی ملی جلی شاعری کی نوک پلک سنوار کر اسے مقبولیت بخش دی تھی۔ ان کے عہد میں کئی اور بھی کامیاب شاعر افق ادب پر جلوہ گر ہو چکے تھے اور شعری ادب کا سانچہ مکمل ہو رہا تھا مگر اس وقت نثری نمونہ خال خال ہی ملتا ہے اور غیر واضح خطوط پر نثر چل رہی تھی۔

اردو زبان کے نشو و نما اور ارتقا پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ

> "اردو ایک جدید ہندوستانی زبان ہے۔ یہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی پیداوار ہے جس میں ہندوستانی فضا اور ہندوستانی عناصر کے علاوہ چند قابل قدر ایشیائی عناصر بھی شامل ہیں۔ بعد میں اس کو مغرب کے معیاروں اور قدروں سے بھی آشنا ہونے کا موقع ملا"[1]

محولہ بالا اقتباس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو جدید ہند آریائی دور کی ایک اہم زبان ہے۔ ہندوستان کی جدید زبانوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ بنگلہ ہندی اور اردو ایک ہی دور کی پیداوار ہیں۔ یہ دور ۱۰۰۰ء سے شروع ہوتا ہے

---

[1] ملاحظہ ہو ہماری زبان یکم مارچ ۱۹۶۲ء علی گڈھ تاریخ ادب اردو کا دیباچہ : از آل احمد سرور

لسانی اعتبار سے تین صدیاں افراتفری کا دور ہیں۔ پرانے سانچے بدل رہے تھے زبانوں میں تغیر اور قواعد کی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ زمانہ ہر لمحہ انقلاب بداماں تھا۔ یہ انقلاب سماجی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی زندگی میں چپکے چپکے برپا ہو رہا تھا۔ اور مسلمانوں کے حملے کے بعد ایک نئے ثقافتی دور کے اچانک شروع ہو جانے کی وجہ سے نئی ہند آریائی زبان میں ادب کی تخلیق بھی انقلابی انداز میں ہو گئی۔[1]

ان جدید آریائی زبانوں میں بلاشبہ اردو بھی شامل ہے جس نے دوسری زبانوں کی بہ نسبت ارتقائی منزلیں زیادہ سرعت سے طے کیں۔ اور ہندوستان کی ایک ہر دلعزیز اور مرغوب زبان بن گئی۔

گو اردو زبان کا ہیولیٰ بارہویں صدی کی دسویں دہائی میں تیار ہونے لگا تھا مگر یہ انتہائی دھندلا اور غیر واضح تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نئی زبان اٹھارہویں صدی میں صحیح معنوں میں ادبی حیثیت اختیار کر سکی تھی۔ شمالی ہند میں سودا، میر اور غالب کا عہد اس کے شعری ادب کا زریں عہد کہلاتا ہے۔

اگر یہ بے بنیاد بات مان بھی لی جائے کہ حسین شاہ کے عہد حکومت میں بنگال میں اردو زبان اپنا رنگ جما چکی تھی تو بھی اس خیال کی تصدیق کی کوئی نہیں ملتی کہ اس عہد میں اردو کی بہت ساری کتابیں تصنیف و تالیف ہو چکی تھیں۔ بلاشبہ انیسویں صدی میں کلکتہ اردو، خصوصاً نثر کا عظیم مرکز بنا۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام نثر کے فروغ کے لئے ایک نعمت ثابت ہوا۔

---

[1] ملاحظہ ہو بہار میں اردو زبان اور ادب کا ارتقاء از اختر اورینوی ص ۱۰۶

اس وقت سے نثر نگاری کا جدید رجحان پیدا ہوا اور سچ پوچھئے تو آسان اردو اور نثر کی داغ بیل پڑی۔ اور شعر و شاعری کی طرح داستان گوئی بھی عوام میں مقبول ہو کر ادب پر چھا گئی، مگر ہر صوبے میں مقامی بولیوں کے امتزاج سے اس نے الگ الگ روپ اختیار کیا۔ علامہ سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

"یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ دار زبانوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی"[1]

مولانا سلیمان ندوی کے اس خیال سے بعض محققین نے اتفاق نہیں کیا ہے۔ اور ان کے بیان کو متضاد قرار دیا ہے مگر میرا خیال ہے کہ مولانا موصوف کی رائے واضح ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو گو شمالی ہندوستان کی بولیوں کا ماحصل ہے تاہم یہ شمالی ہند تک محدود نہ رہ گئی تھی، بلکہ اپنی بالکل ابتدائی شکل میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں پہونچ چکی تھی اور ان ریاستوں کی بھاشاؤں کا رد عمل اس پر مختلف ہوا، اسلوب، طرز بیان، لہجہ اور صوتیاتی انداز میں ہر جگہ کچھ نہ کچھ فرق پیدا ہوتا گیا۔ مسلمان فاتحوں کی عربی اور فارسی زبانیں سب سے پہلے سندھی اور ملتانی بولیوں سے مخلوط ہوئیں۔ پھر پنجابی اور اس کے بعد قنوجی، برج بھاشا اور کھڑی بولی سے۔ اور چونکہ یہ سندھی، ملتانی اور پنجابی خالص ہندوستان کی زبانیں ہیں لہذا اردو پر ان کا یکساں اثر پڑا۔ اردو کی ابتدا انھی بولیوں کے اختلاط اور امتزاج سے ہوئی اور بعد میں کھڑی بولی سے مل کر ایک نئی زبان کے سانچے میں ڈھل گئی اور حکمراں قوم کے ساتھ

---

[1] دیکھئے نقوش سلیمانی ص ۹۶، مولانا سلیمان ندوی

ملف صوبوں میں پھیل گئی، یہی سبب ہے کہ تیرہویں صدی میں ہی اُردو
کال میں بھی اپنی ابتدائی اور مبہم شکل میں موجود تھی ۔

ان بدلتے ہوئے حالات اور ارتقا کی سُست رفتار سے اس خیال کو
تقویت پہونچتی ہے کہ اردو کو واضح فارم اختیار کرنے میں صدیاں لگ گئیں۔
جیسا کہ پہلے لکھا گیا اردو دکنی سب سے پہلے ادبی زبان بنی لیکن دکن میں بھی
ب پھولبن، پدماوت، گلشن عشق اور قطب مشتری جیسی مشہور اور مقبول مثنویاں
صنیف ہو چکی تھیں تو نثر میں کوئی بڑی کتاب تالیف یا تصنیف نہ ہو سکی تھی ۔

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی معراج العاشقین اور شکار نامہ، رسالہ
ع العلم اور چند دیگر مذہبی رسالوں، جو خاص کر تبلیغی کام کے لئے لکھے گئے تھے،
علاوہ نثر میں کوئی بڑا کارنامہ نظر نہیں آتا ہے ۔ ان مذہبی رسالوں اور چھوٹی
چھوٹی درسی کتابوں کے بعد ملا وجہی کی سب رس وجود میں آئی۔ اس کتاب کو
ردو دکنی نثر کا پہلا قابل توجہ اور شاندار کارنامہ قرار دیا گیا ہے۔ سب رس
ردو سے زیادہ دکھنی ہے۔ پھر بھی اس میں اردو کے فعل، تراکیب اور ان گنت
لف ناموجود ہیں جو اسے اردو نثر کی پہلی داستان کا درجہ عطا کرتے ہیں ۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق، پروفیسر نصیر الدین ہاشمی، محی الدین زور اور دیگر
محققین نے سب رس کی اولیت کو تسلیم کیا ہے۔ بعض نے اسے اُردو کا پہلا
ضمہ یا ناول کہا ہے۔ سب رس کا زمانہ بہت پرانا ہے۔ گیارہویں صدی ہجری

لہ سب رس اصل میں ایک تمثیلی ناول ہے جس میں تمثیل اور اشارے کے ذریعہ نیکی اور بدی
ے درمیان کشمکش دکھائی گئی ہے۔ دل آنکھ ناک اور دوسرے اعضائے انسانی اسکے کردار خصوصی ہیں۔

میں یہ تصنیف ہو چکی تھی، مگر اس وقت دکن کے علاوہ اردو کے ننھے نوخیز پودے کی آبیاری نہیں ہو رہی تھی۔ بنگال تو دور افتادہ علاقہ تھا۔ خود شمالی ہندوستان میں جہاں اردو کا ابتدائی سانچہ تیار ہوا تھا نظم و نثر کی جانب بالکل توجہ نہیں دی جا رہی تھی۔ ایسی ناساعد حالت میں اردو بنگال میں ادبی رتبہ کیسے حاصل کر سکتی تھی؟ یہاں خود بنگلہ ابتدائی مرحلے میں تھی اور لوک گیتوں کے سوا اس زبان کا کوئی خاص ادبی سرمایہ موجود نہیں تھا۔ بنگلہ نثر کا بھی باقاعدہ آغاز انیسویں صدی عیسوی میں ہوتا ہے۔

اس بحث سے قطع نظر کہ اردو پہلے دلی، دکن یا پنجاب میں پیدا ہوئی، یہ خیال یقیناً بے بنیاد نہیں کہ افغان اور ترک حملہ آوروں کے ساتھ اردو بنگال میں بھی آئی ۱۳ ویں صدی کی ابتدا ہی میں بنگال میں اس کا خاکہ تیار ہو چکا تھا۔ مگر اس خاکے میں ادبی رنگ بھرا نہ جا سکا۔ صرف صوفیائے کرام کے تبلیغی کام کی وجہ سے اردو بنگلہ پر اپنا اثر مرتب کرنے لگی تھی۔ ویسے اردو میں تالیف، تصنیف یا ترجمے کا کام انیسویں صدی عیسوی میں شروع ہوا۔ اس خاکے میں خوبصورت ادبی رنگوں کی آمیزش ہونے لگی، اور بنگال نے بھی اردو کے نشوونما اور ارتقا میں نمایاں حصہ لیا۔

"بنگلہ زبان بھی ہندوستانی زبانوں کی طرح جدید آریائی زبان ہے اور اس کا ماخذ بھی سنسکرت اور مگدھی زبانیں ہیں۔ چنانچہ جب سنسکرت عوام سے بہت دور ہو گئی تو دوسری مخلوط بولیوں نے رفتہ رفتہ اس کی جگہ لے لی۔ پراکرت، پالی شورسینی کی کوکھ سے مغربی ہندی نے جنم لیا۔ بعد ازاں نئی بھاشائیں اردو ہندی راجستھانی وغیرہ پیدا ہوئیں اور پھر ہندی بنگلہ اور اردو زبانیں جیتی جاگتی زبانوں

کی حیثیت سے عوام میں اور زندہ ادب میں مستقل ہوئیں۔[۱]"

اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ادبی زبان بننے کے لئے اردو کو بہت سے نشیب و فراز سے گذرنا پڑا۔ اور مختلف صوبوں کی بھاشاؤں سے مخلوط ہوتے ہوئے اس نے اپنی جداگانہ شکل اختیار کرلی۔ "پنجاب میں اردو" کے مؤلف محمود شیرانی کا یہ خیال بہت حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کہ :۔

"اردو کا آخری لیکن سب سے زبردست مرکز دہلی ہے جو رنگ آبادی کے اثرات میں قائم ہوتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد وہاں سے لکھنؤ اور مکھنؤ سے کلکتہ پہونچ کر عام ہو جاتا ہے۔[۲]"

میرا خیال ہے کہ اردو صرف کلکتے میں ہی نہیں بلکہ پورے مغربی بنگال میں عام ہو گئی تھی۔ کلکتہ کے علاوہ مرشد آباد، ہوگلی، بردوان، چوبیس پرگنہ اور جہانگیر نگر میں بھی ادبی ماحول جنم لیتا ہے۔ اردو میں مفید معلوماتی اور پایہ کی کتابوں کی تصنیف تصنیف اور ترجمے کا کام بڑی شدومد سے شروع ہو جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں غیر ملکی ادبا، نوابین اور راجوں کی سرپرستی میں نظم و نثر کی اہم کتابیں ترتیب پانے لگتی ہیں اور بنگال کی بھی اردو ادبی متاع دوسرے علاقوں سے پیچھے نہیں رہتی جس کی تفصیل آئندہ ابواب میں بیان کی جائے گی۔

---

[۱] بہار میں اردو زبان کا ارتقاء ص ۴۶ - اختر اورینوی

[۲] پنجاب میں اردو، حافظ شیرانی ص ۱۲ -

بنگال میں اُردو کا ارتقا

بنگالہ ہندوستان کا ایک قدیم صوبہ ہے ، بہت دنوں تک اسے ایک الگ سلطنت کی حیثیت حاصل رہی تھی۔ اس صوبے کی ابتدائی تاریخ بے حد دلچسپ ہے اس کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ اصل میں اس کا نام بنگ تھا جو بعد میں بنگالہ ہوگیا۔ بنگ دو میدانوں کے درمیان پشتے کو کہتے ہیں چونکہ بنگالہ چاروں طرف سے چھوٹی بڑی ندیوں سے گھرا ہوا تھا اس لیئے وہاں کے باشندوں نے سیلاب برد ہونے کے خطرے کے پیش نظر دونوں جانب پشتے تعمیر کر لیئے تھے ۔آئین اکبری میں ابوالفضل[1] نے بنگالہ کو بنگ ہی لکھا ہے مگر اس کی کوئی توجیہہ نہیں کی ہے ۔بعض مورخین کا کہنا ہے کہ بنگالہ اصل میں بنگ + لابہ کا مرکب ہے یعنی بنگالی بھاشا کا گھر ہے۔ یہ تشریح بہت حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے۔ بنگالہ کی ابتدا سے متعلق ایک اور دلچسپ نیم مذہبی روایت بھی ہے کہ

> "ہندوؤں کے مذہبی قصوں کے مطابق چندربنسی خاندان کے راجہ بالی اور رانی سودیشنا کے پانچ بیٹے تھے ۔ایک کا نام انگ تھا۔ دوسرے کا ونگ یا بنگ۔ تیسرے کا پودرا چوتھے کا کلنگ اور پانچویں کا سہاما۔ راجہ بالی کے ہر بیٹے نے ایک ایک سلطنت قائم کی اور اپنے اپنے نام سے اپنی سلطنوں

---

[1] علامہ ابوالفضل بن مبارک شاہ مغل اعظم اکبر کے دست راست اور وزیر اعظم وغیرہ کے دست تھے ، انھوں نے آئین اکبری ، اکبرنامہ اور بہار دانش جیسی مشہور کتابیں فارسی میں تالیف کیں۔ جہانگیر کے اتھوں ایک جنگ میں شہید ہوئے ۔فیضی انکے بھائی تھے ۔آئین اکبری میں ابوالفضل نے لکھا ہے کہ "بنگالہ دراصل بنگ بود ۔

کو منسوب کیا۔ بنگ نے پدماندی کے جنوبی حصے پر جو بھاگیرتی اور پرانی برہمپتر ندی کے درمیان واقع تھا قبضہ کیا۔ بولائی سیل کے عہد میں بھاگیرتی کے پورب کا علاقہ بنگ کہلاتا تھا اور جنوبی حصہ راڑھ جو پراکرت میں لایہ ہے۔ اس طرح بنگال بنگ[۱] + لایہ کا مرکب ہے جو مختلف انقلابی عمل سے گذر کر بنگالہ ہوگیا۔"

کرداروں کے بدلے ہوئے نام کے ساتھ ریاض السلاطین میں بھی کم و بیش یہی روایت بیان کیگئی ہے بنگال کی ابتدا اور آفرینش کے متعلق ابوالفضل غلام حسین[۲] اور دیگر مؤرخین کے بیان اور مذکورہ نیم مذہبی کہانی میں ایک بات مشترک ہے اور بنگ ہے۔ چنانچہ یہ مان لینے میں کوئی ہرج نہیں کہ شروع میں ہندوستان کے اس پرانے صوبہ کا نام بنگ تھا جو بعد میں بنگالہ ہوگیا۔

بنگالہ کی تاریخ بہت پرانی ہے مگر حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ اس قدیم صوبے کا ادب جدید ہے، شروع سے ہی یہاں کی زبان بنگلہ رہی ہوگی خواہ اس کی شکل ابتدا میں کتنی ہی بدلی ہوئی کیوں نہ ہو، مگر اردو کی طرح بنگلہ کو بھی عام فہم اور ادبی زبان بننے میں صدیاں لگ گئیں اور اس کے ادب میں جدید میلانات اور رجحانات مغربی معیاروں اور قدروں سے متاثر ہونے کے بعد ہی پیدا ہوئے ورنہ اسکے قبل لوک گیتوں، دوہوں اور کچھ رومانی نظموں میں ہی اس کا ادب سمٹا ہوا تھا۔ پوتھی لٹریچر اسکی کل ادبی کائنات تھی۔

بنگالہ کی ابتدائی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کا یہ مشرقی حصہ بھی

---

[۱] امپیریل گزیٹرس آف انڈیا ۱۹۰۵ جلد اول ص ۲ Imperial Gazzeteers of India 1909 A.D vol I P.2

[۲] مؤلف ریاض السلاطین۔ تاریخ فرشتہ میں بھی بنگ کا ذکر ہے جو سے منسوب ہوئی تھی۔

غیر ملکیوں کی تاخت وتاراج سے محفوظ نہیں رہا تھا۔ ہر دور میں کوئی نہ کوئی غیر ملکی طاقت
اس کی دولت بٹورنے اور اپنا اثر واقتدار قائم کرنے کے لئے حملے کرتی رہی تھی جس کی
وجہ سے صدیوں تک یہاں مستقل حکومت قائم نہیں ہو سکی تھی اور امن وامان برقرار نہیں
رہ سکا تھا۔ دراصل اکبر کے عہد میں منعم خاں نے ۱۵۷۵ء میں بنگال کے جابر اور سرکش
حکمراں داؤد خاں کو شکست دے کر مغلوں کا پرچم لہرایا اور پھر ۱۵۹۵ء میں راجہ
مان سنگھ نے اپنے تدبر اور حکمت عملی سے بنگال کی سرزمین باغی اور سرکش عناصر سے
پاک کیا۔[۱]" اکبر اعظم کے عہد میں ہی بنگال بھی سلطنت مغلیہ میں شامل ہو گیا اور ایک پائدار
ومستحکم حکومت قائم ہوئی۔ اس وقت سے بنگلہ پر فارسی زبان کے اثرات غالب اور نمایاں
ہونے لگے تھے۔[۲]

مغل حکومت کے استحکام کے ساتھ ہی بنگال میں امن اور خوش حالی کا دور شروع ہوا
سماجی زندگی کی بنیاد مضبوط ہوئی اور یہی دور بنگلہ ثقافت، تمدن، زبان اور ادب کیلئے ایک
موڑ ثابت ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے طوائف الملوکی، سیاسی انتشار اور معاشی بحران کی وجہ سے
وحشیانہ زندگی ابھر آئی تھی۔ کمزور فرماں رواؤں اور طاقتور باغی زمینداروں کے جبر واستبداد
کی وجہ سے "تہذیبی زندگی" کراہ رہی تھی۔ بنگالی قوم گھٹی ہوئی فضا میں سانس لے رہی تھی۔ غلامی
کی زنجیروں میں تہذیبی اور سماجی زندگی کے جکڑ جانے کے باعث زبان اور ادب کے فروغ کے

---

[1] "Bengal under Akbar & Jahangir" by Tapan Kumar Rai Chowdhri P3
بنگال در عہد جہانگیر تپن کمار رائے چودھری ص ۳

[2] The origin and development of Bengali language
Dr. Suniti Kumar Chatterjee P 205

نہ پاتے پیدا نہ ہو سکے۔ بنگال میں فاتح قوم کی تہذیبی و تمدنی زندگی کا اثر اتنا گہرا ہوا تھا کہ افغان بادشاہوں کے عہد میں بنگالی قوم نے اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنی زبان کے فروغ پر توجہ ہی نہیں دی اور غالباً اسی بنا پر اس عہد میں بنگلہ میں کسی عظیم تخلیق کا کوئی نشان نہیں ملتا ہے۔

اس سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلم سلاطین نے اپنی زبان کو بڑھانے کے لئے مقامی زبان کو دبانے یا کچلنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اکثر مسلم حکمرانوں نے بنگلہ سے خاصی دلچسپی لی اس کے فروغ میں مدد دی اور ان سلاطین کی وسیع القلبی اور فیاضی و سرپرستی کی وجہ کر بنگلہ ادبی زبان کے سانچے میں ڈھل سکی، دنیش چندر سین اپنی تحقیقی کتاب بنگلہ ادب کی تاریخ" میں لکھتے ہیں۔

"بنگلہ کے ادبی حیثیت حاصل کرنے کی کئی وجہ ہیں۔ بلاشبہ سب سے پہلی وجہ مسلمانوں کی فتح بنگال ہے۔ اگر ہندو راج کی سلطنت مسلمانوں کی گود میں لڑھک نہ جاتی اور راجاؤں کا سکہ بدستور چلتا رہتا تو بنگلہ کے لئے دربار میں رسائی محال تھی۔ قطب الدین ایبک کے سپاہیوں نے تیرہویں صدی عیسوی میں بنگال کو فتح کیا۔ ان کے بادشاہوں نے بنگال میں فارسی اور عربی زبان کو بنگال میں مروج کرنے کے ساتھ بنگلہ بھی سیکھی اور ہندو رعایا کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کئے۔ جب ان بادشاہوں نے سنسکرت کی مشہور رزمیہ کہانیاں رامائن اور مہابھارت سنیں، جو ہندوؤں کی مذہبی زندگی کا جزو تصور کی جاتی ہیں اور ان کی مذہبی، سماجی اور ثقافتی زندگی کی تشکیل میں اپنا بھرپور اثر رکھتی ہیں تو ان کو بھی قدرتاً ان کی نظموں کے موضوع کو جاننے کا شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے چند پنڈتوں کو ان رزمیہ داستانوں کو بنگلہ میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ اور ناصر شاہ والی گوڑ کے ایما اور حکم سے مہابھارت کا

کا ترجمہ بنگلہ میں ہوا"[1]

دنیش چندر سین کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ مسلم فاتحین جہاں بھی گئے اپنی زبان کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں کے نشو و نما کے لئے مخلصانہ کوشش کی اور ان کی سرپرستی میں مقامی زبانوں کو نہ صرف پنپنے بلکہ پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ اردو کا بھی کم و بیش یہی حال رہا ہوگا۔ یہ بھی ان مسلم حکمرانوں کی مادری زبان نہیں تھی بلکہ ہندوستانی بولیوں کے میل جول سے وجود میں آئی تھی۔ مسلم حکمرانوں، ان کے درباریوں اور فوجیوں کے ساتھ یہ نئی زبان بنگال میں آ ئی ہوگی۔ بلاشبہ اس وقت یہاں اس نئی زبان کا کوئی واضح فارم نہیں ہوگا۔ صدیوں کے بعد ہی اس کے ادب کے لئے بنگال میں خطوط وضع کئے گئے ہوں گے۔ اس نئی زبان کو مشرقی ہند کے اس دور دراز حصے میں، ادبی حیثیت اختیار کرنے کے لئے کتنے نشیب و فراز سے گذرنا پڑا ہوگا۔ کتنی بار یہ قطع و برید کے عمل سے دوچار ہوئی ہوگی تب جا کر اس کا ایک واضح اور مکمل ادبی ساںچہ تیار ہوا ہوگا، اور واضح خطوط پر ادب کی تخلیق ہوئی ہوگی۔

بنگلہ کی بھی کم و بیش یہی تاریخ ہے۔ یہ بھی اردو کی طرح ایک جدید ہندوستانی زبان ہے۔ اس زبان نے بھی ۱۹ویں صدی میں واضح شکل اختیار کی اور ادبی زبان بن سکی۔ چنانچہ بنگال میں اردو کو ادبی فارم اختیار کرنے میں جو دیر ہوئی وہ فطری عمل تھا ویسے سولہویں صدی عیسوی میں ہی اردو بنگال میں بول چال کی زبان کی صورت میں رائج ہو چکی تھی۔

مغربی سیاح یولی (Yule) کا کہنا ہے کہ ۱۶۶۰ء میں ہندوستانی زبان کا باضابطہ[2] استعمال بنگال میں بھی ہونے لگا تھا اور ٹیری (Tary) اپنی کتاب The voyage

---

[1] The History of Bengali Literature P.12 by Dinesh Chandra Sen

ٹاورنیئر (East India in 1655 A.D) مشرقی ہندوستان کا سفر ۱۶۵۵ء) میں اس نئی زبان کا، جسے وہ کباڑیوں کی زبان کہتا ہے، ذکر کرتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ عدالتی زبان فارسی ہے لیکن عام بول چال کی زبان ہندوستانی اور بنگلہ ہے، لیکن اب تک ہندوستانی کے لئے کوئی مناسب رسم الخط منتخب نہیں ہو سکا ہے[1]"

یورپین سیاح ٹیورنیئر کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۷ویں صدی کی پہلی دہائی میں ہی ہندوستانی، مشرقی ہندوستان، بنگال، بہار اور اڑیسہ میں رائج تھی، لیکن اس کا اپنا کوئی رسم الخط نہیں تھا۔ غالباً اس وقت یہ فارسی اور دیوناگری لپیوں میں لکھی جاتی تھی۔

بنگال کا نازک دور سترہویں صدی کے آغاز میں بنگلہ بھی عہد طفولیت میں تھی صرف ودیاپتی[2] اور بھرت چندر کوی[3] کی کویتاؤں (پوتھی)[4] میں یہ کچھ ارتقائی شکل میں ملتی ہے، مگر ۱۷۶۰ء تا ۱۸۰۰ء یعنی چالیس سال تک بنگلہ ادب پر جمود طاری رہا کوئی چونکا دینے والی چیز وجود میں نہیں آئی۔ اس طویل ادبی جمود کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ چالیس سال بنگال کے لئے انتہائی نازک گذرے۔ ہر لمحہ بنگال کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی زندگی انقلاب بداماں تھی۔ ایک طرف تو عظیم الشان سلطنت مغلیہ کی بنیاد،

لہ لنگوسٹک سروے آف انڈیا جارج گریرسن، جلد پنجم حصہ اول تلہ ودیاپتی ۱۴ویں کا متعلق زبانوں میں بہت زیادہ مماثلت ہے، اس لئے ودیاپتی نے دونوں زبانوں میں کویتائیں اور گیت لکھے، اسکی کویتاؤں کو خاص طور سے ابتدائی بنگلہ شاعری کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے تلہ بھرت چندر کوی بنگلہ کے پہلے شاعر مانے جاتے ہیں۔ آج کل مشہور کویتاؤں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے ۱۷۶۰ء میں ان کا انتقال ہوا تھا جسکے بعد ۱۸۰۰ء تک بنگلہ نثر اور شاعری پر جمود طاری رہا۔ بھرت چندر کوی نے اپنی کویتاؤں میں عربی و فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں مثلاً تخت، تاج، غلام، بادشاہ، وزیر و سلطان جیسے الفاظ بار بار ملتے ہیں تلہ بنگلہ میں پوتھی قرۃ نمبر

مغرب سے آنیوالے انقلاب میں ہل رہی تھی۔ اور دوسری طرف یورپین تاجروں، انگریز، پرتگیز ولندیزی اور فرانسیسی اقوام کی طاقت غبارے کی طرح پھولتی جارہی تھی۔ ان غیر ملکیوں کے قدم مضبوطی سے جمتے جارہے تھے۔ ان کے علاوہ دیش کے اندر مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں کی طاقتیں بھی ابھر رہی تھیں۔ سلطنت مغلیہ ان نئی ابھرتی ہوئی طاقتوں کے درمیان پس کر نزاعی ہچکیاں لے رہی تھی اور اتنی کھوکھلی ہوتی جارہی تھی کہ اس کے سنبھلنے کی موہوم سی امید بھی نہ رہی تھی۔ ایسے سیاسی انتشار اور بحرانی دور میں زبان یا ادب کے ارتقا اور فروغ کے لئے وسائل پیدا ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ ارتقا کی تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں اور ان نامساعد حالات کی بنا پر کسی کو ادب اور زبان کے نشو و نما کا دھیان بھی نہ رہا تھا۔

یہ چالیس سال عرصہ، بنگال کے لئے، نازک، ابتلا اور آزمائش کا زمانہ تھا، چاروں طرف اندھیرے پھیل کر گہرے ہو چکے تھے۔ سیاسی، اقتصادی اور سماجی اعتبار سے زندگی کھوکھلی اور کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ امن و امان مفقود تھا۔ جان، مال اور آبرو کے لٹنے کے خوف سے ہر لمحہ کانپتی رہتی تھی۔ اس انتشار اور اضطراب کی وجہ سے شاعروں اور ادیبوں کی بھی قوت فکر سلب ہو گئی تھی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جب اس زمانے میں شمالی ہندوستان، اور دکن میں اردو ادب فروغ پا رہا تھا اور میر سودا اور ولی جیسے منفرد شاعر جنم لے چکے تھے تو بنگال میں اردو شاعری کا چرچا مرشد آباد تک ہی محدود تھا اور وہ بھی بالکل ابتدائی حالت میں ـــ کہیں جا کر انیسویں صدی میں بنگال کے ناسخ، عصمت اللہ انسخ، ضیغم، صادق حسین اختر اور وحشت کلکتوی کو ہندوستان گیر شہرت نصیب ہو سکی۔

باقی ص ۲۷ کا نوٹ: ۱۔ اس ادب کو کہتے ہیں جو گیتوں، کویتاؤں میں ہوں اور چھپے نہ ہوں لیکن ان کے قلمی نسخے محفوظ ہوں

برطانوی سلطنت کا عروج بنگال میں اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے شروع میں اردو کے ادبی سرمایہ کا پتا چلتا ہے اور چونکہ کسی زبان کے ارتقا کی تاریخ اس عہد کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی تاریخ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی ہے لہذا انیسویں صدی میں بنگال کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات پر روشنی ڈالے بغیر بنگلہ یا اردو زبان اور ادب کی تاریخ بھی مرتب نہیں ہو سکتی ہے۔ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۷۵۷ء اور سنہ ۱۸۵۷ء کے درمیان سیاسی، معاشی اور سماجی قلابازیوں کے پس منظر میں ادبی جمود کے اسباب کو پرکھا جائے۔

اٹھارہویں صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائی میں بنگال کی سیاسی تاریخ دراصل مغل سلطنت کے زوال پر برطانوی سلطنت کے عروج اور مستقل حیثیت اختیار کرنے کی تاریخ ہے۔ سنہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ نواب سراج الدولہ کی شکست اور پھر شہادت مسلم سلطنت کے خاتمہ کا پیش خیمہ اور بنگال کی تاریخ سیاست کا نیا موڑ خیال کی جاتی ہے۔ گو اس فتح کی عظمت سے متعلق بعد میں متعدد افسانے گڑھ لئے گئے مگر حقیقت میں پلاسی کی جنگ اور کلائیو کی جیت نے ملک کی بساطِ سیاست الٹ کر رکھ دی۔ مگر سیاسی اور سماجی زندگی کے مستقبل پر یہ فتح زیادہ اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ برطانوی سلطنت کو بھی اس سے براہ راست فائدہ نہیں ہوا تھا۔ خود لارڈ کلائیو کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ پلاسی کی جنگ میں اس نے کیا کھویا اور کیا پایا۔[۵]

کچھ دنوں کے بعد ہی اسے یہ احساس ہوا کہ جنگ پلاسی میں نواب سراج الدولہ کی

۵۔ History of Bengali literature in the 19th century
بنگلہ ادب کی تاریخ۔ by Dr. S.K. Dey P. 16

شکست اور شہادت نے اسلامی سلطنت کے ایک مضبوط ستون کو گرا دیا۔ اس کے بعد ہی وہ جنگ پلاسی میں اپنی فتح کے گیت گانے لگا تھا۔ اس جنگ نے مسلمانوں کی عظمت کے چراغ بجھا دئیے تھے۔ بنگال میں انگریزوں کی عملداری مضبوط اور حکومت وسیع ہو گئی اور بتدریج مشرقی ہندوستان پر ان کا تسلط ہو گیا۔ اس فتح کے وقت بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کو ہندوستان میں برطانوی سلطنت قائم کرنے کا خیال نہیں ہوا تھا بلکہ کاروبار کی توسیع اور ترقی کمپنی کی بنیادی پالیسی تھی۔ کمپنی ہندوستان کی تجارتی منڈی پر چھا جانا چاہتی تھی۔

ملک بھر میں طوائف الملوکی، آمادہ زوال دلی سلطنت، مغل سپاہیوں کی بدچلنی اور تعیش پسندی، امرا کی اخلاقی پستی اور مغلوں کے خلاف مقامی لوگوں کی باغیانہ تحریکیں اور آزادی کی لہر اور ابدالیوں کی یورش اور آنتُ تاراج کے بعد کمپنی کے افسروں اور ڈائرکٹروں کے اندر ہندوستان میں حکومت قائم کرنے کی تمنا بیدار ہوئی۔ انھوں نے رفتہ رفتہ بنگال میں زمینداری کے حقوق اور شہری نظام کو قابو میں کر لیا۔ اور مسلمانوں کی فوجی طاقت اور مادی دولت کو تباہ کر کے اسکی جگہ سنبھال لی۔ جب عالم شاہ ثانی کے عہد میں ۱۷۶۵ء میں کمپنی نے بنگال کی دیوانی حاصل کر لی تو مالیاتی نظام پر اس کا مکمل تصرف ہو گیا اور اس کے ساتھ فوج بھی انکے ہاتھ میں آگئی۔ حصول دیوانی کے بعد برطانوی سوداگروں نے ریاست کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ انھوں نے دیوانی عدالت کا تمام انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا، صرف فوجداری عدالت نوابوں اور جاگیرداروں کے ہاتھ میں رہی۔ صرف خونی اور دیگر سنگین مقدموں کا فیصلہ نام نہاد حکمرانوں (نواب اور جاگیردار) کے ہاتھ میں رہ گیا تھا[1]

---

[1] دیکھئے Regulations of the Bengal Code P. 4, 5

اصل میں اس وقت برطانوی سوداگر بنگال کے حاکم بن چکے تھے مگر اپنی حکمت عملی اور
مندی سے کام لے کر "دوہری حکومت" کا نظام انھوں نے برقرار رہنے دیا تھا۔ اس
میں عوام سخت مشکل اور دشواری میں مبتلا ہو گئے تھے وہ یہ بھی نہیں سمجھ پاتے
کہ انھیں کس کا وفادار ہونا چاہیئے، نواب کا یا کمپنی کا۔ گو نواب کی نام نہاد حشمت
دولت باقی تھی مگر حقیقت میں وہ ایک عہد رفتہ کی یادگار اور نام کے حاکم رہ گئے
ان کی فوجی اور مالی قوت سلب ہو چکی تھی۔ وہ کمپنی کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے
اس محکومی اور بے چارگی کو محسوس کر کے نواب میر قاسم نے کمپنی کی بالادستی کے
بغاوت کا پرچم لہرایا۔ مگر یہ جیالا اور غیور نواب شکست کھا گیا۔ یہ شکست
نت مغلیہ پر آخری کاری ضرب تھی اور اس کے بعد ہی سیاسی انقلاب کے طوفان
لطنت مغلیہ کا چراغ بجھ گیا۔

مشرقی ہندوستان پر کمپنی کا پورا قبضہ ہو چکا تھا ہندوستان کے ایک وسیع
پر انگریزوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ نئی نئی حکومت کے نشے میں وہ بدمست اور
ہو رہے تھے۔ عیش و نشاط کا دریا بہہ رہا تھا۔ ان کی ہر شام بزم نشاط میں ڈوبی
تھی۔ حکمرانوں کے ساتھ یہاں کے باشندے بھی اخلاقی پستی کی دلدل میں دھنستے
ہے تھے۔ ان نئے فرماں رواؤں کے ایما اور اشاروں پر جہانگیری کے ساحل (ہوڑہ اور
ر) پر خوبصورت اور توبہ شکن ملا یائی عورتوں کا بازار حسن لگتا تھا اور ناچ و رنگ
یش و نشاط کی لہروں میں لوگ بہنے لگتے تھے[1]

یہ حسین اور دلربا عورتیں برطانوی افسروں کے عشرت کدوں کو سجاتی تھیں بدلتی

---

1. دیکھئے A Brief Survey of Hugli District P.10 by Crawford.

حاکموں کی عیاشانہ زندگی بنگال کے عوام پر بھی اپنا اثر مرتب کر گئی۔ رعایا کی سماجی اور اخلاقی حالت پست ہو گئی تھی۔ کمپنی کے افسر اپنی عیاشیوں اور رنگ رلیوں کے لئے زر کثیر کے حصول میں لگے رہتے تھے۔ وہ نام نہاد جاگیرداروں اور زمینداروں کا لہو نچوڑتے ان کو ایذائیں دی جاتیں۔ اصل میں نواب ان افسروں کے لئے 'بنک' تھے جو زر کثیر حاصل حاصل کرنے کے لئے غریب رعایا کی کھال تک ادھیڑ لیتے تھے اور یہی روپیہ عیاش اور اوباش افسروں کی نذر ہو جاتا تھا۔ کمپنی کے ڈائرکٹروں کو افسروں کی اوباشی اور بدچلنی کا علم تھا۔ وہ ان کی اصلاح بھی چاہتے تھے۔ افسروں کی عیش کوشی اور بے راہ روی کی انھوں نے کھل کر مذمت کی تھی مگر افسروں کو لگام نہیں دی جا سکی۔ خود گورنر جنرل ہسٹنگز کی عیاشی اور بدکاری عام ہو چکی تھی اور لندن میں وہ ہدف ملامت بنا تھا۔ بیگمات اودھ پر اس کے مظالم اور چیرہ دستی نے اسے اپنی قوم میں ذلیل اور رسوا کیا تھا۔ اور اسکی سرزنش اور گوشمالی بھی کی گئی تھی۔

کہیں انیسویں صدی میں جا کر یہ برائیاں رفتہ رفتہ کم ہوئیں عشرت کدے مٹنے اور مٹائے جانے لگے۔ رنگ رلیوں کا شیش محل چور ہوا مگر عام حالات میں کچھ زیادہ اصلاح نہیں ہوئی۔ لارڈ ولزلی نے اپنے تدبر، حکمت عملی اور دانائی سے کام لیکر بڑھتی ہوئی جہالت کے قلع قمع کے لئے تعلیم کی تحریک چلائی۔ اس کے قبل کمپنی کے افسروں اور نظم و نسق کے طریق کار پر تنقید کرنے کا کسی کو بھی حق نہیں تھا۔ ارل آف ارنگٹن لارڈ ولزلی نے جب گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا اور تعلیم کی تحریک چلائی تو حالات کچھ سنورنے لگے۔ ولزلی نے رعایا کو بہت ساری آسانیاں دیدی تھیں۔

مگر ولزلی کے عہد میں بھی حکومت کی کارکردگی اور بدعنوانیوں کے خلاف

صدائے احتجاج بلند کرنے کی مکمل آزادی نہیں تھی۔ بدعنوانی اور بے ضابطگی پر سخت سزا اور تعمیری نکتہ چینی بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ گو ہندوستان میں ۱۸۰۰ء میں چھاپے خانے قائم ہو چکے تھے اور اکادکا اخبارات بھی نکلنے لگے تھے لیکن ان کا معیار پست تھا۔ معیاری اور ترقی پسند قدروں سے ان کے صفحات خالی تھے۔ ان اخبارات میں اخلاق سوز باتیں اور کہانیاں چھپتی تھیں۔ اغوا اور زناکاری کے مقدمات افسانوی رنگ میں بیان کئے جاتے تھے۔ دراصل یہ فحشیات اور بے ہودگیوں کا پلندہ ہوتے تھے[1]

پہلا اخبار لارڈ ولزلی نے سب سے پہلے تحریر و تقریر پر سخت پابندیوں میں نرمی لانے کی تجویز پیش کی تھی۔ مگر کمپنی کے ڈائرکٹر اس کے لئے بھی تیار نہیں تھے۔ اشاعت مذہب کا حق بھی محدود تھا اور محدود پیمانہ پر تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت تھی حتیٰ کہ مشنریوں کی سرگرمیوں پر بھی کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی۔ ان کو بھی کوئی خاص رعایت نہ تھی جب فادر ولیم کیری، جوشوا مارشمین (J. MARSHMAN) اور ولیم وارڈ (W. WARD) بنگال میں داخل ہوئے تو انھیں ڈین قوم کے سائے میں پناہ ملی۔ ڈین قوم کا صدر مقام سیرام پور (شہر) رہا تھا۔ جب سیرام پور مشنری نے اشاعت مذہب کی خاطر مقامی زبان میں پہلا اخبار نکالنے کا منصوبہ مرتب کیا تو اس کے لئے ولیم کیری (W. CAREY) کو لارڈ ولزلی سے باضابطہ تحریری اجازت لینی پڑی تھی۔ تبلیغی مقاصد کے لئے انھوں نے پہلا رسالہ بنگلہ میں نکالا جس کا نام دگ درشن تھا۔ مشنری نے اس کام کے لئے بنگلہ، اردو، فارسی اور عربی کے خوبصورت ٹائپ ایجاد کئے تھے۔ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ دگ درشن کا ضمیمہ ہندوستانی میں بھی نکالا گیا ہوگا۔ کیونکہ اس وقت ضلع ہوگلی میں اردو بولنے اور پڑھنے والے

---

[1] واضح ہو تاریخ ادب بنگلہ انیسویں صدی میں ص ۸ ۱ سے بنگلہ دگ درشن، سیرام پور مشنری کا ہفتہ سہ روزہ تھا۔ اس کی تفصیل سیرام پور مشنری کے باب میں بیان ہوئی ہے۔

کی خاصی تعداد آباد تھی۔

تبدیلیوں کے اثرات ان سیاسی تبدیلیوں اور نئی انتظامی پالیسی کے اثرات بنگال کے سماجی، معاشی اور تہذیبی حالات پر گہرے اور دور رس ہوئے۔

تیس سال سے کمپنی اور نوابوں کے درمیان کش مکش جاری تھی۔ ان کے تعلقات میں بھی وقت کے ساتھ خاموش انقلاب برپا ہو رہا تھا۔ کمپنی دیوان اور نواب ناظم تھے۔ ان کے درمیان غلبہ اور برتری کے لئے رقابتی جنگ فطری عمل تھا۔ اس رسہ کشی اور رقابت کا ردِ عمل یہ ہوا کہ بدامنی اور بدانتظامی ہر شعبہ میں پھیل گئی اور حکومت کے زعم میں یورپین ملازمین اپنے اختیارات کا غلط استعمال بے جھجک کرنے لگے۔ غیر ملکی استبداد، عوام کی غربت اور جہالت اور حالات حاضرہ سے رعایا کی لاعلمی کی وجہ سے سماجی اور اقتصادی حالات اور بھی زبون ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ سلطنت مغلیہ کی شکست و ریخت کے باعث عوام کی بدحالی اور صنعتی انقلاب ٹل نہیں سکا۔ بلاشبہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستانی عوام نے آخری پانسہ پھینکا۔ مگر یہ بھی الٹا پڑا۔ آزادی کی پہلی تحریک ناکام ہو گئی اور اس کی ناکامی کے ساتھ تین سو سالہ پرانی عظیم سلطنت مغلیہ ہندوستان کے نقشہ سے حرفِ باطل کی طرح مٹ گئی

بندوبست اراضی سچی بات تو یہ ہے کہ سلطنت مغلیہ کے آخری ایام میں ہی نوابوں جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کی حالت خستہ اور زبوں ہو چکی تھی۔ ان کا اثر و رسوخ رفتہ رفتہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ یہ سچ ہے کہ جاگیردارانہ نظام کا دامن بہت سی برائیوں سے بھرا ہوتا ہے مگر اس کی سخت گیری اور رعب داب سے ریاست میں سکون اور شانتی رہتی ہے۔ لوگ مطمئن رہتے ہیں اور آسودہ زندگی گذارتے ہیں۔ اطمینان، سکون اور آسودگی کی فضا میں ہی کسی بھی زبان کا فروغ ممکن ہے اور ادب کے ارتقا کی

بے شمار راہیں پھوٹتی ہیں۔ ان نوابوں اور جاگیرداروں کی سخاوت، دریا دلی اور سرپرستی کی وجہ سے علوم و فنون کی ترقی ہوئی۔ نثر اور شعر و شاعری کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ مگر نئے مغربی نظام کی بندش اور پابندیوں نے ارتقا کے تمام مواقع اور وسائل ختم کر دئے تھے نواب اور جاگیردار گھٹے ماحول میں سانس لے رہے تھے۔ قید و بند اور ناچاری کی گھٹن اور دکھن محسوس کر رہے تھے۔ ان نامساعد حالات میں علوم و فنون اور ادب کی نشو و نما اور ترقی کی تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔

ہولناک قحط یہ زمانہ بنگال کا نازک ترین دور تھا۔ طوائف الملوکی اور دہشت کا دور دورہ تھا۔ رعایا اتنی لوٹی اور نچوڑی گئی تھی کہ نیم مردہ ہو چکی تھی۔ لوٹ کھسوٹ رشوت ستانی اور اقربا پروری ایک عام بات ہو گئی تھی اور اس پر طرہ یہ کہ ۱۷۶۹ء میں ہندوستان میں ہولناک قحط پڑا، بنگال اس قحط سے بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔ یہاں کے لوگوں پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ ڈھائی کروڑ افراد لقمۂ اجل ہو گئے۔ نڈھال اور خستہ عوام کے مصائب اس لئے بھی دوگنے ہو گئے تھے کہ کمپنی کے یورپین افسروں اور ملازموں نے اپنی رنگ رلیاں، عیاشی اور بدمستی ختم نہیں کی۔ ان کے شیش محل میں عیش و نشاط کی محفلیں حسب معمول جمتی رہیں، عشرت کدے، رنگ برنگ اور دلنواز حسیناؤں سے سجتے رہے۔ کمپنی کے ڈائرکٹروں کو افسروں کی عیش کوشی اور بدچلنی گھنونی معلوم ہوئی اور ان افسروں کی سرزنش بھی کی گئی۔ اس خوفناک قحط میں بنگال کی ایک تہائی آبادی نابود ہو گئی[1]

ڈاکہ زنی اور لوٹ اس قحط نے عوام کی سماجی اور معاشی زندگی الٹ پلٹ کر رکھ دی تھی اور ان کے اخلاق پر کاری ضرب لگائی تھی۔ ایمانداری، صداقت، غیرت اور عزت سستی

---

[1] گورنر مغربی بنگال کے نام کمپنی کا خط اگست ۱۷۷۱ء ص ۱۲۹

ہو گئی تھی۔ روٹی کے عوض جوان عورتیں اور کم سن لڑکیاں بازار میں بکنے لگیں۔ بازارِ حسن وسیع ہوتا گیا۔ عیاشیوں کے نئے اڈے قائم ہوئے اور اس کے ساتھ ہی قتل و غارت گری نقب زنی اور ڈاکہ کی وارداتیں عام ہو گئیں۔ چور اچکے اور ٹھگوں کا زور بڑھ گیا۔ شریفوں کے دن بھاری ہو گئے تھے۔ جان مال اور آبرو کے لٹنے کا خوف ہر دم ان سے سایے کی طرح چپکا رہتا تھا۔ بچاؤ کے راستے ڈھونڈے جا رہے تھے۔ مزاحمت اور تدارک کی تدبیریں سوچی جا رہی تھیں۔ عوام سنگین بحران کی گرفت میں تھے۔ زندگی دوبھر ہو گئی تھی۔ اس وقت جب شام کا صبح کرنا سچ مچ جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا تو زبان اور ادب کے فروغ پر کیا توجہ دی جا سکتی تھی۔ ۱۷۷۰ء میں ٹھگوں، لٹیروں اور غنڈوں کی طاقت بہت بڑھ گئی تھی وہ سارے ملک میں پھیل چکے تھے اور من مانی کر رہے تھے۔ ان کے نام سے ہی لوگ کانپ اٹھتے تھے۔

بلاشبہ کمپنی کو ان سماج دشمن ٹولیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے تشویش ہو گئی تھی اور وہ ان کی سرکوبی کی فکر میں غلطاں تھی لیکن پورے ۲۵ سال تک ان طاقتور دشمنوں کو دبایا اور کچلا نہ جا سکا۔ ان کا زور بدستور قائم رہا۔ ۲۵ سال بعد ۱۸۰۰ء سے کچھ پہلے لارڈ ولزلی نے ان طاقتور دشمنوں پر بھرپور وار کیا اور ولیم بنٹنگ کے زمانے میں ان ٹھگوں، لٹیروں اور راہزنوں کی طاقت کچل دی گئی اور بنگال کے عوام کو لوٹ مار اور تاخت و تاراج سے نجات ملی

ان سماج دشمن عناصر کی طاقت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۷۸۰ء میں کلکتہ ان کے ہاتھوں لٹ کر تباہ اور برباد ہو گیا تھا۔ آدھا کلکتہ راکھ کا ملبہ ہو گیا تھا، پندرہ ہزار مکانات پھونک دئے گئے تھے اور سینکڑوں زندگیاں

موت کے گھاٹ اتار دی گئی تھیں[1]۔ انیسویں صدی کی تین چار دہائی تک بنگال میں قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا تھا[2]۔ امیر و غریب یکساں اس سے متاثر ہوئے تھے و بنگال کی اقتصادی، سماجی اور تہذیبی زندگی تہ و بالا ہو کر رہ گئی تھی۔

اخلاقی پستی کی انتہا اس اقتصادی بدحالی اور سماجی برائیوں کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ملک کا حکمراں طبقہ انتہائی پستی میں چلا گیا تھا رات دن بزمِ نشاط اور رقص و سرود میں گذرتے تھے وہ عیاشانہ ماحول میں کھو چکے تھے۔ اس طبقہ کی اخلاقی گراوٹ عوام کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکی۔ مرشدآباد کی زندگی تو گناہ کی لہروں پر بہہ رہی تھی۔ سیر المتاخرین کے مولف غلام حسین خاں نے اس عہد کی عیاشانہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے۔

"مرشدآباد از مدتہا حکم بلاد لوط داشت۔ والی الان ہم کذلک چہ کمتر کسے را دراں بلدہ پاس ناموس خود دیگراں منظور و محفوظ ماندہ بود، بلکہ اغنیا و اقویا را دریں خصوص بمعرفت رسانیدہ، بجز اوغر بار انواع ترغیبات دلاست بہ فجور دمے نمودند۔۔۔ دو بمقتضائے کلام اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِہِمْ ایں عمل رواج یافت مدرو ے ازنجباؤغر بار اظلمے، ندہ باشد والامشاہیر و مقتدراں اکثری رائے کہ بہ بیند مبتلا ہمیں علت و عمل بود۔ بیت ؎

دست در دامن ہر کس کہ زدم رسوا بود
کوہ باآں عظمت یک طرفش صحرا بود[3]

غلام حسین خاں کو مرشدآباد کی اخلاقی پستی اور لوگوں کی گناہ آلود زندگی سے

---

[1] دیکھئے "Calcutta old and new" [2] انیسویں صدی میں بنگلہ ادب کا ارتقا ص ۸۳
[3] دیکھئے سیر المتاخرین مؤلفہ مولانا غلام حسین خاں ص ۸۰۰، ترجمہ انگریزی ص ۸۰

سخت نفرت تھی۔ سیر المتاخرین میں اس نے بار بار گناہ آلود اور پست زندگی کی بڑی مکروہ تصویریں دکھائی ہیں۔ اس کے زمانے میں مرشد آباد "بلاد لوط" بن چکا تھا اور شاید سینکڑوں میں دو چار شخص ہی ایسے ہوں جن کا دامن گناہ سے داغدار ہونے سے بچا ہو گویا شہری زندگی سراپا گناہ بن چکی تھی۔

اس بدکاری، عیاشی اور امراء و نوابین کی اخلاقی پستی کا غریبوں پر بھی بھرپور اور گہرا اثر ہوا تھا۔ امیر اور غریب دونوں ہی اپنے رنگین مزاج اور عیاش آقاؤں کے سانچے میں ڈھل گئے تھے۔ رعایا کی حالت مُردوں سے بھی بدتر ہو گئی تھی۔ ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ جسم سے شرافت کا خول بھی اتر چکا تھا اور قوم ننگی ہو چکی تھی۔ ایسی بے راہ روی اور عیش پسند زندگی، جبر اور بالا دستیوں کے خلاف ان کے اندر احتجاج کرنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ بقول غلام حسین خاں "ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کے تقدس اور پارسائی کی قسم کھائی جا سکے"۔ ایسے دور میں جو بھی ادب پیدا ہوا وہ اس عیاشانہ اور رنگین ماحول کا عکاس تھا۔ لہٰذا اس وقت کے ادب میں بھی جنسی تلذذ اور بے راہ روی نمایاں نظر آتی ہے۔

انیسویں صدی میں مذہب ایک بے معنی شے رہ گیا تھا۔ خدا کا خوف لوگوں کے دلوں سے نکل گیا تھا۔ لا مذہبیت اور لا دینیت محیط ہو چکی تھی۔ ہر کس و ناکس کو صرف اپنے حلوے مانڈے سے کام تھا۔ اپنی آسودگی، ترقی اور دولت کے لئے انھوں نے شرافت اور اخلاق کی تمام حدیں توڑ دی تھیں۔ بردہ فروشی ہنر بن گئی تھی۔ اپنی عورتوں اور لڑکیوں کا سودا بھی وہ بے جھجک کرتے تھے۔ کوئی چیز اخلاق نام کی باقی نہیں رہی تھی۔ نظامِ زندگی پراگندہ ہو چکا تھا۔ ایسے پر آشوب، سیاسی، سماجی اور معاشی دور میں کسی بھی

ادب کے ارتقا اور نشو و نما کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ جاگیردارانہ نظام کی تباہی اور نوابوں کی زبوں حالی کے باعث فنکاروں کی سرپرستی بھی نہیں ہو رہی تھی فن کاروں کا دامن بھی داغدار ہو رہا تھا لہذا ۱۷۶۱ء تا ۱۸۰۰ء بنگال میں افراتفری اور طوائف الملوکی پھیلی رہی۔ چالیس سال کا یہ طویل عرصہ ادب کے لئے بے حد ناسازگار رہا۔ مفید اور صحت مند ادب کی تخلیق ممکن نہیں تھی۔ چند معمولی کتابیں تصنیف و تالیف اور ترجمہ ہو سکی تھیں اور یہ ساری کتابیں بچوں کے درس کے لئے تھیں۔ اور بعض مذہبی معلومات کی ابتدائی کتابیں تھیں۔ بنگلہ ادب کا بھی کم و بیش یہی حال رہا۔ چالیس سال کے طویل عرصہ میں بنگلہ پر بھی جمود طاری رہا تھا۔ کوئی معیاری کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ اردو تو شمالی ہندوستان سے آئی تھی اور ان لوگوں کی زبان تھی جو دلی، لکھنؤ اور عظیم آباد سے ہجرت کر کے مرشدآباد آ گئے تھے اور تلاش معاش میں سرگرداں تھے۔

کلکتہ کی بین الاقوامی حیثیت اور ادب کا نشو و نما

۱۷۸۱ء تک کلکتہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، جو دھیرے دھیرے قصبہ میں بدلتا رہا مگر اس وقت بھی کلکتہ میں صرف کچے مکانات اور پھوس کی جھونپڑیاں تھیں۔ اکا دکا پختہ عمارتیں تعمیر ہونے لگی تھیں۔ چاند پال گھاٹ کا جنوبی حصہ جنگل تھا۔ ۱۷۸۰ء میں اخبارات نکلنے لگے تھے۔ ان اخباروں سے پتہ چلتا ہے کہ کلکتہ میں جو دو چار کشادہ اور لمبی سڑکیں تھیں وہ بھی غلاظتوں سے ڈھکی ہوتی تھیں آئے دن خطرناک اور وبائی بیماریاں پھوٹ پڑتی تھیں۔ غلاظتوں کے ڈھیر، گندی چالیں، اور متعفن نالیاں انسان کی بڑی دشمن تھیں۔ گندگیوں کے ڈھیر پر مکھیاں بھنبھناتی

رہتی تھیں مگر صفائی کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔[۱]

کلکتہ کی یہ حالت بہت دنوں تک نہیں رہی کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے اپنی مستقل راجدھانی بنانے کا جو خاکہ تیار کیا تھا اس میں حقیقی رنگ بھرا جانے لگا تھا۔ لارڈ وارن ہیسٹنگز نے مرشدآباد کی سیاسی اہمیت کو کم کرنے اور کلکتہ کو عظیم شہر بنانے کی اسکیم کے تحت مرشدآباد کی ریونیو کونسلیں توڑ دی تھیں اور بعض سرکاری دفاتر اور بڑی عدالتوں کو کلکتہ منتقل کر دیا تھا۔ کمپنی کے حکمراں کے اس طرز عمل سے اسکی نشاندہی ہونے لگی تھی کہ کلکتہ عنقریب بنگال کا ایک اہم شہر اور راجدھانی ہونے والا ہے۔[۲]

فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں کلکتہ بھاگیرتی کے ساحل پر ایک خوبصورت شہر بنتا جا رہا تھا۔ یوروپین شہروں کے طرز اور ڈھانچے پر اسکی تعمیر و توسیع ہو رہی تھی اس وقت دراصل فورٹ ولیم سے ریاست کے نظم و نسق سے متعلق ہدایتیں جاری کی جا رہی تھیں۔ یہی سال بنگلہ اور اردو ادب کے لئے موافق اور سازگار ثابت ہوا۔ ایک طرف سیرام پور مشنیری وجود میں آچکی تھی اور عیسائی مذہب کی اشاعت کے لئے کوشاں تھی۔ دوسری طرف انگلینڈ سے آنیوالے یوروپین افسروں (سول سرونٹس) کی دقتوں کو آسان کرنے کے لئے گل کرسٹ سیمنری (مدرسہ ہندی) کی جگہ فورٹ ولیم کالج کا قیام دس جولائی ۱۸۰۰ء میں پروفیسر جان گل کرسٹ اور ارل آف مارنگٹن لارڈ ولزلی

---

[۱] انیسویں صدی میں بنگلہ ادب ص ۱۴۴ نیز دیکھئے 'بنگال گزٹ' جس میں کلکتہ کی ناگفتہ بہ حالت اور غلاظتوں کا ذکر تفصیل سے ہوا ہے۔

[۲] Calcutta in olden days P. 165

کے اشتراک عمل سے ہوا۔ اور عربی و فارسی کے علاوہ ہندوستانی (اردو ہندی) میں بھی تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ اور اس مقصد کے تحت قصے کہانیوں کی متعدد کتابیں تالیف اور ترجمہ ہوئیں اور برج بھاشا میں بھی کئی کتابیں ترتیب پاسکیں۔

ان حالات کی روشنی میں یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ کلکتہ کے بین الاقوامی حیثیت اختیار کرنے اور میٹروپولیٹن شہر ہونے پر ہی معاشی، سماجی، و ثقافتی زندگی میں استحکام پیدا ہوا۔ اور کاروبار کے فروغ کے لئے بھی وسائل پیدا ہوئے۔ رعایا کی تعلیم پر بھی خاص توجہ دی جانے لگی۔ اور انگریزی زبان اور مغربی تہذیب کو اپنانے کی ایک لہر چل پڑی۔ بنگالیوں نے فارسی تعلیم سے کنارہ کشی اختیار کی، اور انگریزی میں ڈوب گئے۔ سلطنت مغلیہ دلی اور اس کی چہار دیواری کے اندر سمٹ کر رہ گئی۔ فارسی زبان کا انحطاط ہوتا جا رہا تھا۔ فارسی کی جگہ رفتہ رفتہ انگریزی نے لے لی اور انگریزی تعلیم اعلیٰ بنگالیوں میں عام ہو کر بچلے اور نچلے طبقوں میں پھیلتی لگی۔ جب ۱۸۳۵ء میں فارسی سرکاری زبان نہیں رہی تو ہندوستان کے ہر علاقے میں مقامی بولیوں کو مقبول ہونے کا موقع نصیب ہوا۔ اور بنگال میں بھی بنگلہ کے ساتھ اردو بھی مقبول زبان ہو گئی۔

بنگال کے سماجی، معاشی، تہذیبی اور تعلیمی تغیرات کی اس چالیس سالہ مختصر تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کی ابتدا میں حالات سدھرے۔ طوائف الملوکی ختم ہوئی اور سیاسی استحکام پیدا ہوا اور جب زندگی میں نظم اور ضبط پیدا ہوا تو ذہنی انقلاب بھی رونما ہوا۔ تعلیم کی طرف توجہ دی جانے لگی۔ فنکاروں اور ادیبوں کو ادبی اور علمی جمود کا احساس ہوا اور وہ سب ادب کی نوک پلک سنوارنے میں لگ گئے اور بنگلہ

Memoirs to Waren Hastings Vol I compiled by Glaen P263

اور اُردو کی ترقی کے لئے بھی وسائل پیدا ہوگئے۔ اس زمانے میں صحت مند ادب کی تخلیق ہوئی۔ اُردو نثر تو خاص اسی صدی کی پیداوار ہے۔ اگر فورٹ کالج وجود میں نہ آتا اور پروفیسر جان بارتھوک گل کرسٹ اردو نثر کی ترقی پر توجہ نہ دیتے تو نثر کے نشوونما میں اور بھی کئی سال لگ جاتے اور شاید ادبی دنیا باغ وبہار، آرائش محفل مذہب عشق، تاریخ نادری اور جہانگیر شاہی کے مولفین کے نام سے واقف نہ ہو پاتی۔

غیر ملکی سیاح کے اردو زبان اور ادب پر احسانات

۱۸ ویں صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے حاکموں نے ملک کا انتظام سنبھال لیا تھا حکومت کی ذمہ داریاں اور رعایا کے ساتھ ان کے براہ راست تعلقات نے ان نئے حاکموں کے لئے نئی الجھنیں پیدا کردیں۔ ان کو احساس ہوا کہ ہندوستان پر حکومت کرنے اور عوام میں مقبول ہونے کا بس ایک راستہ ہی ہے کہ وہ ہندوستانی زبانیں سیکھیں۔ اسی وجوہ کے تحت انھوں نے ہندوستان کی دو مقامی زبانوں بنگلہ اور ہندوستانی کو سیکھنا شروع کیا۔ بنگلہ چونکہ مشرقی ہندوستان کے ایک حصہ تک محدود تھی لہذا انھوں نے ہندوستان گیر زبان کو پھیلانے کا منصوبہ مرتب کیا۔ فورٹ ولیم کالج کا قیام اس مقصد کے تحت عمل میں آیا تھا۔ یہ اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے شروع میں ہوا اس کے قبل سترہویں صدی عیسوی میں ہی مشرقی ہندوستان میں غیر ملکی سیاحوں کی ٹولیاں آنے لگی تھیں۔ اور بدیشی زبانوں اور ہندوستانی بولیوں کے اختلاط سے ایک نئی بولی کا سانچہ بننے لگا تھا۔ یہ نئی بولی ابتدائی شکل میں بنگال، بہار اور اڑیسہ میں بھی پہونچ چکی تھی مگر زبان کی حیثیت اختیار نہ کرسکی تھی۔ اور نہ ہی اس کا فارم اور رسم الخط وضع ہو سکا تھا۔ اس کی تصدیق مغربی سیاح ٹیری کے اس بیان سے ہوجاتی ہے کہ "ہندوستان میں

عام بول چال کی زبان انڈو ستانی ہے لیکن اس کا اپنا کوئی رسم الخط نہیں[۹]۔

اکبرِ اعظم کے عہد میں ہی یوروپین قومیں ہندوستان آنے لگی تھیں۔ جہانگیر کے عہد میں ان کی تعداد بڑھی اور شاہ جہاں کے دورانِ حکومت میں انگریزی، فرانسیسی پرتگیزی، ولندیزی اور ڈین قومیں مشرقی سواحل پر آباد ہونے لگی تھیں۔ پرتگیزی ساح واسکوڈی گاما نے سب سے پہلے ہندوستان کا پتہ لگایا تھا۔ چنانچہ اس کے ساتھ پہلے پرتگیزی اور اسپینی ہندوستان آئے۔ ان کے بعد ولندیزی انگریز اور دوسری یورپی قومیں تجارت کی غرض سے ہندوستان آنے لگی تھیں۔ انھوں نے اپنے طرز پر چھوٹے چھوٹے شہر بسائے اور وہیں بس گئے۔

پرتگیزی قوم نے گوا میں اپنا اثر و رسوخ قائم کیا اور پھر ہوگلی اور بنڈیل میں اپنے تجارتی مراکز قائم کیے جہاں ان کی عبادت گاہیں اب تک یادگار کی حیثیت سے موجود ہیں۔

ہوگلی، چنسورہ اور بنڈیل میں پرتگیزیوں اور ولندیزیوں کے اثرات اتنے بڑھ گئے تھے کہ ان کی زبانیں بھی مقامی باشندوں میں مروج ہو گئی تھیں۔ بیوپاریوں نے اپنی تجارتی ضروریات کے لئے پرتگیزی زبان سیکھ لی تھی۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں پرتگیزیوں کی کثیر تعداد ہوگلی اور بنڈیل میں آباد تھی اور پرتگیزی زبان کو وہاں "لنگوا فرینکا" کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی[۱۰]۔

پرتگیزیوں کے ساتھ ولندیزیوں نے بھی اپنی تجارت کو پھیلانے کے لئے "ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی" قائم کی تھی جس کا صدر مقام سورت تھا۔ ہوگلی کے کنارے انھوں نے چنچوڑا[۱۱] کو آباد

---

[۱۰] دیکھئے اے ووبیج ٹو ایسٹ انڈیا، گیری ۔ لنگوسٹک سروے آف انڈیا جارج گریرسن جلد پنجم حصہ ۶

[۱۱] چنچوڑا اصل میں چنسورہ کا نام ہے۔ ولندیزیوں نے اپنی سہولت کیلئے چنچوڑا کو چنسورہ میں بدل دیا تھا

کیا۔ ڈچ نے سرام پور میں فرانسیسی قوم نے چندرنگر میں اپنے صدر دفاتر قائم کئے۔ اس وقت بنگال کے اکثر شہروں پر غیر ملکیوں کا تسلط تھا۔ ان شہروں میں انھی کے سکے چلتے تھے ان غیر ملکیوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ ربط و ضبط پیدا کرنے اور اپنی تجارت کو فروغ دینے کو مقامی زبانیں سیکھ لی تھیں۔ اٹھارہویں صدی میں یہ غیر ملکی بنگال کے کئی اضلاع میں پھیل چکے تھے۔ یہاں کی تجارتی منڈی ان کے قبضہ میں تھی۔ ان کی وجہ سے ہندوستان گیر زبان انڈوستان کی ترقی کی راہ نکلی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک افسر ہل ہیڈ کے متعلق یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے ہندوستانی زبان میں کوئی کتاب لکھی اتنی بات ضرور ہے کہ ہل ہیڈ نے ہندوستانی قواعد کا خاکہ ضرور تیار کیا تھا۔ یہ انگریزی زبان میں تھا۔ یہ ان کی ابتدائی کوشش تھی اور ہندوستانی زبان سے کما حقہ واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے اس کے خاکے میں جا بجا غلطیاں رہ گئی تھیں۔ ہل ہیڈ کے بعد گلکسٹن کے رسالے کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اردو قواعد پر پہلی کوشش تھی جو کامیاب نہ ہو سکی[1]

اردو لغت اور قواعد کی پہلی کتاب

دراصل ۱۷۱۵ء میں اردو کی پہلی گرامر تالیف ہو سکی تھی اردو قواعد کی پہلی کتاب کا مولف ایک غیر ملکی سیاح جوشوا کٹلر تھا۔ جوشوا کٹلر سورت میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائرکٹر تھا۔ آگرہ اور دلی میں سفیر کی حیثیت سے رہ چکا تھا۔ اسے انڈوستانیکا سے تھوڑی بہت واقفیت ہو چکی تھی۔ اس نئی زبان سے شغف کی وجہ سے اس نے ۱۷۱۵ء میں اردو قواعد کی پہلی کتاب لکھی۔ جوشوا کٹلر جہانگیر آباد میں بھی کچھ دنوں تک رہا تھا جہاں کی

---

[1] گل کرسٹ اور اس کا عہد۔ محمد عتیق

بولیاں اس نے سیکھی ہوں گی۔ جوشوا کٹلر ہندوستانی زبان سے بخوبی واقف نہ تھا غالباً یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں معمولی معمولی غلطیاں کی ہیں۔ اسے فعل کا استعمال بھی نہیں آتا ہے۔ واحد اور جمع کی بھی اسے تمیز نہیں۔ میں کی جگہ موئی اور تو کی جگہ توئی اور تم اور تو کو جمع لکھتا ہے[۵]۔

جوشوا کٹلر ۱۷۱۶ء میں فوت ہوا۔ اس نے اپنی موت کے ایک سال قبل انڈوستانیکا کی گرامر مکمل کرلی تھی۔ اس کا نام اس نے لنگوا انڈوستانیکا (انڈوستان کی زبان) رکھا۔ اس میں اسکی فرہنگ بھی دی گئی تھی۔ ڈیوڈ مل نے ۱۷۴۳ء میں سی لینا اور خیٹلا میں یہ کتاب شائع کی اسطرح ۱۷۱۵ء میں لکھی جانیوالی گرامر ۱۷۴۳ء میں یعنی پورے ۲۸ سال بعد شائع ہوئی[۶]۔

جوشوا کٹلر عیسائی مذہب کے پروٹسٹنٹ فرقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ ہندوستان سے وہ ایران گیا جہاں وہ سفیر کے عہدے پر مامور رہا تھا۔ تین برس تک وہ خوش اسلوبی سے اپنے فرائض سرانجام دیتا رہا تھا۔ پھر شاہِ ایران کا عتاب اس پر نازل ہوا۔ کئی ماہ تک قید کی زندگی کاٹی۔ قید سے رہائی پانے کے بعد وہ وطن لوٹ رہا تھا کہ جہاز پر بیمار پڑا اور دنیا سے رخصت ہوگیا[۷]۔

بنجامن شلز جوشوا کٹلر کے بعد جرمن پادری بنجامن شلز نے ہندوستانی زبان کی دوسری گرامر لکھی[۸]۔ بنجامن شلز شاہ ڈین مارک کی ہدایت پر مشنیری کے کام کے لئے ہندوستان آیا تھا۔ بنجامن شلز عرصہ تک کرناٹک میں مقیم رہا تھا۔ ۳۰ جون ۱۷۲۵ء میں

---

[۵] لنگوسٹک سروے آف انڈیا جلد نہم ص ۶ [۶] لنگوسٹک سروے آف انڈیا جلد نہم ص ۷

[۷] لنگوسٹک سروے آف انڈیا جلد نہم ص ۹

[۸] لنگوسٹک سروے آف انڈیا جلد نہم ص ۶، ۷

اس نے مورسس زبان میں قواعد کی دوسری کتاب ترتیب دی۔ بنجامن شلز کی حیات گمنامی کی چادر میں لپٹی ہوئی ہے۔ بس اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ ۱۷۲۶ء میں کرناٹک سے وہ مدراس آیا تھا اور شاہ ڈنمارک کی ہدایت کے مطابق اشاعت مذہب کے کام میں ہمہ تن مصروف ہو گیا تھا۔ اس نے اس مقصد کے تحت مدراس میں ایک خیراتی اسکول قائم کیا تھا جس کو کامیاب کرنے کے لئے اس نے مختلف قصبات اور مواضعات کا دورہ کیا تھا۔ اور مقامی باشندوں سے میل جول بڑھانے اور اثر مرتب کرنے کے لئے مورسس زبان بھی سیکھی تھی۔[۱] اس نے مالا باری (کنڑی) زبان میں انجیل مقدس (بائبل) کا ترجمہ کیا تھا۔ اس نے ایک ہندوستانی عالم کی معاونت سے انجیل مقدس کا ہندوستانی زبان میں بھی ترجمہ کرنا چاہا تھا مگر اس کی یہ کوشش کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ بنجامن شلز ہندوستان سے کب وطن لوٹا؟ اس نے ہندوستانی زبان کی قواعد کے علاوہ اور کوئی کتاب لکھی یا نہیں؟ اس کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ اس نے ۱۷۴۵ء میں ہندوستانی گرامر لاطینی زبان میں مرتب کی تھی۔ بہت دنوں بعد اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہوا جس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے۔[۲]

اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہندوستانی شاعروں اور ادیبوں سے زیادہ غیر ملکی عیسائی ادبا اور شعرا اردو کی خدمت کر رہے تھے۔ بلا شبہ ان کا یہ کام ایک خاص غرض سے وابستہ تھا پھر بھی اردو ادب ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ فارسی رسم الخط (نسخ اور نستعلیق) کے ٹائپ بھی سب سے پہلے ایک انگریز چارلس ولکنس نے ایجاد کیے۔ ۱۷۷۸ء میں اس کا نجی پریس ہوگلی میں قائم تھا۔ ہل ہیڈ کی بنگلہ

---

[۱] لنگوسٹک سروے آف انڈیا جلد نہم ص ۶ [۲] لنگوسٹک سروے آف انڈیا جلد نہم ص ۶۔

گرامر اس پریس سے شائع ہوئی تھی۔ یہ چھوٹا موٹا اور ہلکا پریس تھا۔ جب ولکنس کی تبدیلی مالدہ میں ہوئی تو اپنے ساتھ پریس بھی لیتا گیا اور مالدہ میں اس پریس میں فرانسیس گلیڈون (F. GLADUN) کی فارسی لغت ۱۷۸۷ء میں چھپی اور اسی سال شائع ہوئی تھی۔[۴۷]

چارلس ولکنس کے بعد سیرام پور میں فادر ولیم کیری اور جوشوا مارشمین کی کوششوں سے ایک بڑا پریس قائم ہوا۔ فارسی اور عربی کے عمدہ اور خوبصورت ٹائپ بھی ایجاد کئے گئے۔ اسی زمانہ میں ۱۸۰۱ء کے آخر میں کالج کونسل کا چھاپہ خانہ "ہندوستانی پریس" قائم ہوا۔ اس کے انتظام کار ڈاکٹر ولیم ہنٹر تھے اور ۱۸۰۲ء میں اس کے مالک بن گئے۔ اسی پریس میں فورٹ ولیم کی کتابیں شروع میں پروفیسر جان بارتھوک گل کرسٹ کی نگرانی میں طبع ہوئی تھیں۔

اس طرح کلکتہ اور بنگال کے چند بڑے شہروں میں اردو اپنا اثر قائم کرتی گئی اردو کی کئی کتابیں اور رسالے شائع ہوئے اور عوام نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اردو مقامی باشندوں میں ثانوی زبان کی حیثیت سے مقبول اور مروج ہو گئی اور بنگال کی "نامانوس فضا" میں اُردو کے فروغ کی راہیں ہموار ہونے لگیں۔ بنگال کے بڑے شہروں میں ان غیر ملکی ادبا اور شعرا نے اردو کی ترویج و اشاعت میں مدد دی۔ ان میں یورپین سیاحوں کے کام کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ بنگال کے اندرونی علاقوں میں اردو کے پھیلنے اور عوام میں مقبول ہونے میں نوابوں اور جاگیرداروں کے سایہ عاطفت میں پروردہ ادبی ماحول نے کافی مدد دی تھی۔ صوفیائے کرام کی تبلیغی سرگرمیوں نے اس کام کو اور بھی آسان بنا دیا تھا۔ اور اردو بھی بنگلہ کے ساتھ دوسری مقبول زبان

---

[۴۷] بیسویں صدی میں بنگلہ ادب۔ ڈاکٹر ایس۔ کے۔ ڈے ص ۴۱

بن کر بنگال کے گاؤں گاؤں میں پھیل گئی تھی۔

قبل بھی لکھا جا چکا ہے کہ بنگال میں مسلم حکومت کے ساتھ ساتھ غیر ملکی مسلمانوں کی کثیر تعداد بنگال کے مختلف علاقوں میں بس چکی تھی۔ ان میں کچھ تو اپنی تقدیر آزمانے آئے تھے۔ کچھ کاروبار پھیلانے اور کچھ ملازمت کی غرض سے۔ ان میں ایسے لوگوں کی بھی خاصی تعداد تھی جنھوں نے ایران پر تاتاریوں اور منگولوں[۱] کی یورش، تاخت و تاراج اور قتل عام سے گھبرا کر بنگال کی دور دراز اور پر امن سرزمین میں گوشۂ عافیت ڈھونڈ لیا تھا افغان حاکموں کے ساتھ پلٹن بھی آئی تھی۔ پلٹن میں کنوارے سپاہی بھی تھے تاجر اور کاریگر بھی، انھوں نے بنگالی لڑکیوں سے شادیاں کیں اور یہیں کے ہو کر رہ گئے، تھوڑے ہی عرصے میں یہ غیر ملکی مسلمان بنگال میں ایک زبردست ثقافتی قوت بن گئے اور اس طرح یہاں عربی، فارسی اور بنگلہ کے اختلاط سے اردو زبان اور مشترکہ تہذیب بتدریج پھیلنے لگی اور مسلم تہذیبی اور ثقافتی اثرات بھی بنگالیوں کی سماجی اور تمدنی زندگی پر گہرے ہو گئے۔

اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ سلطان شمس الدین الیاس شاہ کے عہد (۱۳۴۲-۵۸ء) میں جنت آباد (لکھنوتی) کا دربار مسلم بنگالی کلچر کا زبردست مرکز تھا۔ اور بنگال میں علوم و فنون کی ترقی اور اشاعت کے لئے فضا سازگار ہو چکی تھی۔ نوابوں، جاگیرداروں اور فوجیوں کی بنگالی بیگمات کے لئے فارسی اور عربی سے زیادہ آسان اور زود فہم زبان اردو تھی جو بنگلہ سے بہت زیادہ قریب بھی تھی۔ یہ بیگمات اردو جلد سیکھ لیتی تھیں

---

[۱] مغل، چنگیز خاں، ہلاکو اور تیمور لنگ نے مسلسل ایران پر یورشیں کیں اور اسے تخت و تاراج کیا تھا۔ منگول کو مغل کہا جاتا ہے۔ بانی سلطنت مغلیہ بابر اسی منگول خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

اپنی بیگموں کے لیئے ان کے شوہروں نے اردو کی سرپرستی کی۔ اس طرح اردو ان کی سرپرستی کی وجہ سے بنگال کے اکثر ان علاقوں میں پھیل گئی او ر ذریعہ گفتگو بنی جہاں نوابوں اور جاگیرداروں کے اثرات قائم ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مرشد آباد، ہوگلی، پنڈوا، بردوان، مٹیابرج اور جہانگیرنگر[1] میں اردو کے اہم مراکز قائم ہوئے، وہاں شاعروں اور ادیبوں کی بڑی تعداد سرگرم عمل نظر آنے لگی تھی۔ اور انکی بدولت قلیل مدت میں اردو پورے بنگال پر چھا گئی تھی، اور بنگلہ کی ایک شریک زبان کی حیثیت اسے حاصل ہو گئی تھی اور اب انقلاب کے طوفانوں سے گذرنے کے باوجود ان علاقوں میں اردو باقی ہے اور لوگوں میں مقبول بھی۔

انیسویں صدی میں بنگال میں غیر ملکیوں کے اثرات کی وجہ سے اُردو ایک آسان، رس بھری اور لطیف زبان سمجھی جاتی تھی اور بنگالیوں میں بے حد مقبول بھی تھی بنگالی عوام اس لطیف اور آسان زبان کو پھیلانا چاہتے تھے۔ ان کی انتھک کوشش اور جدوجہد کے باعث انیسویں صدی میں اردو بنگلہ کی ایک شریک زبان بن سکی تھی۔ اور ہر تعلیم یافتہ شخص کے لیئے دونوں زبانوں کا جاننا لازمی خیال کیا جاتا تھا۔ اس خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ انیسویں صدی میں راجہ کالی کرشنا، جنم جے ستر ارمن، راجہ رام موہن رائے منشی سدا سکھ دیو، ہر ہردت، تارنی چرن مترا کیشب چندر کرمو کار جیسے بنگالی اُردو کے مشہور و مقبول شاعر، ادیب اور صحافی ہوئے۔ اور اُردو کے لیئے ان کے کام کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا

---

[1] جہانگیرنگر اب ڈھاکہ کے نام سے مشہور ہے اور بٹوارہ کے بعد مشرقی پاکستان کی راجدھانی ہے مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ اردو کا سب سے بڑا مرکز ہے چونکہ مشرقی پاکستان ہمارے موضوع سے باہر ہے لہذا مشرقی پاکستان (مشرقی بنگال) کے شعراء ادبا کا حال نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

ہے۔ انھی بنگالی شاعروں اور ادیبوں اور صحافیوں کے اشتراک وتعاون اور اُردو سے ان کی بے پناہ محبت کی وجہ سے بنگال میں اردو کے خلاف نفرت کی کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوسکی۔ یہاں اس زبان سے اب بھی بنگالیوں کو الفت ہے، بلکہ ہندوستان کی جدید زبانوں میں میٹھی، لطیف اور پیاری زبان خیال کی جاتی ہے اور اب بھی اکثر بنگالیوں میں یہ مقبول بھی ہے۔ ان اردو نواز بنگالی حضرات کے خلوص اور خواہش کی وجہ سے مشرقی ہندوستان میں ہی اردو صحافت کا جنم ہوا[1]۔ اور اردو کا پہلا اخبار کلکتہ سے شائع ہوا۔ اور آج بھی صحافت کے لئے کلکتہ کی سرزمین زرخیز مانی جاتی ہے۔

---

[1] اردو کا پہلا اخبار جام جہاں نما کلکتہ سے شائع ہوا اسکے ایڈیٹر ہری ہردت منشی سداسکھ دیو تھے

فورٹ ولیم کالج اور اُردو نثر

فورٹ ولیم کالج کا قیام اردو نثر کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور کالج سے ہی اردو نثر کی باضابطہ تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اردو کے ایک بہت بڑے غیر ملکی محسن جان گل کرسٹ کی کوششوں سے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد پڑی اور اردو نثر کا شیرخوار بچہ توانا اور طاقتور ہوا۔ سلطان ٹیپو کی شہادت اور سرنگا پٹم کے سقوط کے چودہ مہینے بعد یعنی دس جولائی ۱۸۰۰ء مطابق چار ساون ۱۸۵۷ف اور ۱۷ صفر ۱۲۱۵ھ کو گورنر جنرل مارکوئیس ولزلی نے فورٹ ولیم کالج کی باضابطہ داغ بیل ڈالی۔ اسی تاریخ کو گورنر جنرل کونسل نے کالج کے آئین وضوابط کا مسودہ منظور کیا اور کالج کے وجود کو قانونی شکل دی۔

"ہز لارڈ شپ (ولزلی) کے خاص اس (دستاویز) پر ۴ مئی ۱۸۰۰ء کی تاریخ ڈالی گئی جو میسور کے دارالسلطنت سرنگا پٹم میں برطانوی افواج کی شاندار اور فیصلہ کن فتح کی پہلی سالگرہ کی تاریخ تھی"۔[۲]

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ فورٹ ولیم کالج کی بنیاد جولائی ۱۸۰۰ء میں رکھی گئی تھی، مگر کالج کے مختلف شعبوں میں درس وتدریس کا کام نومبر ۱۸۰۰ء میں شروع ہوا تھا۔[۱]

بلاشبہ فورٹ ولیم کالج ایک خاص غرض کے تحت قائم کیا گیا تھا۔ گورنر جنرل کی کونسل نے کالج کی تشکیل کے لئے جو یادداشت آنریبل کمپنی کے نام بھجوائی تھی اس سے

---

[۱] دیکھئے گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۳۔ [۲] دیکھئے انتخاب از خطوط لارڈ ولزلی مرتبہ سڈنی اوون ص ۴۴۔

پتہ چلتا ہے کہ انگلینڈ سے آنیوالے نوجوان سول افسروں کو ہندوستان کی مختلف زبانیں سکھانے کو یہ کالج قائم کیا گیا۔ اس کے دستور العمل کے بہت سے نکات ہیں۔ دیباچہ میں لکھا گیا ہے کہ

"گورنر جنرل اِن کونسل ایسے آئین وضوابط کی تشکیل کرے کہ ہندوستان میں انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے سول سرونٹس کو اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کی انجام دہی کے لئے مقامی زبانیں سکھائی جائیں۔ اور ان کی تعلیم کا معقول بندوبست کیا جائے۔ انھیں ہندوستان کی رسومات اور رواج سے بھی مکمل واقفیت ہونی چاہئے تاکہ جن علاقوں میں وہ تعینات کئے جائیں ان کا انتظام بخوبی کر سکیں۔ اور مقامی باشندوں سے میل جول پیدا کرنے میں انھیں کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔ چنانچہ برٹش انڈیا کے عمدہ نظم ونسق کی خاطر رچرڈ مارنگٹن مارکوئیس ولزلی نے مندرجہ ذیل ضوابط مرتب کئے"

(۱) آنریبل کمپنی بہادر کے جونیر سول سرونٹس کی تعلیم و تربیت کے لئے فورٹ ولیم میں ایک کالج کی داغ بیل ڈالی جاتی ہے۔ اس کالج میں ادب، سائنس، فقہ اور ان دیگر مضامین کے شعبے کھولے جاتے ہیں جن کا جاننا سول سرونٹس کے لئے نہایت ضروری ہے اور جنھیں جانے سیکھے بغیر برٹش انڈیا پر عمدگی سے حکومت نہیں کی جا سکتی ہے۔

(۲) کالج کی اپنی ایک مناسب اور وسیع عمارت تعمیر کی جائے جس میں ہر مضمون کے لئے الگ شعبہ ہو، اور کالج کا اپنا کتب خانہ ہو

(۳) گورنر جنرل کالج کونسل کے مربی اور سرپرست ہوں گے

(۴) سپریم کونسل کے اراکین دیوانی فوجداری عدالتوں اور نظامت کے جج کالج کے گورنر (منتظم) ہوں گے۔

(۵) کالج فنڈ کا انتظام گورنر جنرل کے ہاتھ میں ہوگا۔ کالج کا براہ راست انتظام پرووسٹ (PROVEST) اور نائب پرووسٹ کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور کالج کا (PROVOST) چرچ آف انگلینڈ کا کلرجی مین ہوگا۔ ؎

کالج کے دستور اور قوانین واضح تھے۔ کالج کے قیام کے ساتھ ہی ہندوستانی، برج بھاشا، فارسی، عربی، بنگلہ اور فقہ و حدیث کے شعبے کھولے گئے لیکن سب سے زیادہ زور ہندوستانی پر دیا گیا کیونکہ لارڈ ولزلی اور پروفیسر جان بارتھوک گل کرسٹ کو اس بڑائیاں کی حد تک یقین تھا کہ ہندوستانی زبان اپنی دل کشی، مٹھاس اور آسان و سہل ہونے کی وجہ سے جلد ہی ملک کی تمام قوموں کی یکساں عزیز زبان بن جائے گی اور عوامی زبان کا درجہ حاصل کر لے گی۔ کیونکہ فارسی بھی سنسکرت کی طرح عوام سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ ان کا یہ خیال درست بھی نکلا کیونکہ فارسی زبان کی سرکاری حیثیت محض ۳۵ سال کے اندر ختم ہو گئی، اور اردو مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پھیل گئی۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ساتھ ہی گل کرسٹ ورنیکلر سیمنری یا مدرسہ ہندی کو توڑ دیا گیا۔ اس کے قبل گل کرسٹ کے مدرسہ ہندی میں ہی یورپین افسروں اور ملازموں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست تھا۔ مدرسہ ہندی کے عہدہ کار کے پیش نظر لارڈ ولزلی کو زیادہ کمپنی کی مرضی جانے بغیر کالج کی بنیاد رکھنے کی ہمت ہوئی تھی۔ کالج کے مصارف کمپنی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے لارڈ ولزلی کی من مانی کارروائی پر

؎ کالج میں پرنسپل کا عہدہ نہیں تھا۔ مسٹر گل کرسٹ نے پرنسپل کے عہدہ کی ذمہ داریاں کبھی بھی نہیں سنبھالیں وہ کالج کے پروفیسر تھے سب سے پہلے پرووسٹ ڈیوڈ براؤن تھے دیکھئے ہسٹری آف فورٹ ولیم کالج مصنفہ

ناراضگی کا اظہار کیا اور کالج کو توڑ دینے کا حکم جاری کیا۔ لارڈ ولزلی اور پروفیسر گل کرسٹ آسانی سے ہار ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے کام کے جواز اور اپنی من مانی کارروائی کی وکالت میں ایک طویل یادداشت کمپنی بہادر کے آنریبل ڈائرکٹروں کے نام بھیجی دلائل اور براہین سے کمپنی کو کالج کی افادیت کا قائل کر دیا۔ ڈائرکٹروں نے کالج کے دوبارہ کھولنے کی اجازت دیدی مگر اخراجات میں بہت حد تک کمی کر دی۔

اردو نثر پر لارڈ ولزلی اور پروفیسر گل کرسٹ کا احسان کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا اگر سچ مچ کالج توڑ دیا جاتا تو نثر کے نشو و نما اور ارتقا میں بیس تیس سال اور دیر ہو جاتی اور اس رائے سے شاید ہی کسی مؤرخ یا محقق کو اختلاف ہوگا کہ

"بلا مبالغہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو احسان ولیؔ نے اردو شاعری پر کیا تھا اس سے زیادہ اگر نہیں تو اتنا ہی احسان جان گل کرسٹ نے اردو نثر پر کیا"[1]

اردو ادب کے مشہور مؤرخ رام بابو سکسینہ نے بھی تاریخ ادب اردو میں جان گل کرسٹ کو اردو نثر میں وہی رتبہ دیا ہے جو اردو شاعری میں ولی اورنگ آبادی کا ہے۔

جان گل کرسٹ کی پر خلوص کاوش اور جد و جہد کی وجہ سے ان کے چار سالہ قیام کے دوران میں کالج میں ساٹھ ستر کتابیں داستان اور تواریخ، مختلف زبانوں سے اردو میں منتقل ہوئیں بلاشبہ یہ داستانیں اردو نثر کے لئے ابتدائی نمونہ تھیں مگر انھی کہانیوں اور تاریخوں پر نثری ادب کی مضبوط اور منقش عمارت کھڑی ہوئی۔

یہ اٹل حقیقت ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں یہ داستانیں اور تاریخیں تالیف، تصنیف اور ترجمہ نہ ہوتیں تو اردو ادب کی کل متاع گل و بلبل، ہجر و وصال اور کنگھی چوٹی کی ہوشربا خیالی

---

[1] دیکھیے گلشن ہند لطف علی۔ دیباچہ مولوی عبدالحق

غزلوں میں سمٹی ہوئی ہوتی اور غالب کی طرح اکثر شاعر "کچھ اور چاہیے وسعت مری زباں کیلئے" کی آرزو اپنے سینہ میں دفن کئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جاتے۔

فورٹ ولیم کالج کی نصف زندگی بہت طویل اگر نہیں تو بہت مختصر بھی نہیں مگر اصل میں اس کی "ہنگامہ خیز" زندگی کے دس پندرہ برس کے اندر زیادہ تر بہترین کتابیں تصنیف تالیف اور ترجمہ ہوئیں۔ اس کے بعد غالباً ۱۸۲۱ء میں ہندوستانی زبان سے غیر ملکیوں کی دلچسپی کم ہونے لگی تھی، اور توجہ کچھ ہٹ گئی تھی۔ ۱۸۳۵ء میں جب فارسی سرکاری زبان کی حیثیت کھو کر اجنبی ہونے لگی تھی تو فارسی اور عربی کی کتابوں پر کم توجہ دی جانے لگی اور ہندوستانی زبان میں بھی بہت کم کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ جو کتابیں پندرہ بیس برس کے عرصے میں تصنیف، تالیف یا ترجمہ ہو چکی تھیں ان کی اکا دکا اشاعت ہوتی رہی تھی اس سے زیادہ کام کا کچھ پتہ نہیں چلتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے عہد کی جتنی کتابوں کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخے ملتے ہیں وہ ۱۸۰۱ء سے ۱۸۲۰ء تک کے ہیں۔ بے شک کچھ قلمی نسخوں کی اشاعت ۱۸۵۰ء تک ہوتی رہی تھی۔ ۱۸۵۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے فورٹ ولیم کالج کے وجود کو مفید نہیں پایا اور اس کے توڑ دینے کا حکم دیدیا تھا۔ اس طرح ۵۸ سال تک کی خدمت کرنے کے بعد یہ یادگار کالج بند ہوا۔

کالج کا محل وقوع فورٹ ولیم میں یہ مشہور کالج قائم ہوا تھا۔ فورٹ ولیم سے ہی برٹش انڈیا پر حکومت کرنے کی ہدایت جاری کی جاتی تھی۔ اسی مناسبت سے کالج کا نام بھی فورٹ ولیم کالج رکھا گیا۔ فورٹ ولیم کے علاوہ لال بازار اور جیت پور کے نزدیک ایک پرانی عمارت میں کلاسیں ہوتے تھے[۵]

[۵] "Annuals of Fort William College" by T. Roebuck, Preface

کالج کے ضوابط و قواعد میں یہ بھی تھا کہ کالج کی اپنی ایک الگ عمارت[1] تعمیر کی جائے گی جو گارڈن ریچ سڑک پر قلعہ کے سامنے ہوگی۔ مگر کالج کی ۵۴ سالہ زندگی میں اس کی کوئی عمارت نہیں بن سکی تھی۔ بعض مورخین اور محققین کا خیال ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد ہی ہندوستان میں لسانی تنازعہ شروع ہوا۔ اور ہندوستانی کے نام پر اردو اور ہندی کے درمیان خلیج پیدا ہو گئی جو امتداد زمانہ کے ساتھ بڑھتی اور گہری ہوتی چلی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ اس خیال میں صداقت بھی ہو، مگر اختلاف کی گنجائش رہ جاتی ہے۔ کالج کے دستور العمل میں کہیں یہ تحریر نہیں ہوا ہے کہ اُردو کی ترقی کو پیش نظر رکھ کر کالج قائم کیا گیا ہے اور اُردو کا کہیں نام بھی نہیں۔ ہاں ہندوستانی کا بار بار اور ریختہ کا کبھی کبھار ذکر ہوا ہے۔ ہندوستانی میں تالیف اور ترجمہ ہونے والی کتابیں فارسی رسم الخط کے علاوہ دیوناگری رسم الخط میں بھی شائع ہوتی رہی ہوں گی۔ اس طرح برج بھاکا کی کتابیں فارسی اور دیوناگری لپیوں میں بھی شائع کی گئی تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ انیسویں صدی کی تین دہائی تک فارسی کا اثر ہندوستانی زبانوں پر غالب آ رہا تھا۔ سرکاری زبان ہونے کے ناتے سے فارسی ہندو اور مسلمان دونوں میں یکساں طور پر مقبول تھی، اس لئے ہندوستانی زبان کے لئے فارسی رسم الخط ہی

---

[1] تامس روبک نے اپنی مشہور کتاب تاریخ فورٹ کالج میں لکھا ہے کہ کالج کی عمارت کیلئے گارڈن ریچ کی جگہ گورنر جنرل نے کئی فوائد کے پیش نظر منتخب کی تھی۔ دیکھئے ص ۴۴۔ [2] عام خیال یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج ۱۸۵۴ء میں ختم ہو گیا تھا لیکن ایل او میلے نے اپنی کتاب The History of Bengal, Bihar and Orissa under British Rule میں لکھا ہے کہ فورٹ ولیم ۱۸۵۴ء تک قائم تھا۔ ۱۸۵۴ء میں مقابلہ کے امتحان کے شروع ہونے کے ساتھ کالج ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا دیکھئے ص ۲۹۳۔

مناسب سمجھا گیا ہوگا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ داستانیں فارسی لپی میں شائع ہو کر مقبول ہوئیں۔ گل کرسٹ کی خاص ہدایت اور ترغیب پر کچھ داستانیں رومن رسم الخط میں چھپی تھیں اور ہندی اور برج بھاکا کے علاوہ بنگلہ زبان میں کئی عام فہم اور مقبول قصوں کو چھاپا گیا۔ ان حالات میں یہ کہنا کچھ بجا نہیں ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں شعوری طور پر ہندی اردو کی "جنگ" کی ابتدا کی گئی تھی۔

اس اختلاف سے قطع نظر اس میں کسی کو کلام نہیں ہوگا کہ کالج کی ۵۰ سالہ زندگی میں نثر کے نشو و نما کے لئے اچھا اور مفید کام ہوا۔ اس فورٹ ولیم کالج نے غیر ملکی ادیب اور شاعر پیدا کئے جنھوں نے ہندوستان میں کئی کارآمد اور مفید کتابیں لکھیں۔ ان غیر ملکی ادبا و شعرا کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان کا ذکر دوسرے ابواب میں کیا جائے گا۔ اس وقت اتنا ہی بتانا کافی ہوگا کہ گل کرسٹ تامس روبک، ڈی کاسٹا جیمس فرانسس کارکرن، جان شور گلیڈون، ولیم ٹیلر، ولیم ہنٹر اور فادر ولیم کیری جیسی ہستیاں گزری ہیں جن کا اُردو ادب پر ناقابل فراموش احسان ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں ہندوستان[۵] کے نامور شاعروں اور ادیبوں کے اجتماع نے کلکتہ اور بنگال میں ادبی ماحول پیدا کرنے اور نثر نگاری کے لئے فضا سازگار کرنے میں مدد دی۔ میر امن دلی والے، مظہر علی خاں ولا، نہال چند لاہوری، حیدر بخش حیدری، میر بہادر علی حسینی، میر شیر علی افسوس، تارنی چرن مترا، مدن مصرا، للو لال جی کب، میر کاظم علی جوان، خلیل علی خاں اشک وغیرہ کالج میں یکجا نہ ہوتے تو بنگال میں اردو ادب کی کوئی خاص جگہ نہیں ہوتی اور فورٹ ولیم اسکول کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل ہو جاتی۔

۵۔ شمالی ہندوستان کو پہلے "ہندوستان" کہا جاتا تھا

فورٹ ولیم کالج کی ادبی سرگرمیوں کا اثر شمالی ہندوستان پر بھی ہوا۔ وہاں بھی قصے کہانیوں کی کتابیں لکھی جانے لگیں اور فسانۂ عجائب جیسی کتابیں ترتیب پاسکیں کلکتہ کے علاوہ ہوگلی ضلع میں سیرام پور مشنری بھی فادر ولیم کیری کی قیادت میں بنگلہ اور ہندوستان کی مختلف زبانوں کے فروغ کے لئے کام کر رہی تھی۔ اس مشنری نے مقامی زبانوں کو ترقی دینے کے لئے بنگلہ کے ساتھ عربی اور فارسی کے بھی خوبصورت ٹائپ ایجاد کئے تھے۔ اس نئی ایجاد کی وجہ سے مذہبی کتابوں کا مشکل کام آسان ہوگیا تھا۔ اس مشنری کی کاوش اور تنگ دود کی وجہ سے ہوگلی اور ۲۴ پرگنہ میں بھی اردو مقبول ہوئی، پھیلی اور ان علاقوں میں اب تک مروج ہے۔ اور بنگلہ سے بھی اردو میں مفید کتابوں کا ترجمہ ہونے لگا۔ خود سیرام پور مشنری میں انجیل مقدس کا ترجمہ اہتمام سے اُردو میں کیا گیا۔

فورٹ ولیم کالج کے ۵۰ سالہ عہد پر نظر ڈالنے کے بعد یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اس نے نثر کے ارتقا کے لئے جو بڑا کام کیا ہے اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ فورٹ ولیم اسکول کے مفصل ذکر کے بغیر "اردو ادب کی تاریخ" یقیناً تشنہ رہ گئی ہے۔

اس کالج کے وجود میں آنے کے قبل اردو نثر کی کتابیں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ ۱۱۴۵ھ میں فضل علی فضلی نے ملا واعظ کاشفی کی مشہور کتاب روضۃ الشہدا کا ترجمہ دہ مجلس یعنی کربل کتھا کے نام سے کیا۔ فضلی کی یہی کتاب شمالی ہندوستان میں نثر کا اولین نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ ویسے یہ کہا کا میں ترتیب دی گئی تھی اور ۱۸۰۱ء میں محمد بخش نے کالج کے لئے اس کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا۔

فضلی کے بعد ۱۷۷۵ء میں میر محمد حسین عطا خاں تحسین نے امیر خسرو کی
کی مشہور کتاب قصہ چہار درویش کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اور اس کا نام
نوطرز مرصع رکھا[1]۔ عطا خاں تحسین کی اس کتاب کو بلا شبہ شہرت دوام ملی
مگر قبول عام اس لئے نصیب نہ ہو سکا کہ فارسی اور عربی کے ادق اور ثقیل
الفاظ کی کثرت اور مصنوعی عبارت اور پیچیدہ طرز نگارش نے اس کی
شگفتگی اور سلاست چھین لی تھی۔ اس نوطرز مرصع کے ڈھانچے پر میر امن نے
نثر کی پہلی مقبول انام اور مشہور کتاب "باغ و بہار" ترتیب دی تھی جس کے
اسلوب اور طرزِ نگارش آج بھی اردو ادب میں نشانِ راہ ہیں۔

---

[1] نوطرز مرصع کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

جان بارتھوک گل کرسٹ

اُردو میں جان بارتھوک گل کرسٹ کی قیادت، اُردو سے بے پناہ شفقت اور خدمات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جناب محمد عتیق صدیقی صاحب نے گل کرسٹ پر اچھا کام کیا ہے اور ان کی کتاب گل کرسٹ اور اس کا عہد شائع بھی ہو چکی ہے. گل کرسٹ اور اس کا عہد، ایک اچھی اور مفید کتاب ہے جس میں گل کرسٹ کی زندگی، اس کے چار سالہ عہد کی تالیفات و تصنیفات اور اس کی ادبی خدمات پر عمدہ بحث کی گئی ہے عتیق صاحب گل کرسٹ کی زندگی کے بہت سے تاریک گوشوں پر سے پردہ اٹھانے میں کامیاب ہوئے ہیں مگر اب بھی گل کرسٹ کی حیات اور اس کے علمی کارنامے تاریکی میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اور بعض باتیں ایسی ہیں جن پر اختلاف باقی ہے۔

عتیق صاحب کے اس خیال سے مجھے ذرا بھی اختلاف نہیں کہ گل کرسٹ کی زندگی میں یا اس کے مرنے کے بعد اس کی سوانح عمری مرتب کرنے کی بھی کوشش نہیں کی گئی یہی وجہ ہے کہ اس کے حالات عموماً ابتدائی حالات خصوصاً آج ہماری دسترس سے باہر ہیں[۱]"

جان گل کرسٹ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں اتنا معلوم ہے کہ ۱۷۵۹ء میں وہ ایڈنبرا میں پیدا ہوا تھا اور اس شہر کے جارج ہیریٹس اسپتال میں تعلیم حاصل کی اور ڈاکٹری کی سند بھی اسے ملی۔ اس سلسلہ میں یہ شبہ کہ اس نے ہیریٹس اسپتال

---

[۱] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۶۲

میں اپنی تعلیم مکمل کی یا نہیں، اسے کوئی سند بھی نہیں ملی تھی۔ عجیب سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ جب وہ بمبئی آیا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں شامل ہوا تھا اسے اسسٹنٹ سرجن کی جگہ پر مامور کیا گیا تھا۔ اگر وہ ڈاکٹر نہ ہوتا اور کوئی سند نہ ہوتی تو فوج میں اس قدر ذمہ دار عہدہ اسے دیا نہ جاتا۔ اور ترقی کر کے وہ سرجن کے عہدہ پر فائز نہیں ہو سکتا تھا۔

گل کرسٹ ۱۷۸۲ء میں ہندوستان آیا۔ اس کا جہاز بمبئی کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا۔ گل کرسٹ کی خوش قسمتی تھی کہ بمبئی کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اسے فوج میں ملازمت مل گئی تھی جس کی تصدیق کمپنی بہادر کی فوج کے کمانڈر انچیف میجر جنرل اسٹی برٹ کی اس سفارشی چٹھی سے ہو جاتی ہے جو اس نے گل کرسٹ کو دی تھی۔ اس سفارشی خط میں میجر جنرل نے لکھا تھا:-

"یہ صاحب بمبئی ڈی ٹیچ منٹ میں اسسٹنٹ سرجن کے عہدے کیلئے بھرتی کئے گئے تھے"[۵]

جان بارتھوک گل کرسٹ کا ہندوستان میں یہ پہلا سفر تھا۔ بمبئی میں مقامی باشندوں سے ملاقات اور ان کے ساتھ گفتگو اور اظہارِ مطالب میں اپنی دقتوں کو اس نے محسوس کیا اور انہی دقتوں اور دشواریوں کو پیش نظر رکھ کر اس نے ہندوستان کی زبانیں پڑھنے اور سیکھنے کا ارادہ کیا۔ گل کرسٹ کو اس پر یقین تھا کہ ہندوستان میں رہنے اور یہاں کے لوگوں پر حکومت کرنے کے لئے ان کی زبانیں جاننا ضروری ہے۔ علاوہ نظم و نسق، ہندوستانیوں کے ساتھ اختلاط اور مغربی تہذیب کے فروغ کے لئے اور اس کے برطانوی آقاؤں کے لئے مقامی زبانیں ناگزیر ہے۔ اس کا اظہار اس نے اپنی گرامر کے

۵۔ ملاحظہ ہو گل کرسٹ اور اسکا عہد، ص ۶۵

ضمیمہ میں بھی کیا ہے ۔ اور اس مقصد کے حصول کی خاطر اس نے ہندوستان کی مختلف بولیوں پر توجہ دینی شروع کی۔ ہندوستان کے مختلف بڑے شہروں کا چکر کاٹنے کے بعد اسے یہ بھی یقین ہو گیا کہ اس وقت فارسی زبان بتدریج گرتی جا رہی ہے اور اس کی جگہ ایک نئی طاقتور شیریں اور لطیف زبان (ہندوستانی) وجود میں آ رہی ہے چنانچہ اس نے ہندوستانی کو پڑھنا اور سیکھنا شروع کیا ۔ اور اس میں اتنی استعداد پیدا کر لی تھی کہ ۱۷۸۵ء میں وہ کلیات سودا پڑھ سکتا تھا۔ سودا کے مشکل کلام کو سمجھنے کی صلاحیت بھی اس میں پیدا ہو چلی تھی اور ان کے محاسن و عیوب میں تمیز کر سکتا تھا۔ ہندوستانی زبان سے اس کی چاہ اتنی بڑھ گئی تھی کہ ہندوستان کے مختلف شہروں کے دوران قیام میں اردو لغت کی تدوین و ترتیب کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے اس کے قبل اردو قواعد اور عمدہ لغت کی کوئی مستند اور جامع کتاب نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کسی زبان کو سیکھنے اور اس میں ملکہ حاصل کرنے کے لئے بنیادی قواعد اور عمدہ لغت کا مطالعہ ضروری ہے ۔ مگر اس وقت تک اردو میں قواعد یا لغت کی ترتیب پر توجہ ہی نہیں دی گئی تھی ۔ اور اردو ادب شعر و شاعری کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا۔ گل کرسٹ نے اردو میں قواعد اور لغت کی کمی کو سب سے پہلے محسوس کیا اور سنہ ۱۷۹۲ء اور سنہ ۱۷۹۶ء کے درمیان اپنی گرامر اور لغت مرتب کر لی ۔

گل کرسٹ کے لغت کے کچھ دنوں بعد انشا نے مرزا قتیل کے ساتھ مل کر مرشد آباد میں اُردو کے لغت اور قواعد پر اچھا اور مفید کام کیا اور دریائے لطافت تصنیف کی اور پھر سنہ ۱۲۰۵ھ میں مرزا جان طپش نے مرشد آباد کے قیام کے دوران میں محاورں اور ضرب الامثال پر مفید اور معلوماتی کتاب تصنیف کی ۔

گل کرسٹ اور ہندوستانی پریس | گل کرسٹ کی تصانیف اور تالیف کا حال بیان
کرنے کے قبل یہاں دو اختلافات پر اظہار خیال ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پہلا اختلافی
مسئلہ ہندوستانی پریس کا ہے۔ فورٹ ولیم کالج اور مولوی اکرام علی کے مصنف
جناب نادم سیتاپوری نے ہندوستانی پریس کو مولوی اکرام علی کی ملکیت بتایا ہے
اور یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ۱۸۱۰ء میں ہندوستانی پریس قائم کیا گیا
'انالس آف فورٹ ولیم کالج' ہندوستانی شعبہ کے نائب پروفیسر تامس روبک
کی تصنیف ہے اس میں ۱۸۱۶ء تک کی رو داد تفصیل سے درج ہے۔ پروفیسر تامس روبک
کی یہ کتاب ۱۸۱۶ء میں ہندوستانی پریس سے ہی شائع ہوئی تھی۔ مگر کالج کی مفصل
روداد لکھنے کے باوجود روبک نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ ہندوستانی پریس کے مالک
مولوی اکرام علی تھے۔ بنگال میں چھاپہ خانے کی تاریخ اور سرکاری ریکارڈ کی چھان
بین سے بلاشبہ اتنا پتا چلتا ہے کہ قیام کالج کے ۲۵ سال بعد کالج کے منشیوں نے
اپنا مشترکہ چھاپہ خانہ قائم کیا تھا مگر ہندوستانی پریس کا ذکر کہیں بھی نہیں ملتا ہے
دوسرا اختلاف یہ ہے کہ ہندوستانی پریس گل کرسٹ کی ملکیت تھا یا نہیں۔
گل کرسٹ اور اس کا عہد کے مولف جناب عتیق صاحب نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے
کہ ہندوستانی پریس مولوی اکرام علی کا نہیں بلکہ پروفیسر جان گل کرسٹ کا تھا۔ اس
پر کافی بحث و استدلال کے بعد عتیق صاحب نے لکھا ہے کہ جان گل کرسٹ نے
ہندوستانی شعبہ کے لئے کتابیں خود چھاپنے کی تجویز کالج کونسل کے سامنے رکھی تھی
مگر اس سے متعلق کالج کونسل کے فیصلے کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ گل کرسٹ
نے عملاً طباعت کا کام اعلیٰ پیمانہ پر شروع کر دیا تھا۔ اس کام کیلئے اس نے سب سے پہلے

ایک چھاپہ خانے کا انتظام کرنا ضروری سمجھا تھا۔ لہذا ۳۰ جنوری ۱۸۰۳ء میں کالج کونسل کے سکریٹری کو اس نے لکھا

"مسٹر فرانسس گلیڈون نے ٹائپ اور طباعت کا جو سامان کالج کونسل کو دیا ہے غالباً اس سے بہتر سامان اس وقت دستیاب نہیں ہو سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ کالج کونسل کے ساتھ آپ میری اس خواہش کا اظہار کر دیں کہ ہندوستانی زبان کی جو کتابیں عنقریب چھاپنے والا ہوں ان کی طباعت کے سلسلے میں اس سامان کو اپنی تحویل میں لیکر انہیں اپنے شعبے کے کام میں لانا چاہتا ہوں۔ عند الطلب اس کو یہ تمام وکمال واپس کرنے کا میں وعدہ کرتا ہوں۔ میری تحویل کے دوران میں اس میں سے اگر کچھ ضائع ہوا تو اس کو میں پورا کروں گا۔[۱]"

عتیق صاحب نے فورٹ ولیم کالج کی کاروائیاں جلد اول کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ گل کرسٹ کی یہ درخواست منظور ہو گئی تھی۔ چھاپہ خانہ نیز اور سامان اس کے حوالے کر دیا گیا اور اسی سامان سے گل کرسٹ نے اس پریس کی داغ بیل ڈالی جو ہندوستانی پریس کے نام سے مشہور ہوا۔[۲]

عتیق صاحب نے کالج کونسل کی جانب سے گل کرسٹ کی درخواست کی منظوری سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ گلیڈون کا سامان طباعت پا کر گل کرسٹ نے ہندوستانی پریس قائم کیا۔ یہ مان بھی لیا جائے تو بھی اس خیال کی تصدیق نہیں ہوتی کہ ہندوستانی پریس گل کرسٹ کی ملکیت تھا۔ پریس اور سامان طباعت کالج کونسل کا تھا اس لئے گل کرسٹ پریس کے منتظم تو ہو سکتے ہیں مالک نہیں بن سکتے تھے۔

[۱،۲] دیکھئے گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۱۵۱ ایضاً۔

ہندوستانی پریس گل کرسٹ کا نہیں تھا

عتیق صاحب اپنے دلائل و براہین کے باوجود اس پر شکوک نظر آتے ہیں کہ واقعی ہندوستانی پریس گل کرسٹ کا ہی تھا۔ رینکنگ (RANKING) نے اپنے مقالے بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ (BEGAL PAST AND PRESENT) میں لکھا ہے کہ ولیم ہنٹر بھی ہندوستانی پریس میں گل کرسٹ کے شریک دار تھے۔ عتیق صاحب نے رینکنگ کے خیال کی تردید کی ہے، لیکن اپنے فیصلے کے جواز میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں دے سکے۔

اصل میں ہندوستانی پریس ڈاکٹر ولیم ہنٹر کی ملکیت تھا۔ گل کرسٹ کا اس پریس سے بس اتنا تعلق تھا کہ اس کی موجودگی میں اور ہندوستان سے واپس جانے کے بعد بھی اس کی کتابیں ہندوستانی پریس میں چھپتی رہی تھیں اور وہ جب تک ہندوستان میں رہا اس پریس سے اس کا لگاؤ رہا۔ لیکن مالکانہ حیثیت کبھی نہ رہی۔

پیاری چند مترا نے اپنی مشہور کتاب "لائف آف دیوان رام کنول سین" میں لکھا ہے کہ رام کنول سین اپنی تقدیر کا آپ معمار تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی ڈاکٹر ہنٹر کے ہندوستانی پریس میں ایک کمپوزیٹر کی حیثیت سے شروع کی۔ رام کنول سین نے ۱۸۰۳ء کے دسمبر یا جنوری ۱۸۰۴ء میں ہندوستانی پریس کی ملازمت اختیار کی۔ جو ولیم ہنٹر کی واحد ملکیت تھا۔[۱]"

پیاری چند مترا کے اس بیان سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی پریس کا مالک جان گل کرسٹ نہیں تھا۔ بلکہ ولیم ہنٹر تھا۔ ڈاکٹر ولسن (Wilson) نے بھی ۱۸۴۵ء میں دیوان رام کنول سین کی سخت علالت پر ایک خط ارسال کیا

---

[۱] ۔ لائف آف دیوان رام کنول سین ص ۴۴-۴۵

تھا جس میں وہ لکھتے ہیں کہ

"۱۸۱۰ء میں رام کنول سین سے میری ملاقات ہوئی وہ اس وقت ہنٹر کے ملازم تھے۔ دیگر فرائض کی ادائیگی کے علاوہ وہ ہندوستانی پریس کے انتظام کار تھے جس کے ڈاکٹر ہنٹر تنہا مالک تھے۔ ۱۸۱۰ء میں ڈاکٹر لڈن (LYDON) اور میں اس کے حصہ دار ہو گئے اور جب ۱۸۱۱ء میں ڈاکٹر لڈن اور ہنٹر جاوا گئے تو انھوں نے پریس مجھے سونپ دیا۔ ڈاکٹر ہنٹر اور ڈاکٹر لڈن جاوا میں ہی انتقال کر گئے، میں اس کا واحد مالک رہ گیا۔ بعد میں تامس روبک بھی میرے شریک ہو گئے پریس کے نگراں اور منتظم رام کنول سین ہی تھے وہ ۱۸۲۹ء تک ہمارے ساتھ کام کرتے رہے۔ ۱۸۲۹ء میں ہندوستانی پریس دوسرے شخص کے ہاتھ میں چلا گیا۔ پریس کی فروخت کے بعد رام کنول سین بھی اس سے علاحدہ ہو گئے۔[1] ...."

دوسرا بحث طلب مسئلہ ہے، اورینٹل سیمنری کا، قتیل صاحب نے لکھا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے قبل گل کرسٹ نے نو وارد انگریزوں کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا تھا جو سرکاری ادارہ تھا اور اس کا نام اورینٹل سیمنری تھا مگر مجھے دوران مطالعہ میں کہیں کوئی ایسی بات معلوم نہ ہو سکی جس سے ثابت ہو کہ گل کرسٹ نے جو مدرسہ کھولا تھا اس کو سرکار سے مدد بھی ملتی تھی۔ بلاشبہ حکومت کی سرپرستی اس مدرسۂ ہندی کو حاصل تھی۔ گل کرسٹ کا یہ مدرسہ نجی تھا۔ اور سرکار سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور اس کا نام گل کرسٹ سیمنری یا مدرسہ ہندی تھا۔

گل کرسٹ کی ہندوستان سے مراجعت کے بعد ۱۸۰۴ء میں کیپٹن بہادر کے ڈائرکٹر

---

[1] The life of Divan Ram kawwal Sen. P.T By Piyare Chund Mitra P. 60-65

نے انگلینڈ میں ان نوجوان افسروں کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے لیے اورینٹل سیمنری کے قیام پر فورٹ ولیم کالج کے عہدیداروں، افسروں اور پروفیسروں کو یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ اورینٹل سیمنری کے چل جانے پر فورٹ ولیم کالج کو توڑ دیا جائے گا۔ اس خیال سے ان میں بے چینی پھیل گئی تھی۔ ان کے اضطراب اور اندیشے کو رفع کرنے کے لیے سر جارج ہلری (George Hilary) بارلو بارنٹ نے ۳ مارچ ۱۸۰۶ء میں ویزیٹر کی حیثیت سے کالج میں تقریر کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ

"جیسا کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ عام خیال اور اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ آنریبل کمپنی بہادر کے ڈائرکٹر صاحب بہادروں کے ماتحت انگلینڈ میں جو اورینٹل سیمنری قائم کی گئی ہے اس کا مقصد فورٹ ولیم کالج کو ختم کرنا ہے، ایک بے بنیاد خوف ہے۔ بلکہ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ (ORIENTAL SEMINARY) اورینٹل سیمنری کے باعث کالج کے کام میں عمدگی اور سہولت و بہتری پیدا ہو گی[1]۔"

سر جارج ہلری بارلو بارنٹ کے اس بیان سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اورینٹل سیمنری انگلینڈ میں ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی واپسی پر قائم کی گئی تھی، اسے کمپنی بہادر کی سرپرستی حاصل تھی اور وہ ایک سرکاری ادارہ تھا۔ گل کرسٹ سیمنری (مدرسہ ہندی) اور انگلینڈ کی اورینٹل سیمنری میں کوئی تعلق نہیں تھا۔

گل کرسٹ کی تصنیفات و تالیفات | ہمارا نثری ادب اردو کے اس غیر ملکی محسن اور ادیب کے احسانات اور خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ گل کرسٹ نے صرف ہندوستان کے مختلف صوبوں سے اردو کے قابل اور منجھے ہوئے ادیبوں، شاعروں

---

[1] The Annals of Fort William College P 63 Appendix

اور عالموں کو ہی کالج کے لئے یکجا نہیں کیا بلکہ اپنی سرپرستی اور خاص نگرانی میں ان سے اردو نثر کی عمدہ داستانیں تالیف اور ترجمہ کرائیں اور ہندوستانی میں خود بھی کئی معیاری اور اہم کتابیں ترتیب دیں۔ گل کرسٹ کی ایک معرکۃ الآرا کتاب اردو قواعد اور لغت کی ہے جو اس نے سخت محنت، جانفشانی اور دیدہ ریزی سے کام لیکر مکمل کیا۔ اس کے قبل اردو یا ہندوستانی زبان کی کوئی ایسی لغت نہیں تھی جو معیاری، مستند اور قابل اعتماد ہو۔ بلاشبہ جوشوا کٹلر، بنجامن شلز اور شکسپیر نے اُردو کی ابتدائی گرامر اور لغت ترتیب دی تھی مگر ان کا کام ادھورا اور غیر مستند تھا۔ ان کی کتابوں میں ابتدائی خاکے ضرور ملتے ہیں مگر یہ کتابیں خود غلطیوں سے پر تھیں اور گمراہ کن بھی۔ ان کی غلطیوں کو پیش نظر رکھ کر گل کرسٹ نے نوجوان یورپین افسروں کے لئے ایک مستند اچھی اور قابل اعتما دلغت اور قواعد لکھنے کا فیصلہ کیا۔ اور ہندوستان کے مختلف شہروں کے دوران قیام میں اپنی مشہور اور لاثانی کتاب مرتب کی

اردو لغت اور قواعد غازی پور کے قیام کے دوران میں ہی گل کرسٹ نے اپنی لغت ۱۷۸۲ء میں مکمل کر لی تھی۔ اس وقت وہ وہاں ایک سوداگر تھا اور نیل کی کاشت کرتا تھا جس میں اسے بھاری خسارہ بھی برداشت کرنا پڑا تھا۔ کتاب کی طباعت اور اشاعت کے سلسلے میں اسے کلکتہ بھی جانا پڑا تھا۔ اور وہاں اس کی یادگار کتاب شائع ہوئی تھی۔ اس لغت کی اشاعت کے بعد اس کی دوسری جلد گرامر آف دی ہندوستانی لنگویج ہے۔ (GRAMMER OF THE HINDUSTANI LANGUAGE) قواعد کی یہ پہلی کتاب ۱۲ × ۸ سائز اور ۳۲۴

صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ آخر کے دو صفحات ضمیمہ کے طور پر دئے گئے ہیں یہ کتاب ۱۷۹۶ء میں کلکتہ کرانیکل پریس سے شائع ہوئی تھی۔ سرورق پر سودا کے اشعار فارسی اور رومن رسم الخط میں درج ہیں۔ گل کرسٹ اپنے دور کے شاعروں میں سودا سے بہت زیادہ متاثر تھا، اور اسے اپنے عہد کا سب سے بڑا اور قادر الکلام شاعر سمجھتا تھا۔ سودا کے اشعار کے نیچے انگریزی اور فارسی میں یہ عبارت درج ہے

"ہر جا کہ سہوے و خطائے واقع شود بذیل کرم بپوشند و قلم اصلاح جاری دارند"

"When e.er there shall occur an ommission or error, cover it with mantle of grace, and hold the pen of correction running over its"

ہندوستانی زبان کے اس قواعد کی بعض خصوصیات قابل ذکر ہیں۔ اس کتاب میں اردو ہندی طباعت کا ابتدائی نمونہ ملتا ہے۔ اس کی نثری صلاحیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس کا اسلوب اور طرز تحریر بھی سامنے آتا ہے۔ اپنی اس کتاب میں ولی، حاتم، سودا، مسکین اور یقین کے اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ اور مسکین کا ایک مشہور مرثیہ اس نے مختلف جگہوں پر نقل کیا ہے۔

ہندی مورل پری سپٹر یا پندنامہ سعدی کا ترجمہ

گل کرسٹ کی یہ کتاب ۱۸۰۳ء میں مکمل ہوئی۔ اس نے اپنی کتاب کو فورٹ ولیم کالج کے پرووسٹ براؤن اور نائب پرووسٹ کلاڈیس بکھانن (Cla-Buchanin) اور کالج کونسل کے دیگر ممبروں کے نام معنون کیا تھا۔ پندنامہ سعدی کے ترجمہ کا نام ہندی

مورل پری سیپٹر یعنی اتالیق ہندی[۱] ہے۔ گل کرسٹ کی کوئی الگ کتاب "اتالیق ہندی" کے نام سے موجود نہیں ہے۔

گل کرسٹ سے قبل مسٹر گلیڈون (GLADWIN) نے پندنامہ سعدی کا ترجمہ مکمل کر لیا تھا۔ اس لئے گل کرسٹ کو اپنی محنت کے اکارت ہونے کا افسوس ہوا تھا لیکن کلکتہ میں جب اس کی ملاقات مسٹر گلیڈون سے ہوئی اور ان کا ترجمہ گل کرسٹ نے دیکھا تو اسے اطمینان ہو گیا کہ دونوں میں نمایاں فرق ہے۔ غزلیات اور اشعار کی ترتیب جداگانہ تھی اور گل کرسٹ نے تین ایسی غزلوں کا ترجمہ کیا تھا جو گلیڈون کی کتاب میں درج نہیں تھیں[۲]

'اتالیق ہندی' کا ترجمہ گل کرسٹ نے خود انگریزی اور ہندوستانی میں کیا تھا، اشعار اور قطعات کے ترجمے میں اس نے منشی مظہر علی خاں ولاؔ سے مدد ضرور لی تھی۔ ولاؔ کے علاوہ کالج کے دوسرے منشیوں نے بھی گل کرسٹ کی معاونت کی تھی۔ گل کرسٹ کی یہ کتاب شروع ہوتی ہے ؎

مرے حال پر کر تو بخشش خدا	کہ ہیں ہم گرفتار حرص و ہوا
نہیں ہے ہمیں داد رس تجھ سوا	تو ہی بخش دے عاصیوں کی خطا[۳]

اس کے بعد خطاب بہ نفس' اردو اور انگریزی میں ترجموں کے ساتھ درج ہے۔

---

[۱] ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی نگرانی اور ہدایت کی روشنی میں کالج کے منشیوں نے 'اتالیق ہندی' کی نوک پلک سنواری تھی۔ دراصل یہ پندنامہ سعدی کا ترجمہ ہے جسے گل کرسٹ نے منشیوں کی مدد سے کیا تھا۔ دیکھئے اینالس آف فورٹ ولیم کالج ضمیمہ ص ۲۱۔

[۲] دیباچہ اتالیق ہندی ص ۱۳-۱۴۔

[۳] دیکھئے ہندی مورل پری سیپٹر ص ۲۔ مطبوعہ نسخہ نیشنل لائبریری کلکتہ۔

خطاب بہ نفس

چہل سال عمر عزیزت گذشت — مزاج تو از حالِ طفلی نہ گشت
ہمہ با ہوا و ہوس ساختی — دمے با مصالح نہ پرداختی
مکن تکیہ بر عمر ناپائدار — مباش ایمن از بازیِ روزگار

خطاب اپنی ذات سے (ترجمہ)

تری عمر کے گذرے چالیس سال — نہ طفل کا اب تک گیا وہ خیال
ہوا و ہوس میں گذری سدا — نہ تو نیک کاموں میں یکدم رہا
بھروسا نہ کچھ عمرِ فانی پہ کر — زمانے کی بازی سے مت ہو نڈر

اس کا ترجمہ دوسری طرف انگریزی میں دیا گیا ہے۔ پندنامہ کالج کے ابتدائی ایام میں شائع کیا گیا تھا۔ سادہ مضمون پر مشتمل ہے۔ اس عہد کے مطابق اختتام پر مندرجہ ذیل قطعہ درج ہے ؎

کریما کا جب ترجمہ ہو چکا — تو مجھ سے مری طبع نے یہ کہا
کہ تاریخ کر یادگارانہ طور — سنِ عیسوی کے موافق بغور
اس کی فکر میں تھا کہ آئی ندا — ہوا ترجمہ نظم میں یہ ولا

مشرقی زبان داں گل کرسٹ کی یہ تیسری مفید اور عمدہ کتاب ہے۔ یہ کتاب گل کرسٹ کی واپسی کے بعد ۱۸۰۶ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے دیباچے میں گل کرسٹ نے زبان کے نام پر بحث کی ہے۔ وہ کہنا چاہتا ہے کہ ہندوستانی کو ہندی و ہندوی کہنے سے کیوں پرہیز کرتا ہے۔ نئی زبان فارسی، عربی اور ہندوستان

۱؎ دیکھئے ہندی مورل پرسپٹر ص ۴۔

کی مختلف بولیوں کے اختلاط سے وجود میں آئی ہے۔ اس لئے یہ ہندوستانی زبان ہوئی۔ لہذا اس کا عمدہ اور مناسب نام ہندوستانی ہی ہے۔ ہندی، ہندوی، مورس مناسب نہیں ہے۔ مشرقی زبان داں ہیں، ہندوستانی اور انگریزی کے تبادل الفاظ کی طویل فرہنگ بھی دی گئی ہے اور زبان کے نشو و نما اور ارتقا پر مبسوط مقالہ بھی ہے
اس کتاب میں ہندوستانی قصے بھی شامل ہیں۔ پہلی کہانی "رُوداد سلیس گلاب کی" کے عنوان سے ہے اور پوری کہانی رومن میں درج ہے۔ دوسری حکایت بدر منیر اور شہزادہ بے نظیر کی ہے۔ اردو اور انگریزی ترجمے بھی شامل ہیں۔ ضمیمہ میں آلات حرب اور ہتھیاروں کے (ARTICLES OF WAR) اردو تبادل الفاظ دئے گئے ہیں۔ قوانین جنگ کی خلاف ورزی کرنے پر مقدمہ اور سزا کی وضاحت بھی کی گئی ہے مگر فوجی آئین کا ترجمہ گل کرسٹ کا نہیں بلکہ کرنل اسکاٹ کا ہے۔

ہندوستان کی مقبول ترین زبان یہ بھی گل کرسٹ کی کتاب ہے اور رومن لپی میں لکھی گئی ہے۔ ۱۸۰۸ء میں ہندوستان کی مقبول ترین زبان یا اسٹرینجرس ایسٹ انڈین گائیڈ ٹو ہندوستان (STRANGERS EAST INDIAN GUIDE TO HINDUSTAN) ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کی چھپائی کا سارا انتظام تامس ہیرڈ کے سپرد تھا۔ اس میں چھوٹی چھوٹی حکایتیں رومن میں اور ان کے ترجمے دئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں گل کرسٹ نے تذکرۂ گلشن ہند کے مؤلف مرزا لطف علی اور مرزا کاظم علی جواں کی مکمل غزلیں دی ہیں۔ ان غزلوں کے ترجمے بھی دئے ہیں۔ گل کرسٹ نے حافظ اور دیگر فارسی شاعروں کی بھی غزلیں نقل کی ہیں۔ جیسا کہ عنوان ہے یہ کتاب ہندوستان آنے والے اجنبی یورپین افسروں اور

سوداگروں کی رہنمائی کے لئے لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب ۴۶ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے اور نوسکھیے اور نووارد دیورپینوں کے لئے مفید بھی ہے۔

گل کرسٹ نے ہندوستانی زبان کے قواعد میں شکسپیر کے دو ڈراموں کے ترجمے بھی شامل کئے ہیں۔ عتیق صدیقی صاحب نے گل کرسٹ کے اس اہم کام کو ایک ادبی کارنامہ قرار دیا ہے جو نثر کے ابتدائی دور کے اعتبار سے بالکل درست ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں اس وقت تک سنسکرت۔ فارسی۔ عربی۔ برج بھاکا اور اردو کے شاہکاروں کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہو چکا تھا۔ لیکن انگریزی زبان کی کسی کتاب کو یا اس کے کسی حصہ کو کسی ہندوستانی زبان میں غالباً منتقل نہیں کیا گیا تھا۔ گل کرسٹ کی یہ کوشش بھی ادب کے لئے احسان ہے۔ گل کرسٹ نے اس ترجمے کے ساتھ چند سطریں بطور دیباچہ بھی لکھی ہیں۔ اور ترجمہ کی افادیت کی جانب اپنے ہم وطنوں کی توجہ مبذول کرائی ہے[۵]

فارسی افعال کا جدید نقشہ کے عنوان سے بھی گل کرسٹ نے مختصر کتاب لکھی ہے۔ یہ ۱۸۰۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں افعال پر آسان اور دلچسپ انداز میں بحث کی ہے۔

قواعد اردو، اردو میں گل کرسٹ نے ہندوستانی گرامر انگریزی میں لکھی تھی اور اردو زبان میں اس کی کمی کو محسوس کر کے اس کا خلاصہ فارسی لپی میں لکھا۔ نووارد انگریز افسروں اور سیول سرونٹس کے لئے ابتدائی قواعد سے بحث کی ہے۔ 'نے' اور 'کو' کے استعمال کی خاص طور پر اس میں وضاحت کی گئی ہے۔ شروع میں اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

---

[۵] دیکھیے گل کرسٹ اور اس کا عہد صفحہ ۹۶

"اردو جسے ریختہ بھی کہتے ہیں زبان عام ہندوستان کی ہے جس کو سب قصبات
اور شہروں میں لوگ بولتے ہیں...... الخ" [1]

قواعد اردو کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے اور
۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ قلمی نسخہ کے اختتام پر کالج کی مہر بھی پڑی ہوئی ہے۔

نقلیات ہندی گل کرسٹ کی یہ کتاب ۱۸۰۲ء میں ہندوستانی پریس سے شائع
ہوئی۔ گل کرسٹ کے ایما اور خاص انتظام میں فارسی، رومن اور دیوناگری لپیوں میں
شائع کی گئی تھی۔ اس میں ہندی کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور گل کرسٹ کے تراجم درج
ہیں۔ نقلیات ہندی کا اردو ترجمہ گل کرسٹ کے ایما اور فرمائش پر منشی تارنی چرن مترا
نے کیا تھا۔ نقلیات ہندی کا دیباچہ خود گل کرسٹ نے لکھا ہے اور ناقدانہ اور عالمانہ
انداز میں لکھا ہے۔

مشرقی داستان گو مشرقی داستان گو گل کرسٹ کی عمدہ مفید اور دلچسپ
کتاب ہے۔ اس کتاب میں حکیم لقمان کی حکایات اور مشرقی کہانیاں، فارسی، برج
بھاشا اور سنسکرت سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں گل کرسٹ
کو کالج کے منشیوں سے مدد ملی تھی۔ ان میں تارنی چرن مترا، مظہر علی خاں ولا، میر بہادر
علی حسینی اور للو لال خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس میں مشرقی داستان گویوں کو
مختصر روداد ملتی ہے۔ مشرقی داستان گو ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسکے علاوہ
ہندوستانی مینویل یا کاسکٹ آف انڈیا کو بھی گل کرسٹ نے مرتب کیا تھا اور یہ
ہندوستانی ادب کا پہلا انتخاب تھا۔

---

[1] دیکھئے قواعد اردو زبان (قلمی نسخہ ص ۱)

گل کرسٹ نے کم وبیش سولہ کتابیں ترتیب دیں۔ اردو سے محبت اور دلچسپی اور اس کی ترویج واشاعت کے لئے مساعی سے پتہ چلتا ہے کہ گل کرسٹ کو اردو زبان کے مقبول انام ہونے کا یقین تھا۔ اس نے ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں نواب سراج الدولہ کی شکست اور لارڈ کلائیو کی "پرفریب جیت" کی تاریخ میں یہ پڑھ لیا تھا کہ انگریز قوم ہندوستان میں اپنی مستقل اور وسیع حکومت قائم کرے گی اور عمدہ نظم ونسق کے لئے ہندوستانی زبان کا سیکھنا اور جاننا ضروری ہے۔ لہٰذا اس مقصد کے ماتحت اس نے ہندوستانی لسانیات پر پہلا کام کیا۔ اور قصے کہانیوں کی آسان، دلچسپ اور پرلطف کتابیں تالیف اور ترجمہ کرائیں۔

کتابوں کی اشاعت پر بھاری اخراجات کے مسئلے پر کالج کونسل اور گل کرسٹ میں تصادم بھی ہوتا رہا لیکن وہ حوصلہ شکن کبھی نہیں ہوا۔ تصادم کے باوجود اس کی اکثر باتیں مان لی گئیں کچھ یقیناً رد کردی گئیں۔ کالج کونسل اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کے عدم اشتراک اور بے توجہی، کوتاہ اندیشی اور تنگ نظری سے بڑا دل برداشتہ ہو چکا تھا اور اپنے ساتھیوں کے مکمل اشتراک اور تعاون نہ پانے کی وجہ سے اسے اتنی اذیت ہوئی تھی کہ اس نے ۲۴ فروری ۱۸۰۴ء میں استعفا دیدیا۔ استعفا نامہ میں لکھا تھا— "اپنی مسلسل علالت اور کمزوری کے باعث میں اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں"[۱]

اس وقت تک اس کا مربی اور سرپرست ولزلی بھی اپنی میعاد حکومت پوری کرکے انگلینڈ جا چکا تھا۔ چنانچہ اس کا استعفا منظور کرلیا گیا اور اردو نثر کا محسن وطن لوٹ گیا۔ وہاں بھی اس کی اجتہاد پسند طبیعت اردو کی توسیع واشاعت کیلئے کوشاں

---

[۱] دیکھئے دیباچہ ترجمہ قرآن، اشک، قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری،

رہی۔ اور وہ ہندوستان کے سفر پر جانے والے یورپین افسروں کو ہندوستانی زبان کی
تعلیم دیتا رہا تھا اور انگلینڈ کی سرکاری اورینٹل سیمنری سے بھی اس کا تعلق تھا۔

ارباب نثر اردو کے مولف سید محمدؒ لکھتے ہیں

"خود ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۰۶ء[۱] میں بمقام لسٹر اسکویر ایک ادارہ تربیہ قائم
کیا تھا۔ اس میں اردو کی پروفیسری پر ڈاکٹر گل کرسٹ کو مامور کیا۔ یہ ادارہ خاص طور پر
ان امیدواروں کی تعلیم و تربیت کے لئے قائم ہوا تھا جو کمپنی (کی) جانب سے طبی عہدہ دار
بنا کر ہندوستان بھیجے جاتے تھے۔ ۱۸۲۵ء میں نظمائے کمپنی نے مصارف میں تخفیف
کے خیال سے اس مفید ادارے کو برخاست کر دیا۔ اور ڈاکٹر گل کرسٹ بھی اس عہدے
سے سبکدوش ہو گئے۔[۲]"

ارباب نثر اردو کے مؤلف کے بموجب گل کرسٹ انگلینڈ لوٹ کر بھی اردو کی
بے لوث خدمت کرتے رہے۔ مشرقی ادارے اور مشرقی علوم و فنون اور ادب سے ان کا
رشتہ ٹوٹا نہیں تھا، مگر رفتہ رفتہ عمر ان کی سرگرمیوں پر بھی اثر انداز ہونے لگی۔ انھیں
بے لوث خدمات کا بھی کوئی خاص صلہ نہیں ملا تھا۔ چنانچہ تمام تعلیمی ادبی اداروں سے اپنے
رشتے انھوں نے توڑ لئے اور تبدیل آب و ہوا کی خاطر فرانس چلے گئے اور پیرس (PARIS)
میں اردو کے اس بڑے سرپرست اور محسن کی موت ۱۸۴۶ء میں ہوئی۔ موت نے اُردو کے اس
جانباز غیر ملکی سپاہی کو ہمیشہ کیلئے چھین لیا مگر اس کا نیک نام اردو ادب میں ہمیشہ زندہ و جاوید
رہے گا۔

۱؎ اورینٹل سیمنری ۱۸۰۵ء میں قائم ہو چکی تھی، ۱۸۰۶ء کی تاریخ غلط دی گئی ہے۔

۲؎ ملاحظہ ہو ارباب نثر اردو، سید محمد حسن ص ۲۲ - ۲۳

تامس رُوبک

جان بارتھوک گل کرسٹ کی ہندوستان سے مراجعت کے بعد ان کی جگہ پروفیسر ٹامس مویٹ کو ملی۔ جیمس مویٹ پروفیسر مقرر کیے گئے۔ اور نائب پروفیسر ولیم ٹیلر ہوئے ٹیلر کے بعد یہ عہدہ تامس روبک کو ملا۔ مسٹر روبک ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں معمولی سپاہی کی حیثیت سے شامل ہوئے تھے لیکن بتدریج ترقی کے مراحل طے کیے۔ پہلے لفٹنٹ اور پھر کپتان ہوئے۔ تامس روبک، جان گل کرسٹ کے کام اور نام سے بے حد متاثر تھے اور گل کرسٹ کے جانے کے بعد فورٹ ولیم کالج کے منشیوں کا انھوں نے بڑا خیال رکھا۔ کالج سے ناوابستہ ادیبوں اور شاعروں کی بھی سرپرستی کی۔ ان کے عہد میں مرزا جان طپش نے کالج کے ایما اور فرمائش پر مثنوی سحرالبیان کے طرز پر عجیب و غریب رومانی مثنوی بہار دانش، تالیف کی۔ کلیاتِ میر تقی میر روبک صاحب کی سرپرستی و معاونت کی وجہ سے ترتیب پا سکا تھا۔

تامس روبک کو بھی اردو ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ فورٹ ولیم کالج کے سکریٹری اور ممتحن بھی رہ چکے تھے۔ ارباب نثر اردو کے مولف کا یہ خیال درست نہیں کہ جان گل کرسٹ کی مراجعت لندن پر روبک صاحب کو شعبہ ہندوستانی کا پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔[۵] سید صاحب کو شاید یہ غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی کہ ۱۸۰۴ء میں تامس روبک کی جتنی کتابیں دوبارہ شائع ہوئی تھیں ان میں روبک کو سابق پروفیسر

---

۵ دیکھئے ارباب نثر اردو ص ۵۴

فورٹ ولیم کالج لکھا گیا۔ جیمس مویٹ اور ٹیلر کے بعد وہ پروفیسر ہو گئے تھے۔

تامس روبک نے اپنی کتاب انالس آف فورٹ ولیم کالج میں جان گل کرسٹ کے استعفا اور لندن کی واپسی کے بعد کالج کے ہندوستانی شعبہ میں ردو بدل کا ذکر کیا ہے۔

اس تاریخی کتاب میں روبک نے اپنا عہدہ نائب پروفیسر کا بتایا ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء تک کالج کے ہندوستانی شعبہ کی تفصیلات اس طرح دی گئی ہیں۔[۵]

ہندوستانی لنگویج کے پروفیسر	ولیم ٹیلر
ہندوستانی لنگویج کے نائب پروفیسر	تامس روبک

دیگر منشیوں کی تفصیل اور سنہ تقرر:۔

میر منشی	تارنی چرن مترا	مئی سنہ ۱۸۱۰ء	منشی	مولوی باب اللہ	اکتوبر سنہ ۱۸۰۱ء
نائب میر منشی	میر بخش علی	نومبر سنہ ۱۸۰۳ء	″	دلیل الدین	اگست سنہ ۱۸۰۶ء
منشی	میر محمد دادر	۱۸ مارچ سنہ ۱۸۰۲ء	″	مولوی محفوظ علی	نومبر سنہ ۱۸۰۶ء
″	خان	مئی سنہ ۱۸۰۱ء	″	میر تصدق حسین	دسمبر سنہ ۱۸۰۲ء
″	یوسف علی	مارچ سنہ ۱۸۰۱ء	″	مولوی بہادر علی	نومبر سنہ ۱۸۰۲ء
″	مولوی نذر اللہ	اپریل سنہ ۱۸۰۲ء	″	میر منصور علی	جولائی سنہ ۱۸۰۴ء
″	مولوی واجب الدین	نومبر سنہ ۱۸۰۸ء	″	میر سعید علی	″ سنہ ۱۸۰۲ء
″	مولوی عبداللہ	اکتوبر سنہ ۱۸۰۳ء	″	مہانند (ناگری رسم خط کے منشی)	سنہ ۱۸۰۲ء
″	مولوی محمد ولی	ستمبر سنہ ۱۸۰۱ء			

۵۔ The Annals of the college of Fort William by Reobuck P.421

میر بہادر علی حسینی کالج کے پہلے میر منشی تھے۔ بہادر علی حسینی کے بعد میر شیر علی افسوس میر منشی ہوئے تھے۔ مگر ستمبر ۱۸۰۹ء میں میر شیر علی افسوس کا انتقال ہوا۔ افسوس کے جانشین منشی تارنی چرن مترا ہوئے۔ ۱۸۱۰ء میں کالج کے شعبہ ہندوستانی کی نئی تشکیل کے بعد ہندوستانی شعبہ کے اکثر منشی کی زندگیاں گمنامی میں لپٹی ہوئی ہیں ان میں چندایک ہی کی کوئی تالیف یا تصنیف پائی جاتی ہے۔ ورنہ خیال ہے کہ ان منشیوں کا تقرر سابق منشیوں کی تالیف اور تصانیف کی نئی ترتیب اور ان کی فہرست تیار کرنے کے لئے ہوا تھا۔

دی اینالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم | تھامس روبک کی یہ تاریخی کتاب فورٹ ولیم کالج پر مستند اور عمدہ کتاب ہے۔ اس میں فورٹ ولیم کالج کے ۱۵ سالہ عہد کی داستان، اور روداد ملتی ہے اور وہ بھی تفصیل سے۔ روبک کی اس کتاب سے اکثر ایسی کتابوں کا پتا چلتا ہے کہ جن کا اب نام و نشان بھی باقی نہیں رہا ہے۔ کالج کے پروفیسر، منشی طلبہ اور کالج کی تالیفات بھی روشنی میں آتی ہیں۔ کتاب کے ضمیمہ میں کالج کونسل کی جانب سے کتابوں کی اشاعت کے کام کا حال بھی ملتا ہے۔ اس کتاب میں بس یہ چیز بری طرح سے کھٹکتی ہے کہ روبک نے اپنے پیش رو اور اُردو کے محسن جان گل کرسٹ کی کتابوں اور ہندوستانی زبان کی ترقی کے لئے ان کے بے لوث کام کا اولاً تو ذکر ہی نہیں کیا اور اگر کہیں ذکر کیا تو بے حد اختصار سے جس سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ گل کرسٹ کی طرف سے روبک کا دل صاف نہیں تھا۔

اُردو لغت | تھامس روبک کی دوسری مفید کتاب اُردو لغت ہے جو دراصل گل کرسٹ کے اردو لغت کا اختصار اور کامیاب چربہ ہے۔ معمولی ترمیم و اضافے

کے ساتھ روبک نے اردو لغت شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے بھی اس لغت کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیا تھا مگر اردو لغت کو وہ شہرت نصیب نہ ہو سکی جو گل کرسٹ کے لغت کو ہوئی۔ اردو لغت میں ہندوستانی انگریزی الفاظ کی طویل فرہنگ بھی شامل ہے اور ڈاکٹر گل کرسٹ اور ڈاکٹر ہریس کے لغات کی فرہنگیں بھی شامل کردی گئی ہیں۔[۵]

لشکری لغت تامس روبک نے اردو لغت کے بعد جہاز رانی کی لغت بھی ترتیب دی تھی۔ اس لغت میں اصول جہاز رانی سے متعلق تمام انگریزی اصلاحات کے لئے ہندوستانی الفاظ دئے گئے ہیں اور اس کے ساتھ لشکری لغت خاص فوجیوں کے لئے مرتب کی تھی جو سنہ ۱۸۱۱ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی تھی۔ فوجی اصلاحات، انگریزی الفاظ کے متبادل ہندوستانی الفاظ لشکری لغت میں دئے گئے ہیں۔ یہ کتاب فوجیوں میں بے مقبول ہوئی اور اس کے تین اڈیشن شائع ہوئے۔ یہ کتاب انگریزی میں ۵۰۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ تیسری بار سنہ ۱۸۸۲ء میں اسمال ایم اے کی تجدید نظر کے بعد کچھ اضافے کے ساتھ یہ شائع ہوئی۔ یہ ان یورپین سپاہیوں کے لئے بے حد مفید اور کارآمد ثابت ہوئی جو ہندوستان میں نووارد ہوتے ہیں اور آج تک اس کی مقبولیت میں کمی نہیں ہوئی ہے۔

تامس روبک نے ان دو تین کتابوں کے علاوہ مولوی حفیظ الدین بردوانی کی مشہور تالیف "خرد افروز" پر جو عیار دانش کا ترجمہ ہے، نظر ثانی کی تھی۔ اور انگریزی میں مبسوط دیباچہ لکھ کر سنہ ۱۸۱۵ء میں اہتمام سے اسے شائع کیا تھا۔ روبک

---

[۵] دیکھئے ارباب نثر اردو ص ۱۱۴

PHOTO

OF

COINS

DURING

REIGN

OF

EAST

INDIA

COMPANY

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد کے سکے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو (جسے ریختہ بھی کہتے ہین) زبان عام ہندوستان
کی ہی۔ جس کو سب قصبات اور شہرون مین اُسے
بولتے ہین، اگرچہ زبان ہندی پارسی عربی ترکی برج بھاشے
وغیرہ سے ملی ہوئی ہی، لیکن ہندوستان زادون کے
محاورون سے طرح طرح کے دخل و تصرف اور رنگ رنگ کے
جوڑ توڑ پا کے ایک نئی زبان بن گئی ہی۔ جس کا مادہ
(یا مفردات) ان سب زبانون کی لغتین ہین۔ اور
صورت زیا ہیئت تالیفی اس کی برج بھاشے کی صورت
ترکیبی سے پر متصل ہی۔ اگرچہ سابقے نے ریختہ دانون
کے ترکیب پارسی بھی بکثرت اس مین مندرج کی ہین۔

عکس قواعد اردو
جان گل کرسٹ

PHOTO OF QAWAID URDU
By
JANGILL CREST

کی زندگی کے آخری ایام کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ غالباً ۱۸۶۵ء میں ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ کیونکہ لشکری لغت پر نظر ثانی کر کے مائیکل اسمتھ نے ۱۸۶۵ء میں اسے پھر شائع کیا تھا۔ اس ایڈیشن میں تامس روبک کا ذکر عقیدت اور احترام سے کیا گیا ہے۔ ان کی موت کے بعد ہی اسمتھ کو لغت پر تجدید نظر کے بعد اسے شائع کرنے کا خیال ہوا ہوگا۔

جوزف ٹیلر

جوزف ٹیلر کو اردو اور فارسی سے گہرا لگاؤ تھا۔ جان بارتھوک گل کرسٹ اور جیمس موئٹ کے بعد ٹیلر فورٹ ولیم کالج کے پروفیسر ہوئے۔ جوزف ٹیلر نے ولیم ہنٹر کے اشتراک اور تعاون سے اردو لسانیات پر مفید اور اچھا کام کیا ہے۔ اور گل کرسٹ کے نقش قدم پر چل کر ہندوستانی زبان کی ایک لغت ترتیب دی۔ ٹیلر کی یہ کتاب ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی۔ مبتدیوں کے لئے یہ لغت مفید اور کارآمد ہے۔ ٹیلر اور ہنٹر کو اس کام میں کالج کے منشیوں نے مدد دی اور اردو قواعد سے متعلق اہم معلومات بہم پہونچائی تھیں ٹیلر اور ہنٹر کو بھی اردو نثر، ہوشربا داستانوں اور تاریخی کتابوں سے خاص دل چسپی تھی۔ ہندوستانی زبان سے والہانہ شیفتگی کی وجہ سے ان دو ہستیوں نے اس عہد کے مشہور شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کی۔ مرزا جان طپش ڈاکٹر ہنٹر کی وساطت سے ہی روبک سے ملے تھے۔ مرزا جان طپش نے اپنی مثنوی میں کالج کی تعریف و توصیف کے ساتھ روبک، ہنٹر اور ٹیلر کے بھی تعریفی گیت گائے ہیں۔

چل اے خامہ کالج کی توصیف کر — ہوئے مجتمع جس میں اہلِ ہنر
فصاحت بلاغت کا ہے جو مقام — جو ہے تربیت گاہ ہر خاص و عام
رہے ڈاکٹر ہنٹر اس میں سدا — ہر اک اہلِ حاجت کا حاجت روا
تنعم، تمکن، ترحم، کرم — عیاں انکے سیما پہ ہے دم بہ دم
ہے وابستہ اس سے ہر اہلِ سخن — کہاں ایسے ہوتے ہیں آگاہ فن
شرف اس نے ہندی زبان کو دیا — دیا نظم اردو کو یہ مرتبا
ترقی سب اس کی اسی سے ہوئی — ہوئی قدر اس سے تصانیف کی[۱]

مرزا جان طپش نے ڈاکٹر ہنٹر کی مدحت سرائی میں یقیناً مبالغہ سے کام لیا ہے۔ پھر بھی یہ کہنے میں پس و پیش نہیں ہو سکتا کہ ولیم ہنٹر کو ہندوستانی زبان، ادب اور معاشرت سے خاص وابستگی تھی۔ اور ہندوستانی اور فارسی کتابوں کی اشاعت کی خاطر انھوں نے ہندوستانی پریس قائم کیا تھا جس میں فورٹ ولیم کالج کی تمام اہم مفید، علمی اور ادبی کتابیں شائع ہوتی تھیں۔ ۱۸۰۸ء میں ڈاکٹر ہنٹر کا تبادلہ ہو گیا اور وہ جاوا چلے گئے۔ چند برسوں کے بعد جاوا میں ہی ولیم ہنٹر کا انتقال ہوا۔

فرانسس گلیڈون

۱۸۰۶ء میں فورٹ ولیم کالج کے سالانہ کنووکیشن اڈریس میں ہلر دبار لو بارنٹ نے کالج کے کاموں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ مسٹر فرانسس گلیڈون نے ہندوستانی لسانیات پر عمدہ کام کیا ہے۔ انھوں نے فارسی اور اردو (ہندوستانی) اور انگریزی

---

[۱] دیکھئے بہار دانش قلمی نسخہ ص ۲۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ۔

میں لغت کی مفید کتاب ترتیب دی ہے جس کی تین جلدیں ہیں۔"

بار لو بارنٹ کے اس بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ گلیڈون نے فارسی اور بنگلہ لغات کے علاوہ اُردو کی بھی لغت مرتب کی تھی۔ گلیڈون کی فارسی اور بنگلہ لغات کے مطبوعہ نسخے ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ مگر ہندستانی لغت کا کہیں پتہ نہیں مل سکا۔ شاید یہ زمانہ برد ہو گیا، گلیڈون نے گل کرسٹ کی گرامر اور لغت کی اشاعت کے بعد اپنی ہندوستانی لغت کی اشاعت مناسب اور مفید نہ سمجھی ہو۔ فرانسس گلیڈون ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم تھے اور فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد کالج سے ان کا براہ راست تعلق ہو گیا تھا۔ کالج کے قیام کے قبل ہی ان کی فارسی انگریزی لغت ۱۷۹۶ء میں مرتب ہو چکی تھی۔ ان کی یہ لغت ۱۷۹۷ء میں شائع ہوئی تھی جس کا قدیم مطبوعہ نسخہ نیشنل لائبریری میں موجود ہے اس لغت کا نام ہے "اسلامی قوانین دفعہ کی ڈکشنری"۔ جس میں بنگال ریونیو کی اصطلاحات وتراکیب، فارسی اور ہندستانی میں دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی اور فارسی کے متبادل الفاظ کی طویل اور مفید فرہنگ بھی شامل ہے

گلیڈون کی یہ کتاب آنس اینڈ فریس پریس (کلکتہ) میں ۱۷۹۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ ہندستانی الفاظ کے متبادل انگریزی الفاظ بھی دئے ہیں جو یورپین سیاحوں اور نوواردوں کے لئے مفید ہیں۔ گلیڈون کی یہ کتاب ۱۰×۸ سائز میں ہے اور ۱۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

گلیڈون کی دوسری کتاب دلچسپ کہانیاں ہے جو فارسی سے بنگلہ[1] اور انگریزی میں

---

[1] بنگلہ ترجمہ گلاد سے نے کیا تھا اور انگریزی ترجمہ خود گلیڈون نے کیا تھا۔

یورپین سوداگروں اور سیاحوں کے لئے شائع کی گئی تھی۔ دلچسپ کہانیاں ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ دیوناگری رسم الخط میں ہندوستانی زبان میں بھی شائع ہوئی تھی۔ مگر اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا۔

سخت جستجو اور تلاش کے باوجود گلیڈون کی زندگی سے متعلق کچھ مواد حاصل نہیں ہو سکا۔ فورٹ ولیم کالج اور سیرام پور مشنری سے متعلق تمام کتابیں گلیڈون کے حالات سے خالی ہیں۔ بس اتنا پتا چلتا ہے کہ وہ چارلس ولکنس کا ساتھی تھا اور ولکنس کا پریس اس کے قبضہ میں آیا تھا۔ گلیڈون انگلینڈ کب لوٹا اور اس کی موت کہاں اور کس سنہ میں ہوئی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

گلیڈون کے علاوہ شکسپیر، پلاٹس، ٹامس مینول نے بھی اردو کہانیوں اور تاریخوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا اور فورٹ ولیم کالج کی داستانیں ان ادبا کی محنت اور خلوص کی وجہ سے انگریزی کا لباس پہن سکی تھیں۔

کالج کے ہندوستانی ادبا و شعرا

جس وقت گل کرسٹ نے لارڈ ولزلی کے مشورے سے فورٹ ولیم کالج کے قیام کی تجویز سوچی تھی۔ اسی وقت اس نے ہندوستانی زبانوں میں تالیف اور ترجمے کا بھی خاکہ تیار کر لیا تھا۔ اتنا بڑا کام وہ تنہا تو نہیں کر سکتا تھا چنانچہ کالج کے قیام کے ساتھ ہی اس نے کلکتے میں مقیم ادبا کا تقرر کیا اور ہندوستان کے مختلف حصوں سے اردو کے مشہور ادبا کو مدعو کیا۔ اس طرح گل کرسٹ کی تگ و دو کی وجہ سے فورٹ ولیم کالج میں جید عالم اور مشہور ادیب و شاعر جمع ہو گئے، جنھوں نے اردو نثر کی مفید، عمدہ اور معیاری کتابیں تالیف اور ترجمہ کیں۔ کالج میں منشیوں کی طویل فہرست ہے اور اس باب میں ان منشیوں کا بھی حال درج ہے جو اب تک گمنامی کی روشنی میں نہیں آئے ہیں۔ سب سے پہلے میر بہادر علی حسینی کالج کے پہلے میر منشی تھے۔ ان کی تالیفات، اردو نثر کے ارتقا کے لئے ان کی مساعی اور ان کے کام کا حال تفصیل سے درج ہے۔

میر بہادر علی حسینی

میر بہادر علی حسینی کالج کے میر منشی تھے۔ مگر اس کے باوجود انھیں وہ شہرت نصیب نہ ہو سکی جو میر امن اور شیر علی افسوس کو ہوئی۔ میر بہادر علی حسینی کی حیات گمنامی میں پڑی ہوئی ہے۔ ان کے زمانے کے تمام منشیوں نے اپنی کسی نہ کسی

تالیف میں اپنا تھوڑا بہت حال لکھا ہے، مگر بہادر علی حسینی نے کالج کے لیے صرف تین چار کتابیں تالیف اور ترجمہ کیں۔ ان کی کسی تالیف کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخے کے دیباچے میں ان کا حال بیان نہیں ہوا ہے اور نہ تو ان کے معاصرین نے ان کے متعلق کچھ لکھا ہے۔ بینی نرائن جہاں نے "دیوان جہاں" کے نام سے اپنے عہد کے شاعروں کا ایک مختصر تذکرہ ترتیب دیا ہے۔ مگر اس میں بھی میر بہادر علی حسینی کا بالکل ذکر نہیں ہے۔

ارباب نثر اردو کے مولف کا خیال ہے کہ میر بہادر علی حسینی دلی کے رہنے والے تھے۔ میر امن دلی والے سے دوستی اسی بنا پر ہوئی تھی۔ اور میر حسینی کی سفارش پر میر امن کو کالج میں ملازمت مل سکی تھی۔ ارباب نثر اردو کے مؤلف نے یہ رائے میر امن کی اس عبارت سے اخذ کی جو امن نے باغ و بہار کے دیباچہ میں اپنی نوکری کا ذکر کرتے ہوئے لکھی ہے۔۔۔۔

"منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے رسائی ہوئی۔ میر امن کے اس بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ میر حسینی سے ان کی گہری دوستی تھی"[۱]

اس عبارت سے یہ مطلب نکالنا کہ میر امن اور حسینی ہم وطن ہونے کے ناتے سے ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے، درست نہیں ہے غالباً مولف ارباب نثر اردو نے میر امن کے اس بیان پر زیادہ توجہ نہیں دی جو وہ اسکے قبل لکھ آئے تھے۔

"عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہوا۔ اشرف البلاد کلکتہ میں آب و دانے کے زور سے آپہونچا۔ چندے بے کاری گذری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلا کر

---

[۱] دیکھئے ارباب نثر اردو۔ سید محمد حسن ص ۱۱۱

اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے
وہاں رہنا پڑا، لیکن نباہ نہ دیکھا تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے[1]..... الخ"
اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ میر بہادر علی حسینی ترمذی میر امن کے گہرے
دوست ہوتے تو دو برس سے کلکتہ میں قیام کے دوران میں انکی ملاقات اکثر ہوتی رہتی
اور میر امن کو کالج میں ملازمت پہلے ہی مل جاتی۔ دو سال تک اتالیقی کے سہارے
گذر بسر کی ضرورت نہ ہوتی۔

میر حسینی کے آباؤ اجداد کا وطن سبزوار تھا اور مغل سلطنت کے وقت ان کا
خاندان بھی ترک وطن کر کے ہندوستان آگیا تھا۔ اور دلی کے گرد و نواح میں
بس گیا تھا۔ اور یہ ممکن ہے کہ تلاش معاش میں ان کے آباؤ اجداد کو بنگال اور بہار کا بھی رخ
کرنا پڑا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر بہادر علی حسینی کی زندگی کا بیشتر حصہ بہار اور کلکتہ میں گذرا
میر صاحب کی سفارش سے بحر عشق کے مترجم سید منصور علی بن سید امام بخش حسینی
سبزواری کالج میں منشی مقرر ہوئے تھے۔ میر حسینی اور سید منصور علی میں قرابت
ضرور تھی کیونکہ منصور علی حسینی نے "بحر عشق" میں میر صاحب کا ذکر بڑے احترام اور
بزرگانہ عقیدت سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"جناب میر صاحب قبلہ و کعبہ مخدومی و معظمی سید میر بہادر علی حسینی ترمذی کہ حق تعالے
اپنے فضل و کرم سے اس جہاں میں بعزت و حرمت نگاہ رکھے۔ ۱۸۰۱ء میں اشرف البلاد
میں وارد ہو کر بصیغہ منشی گری مدرسہ میں کمپنی بہادر کے تفرقی ہندوی میں سرفراز ہوا[2]۔"

منصور علی حسینی نے بھی اپنا تفصیلی حال نہیں لکھا ہے، لیکن بحر عشق کا جو انداز بیان ہے

---

[1] ملاحظہ ہو دیباچہ باغ و بہار مطبوعہ ۱۸۰۴ء پہلا ایڈیشن [2] بحر عشق قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی ص ۲-۳

اس میں بہاری خصوصیت "صاف جھلک رہی ہے حتیٰ کہ منصور علی حسینی نے "دجہ سے" کی جگہ "دجہ کر" جابجا لکھا ہے جو سوائے بہار کے کہیں بھی ادبی زبان میں داخل نہیں ہے۔

میر بہادر علی حسینی کا سنہ وفات بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ ۱۸۰۸ء کے دسمبر میں میر منشی کے عہدے سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ اور میر شیر علی افسوس ان کے جانشین ہوئے تھے۔ مگر ۱۸۱۲ء تک کالج سے ان کا تعلق قائم رہا تھا۔ اور ریٹائر ہونے کے باوجود ۱۸۱۶ء تک کالج میں محض مترجم کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے[1]۔

میر بہادر علی نے کئی کتابیں تالیف کیں۔ سب سے زیادہ شہرت اخلاق ہندی کو نصیب ہوئی مگر ان کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ "تاریخ آشام"[2] ہے جو چھپ نہ سکی لیکن اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں اب تک زمانہ برد ہونے سے بچ رہا ہے۔

تاریخ آسام تاریخ آشام (آسام) میر حسینی کی بڑی مفید اور دلچسپ کتاب ہے، سید صاحب نے ولی احمد شہاب الدین طالش کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہربٹ ہرنگٹن کے ایما پر کیا تھا۔ تاریخ آسام کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں:۔

"خدا کی حمد اور رسول کی نعت کے پیچھے سید بہادر علی حسینی نے آشام کی تاریخ کا جو محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کی سلطنت میں نواب عمدۃ الملک میر محمد سعید اردستانی کے رفیق ولی احمد شہاب الدین طالش نے لکھی تھی، ۱۸۰۵ء مطابق ۱۲۲۰ھ میں خداوند ہربٹ ہرنگٹن اور ہنری کول صاحب بہادر کی فرمائش سے جو بے کسوں کا

---

[1] دیکھئے انالس آف فورٹ ولیم کالج ضمیمہ ص ۵۱ [2] "تاریخ آشام" قلمی نسخہ میں آسام کو ہر جگہ آشام لکھا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں آسام کو آشام لکھتے تھے ورنہ ہر بار آشام استعمال نہ ہوتا۔

ماں باپ ہے۔ مارکوئس ولزلی گورنر جنرل کے عہد اور پادری ڈیوڈ براؤن اور بکانن صاحب کی تولیت میں کہ علم و حلق میں مشہور و معروف ہیں، ہندی زبان میں ترجمہ کیا[1]"

میر صاحب کو ترجمے کے کام کی دشواری اور مشکلات کا پورا پورا احساس تھا۔ انھوں نے اپنی کم مائگی کا اعتراف کیا ہے۔ میر صاحب نے اس تاریخ کا ترجمہ بڑی محنت خلوص اور ایمانداری سے کیا ہے اس وجہ سے یہ انکی اپنی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔

میر حسینی نے لکھا ہے کہ "تاریخ آشام" کے مصنف خواجہ طاآش، خواجہ سعید اردستانی کے ساتھ کوچ بہار اور آسام کی فوجی مہمات میں ہمرکاب تھے۔ فوجی مہم کے دوران میں ان کو جن تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا ان کا حال تفصیل سے درج ہے۔ مصنف کے خیال میں آسام کے لوگ فریبی اور غدار تھے۔ پہلا باب آسام اور کوچ بہار کے ملک پر قبضہ کرنے کی مہم کی روانگی سے متعلق ہے۔ حسینی صاحب نے ترجمہ میں اس کی روح برقرار رکھی ہے۔ اور عنوان بھی اصل کے مطابق قائم کیا ہے۔

"مقالہ بادشاہی جھنڈا روانہ ہونے کے ذکر میں، کوچ بہار اور آسام کا ملک لینے کے لئے۔"

تاریخ آسام میں چار مقالات (باب) دئے گئے ہیں حسینی کی تاریخ شروع ہوتی ہے

"بھیم نراین کوچ بہار کے راجہ نے من چلی اور دلیری کی رو سے گھوڑے کھاٹ پر دوڑ کی، کچھ وہاں کی رعیت اور اپنے آدمی، مسلمان زنڈیوں[2] (عورتوں) اور لڑکیوں

---

[1] ملاحظہ ہو دیباچہ تاریخ آشام قلمی نسخہ ص ۲-۳ [2] دیکھیے مخطوطہ تاریخ آشام ص ۱۴-۱۵

میں سے پکڑے گئے اور اپنے وزیر لبوا ناتھ کو بڑی بھیڑ بھاڑ سے کام روپ دیس کے ارادے سے جسے گواہٹی (گوہاٹی) اور توالع کہتے ہیں، جو بادشاہی ملک میں داخل تھا روانہ کیا۔ اس بات کے سنتے ہی دھج سنگھ اشام کے راجہ کو طمع دامن گیر ہوئی، لالچ کا پردہ دل کی آنکھوں پر چھا گیا۔ آخر کی خرابی کا اپنے من سوچ بچار نہ کیا۔ بہت سے لوگ (غالباً سپاہی) خشکی اور تری (کے راستہ) سے کامروپ بھیجے میر لطف اللہ شیرازی نے جو کامروپ کا فوجدار تھا، دونوں طرف سے آفت کا سیلاب اور بلا کا دوا اپنے پر امڈا دیکھا۔ ابر آلے (ادپرولے) کی جانب نپٹ نراسا ہو، سب چیزوں سے ہاتھ اٹھا ...... تیر کی طرح ترت اپنے تئیں جہانگیر نگر (ڈھاکہ) کے گرد پہونچایا۔"

مہم کی روانگی اور راہ کی دشواریوں اور صعوبتوں کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ اس دیباچہ اور تعارف کے بعد کوچ بہار پر فوج کشی سے متعلق پہلا باب (مقالہ) ہے۔

"پہلا مقالہ نواب برتر لقب کے کوچ کرنے میں بھیم نرائن کوچ بہار کے راجا کی بیخ و بنیاد اکھاڑنے کی اور اس زمین کے فتح ہونے میں خدا کی مدد سے[۵]۔"

اس کتاب کے مطابق کوچ بہار کی تسخیر کی مہم ۱۸ ربیع الاول ۱۰۷۲ھ کو شروع ہوئی۔ نواب سپہ سالار کی فوج طوفان کی طرح اپنے راستے سے تمام رکاوٹوں کو ہٹاتے دشمنوں کی صفیں الٹتی کوچ بہار کے سرحدی شہر گواہٹی میں داخل ہو گئی۔ راجا کو شکست ہو گئی اور بفضلِ ربی سے کوچ بہار فتح ہو گیا۔ دھج درنگ دیس کے راجہ نے شکست کے خوف سے نواب کی اطاعت قبول کرلی، کوچ بہار میں شورش اور بغاوت کو کچلنے

---

[۵] مخطوطہ تاریخ آشام ص ۱۴ - ۱۵

اور گوہاٹی پر اپنا پرچم لہرانے کے بعد نواب نے اپنی فوج کا رخ آسام کی جانب موڑ دیا
تالش نے لکھا ہے کہ ۱۰۷۳ھ کے جمادی الاول کی تیسویں تاریخ آشامی بے ایمانوں سے
رہائی اللہ کا ملک آشام لینے کے لئے گھونٹا گھاٹ سے روانہ ہوئے[۱] ....."

تاریخ آشام کا یہ ترجمہ قلمی نسخہ ۱۳۹ اوراق پر پھیلا ہوا ہے۔ سائز ۷×۱۰ ہے
در خوشخط لکھا ہوا ہے، تاریخ نواب عمدۃ الملک کی وفات پر ختم ہوئی ہے۔

تاریخ آسام دلچسپ واقعات، خونریز جنگ، تباہی اور تاخت و تاراج اور
بدی ناؤ کی داستان سے بھری ہوئی ہے ریاست میں مغل سپاہیوں کی ناگفتہ بہ پریشانیوں
سے پر ہے۔ اس میں اس وقت کے آسام کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کے
شارے بھی ملتے ہیں۔ اس زمانہ میں جنگ میں کام دینے والے ہتھیاروں کا ذکر بھی ملتا ہے۔
در آسام سے متعلق دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں لیکن اس میں میر بہادر علی حسینی
کی کمزوری نمایاں ہے۔ ان کا انداز بیان میر امن یا میر شیر علی افسوس جیسا شگفتہ
نہیں ہے۔ جملوں کی تعقید، مقفیٰ عبارت اور بھونڈے ہندی الفاظ کا بے محل استعمال
کتاب کی دلچسپی پر اثر انداز ہوا ہے۔ عبارت ثقیل اور بوجھل ہو گئی ہے۔ اور
طبیعت الجھنے لگتی ہے۔ ترجمہ میں بس یہی کمزوری کھٹکتی ہے۔ میر حسینی صاحب نے
ترجمہ کے اصول کا خون نہیں کیا ہے اور اپنے فرض کو نباہنے کی پوری کوشش
کی ہے۔ غالباً دوسری کئی عمدہ تاریخوں کی طرح میر حسینی کی یہ مفید تاریخی داستان بھی
چھپ نہ سکی۔ صرف خطی نسخہ کی شکل میں دست برد زمانہ سے بچ رہی ہے۔

نثر بے نظیر | میر بہادر علی حسینی کی دوسری تالیف ہے۔ اصل میں یہ اردو کی

---

[۱] قلمی نسخہ تاریخ آشام ص ۳۲

مشہور ترین مثنوی سحر البیان کا "نثری خلاصہ" ہے۔ اس میں شہزادہ بے نظیر اور شہزادی بدر منیر کے معاشقے کی دلفریب داستان بیان ہوئی ہے۔ پروفیسر جان گل کرسٹ کے ایما پر بہادر علی حسینی نو وارد انگریز افسروں کی خاطر آسان زبان میں یہ کہانی دہرائی ہے۔ میر علی حسینی نے نثر کے ڈھانچہ میں اس مثنوی کو ڈھالنے کی وجہ خود بیان کی ہے :۔ "شاہ عالم کے عہد میں ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۲ء میں بحکم صاحب مسٹر جان گل کرسٹ کے نثر کیا۔ اس کو عام بولی میں جس ڈھب سے سب کوئی آپس میں بولتے ہیں۔ سو مبتدیوں کے حق میں ہندوستانی زبان سیکھنے کے واسطے بہت اچھی ہے کیونکہ اس میں ہندی کے بہت سے لفظ ہیں، اور دوسری خاص محاوروں میں کہ جس وضع سے اشخاص امتیازی باہم گفتگو کرتے ہیں[۱]۔"

میر صاحب کے دیباچہ سے ظاہر ہے کہ مثنوی سحر البیان کا نثری خلاصہ انھوں نے خاص مقصد کے تحت کیا۔ آسان ہندوستانی میں مبتدیوں اور خاص کر نو وارد ولایتی سیاحوں اور سوداگروں کی دشواریوں کو پیش نظر رکھ کر ترتیب دیا گیا۔ میر صاحب نے ہندی الفاظ زیادہ استعمال کئے ہیں اور آسان زبان بھی استعمال کی ہے لیکن ان کا قصہ بے نظیر، مثنوی کے پاسنگ میں بھی نہیں آتا۔ نثر بے نظیر کا رنگ پھیکا، اسلوب بے جان، عبارتیں بوجھل اور جا بجا تعقید سے پر ہیں جو قصہ کو دلچسپ بنانے کے بجائے الجھا دیتی ہیں۔ جو روانی اور شگفتگی میر حسن کی مثنوی میں ہے یہاں بالکل ناپید ہے۔ سحر البیان پڑھتے وقت انسان اُسکے ماحول، مافوق الفطرت عناصر کی کرشمہ سازیوں میں کھو جاتا ہے اور محیر العقول دنیا میں پہونچ جانے کے باوجود بے نظیر

---

[۱] ملاحظہ ہو قلمی نسخۂ بے نظیر ورق ۲

،ور بدر منیر کا قصہ اپنا معلوم ہوتا ہے۔ مگر نثر بے نظیر، ایک حیرت انگیز کہانی کو بھی بوجھل اور بے کیف بنا دیتی ہے۔ قصہ کا آغاز ہی بھونڈا معلوم ہوتا ہے:۔

کہتے ہیں کہ کسی وقت ہندوستان کی سرزمین پر ایک بادشاہ عالم پناہ، رعیت پرور، غریب نواز تھا۔ ملک اس کا بڑا، دولت اس کی بہت، نوکر چاکر ہزاروں، فوج ولشکر بے شمار؛ اپنے ملک و مال وسپاہ کی کثرت، زیادتی، بہتات سے ہمیشہ خوش وقت، ...ل غنی اور فارغ البال رہتا تھا[1] الخ"

پوری کتاب ایسی مبہم، گنجلک عبارت اور نامانوس الفاظ سے بھری پڑی ہے جو ایک دلچسپ، پر لطف اور حیرت انگیز کہانی کو بھی بدمزہ کر دیتے ہیں۔ شہزادہ بے نظیر کے پیدا ہونے کا حال اس طرح لکھا ہے۔

" . . جب پورے نو مہینے گذرے، تب ایسا خوش نصیب ایک لڑکا بادشاہ کے گھر میں پیدا ہوا کہ کیا کہیے کہ جس ہونے سے فی الحال سورج کا منہ تو مارے جلن کے انگارہ ہو گیا اور چاند کا کلیجہ اس کے حسن خداداد کا نور دیکھتے ہی نہایت شرمندگی سے پانی پانی ہو گیا[2] .... الخ"

نثر بے نظیر میں ایسی بے تکی تشبیہات اور استعارات جا بجا ملتے ہیں، عبارت بھی آسان اور سلیس نہیں ہے۔ شاید اسی وجہ سے گل کرسٹ کی فرمائش پر میر شیر علی افسوس نے اس پر تجدید نظر کی تھی۔ اور بہت سے بے ربط جملے، بے معنی عبارتیں، نامانوس اور جنبی الفاظ حذف کر کے اسے دوبارہ مرتب کیا تھا۔

نثر بے نظیر بھی فورٹ ولیم کالج کی دوسری داستانوں کی طرح چند ابیات پر

---

[1] قلمی نسخہ بے نظیر ورق ۴ [2] ایضاً ورق ۹

ختم ہوتی ہے۔ یہ کتاب ۱۰۸ اوراق پر مشتمل ہے۔ قلمی نسخہ پر کالج کی مہر ثبت ہے۔ اس کی اہمیت صرف اسی حد تک ہے کہ یہ اردو نثر کی ان ابتدائی مطبوعات میں سے ہے جن سے اردو نثر کا عالیشان قصر تعمیر ہو سکا ہے۔

اخلاق ہندی تاریخ آسام کے بعد اخلاق ہندی سید بہادر علی حسینی کا دوسرا سب سے مشہور کارنامہ ہے۔ اصل میں اخلاق ہندی کے باعث ہی میر بہادر علی حسینی کا نام زندہ ہے۔ اخلاق ہندی میر بہادر علی کی کوئی اپنی تصنیف نہیں ہے بلکہ مفتی تاج الدین کی فارسی کتاب مفرح القلوب کا ترجمہ ہے۔ مفرح القلوب بھی ہتوپدیش (سنسکرت) کا ترجمہ ہے۔ مفتی تاج الدین کی فارسی کتاب کو اپنے زمانے میں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ اخلاق ہندی کے ترجمے کا سبب بہادر علی حسینی نے خود لکھا ہے۔

"اس کتاب کو ہندی میں ہتوپدیش یعنی نصیحت مفید کہتے ہیں اور اس میں چار باب مندرج ہیں۔ ایک میں ذکر دوستی کا، دوسرے دوستوں کی جدائی کا۔ تیسرے میں لڑائی کی ایسی باتوں کا جو اپنی فتح ہو، اور مخالف کی شکست، چوتھے میں کیفیت ملاپ کی خواہ لڑائی کے آگے ہو یا پیچھے۔ غرض ایسے عجیب و غریب قصوں میں قصے لپٹے ہوئے ہیں جن کے دیکھنے اور سننے سے آدمی دنیا کے کاروبار میں بہت ہوشیار، نہایت چالاک ہو جائے۔ علاوہ اس کے بھلی بری حرکتیں ہر ایک نظر آدیں۔ چنانچہ یہ کتاب سرکار دولت مدار میں ملک الملوک شاہ نصیر الدین کی (جس کی تخت گاہ صوبہ بہار تھا) پہونچی جب انھوں نے سنا، اس میں قصے از بسکہ دلچسپ ہیں اور نصیحت نہایت مرغوب، اور باتیں بہت خوب، اور حکایتیں اکثر مفید، تب اپنے ملازموں میں سے ایک کی

طرف مخاطب ہو کر کہا کہ اسکو ترجمہ سلیس فارسی میں کرو تو میں اپنے مطالعہ میں لاؤں اور اس کے مضمون سے مستفید ہوں۔ تب انھیں میں سے ایک شخص حکم بجا لایا اور نام اس کا 'مفرح القلوب' رکھا۔ بالفعل اس عاصی میر بہادر علی حسینی نے ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء کے فرمانے سے صاحب خداوند نعمت جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے زبان فارسی سے ترجمہ سلیس مروّاجی ریختے میں جسے خاص و عام بولتے ہیں، کیا اور نام اس کا 'اخلاق هندی' رکھا[۱]۔"

ہتوپدیش کی داستان در داستان کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ گنگا کے کنارے مانک پور نام کا ایک شہر آباد تھا۔ وہاں کا راجہ چندرسین تھا جو نہایت سخی، فیاض، عادل اور دانا گنا جاتا تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے جو بے ادب گستاخ اور جاہل تھے اور دربار میں بھی ادب، سلیقہ اور تمیز سے نہیں رہتے۔ ان کی حماقت اور بدتمیزی اور جہالت کا غم باپ کو موم کی طرح پگھلاتا جا رہا تھا۔ ایک دن دربار میں ان چار لڑکوں کی بدعقلی اور بدتمیزی پر ایک برہمن لیش شرما نے ان چار نالائق اور جاہل لڑکوں کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا۔ راجہ سے کہہ کر وہ ان کو ہمراہ گھر لے آیا اور ان کو ہتوپدیش (نصیحت آموز داستانیں) سنائیں جنھیں سن کر راجہ کے نالائق اور جاہل بیٹے نیکی اور تعلیم کی طرف رجوع ہوئے۔ راجہ برہمن لیش شرما کے کام سے بہت خوش ہوا۔ اسے انعام و اکرام عطا کیا۔

'اخلاق ہندی' فورٹ ولیم کالج کی مقبول ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے اس کے کئی ایڈیشن چھپ کر مقبول انام ہوئے۔ کالج کے نصاب میں بھی یہ شامل تھی گل کرسٹ نے انڈین کا سکٹ (بیاض ہندی) میں پہلے اس کی کہانیاں دی ہیں

[۱] دیکھئے اخلاق ہندی مطبوعہ ۱۸۰۳ء (ہوگلی محسن کالج چنسورہ) ص۔ ۲

اخلاق ہندی حسینی کا بڑا کارنامہ ہے۔ حسینی نے سلیس ترجمہ کیا ہے۔ عبارت میں روانی ہے۔ مگر اس کتاب کا بھی انداز بیان شگفتہ نہیں ہے۔ کوئی چاشنی نہیں ہے اور جا بجا پھیکے پن کا احساس ہوتا ہے۔

اخلاق ہندی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ طویل فقروں اور پیچیدہ عبارت کے باوجود یہ داستانیں بے کیف اور بوجھل نہیں ہوتی ہیں۔ عربی ہندی اور فارسی کے الفاظ کے استعمال میں توازن سے کام لیا گیا ہے اور سادہ طرز بیان کی وجہ سے کہانیاں پڑھنے میں اُپ اور اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔

اخلاق ہندی میں نصیحتوں اور نیکیوں کے موتی بکھرے ہوئے ہیں اور ہر شخص ان موتیوں کو چن کر اپنا دامن بھر سکتا ہے اور اپنی زندگی کو فریب، ریاکاری اور گناہ کے سمندر میں غرق ہونے سے بچا سکتا ہے۔ اخلاق ہندی میں انسانی فریب اور عورتوں کی بے وفائیوں اور فریب کاریوں کی عبرتناک تصویریں سامنے آتی ہیں۔ ایک حکایت ہے عورت کے فریب کے متعلق۔

"ایک دن اس نے اپنی عورت سے کہا کہ میں تیرے باپ کے گاؤں جاتا ہوں۔ تین دن میں آؤں گا۔ تو گھر سے چوکس رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں چور آ پڑیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سی سانس بھر کر سر جھکایا اور رو رو کر کہنے لگی کہ تم تین روز کے آنے کا اقرار کرتے ہو، دن مجھے تمہاری جدائی میں تین روز تین برس کے برابر ہیں۔ اس کو روتا دیکھ کر وہ بھی آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور عاجزی سے کہنے لگا کہ مجھ کو تو اپنے پاس ہی جانیو میں جب تک تجھ کو نہ دیکھوں گا دانا پانی خوش نہ آوے گا۔ یوں اسے سمجھا بجھا کر چلا گیا۔ کوس چار ایک پر جا کر یہ خیال کیا کہ اس نے اپنے جی میں کہا کہ کمہارنی کو میں روتا

چھوڑ کر آیا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے تئیں میری جدائی کے خنجر سے جوہر کرے اور دل میں کہنے لگا کہ خدا جانے یہاں سے گھر پہنچنے تک اسے جیتا پاؤں یا نہیں۔ یہ سوچتے ہی الٹے پاؤں پھرا۔ اس کی جورو نے کیا کیا۔ جب وہ گھر سے نکلا، دن دوپہر ایک مسٹنڈے جوان کو کہیں سے لائی اور اپنی کوٹھری میں لے جا کر عیش کرنے لگی پھر ایک رات رہے وہ کمہار پھر آیا کواڑ کے پٹ بھڑے دیکھ کر جانا کہ کوئی غیر مرد اس گھر میں ہے اور اس کی آہٹ بھی پائی۔ آہستہ آہستہ گھر کی ٹٹی کے نیچے ہو کر پلنگ کے تلے گھس گیا۔ کمہارنی نے بھی پاؤں کے کھٹکے سے جانا کہ میرا خاوند چارپائی کے نیچے سے دیکھ رہا ہے۔ عین وصل کی حالت میں اپنے یار سے پکار پکار کر کہنے لگی۔ اے مرد تو نے کہا تھا کہ میں ایماندار ہوں ایسا نہ ہو کہ اب بے ایمان ہو جائے، اور تو جانتا ہے کہ جو میں نے تیرے ساتھ شرط . میں نے تجھ کو کہا تھا کہ مرا خاوند گھر میں نہیں ہے تو دو تین دن مری حویلی کی نگہبانی کرو۔ اور تو نے کہا تھا کہ تو مجھ کو کیا دے گی۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ اپنے باغ سے ایک گلدستہ خوشبودار پھولوں کا بنا کر تجھ کو دونگی۔ . . مگر پھر اس وقت میں نے اس اقرار کا انکار کیا تھا۔ پھر تو نے کہا تھا کہ میں کچھ نہیں چاہتا، بس کسی وقت اپنی پاتی لیٹ رہنے دینا میں نے اس شرط پر قبول کیا تھا کہ میرے خاوند کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگا وے۔ تب مرد بولا۔ اے نیک بخت ایسا دغاباز و بے ایمان نہیں ہوں کہ پرائی چیز پر ہاتھ ڈالوں جس کی بات کا ٹھکانا نہیں اس کے ایمان کا بھی نہیں۔ میں نے اس عمر میں بہت سیر کی، پر تجھ سی عورت ستونتی اور دیانتدار کہیں نہیں دیکھی۔ اس عصمت اور پارسائی کے سبب تیرا خاوند تجھے چاہتا۔!؟[۱]

---

[۱] دیکھیے اخلاق ہندی مطبوعہ ۱۸۰۳ء ص

اخلاق ہندی میں عورتوں کی ریاکاری، فریب، بدکاری اور مکاری کی ایسی متعدد عبرت آموز کہانیاں دلچسپ اور ناصحانہ انداز میں لکھی گئی ہیں۔ ہر قصے کے ساتھ ایک قصہ لپٹا ہوا ہے۔ ہر حکایت میں اخلاق سے متعلق کہاوت اور کوئی نہ کوئی سبق ضرور ملتا ہے۔ اسی بنا پر اس کا نام اخلاق ہندی رکھا گیا ہے

دوستی کیسے لوگوں کے ساتھ کی جائے۔ نباہ کن لوگوں کے ساتھ ممکن ہے ایسی حکایتیں بھی درج ہیں۔ کوا اور ہرن کی حکایت، نصیحت آموز ہی نہیں دلچسپ بھی ہے۔ لالچ میں جان جاتی ہے۔ لالچ کی برائی پر ایک مفید حکایت بیان کی گئی ہے جو قارئین کے ذہن پر لازوال اثر.... چھوڑ جاتی ہے۔

میر منشی بہادر علی حسینی کی یہی تین کتابیں مشہور ہیں۔ اخلاق ہندی اور نثر بے نظیر تو چھپ چکی ہیں مگر تاریخ آشام کو چھپنا نصیب نہیں ہوا۔

تاریخ آشام شائع ہو جاتی تو حسینی کا سب سے بڑا کارنامہ ہمارے سامنے آ جاتا۔ میر بہادر علی حسینی نے ان کتابوں کے علاوہ گل کرسٹ کی کتاب قواعد اردو کی بھی تصحیح کی اور اس کی ترتیب و تالیف میں گل کرسٹ کی بڑی معاونت کی تھی۔

افسوس ہے کہ میر حسینی کی وفات کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

میر شیر علی افسوؔس

میر بہادر علی حسینی کی سبکدوشی کے بعد ۱۸۰۸ء میں میر شیر علی افسوؔس جعفری
رٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبہ کے میر منشی ہوئے۔ کچھ لوگوں کو افسوؔس کے
یر منشی ہونے پر اختلاف ہے مگر ۱۸۰۸ء میں ویزیٹر کی حیثیت سے لارڈ منٹو نے سالانہ
لسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میر شیر علی افسوس شعبہ ہندوستانی کے ہیڈ
نشی نے ہندوستان کی تاریخ اور جغرافیہ پر ایک مفید کتاب تالیف کی ہے جس کی چھپائی
و رہی ہے[1]۔۔۔"

لارڈ منٹو کے اس بیان سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ۱۸۰۸ء کے قبل میر
ادر علی حسینی سبکدوش ہو چکے تھے اور میر شیر علی افسوؔس نے انکی جگہ سنبھال لی تھی۔
سوس کا پورا نام میر شیر علی جعفری تھا۔ وہ سید علی جعفر خاں کے بیٹے اور سید غلام مصطفٰے
پوتے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب جعفر صادقؑ سے ملتا ہے اس مناسبت سے وہ اپنے
م کے ساتھ جعفری لکھتے ہیں۔ انکے آباؤ اجداد خافؔ[2] کے رہنے والے تھے۔ انکے بھائی
د عالم الدین خانی ہندوستان ہجرت کر کے آئے تھے اور نارنول میں سکونت پذیر ہوگئے
تھے۔ انکے دادا سید محمد مصطفٰے محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں (۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء)
نے آل و عیال کے ساتھ دلی آ گئے۔ افسوؔس دلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۷۴۷ء میں
ب شمس الدولہ قتل ہوئے تو اس وقت افسوس کی عمر گیارہ سال تھی۔ اس لئے

دیکھئے: لسٹ فورٹ ولیم کالج ص، ۱۵ ۔ ۲ خاف ایران میں ایک گمنام مقام ہے۔

افسوس کی پیدائش ۱۷۳۶ء میں ہوئی ہوگی[1]۔ افسوس کے سنہ پیدائش پر اختلاف ہے بعض مورخین اور محققین کا خیال ہے کہ افسوس ۱۷۳۵ء میں یا اس کے قبل پیدا ہوئے مگر کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہونے کے باعث ۱۷۳۶ء کو ہی سنہ پیدائش مان لینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ انڈیا آفس لائبریری کے ہندوستانی مخطوطات کی فہرست میں بھی افسوس کا سنہ پیدائش ۱۷۳۶ء درج ہے۔

شیر علی افسوس ۶۴ سال کی عمر میں کلکتہ آئے۔ اس وقت فورٹ ولیم کالج میں اردو منشیوں کی ضرورت تھی ۱۸۰۰ء کے قبل افسوس، دلی کی تاخت و تاراج اور طوائف الملوکی کے باعث اپنے والد سید مظفر علی کے ساتھ دلی سے پٹنہ آچکے تھے عظیم آباد میں نواب میر قاسم علی اور ان کے جانشین جعفر علی خاں کی ان کو سرپرستی حاصل تھی۔ کچھ دنوں تک وہ اودھ کے نواب سے وابستہ رہے، پھر لکھنؤ آئے کبھی عشرت اور کبھی عسرت کے ایام گذارنے کے بعد وہ مرشدآباد چلے گئے جہاں مرزا لطف علی مؤلف گلشنِ ہند سے ملاقات ہوئی۔ مختلف شہروں کا چکر کاٹنے اور کئی درباروں سے وابستگی کے بعد وہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ آئے اور ہندوستانی شعبہ کے روح رواں جان گل کرسٹ کی سفارش پر کالج کے شعبہ ہندوستانی کے نائب میر منشی مقرر کئے گئے۔ اس وقت انکی عمر ڈھل چکی تھی اور اپنا دیوان مرتب کر چکے تھے نساخ نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ

"آخری ایام میں افسوس کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی میر منشی گری میں مقرر ہوئے ..... ترجمان گلستان اور دیوان ان کا نظر سے گذرا ہے ..... [2]"

---

[1] ملاحظہ ہو ارباب نثر اردو ص ۱۳۶ [2] دیکھیے سخن شعراء، عبدالغفور خاں نساخ ص ۳۹

افسوس صرف اچھے نثار ہی نہیں تھے بلکہ کامیاب شاعر بھی تھے۔ عربی اور فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ اردو زبان تو ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ شاعری میں افسوس میر حیدر علی حیراں اور میر سوز کے شاگرد تھے۔ کلکتہ آنے کے قبل غزلیات قصائد اور قطعات کا ذخیرہ ہو چکا تھا۔ کلکتہ میں سب سے پہلے انھوں نے اپنا دیوان مرتب کیا لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اب افسوس کا دیوان نایاب ہے۔

افسوس کی دو تالیفات نے انھیں شہرت دوام بخشی۔ ان کے دو عظیم کارناموں کو اردو ادب کی تاریخ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پروفیسر جان گل کرسٹ کے ایما پر افسوس نے باغ اردو کو تالیف کیا۔ باغ اردو اصل میں شیخ سعدیؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف گلستاں کا سلیس اور با محاورہ ترجمہ ہے جو سات سمندر پار سے آنے والے انگریز افسروں کی ابتدائی تعلیم و تربیت کی غرض سے ترتیب دی گئی تھی۔ افسوس نے باغ اردو کا ترجمہ ۱۸۰۲ء مطابق ۱۲۱۷ھ میں مکمل کر لیا تھا اور گل کرسٹ کی موجودگی میں یہ کتاب شائع بھی ہو چکی تھی۔

شیر علی افسوس کی دوسری مفید اور مشہور کتاب آرائش محفل ہے جو سجان رائے کی مشہور کتاب "خلاصۃ التواریخ" کا خلاصہ ہے۔ افسوس کی یہ کتاب مقبول عام ہوئی اور فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں داخل تھی۔ اور آج بھی ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ ...

آرائش محفل افسوس کی ایک یادگار کتاب ہے۔ عام خیال ہے کہ پنڈت سجان رائے، جو پٹیالہ کے باشندے تھے، کی فارسی کتاب "خلاصۃ التواریخ" کا حرف بحرف ترجمہ ہے لیکن یہ خیال غلط ہے۔ ۱۸۰۲ء میں باغ اردو کی اشاعت کے بعد

افسوس نے آرائش محفل کے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

"۔۔۔ عاصی شیر علی جعفری متخلص بہ افسوس ابن سید علی مظفر خاں یہ کہتا ہے کہ جب باغ اردو کی تحریر سے فراغت پاچکا، صاحب مدرس ہندی مسٹر جان گل کرسٹ بہادر دام اقبالہٗ نے اس کا چھاپہ شروع کردایا۔ چنانچہ پانسو کتاب چھپی اور دور تک پہنچی۔ بعد اس کے فرمایا کہ تو اس فن میں دستگاہ کامل رکھتا ہے۔ تیرے کلام کی طرز سے ہم بہت محظوظ ہوئے۔ اب جتنی کتابیں کہ لوگوں کی تالیف ہیں یا ترجمے تو انھیں اصلاح دے۔۔۔۔۔ مجبور تھا، حکم ان کا رد نہ کرسکا۔ طوعاً کرہاً اس کام میں مشغول ہوا۔ چار کتابیں تو بالکل درست کیں۔۔۔۔۔۔ اور ایک آدھ کے جملے مربوط کردئے۔۔"

ان کتابوں کی ترمیم و تصحیح کے کام کو افسوس نے محنت برباد گناہ لازم کہا ہے ان سے فارغ ہونے کے بعد افسوس نے مرزا رفیع سودا کے کلیات کو ترمیم و اضافے کے ساتھ مرتب کیا اور ہندوستانی پریس سے افسوس کا ترتیب دیا ہوا کلیات شائع ہوا۔ کلیات سودا سے فراغت پا کر مسٹر ہرنگٹن کی تجویز اور فرمائش پر خلاصۃ التواریخ کے ترجمہ کا بیڑا اٹھایا۔ مگر ترجمے میں ترمیم و اضافے اتنے کئے کہ آرائش محفل افسوس کی تالیف معلوم ہوتی ہے۔ آرائش محفل کی تالیف اور ترجمے کا کام افسوس نے ۱۸۰۴ء میں شروع کیا تھا لیکن کتاب ۱۸۰۵ء مطابق ۱۲۲۰ھ میں ختم ہوئی۔ افسوس کے دیباچے سے اس کی تصدیق ہوجاتی ہے۔

"اگرچہ آغاز اس کا گورنر جنرل مارکوس ولزلی بانی مدرسہ کے سال کے آخری عہد حکومت میں ہوا۔ سن ہجری اس وقت ۱۲۱۹ھ اور عیسوی ۱۸۰۴ء لیکن احوالِ

سلاطین ہنود کا . . . گورنر جنرل بارنٹ کی ابتدار یاست میں کہ سن عیسوی ۱۸۰۵ء مطابق ہجری ۱۲۲۰ھ میں تمام ہوا ۔ اب کریم ساز و بے نیاز سے امیدوار ہوں کہ احوال سلاطین مسلمین میں اسی طرح انصرام ہوئے تاکہ اس ہیچ مدان کی ایک یادگاری کتاب خانۂ دہر میں باقی رہے اور طلبا زبان اردو کو فائدہ کامل بخشے ۔ اس کا نام آرائش محفل رکھا ۔"

افسوس کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ آرائش محفل ۱۸۰۵ء میں مکمل ہوئی اور ان کی یہ ایک یادگاری کتاب ہے ۔ افسوس کا دعویٰ بہت حد تک سچ ثابت ہوا ۔ اردو نثر میں ان کی آرائش محفل کو اب بھی ایک نمایاں اور منفرد مقام حاصل ہے اور کتاب ہر طبقہ میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی ۔ افسوس کی آرائش محفل کو قبولِ عام اس لئے نصیب ہوا کہ یہ محض بھونڈا ترجمہ نہیں بلکہ اضافہ ہے ۔ افسوس نے ترمیم و اضافے سے کتاب کی دلچسپی بڑھا دی ہے ۔ افسوس نے خود لکھا ہے کہ انھوں نے خلاصۃ التواریخ کا ہو بہو ترجمہ نہیں کیا ۔ ہاں مضمون اس کا اِس زبان میں لکھا ہے اور کمی زیادتی بھی جہاں موقع دیکھا ہے کی ہے ۔"

آرائش محفل میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں کا تفصیلی حال بیان کیا گیا ہے ۔ سلاطین ہنود اور مسلمین کی جامع اور مبسوط تاریخ بیان ہوئی ہے ۔ اردو نثر کے ابتدائی دور کی کتاب ہونے کے باوجود اس کا طرزِ بیان رواں دواں ، عام فہم اور صاف ہے ۔ تاریخ اور جغرافیائی مضامین کے باعث عبارتیں کہیں کہیں خشک اور ثقیل ہو گئی ہیں ۔ اور کہیں مبالغہ آرائی کی انتہا کر دی گئی ہے ۔

آرائش محفل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ افسوس نے ادب کے دامن کو نہیں

چھوڑا۔ ویسے افسوس کا بھی طرزِ بیان میر امن کے شگفتہ اور جاندار اسلوب سے لگا نہیں کھاتا۔ ان کا طرزِ نگارش بھی میر امن کا سا لوچ دار اور بے ساختہ نہیں ہے میر امن کی زبان ٹکسالی ہے اور محاوروں میں ڈوبی ہوئی۔ افسوس کی زبان صاف اور سلیس ہے۔ اس میں متانت ہے اور عربی فارسی الفاظ اور فقروں کی کثرت کے باوجود عبارت پیچیدہ اور گنجلک نہیں ہوتی۔

افسوس نے لکھنؤ، مرشد آباد اور بنگال کے دوسرے بڑے شہروں کے علاوہ موسمِ بہار کا حال بھی دلچسپ پیرائے میں لکھا ہے۔

چند سطریں موسمِ بہار کی تعریف میں

"فصلِ ربیع میں بھی اس مملکت کے بیچ پھول پھل بہتایت (بہتات) سے انواع واقسام کے پھولتے پھلتے ہیں۔ آم موراتے ہیں بلکہ گلاب بھی باغوں کے بیچ بیشتر اس فصل میں پھولتا ہے۔ جنگلوں میں ٹیسو، سرسوں اس کثرت سے کہ نگاہ کام نہیں کرتی اور آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ رنگت اس کی عاشقوں کے چہرے کی زردی، زیادہ چمکاتی ہے اور ہوا آتشِ عشق کو دونا بھڑکاتی ہے۔

ابیات

جن کو وصلِ گل رخاں ہے انکو بھاتی ہے بہار　　ہم سے مہجوروں کو لیکن کب خوش آتی ہے بہار
دیدِ گل کیا کیجیے بڑھتی ہے دونی بے کلی　　خارِ ہجراں اور بھی دل میں چبھاتی ہے بہار

فی الحقیقت رات دن اس کا خالی کیفیت سے نہیں کیونکہ دھوپ بے حدت اور چاندنی بے کدورت ان دنوں رہتی ہے اور باد بھی عطریت واعتدال سے بہتی ہے چنانچہ اس کے جھوکے کی لپیٹ دماغوں کو لہکاتی ہے۔ رطوبت اجسام کی تازگی بڑھاتی

ہے مزایان ہند اس موسم کو فصل بہار یا موسم بہار کہتے ہیں۔ پر اکثر خاص و عام
گلابی جاڑا[۱]"

موسم بہار اور گلاب کی تعریف کے بعد افسوس نے پھلوں اور میوہ جات کے
ذخیرے خوبصورت پیرائے میں لکھے ہیں۔ پھر ہندوستان کے مختلف جانوروں
جیسے ہاتھی، گھوڑا، بھینسے گائے، بیل اور گھڑیال وغیرہ کے حالات اس طرح لکھے
ہیں کہ پڑھتے وقت طبیعت کو کسی وقت بھی الجھن نہیں ہوتی۔ اہل ہند کمال اور بے پایاں علم
کا حال بھی لکھا ہے۔ ہندوستان کی عورتوں کی وفا، شوہر پرستی، نیکی و بردباری،
سلیقہ شعاری اور خوبصورتی و دل آویزی کی داستان لکھتے وقت افسوس کا قلم
دریا کے بہاؤ کی طرح چلتا ہے۔ عورتوں کے ستی ہونے کے حال میں ستی کی رسم کو
شوہر پرستی سے عبارت کرتے ہیں۔

"عورات اس ملک کی یعنی ہندنیاں جن کو اپنے شوہروں سے ایسے تعشق کی
عادت ہے کہ سوز فراق کی جلن سہہ ہی نہیں سکتیں۔ اور ان سے جدا ایک دم رہ ہی
نہیں سکتیں۔ مرنے بعد ان کے مرنے کے لباس دلہنوں کا پہن، بناؤ سنگار کر، بن ٹھن کر،
اور جا سوند جاتی... اس کی لاش کے ساتھ اگر موجود نہ ہوں، تو اس کا کپڑا ہاتھ میں
لے آگ میں جل جاتی ہیں۔ اور اپنے سونے سے بدن کو راکھ بناتی ہیں، تا دنیا میں نام
ان کا روشن رہے اور عقبیٰ میں بہت سا سکھ ملے[۲]"

ہندوستانی تہذیب، ثقافت، سماجی اور تمدنی زندگی کا سرسری ذکر کرنے کے
بعد افسوس نے ہندوستان کے مختلف صوبوں کا حال بیان کیا ہے۔ صوبہ بنگالہ کے شہر

---

[۱] دیکھیے آرائش محفل مطبوعہ ۱۸۰۸ء ص ۸۵ [۲] ایضاً ص ۳۵

لکھنوتی اور مرشد آباد کا حال اس طرح بیان کیا ہے۔

"ایک بڑا شہر بھاگیرتی کے کنارے اورنگ زیب کے وقت بسا۔ لیکن دریا کے دونوں کناروں پر پہلے اس جگہ مخصوص خاں سوداگر نے ایک سرائے بنا کر مخصوص آباد نام رکھا تھا۔ کتنی دوکانیں اس میں تھیں۔ جب جعفر خاں کو؟ اصالتہ صوبہ داری بنگالے اور اڑیسہ کی محمد عالمگیر نے عنایت کی اور مرشد علی خاں کے خطاب سے سرفراز کیا تب اس نے وہیں شہر آباد کیا اور مرشد آباد نام رکھا بلکہ دارالحکومت اس کو ٹھہرایا۔ چنانچہ اب تلک بھی ۱۲۲۰ھ میں اور ریاست صاحبان کمپنی کی بود و باش ناظم کی اس میں ہے۔ طول اس کا چار کوس سے زیادہ ہے۔ چولی بوٹے دار اور ساڑی یہاں کی مشہور، باغات، عمارات بھی فی الجملہ لیکن نا قابل تحریر۔ الا موتی جھیل اور گوری بنگلے کی، سو وہ بھی خراب و مسمار ہو گئی ہیں۔ زبانوں پر فقط نام رہ گیا ہے۔ ہاں ایک نواب سراج الدولہ خلاصہ عمارات امام باڑا ابتک قائم ہے ...... زبان اس شہر کے لوگوں کی بہ نسبت یہاں کے اور بلاد کے باشندوں کی درست ہے۔ وجہ اس کی ہم صحبت ہونا اکثر اوقات ہندوستانی والا ہے [۵]"

افسوس نے مرشد آباد کے علاوہ بنگال کی پرانی راجدھانی لکھنوتی (گوڑ) ہوگلی اور کلکتے کے بھی جغرافیائی اور تاریخی حالات تحریر کئے ہیں۔ مرشد آباد کے حال سے پتا چلتا ہے کہ ۱۸۰۲ء تک مرشد آباد کی سیاسی اہمیت بالکل ختم نہیں ہوئی تھی۔ گو ایسٹ انڈیا کمپنی کا پایہ تخت کلکتہ منتقل ہو چکا تھا لیکن

---

[۵] دیکھیے آرائش محفل مطبوعہ ۱۹۰۶ء ص ۲۵

کمپنی بہادر کی نظامت وہاں تھی، مرشدآباد کی زبان اردو تھی۔ اور کلکتہ، ہوگلی لکھنوتی اور ڈھاکا کے مقابلے میں زیادہ درست اور صحیح تھی۔ اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ کیونکہ دلی کے لٹنے اور تباہ ہونے کے بعد شاعروں اور ادیبوں کا قافلہ مختلف شہروں سے ہوتا ہوا مرشدآباد میں پناہ گزیں ہوا تھا جو بنگالہ میں اردو کا پہلا اور سب سے بڑا مرکز بنا۔

افسوس کی آرائش محفل بھی خامی اور عیوب سے خالی نہیں ہے۔ تاریخی واقعات کی ترتیب کے وقت ان کی صحت کا بالکل خیال نہیں رکھا گیا۔ افسوس نے سلاطین اور ان کی لڑائیوں کا حال افسانوی رنگ میں لکھا ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ نووارد انگریز افسروں کے لئے کتاب کو آسان اور عام فہم بنانا چاہتے تھے اس کتاب پر ان کو انعام بھی ملا تھا۔ شہاب الدین غوری، پرتھوی راج چوہان اور جے چند کی لڑائیوں اور مخاصمت کا حال اس طرح لکھا ہے۔

"جب پندرہ برس اس کی سلطنت پر گذرے۔ سلطان شہاب الدین غوری غزنین سے کئی مرتبے آیا، اور کئی بار لڑا۔ آخر مقام ترائن میں کہ تھا ورسی کر مشہور ہے راجہ مذکور کو اس نے مار لیا اور آپ تخت پر اجلاس فرمایا۔[۱] الخ"

پرتھوی راج کی شکست کا حال بھی درج ہے اور افسوس نے مصنف سجان رائے کی یہ تاریخی غلطی درست نہیں کی کہ سات بار غوری نے ہندوستان پر

---

[۱] پرتھوی راج چوہان اور غوری کی جنگیں صرف دو بار ہوئی تھیں۔ افسوس نے لکھا ہے کہ غوری نے سات مرتبہ ہندوستان پر فوج کشی کی اور ہزیمت اٹھائی جو درست نہیں ایسی اتفاقی اور تاریخی غلطیوں سے کتاب بھری پڑی ہے۔ دیکھئے ص ۱۸۲ ۔ آرائش محفل مطبوعہ ۱۸۴۳ء

چڑھائی کی اور ہر بار شکست کھا کر لوٹ گیا۔ جہاں تک راجہ جےچند والیٔ قنوج کا ذکر ہے وہ درست ہے مگر آرائش محفل میں جےچند کو بھی زبردست اور طاقتور راجہ بتایا گیا ہے۔ پرتھوی راج سے بھی زیادہ طاقتور مگر رقابتی کشمکش کا حال نہیں ملتا۔ سنجوگتا کے اغوا کا حال بھی غلط درج ہے۔

باغ اردو | افسوس نے آرائش محفل سے پہلے باغ اردو یا ترجمہ گلستان کو مکمل کیا تھا۔ باغ اردو کو اردو ادب میں اس لئے اہمیت ہے کہ اردو نثر کے فروغ اور نشو ونما کی ایک کڑی ہے۔ شیخ سعدی کی گلستان کے کئی ترجمے ہوئے لیکن افسوس کا ترجمہ آسان اور عام فہم ہے۔ باغ اردو کی آسان اور عام فہم زبان میں ہونے کے علاوہ ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ افسوس نے سعدی کے ابیات کا ترجمہ بھی منظوم کیا ہے اور اس میں وہ کامیاب رہے ہیں۔ یہ افسوس کی قادرالکلامی کا ثبوت ہے۔ باغ اردو کی ترتیب مضامین حسب ذیل ہے۔

(۱) احوال رسم خط ــ اس عنوان سے افسوس نے گل کرسٹ کے رسالہ رسم الخط اور اعراب کا خلاصہ لکھا ہے۔

(۲) دیباچہ میں افسوس نے اپنا حال اختصار سے لکھا ہے۔ شیخ سعدی کا بھی حال تحریر کیا ہے اور اپنے سرپرست لارڈ ولزلی اور گل کرسٹ کی مدح سرائی کی ہے۔

شیخ سعدی کے دیباچے کے ترجمے کے بعد گلستان کی فارسی حکایات کے ساتھ اردو تراجم دئے ہیں۔ نمونہ کے طور پر باغ اردو سے گلستاں کی فارسی حکایت اور اردو ترجمہ دیا جاتا ہے۔

حکایت ــ یکی از بزرگان پارسائے گفت کہ چہ گوئی در حق فلاں عابد۔

دیگراں در حق او بہ طعنہ سخنہائے گفتہ اند، گفت بظاہرش عیب نمی بینم و در باطنش عیب نمی دانم۔ پس بروئے طعنہ چگونہ کنم ؎

ہر کسے را کہ پارسا بینی پارسا داں و نیک مرد انگار
ورنہ دانی کہ در نہانش چیست محتسب را درون خانہ چہ کار

(ترجمہ) ایک بزرگ نے کسی پرہیزگار سے پوچھا کہ فلاں عابد کے حق میں آپ کیا کہتے ہیں کہ اکثر اشخاص اس کے حق میں طعنہ آمیز باتیں کہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ بظاہر اس میں کچھ عیب نہیں دیکھتا اور باطن سے آگاہ نہیں پس اس کے منہ پر طعنہ ...... کیسے کہوں ؎

جس کو ظاہر میں متقی دیکھے اس کے تقویٰ کا تو نہ کر انکار
کھوج مت کر کسی کے باطن کی محتسب را درونِ خانہ چہ کار

افسوس کے ترجمہ گلستاں کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ کالج کے نصاب میں بھی یہ کتاب شامل تھی۔ نووارد افسروں کو بھی سعدی کی اخلاقی حکایات مرغوب تھیں اور کالج کے ارباب حل و عقد نے ان کے اس کام کو سراہا تھا۔ افسوس کے بعد عبداللہ نے ۱۸۲۴ء مطابق ۱۲۴۰ھ میں گلستاں کا ترجمہ کیا تھا جو انکے پریس مطبع کلکتہ سے شائع ہوا لیکن عبداللہ کا ترجمہ ادبی اعتبار سے افسوس کے ترجمہ سے کمتر ہے۔ عبداللہ کے ترجمے میں لطافت اور دلکشی نہیں ہے۔ یہ لغوی ترجمہ ہے۔ اور طبیعت پر بوجھ ہوتا ہے۔

دیوان افسوس افسوس جتنے اچھے نثر نگار تھے اس سے زیادہ کامیاب شاعر تھے ایک ضخیم کلیات انھوں نے ۱۸۰۳ء میں مرتب کیا تھا مگر مقام افسوس ہے کہ افسوس کو

ادبی دنیا ایک شاعر کی حیثیت سے کم جانتی ہے۔ باغ اردو اور آرائش محفل نے افسوس کو دائمی شہرت عطا کی مگر شاعر کی حیثیت سے خال خال ہی لوگ انھیں جانتے ہیں۔ ان کی بدقسمتی ہے کہ ان کی حیات کا سب سے بڑا کارنامہ دیوان شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکا۔ افسوس اپنے عہد کے ایک کامیاب اور نغز گو شاعر تھے۔ انیسویں صدی کے تمام تذکرہ نویسوں نے افسوس کا حال لکھا ہے اور ان کے کلام کی تعریف کی ہے تذکرہ سرور میں بھی افسوس کا حال ملتا ہے اور ان کی شاعری پر ہلکا سا تبصرہ بھی ہے۔

دیوان افسوس میں عشقیہ غزلوں کے علاوہ تصوف اور معرفت سے بھرپور غزلیں بھی ملتی ہیں۔ ایسی غزلوں میں تصوف اور عرفان کے امتزاج سے صوفیانہ فلسفہ شاعری کے سانچے میں ڈھل گیا ہے۔ یہی افسوس کا اپنا ایک الگ رنگ ہے، ورنہ اس کی عاشقانہ شاعری قدیم اساتذہ کے ڈھنگ کی ہے۔ میر تقی میر، قائم، میر سوز اور سودا کا انداز ہے۔ وہی فرسودہ پٹے پٹائے خیالات اس کی غزلوں کے بھی موضوع ہیں۔ افسوس نے پہلے میر سوز کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ بعد میں حیران کے شاگرد ہوئے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ افسوس کے ابتدائی کلام میں میر سوز کا رنگ جھلکتا ہے۔

دیوان افسوس میں پہلی اور تیسری غزل عارفانہ ہے۔ اس میں خدا کی عظمت اور توحید کے نغمے الاپے گئے ہیں۔

افسوس نے میر سوز سے اصلاح لینی کیوں چھوڑی! اس بات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا لیکن اس سے اختلاف نہیں کہ سوز سے قطع تعلق کر کے انھوں نے حیران کو اپنا استاد بنایا۔ اس کی تصدیق غفور خاں نساخ کے سخن شعرا، اور بینی نرائن جہاں کے تذکرہ شعراء دیوان جہاں سے ہوتی ہے۔ جہاں لکھتے ہیں۔

"افسوسؔ تخلص، نام شیر علی ہے۔ میر علی مظفر خاں کے بیٹے پہلے تھوڑے دنوں میر سوزؔ سے اصلاح لی۔ بعد اس کے شاگرد ہوئے میر حیدر علی حیرانؔ کے"

دیوان افسوسؔ کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے نسخہ بوسیدہ حالت میں ہے۔ جا بجا کرم خوردہ ہے۔ دیوان کا دیباچہ فارسی میں ہے۔ اس طرح عتر بود ہو لہے کہ پڑھا نہیں جاتا۔

افسوسؔ نے دیباچہ منظوم لکھا ہے اور ایک ضمنی تعارف بھی۔ اس میں تاجدارانِ برطانیہ کی مدح سرائی، ہندوستان کی خوشحالی اور عوام کی آسودگی کا حال بیان کیا ہے دراصل اپنی مشہور کتاب آرائشِ محفل کی ایک حصے کو نظم کر دیا ہے کہ ہندوستان میں سونے چاندی کی افراط ہے۔ دولت کی گنگا بہتی ہے اور لوگ راستوں میں موتی اچھالتے چلتے ہیں۔ کوئی اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا تھا۔ اس تعارف میں خشیلوں کی خوشامد پسند طبیعت بھی نمایاں ہے۔ گل کرسٹ، بارلو، براؤن، بکھان کی تعریف میں آسمان زمین کے قلابے ملائے ہیں۔ بارلو کے قصیدے کا آخری شعر ہے ؎

یا الٰہی صاحب ذیشاں ہستر بارلو ✿ مسند عزت پہ دنیا میں رہیں حکمراں

افسوسؔ نے رسول صلعم، حضرت علیؓ اور شہید کربلا کی شان میں بھی نعت و منقبت لکھے ہیں اور مرثیے بھی لکھے ہیں۔ میدان کربلا کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں بلا کا دلکش ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ افسوسؔ مرثیہ نگاری کی طرف توجہ دیتے اور اپنی ساری قوت فکر و تخیل اس فن پر صرف کرتے تو وہ بھی میر انیسؔ کی طرح ایک کامیاب اور بے مثال مرثیہ نگار ہوتے۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

۱۔ دیکھئے دیوان جواں، قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، ورق ۱۴

جب چلتے چلتے شاہ کا مرکب ٹھہر گیا — ہر چند ایڑ کی پہ وہاں سے نہ ٹک ٹلا
تب پوچھا کون سی ہے یہ جا کوئی بول اٹھا — کہتے ہیں کربلا اسے جب شہ نے یوں کہا

گر نام ایں زمیں بہ یقیں کربلا بود
ایں جا نصیب با ہمہ کرب و بلا بود

افسوس نے کربلا میں یزیدی فوج کے ساتھ حضرت امام حسین کی جنگ اور شہادت کا حال اجمال سے بیان کیا ہے۔ ہر بند میں افسوس کا خون روتا ہوا دل کرب و بلا میں مبتلا نظر آتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کربلا کے سانحات اسکی آنکھوں کے سامنے ہوئے ہوں۔ اس کا دل خون کی شکل میں اس کی آنکھوں سے ٹپک رہا ہو۔ مرثیہ کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں ؎

ہر ایک کی زبانی یہ زینب کرے بین
پھر ہوئی اب تو اٹھ گیا یک لخت دل سے چین
تاراج اپنا سر ہوا مر گیا حسین
ہو کر اسیر شامیوں کے ہم نگر چلے

بس اب زیادہ کیا کروں اس غم کو بیاں
افسوس کرتے تجھ سے کہتا ہوں آسماں
اہل حرم تو روتے پھریں اجڑے خانماں
اور شامی ہو دیں شاد کہ با فتح گھر چلے[1]

نعت، منقبت اور مرثیہ کے بعد دیوان کی جو پہلی غزل ہے وہ عارفانہ ہے اس

---

[1] ق، ن ۹۲ ورق پر

یہ غزل خدائے بزرگ و برتر کی حمد ہے۔ اس میں عرفان اور وحدت کے فلسفے کو نظم کیا گیا ہے۔ افسوس کی نظر میں رام و رحیم میں کوئی فرق نہیں۔ انسان کا دل دنیاوی آلائش سے پاک ہو تو اسے ہر شے میں خدا کا جلوہ نظر آئے گا۔

غزل

خدایا کس طرح ہو وصف مجھ سے تیری صنعت کا
کرشمہ ایک ہی یہ چرخ تیرے دست قدرت کا

کہیں گر حمد تیری جن و انساں، حور اور غلماں
بیاں تو بھی نہ ہووے ایک شمہ تیری رفعت کا

رحیم و رام کو سمجھے گا وہ تو ایک ہی دل میں
کھلا ہووے گا جس پر زاہدا اسرار وحدت کا

نظر آوے تجھے ہی شیخ دیر و کعبہ یکساں ہے
تیری آنکھوں کے آگے گر نہ ہو یہ پردہ غفلت کا

نہیں اعمال پر افسوس کو امید جنت کی
فقط ہے گا بھروسا یا الٰہی تیری رحمت کا

افسوس نے اپنی بعض غزلوں میں عشق حقیقی، اسرار وحدت اور تصوف کو اس خوبصورتی سے شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ اسکی شاعری تصوف و اسرار وحدت کے فلسفہ کا امتزاج ہو گئی ہے۔ اس کی عارفانہ غزلوں میں یہ خصوصیات نمایاں ملتی ہیں غزل

یہ صورت سے ترے جو کہ خبردار ہوا
اس کو ہر شے میں صنم ترا ہی دیدار ہوا

جو مے عشق سے بے ہوش ہوا متوالا
اپنے نزدیک وہی دیر میں ہشیار رہوا

آج آنکھوں کی تری اور ہی کیفیت ہے
شاید افسوس تجھے دوست کا دیدار ہوا

کہاں عاشق و معشوق یہ ہوتا ہے آخر کو
لیلیٰ مثل مجنوں ہو گئی، مجنوں ہوا لیلا

یہ سحر سامری تعالے پری و تیری آنکھوں میں
کہ دیکھ ان کو دیوانہ ہو گیا افسوس دانا

(8)

افسوس کے بعد کے کلام میں جرأت اور دوسرے غزل گو شاعروں کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ افسوس نے بھی غزل گو شاعروں کی روایت برقرار رکھی ہے۔ بڑی بے باکی سے اور کھل کر اظہارِ عشق کیا ہے۔ بعض غزلوں میں میر تقی میر کا سا گداز ہے۔ شوخی اور بے باکی ہے۔ وہ اپنے جذبات و محسوسات کے اظہار میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ اس کی ایک پیاری سی غزل ہے جس میں میرؔ کا رنگ صاف جھلک رہا ہے ؎

سامنے سے جو وہ نگار گیا دل پہ تیرِ نگاہ مار گیا
دیکھو بے تابی دل کی اس در پر ایک دن میں ہزار بار گیا
منزلِ عشق تک نہ پہنچا آہ میں تو چلتے ہی چلتے ہار گیا
تیری مجلس سے جو کوئی اٹھا اپنے گھر تک وہ اشکبار گیا

پاس اس کے سب گئے خورسند
ایک افسوسؔ سوگوار گیا

یہ دین و دل ترا لٹ جائے گا سن اے افسوسؔ
بتوں سے دوستی اتنا نہ کر برائے خدا

گر خوشی سے نہ آتے ہو نہ آؤ صاحب
ہم بھی ملنے کے نہیں پھر کبھی جاؤ صاحب

اہلِ محفل ابھی چلنے لگے گی تلوار
انکھڑیاں دیکھو ہر ایک نہ اڑاؤ صاحب

عاشق افسوس اس صنم کا ہے — جس کو دعویٰ ہے کبریائی کا
جس نے دیکھا سو ہو گیا حیراں — حال افسوس کا عجب ہے اب
فائدہ کچھ نہ ہوا بلکہ جہاں میں افسوس
دل لگا تجھ سے مری جاں ہوا خوار بہت
گلی میں اسکی لے افسوس جا مت — نہیں پھرتا کوئی واں سے سلامت

سب چلے بزم سے اس کی لبِ خنداں لیکر — آہ ایک میں ہی چلا دیدۂ گریاں لیکر
سگِ دشت بھی بیزار ہیں مجھ سے افسوس — اب کدھر جاؤں بجز دلِ ناداں لیکر

اس کے دل سے گیا نہ بغض افسوس — نت پڑھے ہیں میں نے سورۂ اخلاص

دیوان افسوس میں صرف عارفانہ اور عاشقانہ ہی غزلیں نہیں ہیں۔ اگر اُس کی غزلوں میں غمِ جاناں کا ذکر جا بجا ملتا ہے اور شدت سے ملتا ہے تو غمِ روزگار کا بھی رونا ہے۔ بے ثباتی عالم محبوباؤں کی ستم رانیوں اور دنیا والوں کی ابلہ فریبی اور ریاکاری پر بھی اپنی پوری تخلیقی قوت کے سہارے بھرپور طنز کرتا ہے ــ

نہ تو ساقی ہے نہ مے ہے نہ خم ہے افسوس — گردشِ چرخ سے کیا ہو گئی صحبت برہم

۱؎ دیوان افسوس قلمی نسخہ ورق ۶۲

افسوس نہ دل دیجیو زنہار آجکل — دلدار ہو گئے ہیں دل آزار آجکل

حالاتِ شبِ ہجر کی مت پوچھ سحر تک — افسوس کئی مرتبہ مر مر کے جئے ہیں

مت بھول ہے یہ عشقِ گلِ بوستاں عبث — باندھی ہے عندلیب تونے یہاں آشیاں عبث

قطعات

داغ دل پر ہزار رکھتے ہیں — اپنے گھر لالہ زار رکھتے ہیں

آپ باور اگر نہیں کرتے — خوش رہیں اختیار رکھتے ہیں

اس بوسیدہ مخطوطہ میں افسوس کی غزلیات کا حصہ مندرجہ ذیل غزل پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد قطعات و رباعیات اور مخمس ہیں۔ اور پھر فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل و اقتدار کی شان میں "خوشامدانہ قصاید" ہیں۔

غزل ؟

تمنائے ہم آغوش ہے، اس ہر دم خیالی سے — [illegible] جو رکھتے پاؤں تصویر نہالی سے[1]

کسی کی جان جاتی ہے، بمقراض ہے ظالم — کہ بوئے خون آتی ہے تیری مہندی کی لالی سے

شراب ناب میں ملتی نہیں ہرگز یہ کیفیت — جو اس دلکولی ہے اس لبِ میگوں کی لالی سے

کسی کے حال خوش کا دھیان بھی کرتے نہیں ہرگز — ہمیشہ مست رہتے ہیں ہم اپنی خستہ حالی سے

نہیں ممکن جو پیری میں بھی افسوس سے چھوٹے

کہ جسکا عشق کا اس کو پڑا ہے خورد سالی سے

غزلیات کے بعد رباعیاں شروع ہوتی ہیں۔ افسوس کی رباعیات بیس تیس صفحات

---

[1] یہ حصہ دیمک چاٹ گئی ہے پڑھا نہیں گیا۔

پر پھیلی ہوئی ہیں مگر اس کی رباعیاں بے کیف نظر آتی ہیں "کان نمک بود گر ملاحت نہ داشت"
والا معاملہ ہے۔ نمونہ کے طور پر اس کی رباعی نقل کی جا رہی ہے ؎

ایک پل میں گدا کو شاہِ شاہاں کر دے جس مور کو تو چاہے سلیماں کر دے
بیتاب ہوں علی علی ہے دن رات افسوسؔ اب میرے بھی مشکلات آساں کر دے

دیوان افسوسؔ کا بوسیدہ خطی نسخہ ۲۶۸، اوراق پر مشتمل ہے۔ افسوسؔ کا
دیوان شائع ہوا تھا لیکن زمانہ برد ہوگیا۔ سخن شعراء میں نساخ نے افسوسؔ کے حال میں
لکھا ہے کہ "دیوان ان کا نظر سے گذرا ہے" جس سے ثابت ہوتا ہے کہ افسوس کا دیوان
شائع ہو چکا تھا مگر اس کے مطبوعہ کلام کی کوئی کاپی شاید ہی دستیاب ہو سکے۔ افسوسؔ
کے دیوان کے چند خطی نسخے رہ گئے ہیں۔ ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں،
دوسرا انڈیا آفس لائبریری اور تیسرا کتب خانہ آصفیہ میں اور چوتھا مولانا آزاد کالج
کلکتہ کی لائبریری میں۔

ایشیاٹک سوسائٹی کتب خانہ کے خطی نسخہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ افسوسؔ نے
اپنے دیوان کی ترتیب و تدوین لکھنؤ میں نہیں بلکہ فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے دوران میں
کلکتے ہی میں کی۔ چنانچہ کمپنی بہادر کے افسروں، کالج کے پروفیسروں، جان گل کرسٹ،
کرنیل اسکاٹ، سکریٹری بارلو اور پادری براؤن کے قصیدے دیوان کے آخری حصے میں درج ہیں
افسوس ہے کہ افسوسؔ کا دیوان دوبارہ شائع نہیں ہوا۔ افسوسؔ اور
مظہر علی خاں ولاؔ کے دواوین شائع ہو جاتے تو کلاسیکی ادب کے شعری سرمایہ
میں خاصہ اضافہ ہوتا۔

۱؎ دیکھئے ارباب نثر اردو ص ۱۴۱

افسوس نے کالج کی ملازمت صرف آٹھ دس سال کی۔ ۹ ار ستمبر ۱۸۰۹ء میں
ان کا انتقال کلکتہ میں ہوا اور ان کی جگہ منشی تارنی چرن مترا کو میر منشی مقرر کیا گیا۔
میر افسوس کے انتقال کے وقت ان کا پورا خاندان کلکتہ میں مستقل طور پر آباد
ہو چکا تھا۔ افسوس کے بیٹے میر سید علی جعفری نے گلشنِ اخلاق نامی کتاب
ترتیب دی تھی۔ ان کے نواسے مسرور بھی کلکتہ کے مشہور شاعروں میں گذرے ہیں۔

حیدر بخش حیدری

فورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں حیدر بخش حیدری کو وہ شہرت نصیب نہیں ہوئی جو باغ و بہار کے مولف میر امن دلی والے کو نصیب ہوئی۔ حیدری میر امن سے کم پایہ کے ادیب نہیں تھے اور سب سے زیادہ کتابیں تالیف اور ترجمہ کیں۔ پھر بھی میر امن سے ان کو کم شہرت ملی۔ سید حیدر بخش حیدری کی ولادت دلّی میں ہوئی۔ سنہ پیدائش پر اختلاف ہے مگر جس وقت حیدری کلکتہ آئے تھے ان کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی چنانچہ ان کا سن پیدائش ۱۷۶۰ء قرار دیا جاسکتا ہے۔

حیدری کا خاندان نجیب الطرفین تھا۔ ان کے والد سید ابوالحسن کے آباو اجداد نجف اشرف کے رہنے والے تھے۔ تیموریوں کے حملے اور تاخت و تاراج کے دوران میں نجف اشرف سے ہجرت کر کے انھوں نے دلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ دلی میں مالی دشواریوں اور عسرت و مفلسی نے سید صاحب کو اسقدر پریشان حال بنا دیا تھا کہ انھیں دلی کو خیر باد کہنا پڑا اور وہ بنارس جا بسے تھے۔ اس وقت دلی بھی متواتر یورش، داخلی شورش اور غلفشار کی وجہ سے ویران اور تباہ ہو رہی تھی۔ خزاں کی زہریلی ہواؤں نے شعر و ادب کے چمن کو اجاڑ دیا تھا۔ سوکھی ٹہنیاں اور ننگی شاخیں رہ گئی تھیں۔ اقتصادی بدحالی سیاسی انتشار اور طوائف الملوکی نے معزز ہستیوں کو ترک وطن کے لئے مجبور کیا تھا۔ حیدری کے والد بھی تارکان وطن کے کارواں کے ساتھ بنارس آئے اور وہیں آباد ہو گئے۔ دلی کے ادبی ماحول اور شعر و شاعری کی فضا

سے حیدری کا نکلنا ظاہرًا بڑی بدنصیبی تھی مگر یہ ہجرت حیدری کو راس آگئی کیونکہ
اس وقت بنارس میں نواب ابراہیم خاں خلیل ناظم عدالت تھے۔ ابراہیم خلیل
اپنے عہد کے بہترین فارسی شاعر اور ادیب شمار کئے جاتے تھے۔ ان کا فارسی تذکرہ
گلزار ابراہیم اور اردو کے ابتدائی دور کے فارسی اور اردو شعرا کے حال کے لئے ایک
عمدہ اور قابلِ اعتماد ماخذ خیال کیا جاتا ہے۔ بنارس میں نواب ابراہیم خاں اور
سید ابوالحسن کے تعلقات اسقدر دوستانہ ہو گئے تھے کہ سید صاحب نے اپنے
بیٹے کو نواب موصوف کی تربیت اور اتالیقی میں دیدیا، نواب صاحب جیسے لائق اور
عالم شخص کے فیض صحبت اور تربیت نے حیدری کے ذہن استعداد کو صیقل کیا۔ ان
کی تخلیقی قوت کو جلا بخشی، ان کی صلاحیتوں کو بڑھایا۔ ادب عالیہ کے باریک نکات
اور شعر و شاعری کی فنی خوبیوں اور لطافتوں کو سمجھنے اور جاننے کا موقع نصیب ہوا
اور نواب صاحب کی نوازش و عنایت سے انھیں کام بھی ملا۔

حیدری کو قاضی عبدالرشید جیسے فارسی اور عربی کے جید عالم کی ماتحتی میں
کام کرنا پڑا اور قاضی صاحب کی صحبت میں انھوں نے فارسی اور عربی بھی سیکھ لی جو
ان کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی۔

کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے قیام اور گل کرسٹ کی "علمی و ادبی فیاضیوں" کا
چرچا سارے ہندوستان میں ہو رہا تھا۔ حیدری نے بھی یہ چرچا سنا اور بنارس

لہ گلزار ابراہیم ۱۷۹۰ء کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری میں موجود ہے اور
اچھی حالت میں ہے۔ اس کا ترجمہ مرزا لطف نے کالج کیلئے گلشن ہند کے نام سے ترمیم و اضافے کے
ساتھ کیا۔ جسے انجمن ترقی اردو ہند نے شائع بھی کر دیا ہے۔

چھوڑ کر کلکتہ جانے کا قصد کیا اور اپنی قسمت آزمائی کے لئے سفر پر روانہ ہوگئے۔ حیدری اپنے ساتھ مختصر سی داستان "مہر و ماہ" بھی لے گئے تھے۔ اس کو ڈاکٹر گل کرسٹ کی نذر کیا۔ اور ڈاکٹر گل کرسٹ نے اسکی خوبی، مطالب، طرز بیان کی سلاست و صفائی کو بے حد پسند کیا۔

گل کرسٹ کی مہربانی اور سفارش سے حیدری فورٹ ولیم کالج کے منشی مقرر کئے گئے۔ اور خالص علمی زندگی شروع کی اور زندگی کے آخری سانس تک تالیف و تصنیف کا کام کرتے رہے۔ فورٹ ولیم کالج کے دوسرے منشیوں کی طرح تذکرہ نگاروں نے حیدری کا حال نہیں لکھا ہے۔ ان کی تصانیف اور دیگر کتابوں میں ان کا جستہ جستہ حال ملتا ہے۔ بینی نرائن جہاںؔ نے جو حیدری کے دوستوں میں تھے، اپنے تذکرہ "دیوان جہاں" میں بھی حیدری کا مختصر حال لکھا ہے۔

"حیدری تخلص، نام حیدر بخش، دلی کے رہنے والے ہیں، بالفعل مسند حیات میں (یہ) موجود ہیں۔"

جہاںؔ نے حیدری کا حال بطور شاعر لکھا ہے۔ ان کی کئی غزلیں اور ایک مخمس نقل کیا ہے۔ دیوان جہاں کی منتخبہ غزلوں سے جان پڑتا ہے کہ حیدری کو شعر و شاعری کا اچھا مذاق تھا لیکن شاعری ذریعۂ عزت یا معاش نہیں تھی تفنن طبع کے لئے شعر کہا کرتے تھے۔ دیوان جہاںؔ سے حیدری کی غزل یہاں نقل کی جاتی ہے ؎

برابری کا تری گل نے جب خیال کیا ۔۔۔ صبا نے مار طمانچہ منہ اس کا لال کیا[۲]
وہیں ہو چیں بجبیں غصہ سے کہا بک مت ۔۔۔ کبھی جو بوسے کا اس سے میں ٹک سوال کیا

---

[۱] موخذ تبار، باب ہشتم، ص ۲ [۲] آب حیات میں یہ شعر سوداؔ سے منسوب کیا گیا ہے ناسخ نے بھی سخن شعرا میں حیدری کا یہ مطلع نقل کیا ہے۔

نہ آئی کچھ مسیحائی تری کام مرے — بدن سے روح نے آخر کو انتقال کیا
گرا تھا کٹ کے زمیں پر کبھی ترا ناخن — فلک نے اسی کو اٹھا کر وہیں ہلال کیا

ادا کا اس کی نہ دیکھا میں حیدری محبوب
خدا نے اس کو زمانے میں بے مثال کیا

دیوانِ جہاں کا قلمی نسخہ ۳ ستمبر ۱۸۱۲ء کو ترتیب پاسکا تھا جس سے ظاہر ہے کہ حیدری ۱۸۱۲ء تک بقید حیات تھے اور کلکتہ ہی میں تھے۔ دو سال بعد بنارس چلے گئے جہاں ۱۸۲۳ء میں ان کی وفات ہوئی۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے منشی غلام حیدر کے، جو حیدری کے دوست تھے، حوالے سے حیدری کا سنہ وفات ۱۸۲۳ء لکھا ہے جو صحیح معلوم ہوتا ہے۔

حیدری فورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں مظہر علی خاں ولا کی طرح بہت سی کتابوں کے مؤلف اور مترجم ہیں۔ حیدری نے کالج کے لئے کم سے کم دس کتابیں تالیف کی ہیں جن میں آرائشِ محفل یا قصہ حاتم طائی بہت مشہور ہے لیکن ان کی عمدہ، مفید اور پر از معلومات کتابیں تاریخِ نادری اور ہفت پیکر شائع نہ ہوسکیں۔ گلشنِ ہند کا بھی قلمی نسخہ یورپ کے ایک کتب خانہ کے سوا کہیں دستیاب نہیں ہے۔

ہفت پیکر کے منظوم دیباچے میں حیدری نے اپنا حال اختصار سے بیان کرتے ہوئے اپنی کتابوں کی فہرست بھی لکھی ہے۔ اس منظوم دیباچے کے مطابق حیدری نے اس کے قبل توتا کہانی، قصہ حاتم طائی، گلدستہ حیدری، روضۃ الشہدا (گل مغفرت) گلزار دانش اور تاریخ نادری لکھی۔ مگر اس فہرست میں گلشنِ ہند اور قصہ مہر و ماہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ حیدری نے ہفت پیکر کی تالیف کے بعد "گلشن ہند"

ترتیب دی ہو۔ توتا کہانی اور حاتم طائی (آرائش محفل) کو جو قبول عام نصیب ہوا اس کی دوسری زیادہ مفید اور معلومات افزا کتابوں کو نصیب نہ ہو سکا اور یہ کتابیں صرف مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہیں۔

تاریخ نادری حیدری کی سب سے مفید اور معلومات افزا کتاب 'تاریخ نادری' ہے جو اصل میں تاریخ جہاں گشائے نادری کا ترجمہ ہے۔ تاریخ نادری کا ایک عمدہ قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری میں موجود ہے۔ یہ حیدر بخش حیدری کا بڑا کارنامہ ہے۔ یہ نادر شاہ کے عہد حکومت کی قابل وثوق تاریخ ہے جسے نادر شاہ کے وقائع نویس منشی محمد مہدی[1] نے فارسی میں لکھا۔ اس کا ترجمہ حیدری نے کیا۔ جس کا قلمی نسخہ ۷۸۰ اوراق پر پھیلا ہوا ہے۔ حیدری نے تاریخ جہاں گشائے نادری کا ترجمہ ۱۸۰۹ء میں مکمل کیا تھا۔ اس کے ترجمہ کا حال انھوں نے تاریخ نادری کے دیباچہ میں خود لکھا ہے :۔

"بس معلوم کیا چاہئے کہ منشی محمد مہدی جو نادر شاہ بادشاہ کے حضور پر نور سے خدمت وقائع نویس رکھتا تھا اور تاریخ نادری کو اس نے زبان فارسی میں بعض لغت ترکی سے تیار کیا تھا اب اس کتاب کو سید حیدر بخش حیدری نے عہد حکومت میں عالی شان والا مناقب ..... لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ عالیشان .... دست گیر درماندگان اور بے کساں جناب ولیم ٹیلر دام اقبالہٗ کے

---

[1] منشی محمد مہدی نادر شاہ درانی کا وقائع نویس تھا۔ اور اس کی فوجی مہمات کے دوران میں اس کے ساتھ رہا۔ مہدی نے اپنی تاریخ نادری میں نادر شاہ کے عروج و زوال کی پوری داستان بڑی ایمانداری سے بیان کی ہے۔ تاریخ جہاں گشائے نادری کا قلمی نسخہ اور کئی مطبوعہ نسخے نظر سے گذرے۔

سنہ ۱۲۲۴ھ مطابق سنہ ۱۸۰۹ء زبان ہندی میں ترجمہ کیا اور نام اسکا وہی رکھنا چاہتا ہے۔[۱]،،

دیباچے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ولیم ٹیلر کے علاوہ ڈاکٹر ولیم ہنٹر (W. HUNTER) نے بھی حیدری کو اس مفید تاریخ کا ترجمہ کرنے کی ترغیب دی تھی۔ حیدری نے دیباچے میں ٹیلر کے ساتھ ولیم ہنٹر کا بھی قصیدہ لکھا ہے اور اس کا اعتراف کیا ہے کہ انکی ہمت افزائی اور مشورے کے بعد انھوں نے اس بڑی کتاب کے ترجمہ کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا اور ان کے مشورے پر اس کا مختصر مگر جامع نام "تاریخ نادری" تجویز کیا تھا۔

تاریخ نادری' نادر شاہ درانی کے عہد کی دلچسپ اور معلومات افزا کتاب ہے اس میں نادر شاہ کے عہد کے انقلاب پذیر حالات بے کم و کاست لکھے گئے ہیں۔ نادر شاہ درانی ایک جابر اور ظالم حکمراں تھا۔ "خونریزی اور تاخت و تاراجی" اس کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ تخت نشینی سے اس کے زوال تک کی دلچسپ کے ساتھ تہلکہ خیز وارداتیں بھی مصنف نے بڑی ایمانداری سے بیان کی ہیں۔ نادر شاہ کے عہد میں ایران میں طوائف الملوکی سی پھیلی ہوئی تھی۔ ایران کا گوشہ گوشہ سازش اور ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس کتاب میں بدحال ایران کی سیاسی قلابازی، انتشار، لوٹ کھسوٹ، بغاوت اور اقتدار کے لئے چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے مابین آئے دن کی خونریز اور تباہ کن جنگ کی مکمل تصویر نمایاں ملتی ہے اصل میں یہ تاریخی دستاویز کہی جا سکتی ہے۔

اس میں تشکک کی گنجائش نہیں کہ اس کتاب کا مصنف منشی محمد مہدی مشہد آبادی نادر شاہ کا ایک نمکخوار تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے نادر شاہ کی

---

[۱] ملاحظہ ہو تاریخ نادری ق، ن، ورق ۴

بعض برائیوں اور "وحشی خصوصیات" پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہو اور اسکے خلاف اس کی شجاعت، سخاوت اور درایت کا حال بیان کرنے میں رنگ آمیزی سے کام لیا ہو۔ لیکن نادر شاہ کے آخری ایام میں اسکے جنون، انسانیت سوز مظالم اور وحشیانہ اقدام کی جو داستان اس کتاب میں ملتی ہے" اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وقائع نویس نے اپنی نمک خواری اور ملازمت کے باوجود تلخ حقائق کے لکھنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ غالباً تاریخ التواریخ کے بعد فارسی زبان میں (نادر شاہی عہد تک) تاریخ جہاں کشائے نادری ایک عمدہ اور مفید تاریخ سمجھی جاتی ہے اور نادر شاہ کے زمانہ کا مورخین کے لئے "یہ قابل اعتماد ماخذ خیال کی جاتی ہے۔

اس کتاب میں ایران کی تباہی، معاشی بدحالی اور قتل و غارت گری کی واضح تصویر اتاری گئی ہے۔ اتنا عمدہ نقشہ دوسری کتابوں میں نہیں ملتا۔

"مخالفوں کے ظلم و ستم کی آتش سوزاں نے ہر ایک طرف کے تر و خشک کے خرمن کی ہستی کو شعلۂ جانستاں سے جلا کر خاک سیاہ کر دیا تھا۔ دہر میں ہر ایک جاگہ ہر ایک بادشاہ کہلایا، چنانچہ ہر ایک چھوٹے بڑے فتنہ و فساد وقوع میں آیا (آئے) قندھار سے لے کر اصفہان تک طائفہ غلجہ کا عمل ہوا۔ ہرات میں ابدالی کا داتات لکزو کے تصرف میں آیا، فارس کا بادشاہ صفی مرزا نام مجہول الحال و مجہول النسب ٹھہرا۔ کرمان میں سید احمد میرزا داؤد نے بلوچستان اور اطراف بنادر تک لے لیا، جانکی عباس کے ہاتھ لگا۔ گیلان اسمٰعیل نے پایا، خراسان ملک محمود سیستانی کو ملا۔ غرض ہر ایک صاحب داعیہ و استعداد پیدا ہو گیا......"

؎ تاریخ نادری قلمی نسخہ ورق ۵

ایک عظیم ملک میں انتشار، لوٹ کھسوٹ اور سیاسی قلابازی کی اس سے عمدہ تصویر اور کیا ہو سکتی ہے۔ مصنف کا اندازِ بیان بڑا جاندار ہے۔ اور مترجم نے بھی ترجمے میں اصل کتاب کا زور برقرار رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔

تاریخ نادری میں ترکی الفاظ کی فرہنگ بھی بطورِ ضمیمہ شامل کر دی گئی ہے جو بے حد مفید اور کارآمد ہے۔ افسوس ہے کہ حیدر بخش دہلوی کی یہ مفید کتاب شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکی اور اردو داں طبقہ اب تک ایک عمدہ اور دلچسپ تاریخ کے مطالعہ سے محروم ہے۔

تاریخ نادری میں جنگی مہمات، فتوحات اور شکست و پسپائی کے حالات ہی صرف من و عن نقل نہیں کئے گئے ہیں بلکہ اس عہد کے ایران کی سماجی اور ثقافتی زندگی کے خاکے بھی جا بجا ملتے ہیں، اس میں نادر شاہ کے کیریکٹر اور عادات کی بھی قلمی تصویر ملتی ہے۔ نادر شاہ صرف جابر اور ظالم بادشاہ ہی نہیں تھا بلکہ شکی المزاج بھی تھا۔ اس کے ہاتھوں تہذیب و ثقافت کا خون ہوا تھا۔ اس کا حال بھی بڑے عمدہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

جبکہ داغستان میں لشکر ہمایون اُترا اور نشان شاہنشاہی پھرانے لگا، حضرت ظل الٰہی نے وہاں مقام کیا لیکن بعضے بعضے وسوسوں اور گمان باطلوں کے باعث گھبرانے لگے، یہاں تک اندیشہ ناک ہوئے کہ اپنے قرۃ العین یعنی جہانداری و جہاں بانی رضا قلی مرزا کو کہ اس جناب فیض مآب کا بڑا بیٹا تھا اور ولی عہد و خلف رشید کہلاتا تھا اپنی نظر کیمیا اثر سے گرا دیا، بے ہے اس نور دیدہ سرد ریسینہ کے صدقہ چشم سے آنکھیں نکلوا کر اندھا کر ڈالا[1]..... الخ"

---

[1] دیکھئے قلمی نسخہ تاریخ نادری صفحہ ۲۵۲

محض معمولی شبہ کی بنا پر اپنے عزیز فرزند اور ولی عہد سلطنت کی آنکھیں نکلوا دینا انتہائی مہیب، انسانیت سوز اور بہیمانہ فعل ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے تصور سے ہی تہذیب و تمدن کی آنکھیں شرم سے جھک جاتی ہیں، اور لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اقتدار اور سلطنت کی ہوس انسان کو خونخوار درندہ بنا دیتی ہے جسے اپنے بیگانے کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ تاریخ نادری کے مصنف محمد مہدی کو بھی اپنے آقا کے اس انسانیت سوز عمل پر صدمہ ہوا تھا لیکن اس کے اثر کو کم کرنے کی خاطر اس نے اس خونیں داستان کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ نادر شاہ نے یہ حرکت پاگل پن اور جنون میں کی تھی۔ اس واقعہ کے بعد وہ بالکل خالی الذہن ہو گیا تھا۔ پاگلوں اور اس کے درمیان کوئی فرق نہیں رہا تھا اور یہی جنون اس کے قتل اور اس کی عظیم سلطنت کے زوال کا باعث ہوا۔

نادر شاہ کو اپنی بربریت اور درندگی پر اس قدر پشیمانی اور ندامت ہوئی تھی کہ بقول مصنف تاریخ نادری

"اس غم و الم کے باعث حضرت ظل الٰہی کی آنکھوں میں بھی روزِ روشن شبِ دیجور کی مانند تیرہ و تار ہو گیا اور سودائے جنون نے دماغ جان میں گھر کیا۔۔۔[۱] الخ

تاریخ نادری کے خاتمہ میں [۲] آدمی کے زوال اور قتل کی عبرتناک کہانی نادر بیان کی گئی ہے:۔

"اس جنون میں نادر شاہ نے اپنی رعایا اور امراء پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے کہ

---

[۱] تاریخ نادری ق ن، ورق ۴۵۳

ان کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بدن میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے، کسی کو زندہ جلا دیا، کسی کے گوشت سے ناخن الگ کر دئے، آخر ان مظالم سے تنگ آکر لشکریوں نے بغاوت کی اور نادر شاہ کا سر کاٹ کر بچوں کو کھیلنے کے لئے دے دیا۔"[1]

نادر شاہ کے قتل کے بعد درّانی سردار اور سپاہی احمد شاہ ابدالی کو اپنا بادشاہ منتخب کرتے ہیں اور اس پر ہی تاریخ ختم ہو جاتی ہے۔

حیدری نے صاف اور آسان ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ترجمے کی دقت کے پیش نظر کہیں کہیں عبارت کا صرف مطلب یا خلاصہ لکھ دیا ہے اور فارسی استعارات، تراکیب اور تشبیہات بھی جوں کی توں رہنے دی ہیں۔ فارسی تراکیب اور قدیم طرز نگارش کی وجہ سے تعقید لفظی پیدا ہو گئی ہے جس نے سلاست کا جا بجا خون بھی کیا ہے اور بعض بعض ابواب کی عبارتیں اتنی پیچیدہ اور گنجلک ہو کر رہ گئی ہیں کہ مطلب آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ ان چند خامیوں کے باوجود حیدری کی اس غیر مطبوعہ تاریخ کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر افسوس کا مقام ہے کہ بہادر علی حسینی میر منشی فورٹ ولیم کالج کی "تاریخ آسام" کی طرح یہ کتاب بھی چھپ کر منظر عام پر نہیں آسکی اور اردو ادب خصوصاً تاریخ کا دامن ایک عمدہ، مفید اور دلچسپ تاریخ سے خالی رہ گیا۔

تاریخ نادری کا غیر مطبوعہ نسخہ صاف لکھا ہوا ہے۔ یہ ۵×۷ سائز پر ۵۶ ۳ اوراق پر پھیلا ہوا ہے۔ ضخیم و حجیم ہونے کے باوجود اتنا دلچسپ اور معلومات افزا

---

[1] تاریخ نادری۔ ق۔ ن، ورق ۵۵ ۳

کہ پڑھتے وقت طبیعت کو کہیں بھی الجھن یا گرانی محسوس نہیں ہوتی۔ فورٹ ولیم کی دوسری کتابوں کی طرح تاریخ نادری کے آخر میں تین تاریخی قطعات درج ہیں ایک کھیم نرائن صاحب کا ہے جو حیدری کے عقیدت مندوں میں تھے اور تاریخ نادری کے ترجمہ کو اتنا پسند کیا تھا کہ مترجم کی تعریف میں قطعہ بھی کہہ ڈالا تھا۔ حیدری نے تبرکاً کھیم نرائن کے اس قطعہ کو سب آخر میں درج کیا ہے ؎

ق

تاریخ نادری کو کیا جس نے ترجمہ ہندی زباں میں اسکو ہے مشق سخنوری
رنگ گل سعادت و بوئے گل شرف حیدر کے حب سے ہے ملقب بہ حیدری

اس قطعہ پر ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کا یہ خطی نسخہ ختم ہوتا ہے اور اس کی پشت پر فورٹ ولیم کالج کی مہر، اردو، ہندی اور انگریزی میں ثبت ہے۔ حیدری کی یہ تاریخ شائع ہو جاتی تو اردو کے تاریخی ادب میں بیش بہا اضافہ ہوتا۔

ہفت پیکر

ہفت پیکر حیدری کا دوسرا کارنامہ ہے۔ یہ ۱۸۰۵ء میں مکمل ہوئی تھی۔ ہفت پیکر بھی شائع نہیں ہو سکی۔ حیدری نے کالج کے عہدیداروں کی فرمائش پر نظامی گنجوی کی مشہور فارسی مثنوی ہفت پیکر کا منظوم ترجمہ کیا تھا جس سے حیدری کے ایک کامیاب شاعر ہونے کا پتا چلتا ہے ہو سکتا ہے کہ ولا اور افسوس کی

طرح حیدری نے بھی اپنا دیوان مرتب کیا ہو۔ مگر دیوان جہاں، نسخہ دلکشا اور سخن شعرا میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ دیوان جہاں میں ان کی دو تین غزلیات کے سوا اور کہیں ان کے کلام کا پتہ نہیں ملتا ہے۔ ہفت پیکر کے دیباچے میں حیدری نے اس کا سبب تالیف لکھا ہے اور اپنے عہد کی روش کے مطابق انھوں نے بھی کالج کونسل گورنر جنرل اور دیگر متعلقین کالج کی مبالغہ آمیز تعریف کی ہے جس سے ان کی خوشامدانہ طبیعت نمایاں ہوتی ہے۔ حیدری اس پر مجبور تھے۔ کالج کے منشیوں نے اپنے آقاؤں کی مبالغہ آمیز مدح سرائی کو اپنا ایک فن بنا لیا تھا۔ حیدری بھی اس فطری کمزوری سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

ہفت پیکر کے منظوم ترجمہ کا سبب حیدری نے یہ بیان کیا ہے

ہفت پیکر جو نظامی نے کہی ۔۔۔ ہے بہت دلچسپ خوبا سے بھری
لیکن تو اس کو یہ ہندی نظم کر ۔۔۔ کیونکہ ہے قند مکرر خوب تر
ہفت پیکر تھا نظامی گنجوی کا کلام ۔۔۔ میں نے ہندی کر دیا اس کو تمام
جب یہ نسخہ میں نے ہندی میں لکھا ۔۔۔ ہفت پیکر نام بھی اس کا رکھا
فارسی کو کر دیا ہندی تمام ۔۔۔ تا رہے ہندوستان میں میرا نام

ہفت پیکر کا ترجمہ کرتے وقت حیدری کے دل میں یہ امید ضرور جاگی تھی کہ نظامی کی یہ بے مثال فارسی مثنوی جب اردو کے قالب میں ڈھل جائے گی تو اسے بھی اتنی شہرت نصیب ہوگی جتنی فارسی کلام کو ہوئی تھی لیکن یہ امید حقیقت کا روپ دھار نہ سکی۔ کیونکہ اردو ہفت پیکر میں وہ زور نہیں ہے جو فارسی میں ہے۔ آورد زیادہ اور آمد کم ہے۔ بھرتی کے اشعار کثرت سے ہیں اور غالباً اسی وجہ سے دلکش

داستانیں بھی الجھ کر رہ گئی ہیں اور اس کی لطافت، سلاست اور شگفتگی جاتی رہی ہے۔

ہفت پیکر میں دراصل سات افسانے ہیں۔ ایک افسانہ دوسرے سے لپٹا ہوا ہے۔ ساتوں کہانیاں دلچسپ اور پرلطف ہیں۔ ان کہانیوں میں محیر العقول مافوق الفطرت کردار ہیں اور طلسمی دنیا اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔ پہلی کہانی چین کے ایک شہر اور وہاں کے سیاہ پوش شہریوں کی ہے جو بہرام گور کو اس کی ہندوستانی دلہن شب عروس کو سناتی ہے۔ ایک دل باختہ شاہ سیاہ پوش کے دیش میں پہونچتا ہے اسے وہ گوہر مقصود نظر آتا ہے جس کی برسوں سے اس کی تلاش تھی مگر اپنی بے صبری اور بے چینی کی وجہ سے اپنا گوہر مقصود کھو دیتا ہے۔ ہفت پیکر کا یہ قلمی نسخہ حمد خدا سے شروع ہوتا ہے ؎

حمد اس کی جس نے پہلی پیدا کئے	ہفت پیکر ہفت گنبد کے لئے
اولیں گنبد میں ہے مہر جلوہ گر	ہے دوم گنبد عطارد کا مقر
تیسرے گنبد میں زہرہ جائے گیر	گنبد چارم میں خورشید منیر
پانچویں گنبد میں ہے ترک فلک	اور چھٹے میں مشتری بے شبہ شک
ساتواں گنبد جو ہے سب سے بلند	ہے زحل کا وہ مکاں بے چون و چند
ہفت پیکر کے تماشہ کے لئے	ہفت جنت آشکارا کر دئے[1]

حمد کے بعد حیدری نے حضرت محمد صلعم کی شان میں نعت اور حضرت علی کی مدح لکھی ہے۔ طویل نعت اور حمد کے بعد ہفت پیکر کی پہلی داستان بہرام گور کے پہلو میں

---

[1] خطی نسخہ ہفت پیکر صفحہ ۱-۲

ہیں ہندی شہزادی سیاہ پوش کی منظوم داستان سناتی ہے ؎

آخری اپنی سلطنت بیچ دیا — اور ولی عہد اک یگانے کو کیا

پوچھتا پھرتا تھا اس بستی کا نام — تا ملے مجھ کو شتابی وہ مقام

آخرش اس شہر میں داخل ہوا — اس کو پایا تھا جسے ڈھونڈتا

شہر دیکھا ایک جنت سے سوا — ڈھیر دیکھا ہر گلی میں خشک کا

مہر و مہ کی شکل تھے چھوٹے بڑے — تھے سیہ کپڑوں سے تن ڈھانکے ہوئے

جوں بدیسی جاکے ایک گھر میں رہا — ملک کا غم تھا، نہ خطرا مال کا

سال بھر اس شہر کے لوگوں کا حال — پوچھتا پھرتا بے حال اور بدحال

ہر گلی کوچے میں پھرتا تھا وہاں — بارے ایک قصاب دیکھا ناگہاں

خوبصورت خوش مزاج و نیک ذات — سچ سوا کرتا نہ ہرگز جھوٹ بات

نیک بختی اور اس کی راستی — دیکھ الفت میں نے جان و دل سے کی

ساتھ جب رہنے لگے آٹھوں پہر — اس کی خدمت کے لئے باندھی کمر

دن بہ دن اس کا کیا رتبا بڑا — زر سے آخر موم آہن کو کیا

زر کیا میں نے اسے یہاں تک عطا — بارے جس کے جھکا سر گنج کا

گھر جسے اک دن وہ اپنے لے گیا — اور بہت کچھ لا کے آگے دیدیا

اسقدر دینے کا ہے پھر کیا سبب — بس بتا دے جلد اے والا نسب

ایک جان کیا چیز گر ہوتیں ہزار — وارتا اس بات پر میں بار بار

پر ترازو میں سخاوت کی تری — ہو نہیں سکتی ہے یہ پاسنگ بھی

جب مجھے اس بات سے ڈھارس ہوئی — اور ہوئی معلوم اسکی دوستی

حالِ دل سب اسکے آگے کہدیا — اپنے ملک و سلطنت کا ماجرا
یعنی اس خاطر ادھر آنا ہوا — ہات اپنا تاج شاہی سے اٹھا
تا یہ مجھ پر حال ہوجاوے عیاں — ہیں یہاں کے جسقدر باشندگاں
ماتمی پہنے ہیں کپڑے کس لئے — خرمی سے کیوں کنارہ کش ہوئے
دیکھ کر تنہا مجھے وہ نیک خو — اس طرح کرنے لگا پھر گفتگو
ہے غنیمت یہ گھڑی حق میں ترے — چاہے تو دے نہ اسکو ہات سے
لے چلا مجھ کو مثلِ دیوا اٹھا — ایک ویرانے کی جانب رخ کیا
ٹوکرا اٹھا ایک رسی سے بندھا — جلد جا کر وہ اسے لایا اٹھا
پھر لگا کہنے کہ اے شاہ جہاں — ایک ذرا تو بیٹھ اس کے درمیاں
تا یہ ظاہر تجھ پہ ہو راز عیاں — کس لئے رہتے ہیں چپ خرد و کلاں
حادثہ کیا ان پہ ہے ایسا پڑا — کس لئے کالا بدن سب نے کیا
نیک و بد جو کچھ ہے اس میں چھپا — تجھ پہ کر دے گا عیاں یہ ٹوکرا
میں گیا اس ٹوکرے میں جس سما — ٹوکرا سیمرغ ہو کر لے اڑا
ہو گیا بت خانہ وہ گلشن تمام — ہر روش پر تھا بتوں کا اژدہام
دور سے تھا میں تماشا دیکھتا — ہر روش پر تھیں ہزاروں دلربا
لعل مثل لالہ تھے ہر اک کا لب — خون دل عاشق کا پی ہنستی تھیں سب
جس گھڑی دیکھی یہ بزم دلفریب — اڑ گئے یکبار صبر و شکیب
ایک گھڑی تھی یا کچھ اس سے کم — آئی جو ایک رشک حوران ارم
جلوہ گر وہ مہ تھا سوئے جہاں — نور سے اس کے خجل ہے آسماں

اتنے میں ایک بانوئے فرخندہ بخت　　ہاں بلیٹھی جو بن بالائے تخت

اس طرح وہ تخت پر آئی نظر　　جس طرح ہو برج انور میں قمر

مجکو شہزادی نے فرمایا ہے یوں　　لے چلوں یہاں سے تجھے وہاں جس کا توں

میں تامل اس میں کر سکتی نہیں　　ڈر ہے مجھ پہ نہ ہو وہ غصہ کہیں

میں تو اس بات پر جی سے خدا　　سنتے ہی اس کی زبان از چلا

سنتے ہی کہنے لگی وہ مہ جبیں　　کھولدے آنکھیں میں آنکھیں کھولدیں

جی میں یہ گذرا کہ اب پایا شکار　　پاس مرے آئی وہ اشکبار

خوب سا میں جب میں نے دیکھا کر کے دھیان　　میں تھا بیٹھا تو کر کے درمیان

تھی نہ صورت حسن کی واں نہ مرد کی　　میں تھا تنہا اور راہ سرد تھی

شہر میں آیا میں اپنے خوار و زار　　اور کیا کالے برن کو اختیار[1]

جب یہ اس ہندی دلہن نے ماجرا　　سربسر بہرام کے آگے کیا

شہ نے کہکر آفریں و مرحبا　　اپنی چھاتی سے لگا کر سلا[2]

(پہلی اقلیم کی شہزادی نے از رو ادب　　کیا اس قصہ دلچسپ کو اسطرح[3] تمام)

ہندی شہزادی جب اپنی کہانی سنا چکی ہے، تو پو پھٹنے لگتی ہے اور صبح کی لطیف ہوائیں بہرام کو سلا دیتی ہیں۔ دوسری رات چین کی شہزادی دوسری رنگین داستان سناتی ہے اور پھر تیسری اقلیم کی شہزادی سبز پوشوں، چوتھی سرخپوشوں، کی دلفریب کہانیاں سنا کر بہرام گور کو خوش کرتی ہیں۔ ساتویں اقلیم کی شہزادیوں

---

[1] قلمی نسخہ ص ۳۲　[2] قلمی نسخہ ص ۳۲　[3] قلمی نسخہ ہفت پیکر ص ۳۶

کی کہانیاں اتنی مربوط ہیں کہ ساتوں کہانیوں کو ختم کیے بغیر طبیعت کو سکون نہیں ملتا۔ ہفت پیکر کی آخری رنگین داستان دل باختہ اور برگشتہ تقدیر شہزادے کی ہے جو ناکامیوں کے چکر سے نکلنے میں کامیاب ہوتا ہے اور اس کی دیرینہ آرزو پوری ہوتی ہے۔ حیدری نے دلکش پیرائے میں ساتویں داستان بیان کی ہے اس میں بلا کا زور ہے ۔؎

یہاں تلک کی اس نے آخر جستجو ۔۔۔ تا نظر آئی اسے وہ ماہ رو
ہر طرح اس مہ لقا کو وہ جواں ۔۔۔ اپنے لایا عقد میں باعز و شاں
آرزو اس کی بر آئی اس گھڑی ۔۔۔ مرغ چونکا اور مچھلی سو گئی
صبر کرنے سے ملا اس کو وہ مال ۔۔۔ جو کیا تھا اس پہ خالق نے حلال[۱]

تھی جو وہ سیمیں بدن شیریں کلام ۔۔۔ یہ حکایت اس نے کی جس دم تمام
شہ نے پہلو سے لیا اس کو لگا ۔۔۔ تھا ہر اک شب عیش کرتا رہا
جلوہ گر ہوتا ہر ایک گنبد میں جا ۔۔۔ جوئے عشرت ہر طرف دیتا بہا[۲]

اس ہفت داستان پر ہفت پیکر ختم ہوتی ہے۔ ہفت پیکر کا قلمی نسخہ ۱۵۲ اوراق پر پھیلا ہوا ہے۔ آخر میں جوآن اور رحیم نرائن رند نے رواجی قطعات تاریخ بھی درج کیے ہیں۔ حیدری کی ہفت پیکر ابتدائی دور کی عمدہ، دلچسپ اور معیاری مثنوی ہے لیکن اس میں نظامی کی فارسی مثنوی کا ساز نہیں، جو لطافت، بہاؤ، دل پسند اس نظامی کی مثنوی میں ہے وہ اردو میں نہیں۔ پھر بھی حیدری کی ہفت پیکر

---

[۱] دیکھیے قلمی نسخہ ورق ۱۵۱

شائع ہو جاتی تو اردو کلاسیکی شعری ادب میں نمایاں اضافہ ہوتا۔

قصۂ حاتم طائی عرف آرائش محفل | آرائش محفل، اردو میں قصہ حاتم طائی کے نام سے مشہور ہے۔ حیدری کی یہ کتاب عوام میں اتنی مقبول ہوئی کہ بار بار چھپی ہے۔ آرائش محفل بھی فارسی نثر کی کتاب کا ترجمہ ہے جسے حیدری نے پروفیسر گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۲ء مطابق ۱۲۱۶ھ میں مکمل کیا تھا۔ حیدری نے صرف بے کم و کاست ترجمہ نہیں کیا ہے اصل کتاب کی عبارت میں مناسب ترمیم و اضافہ کر کے اپنا اسلوب نکالا ہے اور اس کے اسلوب اور دلکش طرز بیان نے آرائش محفل کو اور بھی دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو قصہ حاتم طائی کو فارسی اصل سے زیادہ شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی ہے۔ حیدری نے اس عہد کی روش سے ہٹ کر سادہ اور آسان زبان میں یہ قصہ لکھا ہے۔ اور حیدری نے باغ و بہار کے انداز کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ گو اس میں حیدری کو کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی، آرائش محفل کو اردو ادب میں اہمیت اس لئے حاصل ہے کہ یہ اس عہد کی یادگار ہے۔ جب نثر طفل شیر خوار کی حیثیت رکھتی تھی اور فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ کے استعمال کی وجہ سے عبارت مصنوعی اور گنجلک ہو جاتی تھی۔ آرائش محفل عام طور پر بازار میں فروخت ہوتی ہے اور اردو زبان کے ہر طالب علم نے اس قصے کو اپنی زندگی میں کم سے کم ایک بار ضرور پڑھا ہوگا۔ قصہ حاتم طائی یا آرائش محفل کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

گلزارِ دانش حیدری کی ایک اور اچھی کتاب گلزارِ دانش ہے۔ اس کا ذکر اس نے اپنی مثنوی ہفت پیکر میں کیا ہے۔ گلزارِ دانش شیخ عنایت اللہ کی مشہور کتاب (فارسی) بہارِ دانش کا ترجمہ ہے۔ بہارِ دانش ایک نیم تاریخی داستان ہے جس میں جہاندار شاہ اور بہرہ در بانو کے معاشقے کی دلکش اور لطیف کہانی اثر انگیز انداز میں بیان کی گئی ہے۔ بہرہ ور کے عشق میں جہاندار شاہ کو سخت ابتلا اور آزمائش سے گذرنا پڑتا ہے اور موت کی سرحد کے قریب پہونچنے کے بعد جہاندار شاہ کو اپنی منزل ملتی ہے۔ عنایت اللہ نے یہ کہانی اپنے ایک برہمن دوست سے سنی تھی۔ اور فارسی میں قلمبند کی۔ بہارِ دانش کا ترجمہ حیدری نے کالج کے لئے کیا۔ مرزا جان طپش نے بہارِ دانش کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ افسوس کی بات ہے کہ حیدری کا یہ بڑا کام شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکا۔ لیکن خوش قسمتی سے گلزارِ دانش کا ضخیم قلمی نسخہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ عام خیال ہے کہ گلزارِ دانش کا نسخہ زمانہ برد ہو چکا ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ گلزارِ دانش کا قلمی نسخہ بالکل اچھی حالت میں ہے۔ یہ ۱۰۸۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ سائز ۷ × ۱۰ ہے۔ اس کی تالیف و ترجمہ کا سبب حیدری نے اپنے قلمی نسخہ کے دیباچے میں خود لکھا ہے۔

"بہارِ دانش کو شیخ عنایت اللہ طوطی باغ سخن نے ایک برہمن بچہ حسین و مہ جبین کے کہنے سے تصنیف کیا اور محمد صالح جواس والا جوہر سے نسبت ہم گوہری و شاگردی رکھتا تھا۔ اس نے بھی ایک دیباچہ اپنی موزونی طبع سے ساتھ عبارت رنگین و خوب و بندش الفاظ دلچسپ و مرغوب کے

تصنیف کرکے اس کتاب میں داخل کیا تھا ۔ اب اس ذرۂ بے مقدار خاک پائے آل احمد مختار صلوٰۃ سید حیدر بخش آمادہ بے ہنری المتخلص بہ حیدری ساکن دلّی خلف ابوالحسن نجفی نے ..... عہد میں مارکویس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام افضالہ کے ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء زمانے سے جناب مسٹر ولیم ہنٹر کے موافق اپنی طبع کے زبان ریختہ میں ترجمہ کیا ۔ اور نام اس کا گلزار دانش رکھ کر اہل دانش و بینش کی نذر گذرانا[1] ... الخ"

سبب تالیف کے قبل حیدری نے حمدِ خدا سے گلزار دانش کی ابتدا کی تھی۔ یہ حمد خلاف توقع نثر میں لکھی گئی ہے ۔

"حمد کرتا ہوں اس خالق بے ہمتا کی کہ جس نے ایک کن میں کون و مکاں کو پیدا کیا اور اپنے مہر و کرم سے شاہدان مہر و ماہ کو جلوہ دیا۔ جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مبعوث کرکے ہم گنہگاروں کے واسطے رحمۃ العالمین کے خطاب سے سرفراز فرمایا[2] ..... الخ"

حمد کے بعد رسول پاک کی نعت اور حضرت علی کی منقبت درج ہے۔ گلزار دانش کی داستان شروع ہوتی ہے :۔

"ایام سلف و زمان گذشتہ کے درمیان مملکت ہندوستان وسعت آباد جنت نشان میں ایک ایسا بادشاہ چھتر داری رہتا تھا کہ جس نے آفتاب جہاں تاب کی مانند حیران جہاں کو اپنے حکم کے سائے میں گھیر لیا تھا بلکہ اپنے عدل کے شمع نور سے شبستان دہر کو روشن کر دیا[3] ... الخ"

---

[1] دیکھئے مخطوطہ گلزار دانش ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری ص۵ [2] ملاحظہ ہو قلمی نسخہ ورق ۲ [3] ایضاً ورق ۳۱

پس منظر پر روشنی ڈالنے کے بعد مصنف نے جہاندار شاہ کا قصہ شروع کیا ہے۔ جہاندار شاہ شکار کو جاتا ہے۔ شکار سے واپسی کے وقت ایک شیریں سخن توتا مول لیتا ہے جو اسے شہزادی سنگل دیپ کے بے پناہ حسن وجمال کی کہانی سناتا ہے۔ توتا کی زبان سے سنگلدیپ کی شہزادی کے سحر زا حسن کا افسانہ سن کر جہاندار شاہ بہرہ ور بانو کے عشق میں "مجنوں" ہو جاتا ہے، تمام سدھ بدھ کھو دیتا ہے اور اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کے لئے "موت کی خوفناک وادی" کا سفر اختیار کرتا ہے۔ بالآخر سخت ابتلا، آزمائش اور کئی بار موت کے جال میں الجھنے کے بعد کامیاب و کامگار ہوتا ہے اور بہرہ ور بانو کے ساتھ عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ دنیا میں ان کا انصاف، محبت اور جہانداری ضرب المثل بن جاتی ہے اور اس طرح گلزار دانش کا طربیہ انجام ہوتا ہے۔ تتمہ پر حیدری کے دوست مرزا کاظم علی جوان نے قطعہ تاریخ بھی تحریر کیا ہے۔ مرزا کاظم علی جوان کے تاریخی قطعہ کے بعد مولف اختلاط حسن مرزا ابوالقاسم کا بھی ایک تاریخی قطعہ درج ہے حیدری نے اپنی مثنوی کی طویل فہرست آخر میں دی ہے۔ فہرست چھ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ خطی نسخہ خوش خط لکھا ہوا ہے، لیکن جا بجا غلطیاں رہ گئی ہیں۔

گل مغفرت یا روضۃ الشہداء گل مغفرت یا روضۃ الشہدا ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف ہے۔ روضۃ الشہدا کا پہلا ترجمہ ۱۱۴۵ھ میں فضل علی فضلی نے کیا تھا۔ اس کا نام دہ مجلس تھا جو غالباً پدماوت جائسی کی طرح برج بھاکا میں ہے اور اردو میں ہے۔ فضلی کی دہ مجلس کا صاف اور آسان اردو میں ترجمہ محمد بخش نے کالج کے لئے کیا۔ محمد بخش کے حال میں کریم لکھتا یا دہ مجلس پہ

تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ گل مغفرت کے متعلق ارباب نثر اردو کے مؤلف نے لکھا ہے۔

"حیدری نے گلشن شہیداں کے نام سے اس کو اردو میں منتقل کیا پھر گلِ مغفرت کے نام سے ایک انتخاب مرتب یہ کتاب صرف شہدائے کربلا کے حالات پر مشتمل ہے اور اس کو انھوں نے اپنے مذہبی اعتقادات اور محبت اہل بیت کی بنا پر ۱۲۲۷ھ میں اپنے ایک دوست کی تحریک پر ترتیب دیا ہے۔ مگر اس میں اپنی طرف سے جا بجا نظم و نثر کے اضافے اسقدر کر دئے ہیں کہ گویا وہ ان کی مستقل تالیف بن گئی ہے۔ الخ"[۱]

حیدر بخش نے مولوی سید حسین علی صاحب جونپوری کے ایما پر یہ کتاب ترجمہ اور تالیف کی تھی۔ دیباچے میں حیدری نے اس کا اعتراف کیا ہے

"اب شہر محرم الحرام کی بیسویں تاریخ ۱۲۲۷ھ میں جناب فیض مآب مولوی سید حسین علی صاحب جونپوری کے ارشاد کرنے سے اس نسخہ دہ مجلس کو انتخاب کیا۔ اس کا نام گل مغفرت رکھا۔" انالس آف فورٹ ولیم کالج کے ضمیمہ میں بھی حیدری کی گلِ مغفرت کا ذکر ہے ۱۲۲۷ھ مطابق ۱۸۱۲ء میں گلِ مغفرت کلکتہ سے شائع ہوئی اور بے حد مقبول ہوئی۔ یہ کئی بار چھپی لیکن اب اس کا مطبوعہ نسخہ بھی نایاب ہے۔ اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں بھی ہوا تھا۔ نمونتاً عبارت ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

"حاصل کلام وہ نیک انجام (بادشاہ) بعد تھوڑے دنوں کے مر گیا۔ شب کے وقت کسی شخص نے اسے خواب میں دیکھا کہ ایک تاج مرصع سر پہ دھرے خلعت شاہانہ پہنے کار چوبی ٹپکا کمر میں باندھے ہوئے حور و غلمان اپنے ساتھ لئے

[۱] دیکھیے ارباب نثر اردو صفحہ ۱۰۶

ہوئے ایک اسپ خرام پر سوار ہے اور بہشت بریں کی سیر کرتا پھرتا ہے۔ پوچھا اس نے، کہا کہ اے شخص پہلے میں غضب الٰہی میں گرفتار ہوا تھا۔ بعد اس کے حضرت امام حسین علیہ السلام کا غم والم یاد کرنے اور آپ کے حال زار پر رونے کے صدقے بخش دیا گیا۔ یقین ہے کہ جو کوئی آپ کے ماتم میں شریک ہوگا اور آپ کا رنج والم یاد کرکے روئے گا، یہ گریہ وزاری حشر کے دن اس کے کام آدیگی، موجب نجات ہوگا۔"

گل مغفرت کی محولہ عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ روضۃ الشہداء میں یہ کہانی سرسری طور سے بیان کی گئی ہے۔ گل مغفرت اصل میں ترجمہ کم اور حیدری کی تالیف زیادہ ہے۔ شبلی کی دہ مجلس میں گل مغفرت کے بہت سے واقعات نہیں ہیں۔

گلدستۂ حیدری یہ حیدری کے مختلف مضامین، دیباچوں اور نظموں کا مجموعہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے لیکن یہ کتاب بھی شائع نہ ہو سکی۔

(۱) مجموعہ شہدا حضرت امام حسین علیہ السلام اور دیگر شہدائے کربلا پر دردناک مرثیے ہیں۔

(۲) مجموعہ حکایات: اس میں حیدری نے اپنا حال دسو سے زیادہ قصّے اور لطیفے شامل کئے ہیں۔

(۳) قصہ مہر و ماہ کا دیباچہ۔

(۴) قصہ لیلیٰ مجنوں کا دیباچہ

(۵) دیوان غزلیات: غزلوں کے علاوہ اس میں قطعات، قصاید اور ہجویات شامل ہیں۔

گلدستۂ حیدری کی افادیت اتنی ہے کہ اس میں حیدری کو مترجم، مؤلف

اور شاعر کے روپ میں ایک ساتھ دیکھتے ہیں ۔ حیدری کے دیباچے میں ہلکے تنقیدی اشارے بھی کہیں کہیں ملتے ہیں ۔

گلشن ہند | حیدری نے اپنے عہد کے شاعروں کا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا۔ مگر مرزا لطف علی کے تذکرہ گلشن ہند کو دیکھنے کے بعد غالباً حیدری نے اپنے تذکرے کو قابلِ اشاعت نہ سمجھا ہو۔ حیدری کا تذکرہ شائع ہو سکا نہ اس کا کوئی خطی نسخہ دستیاب ہو سکا ہے ۔ مگر ارباب نثر اردو کے مولف سید محمد نے مفصل لکھا ہے ۔

اس تذکرہ کی وجہِ تالیف حیدری نے یہ بیان کی ہے کہ وہ کشتی میں سوار ہو کر ۱۲ رجب ۱۲۱۴ھ کو مرشد آباد آئے اور غالباً وہاں سے کلکتہ کا ارادہ رکھتے تھے کہ راہ میں غازی پور کے قریب ان کے ایک قدیم دوست مرزا محمدؐ علی دہلوی سے ملاقات ہوئی۔ دونوں اتفاق سے ایک راہ جا رہے تھے ۔ مرزا موصوف شاعری کا بے حد ذوق رکھتے تھے ۔ اور سفر میں بھی ان کے ساتھ کئی ایک اردو دیوان موجود تھے ۔ انھوں نے حیدری کو تذکرہ لکھنے کا مشورہ دیا۔ اور اس میں اتنی دلچسپی لی کہ ان کے ساتھ جتنے دیوان تھے ان کے سپرد کر دئے اور باصرار تمام ان کو اس کام پر آمادہ کیا ۔ اور ان کی تحریک و ترغیب سے یہ تذکرہ تمام ہوا اس کی تاریخ تالیف ۱۲۱۴ھ ہے اور ذیل کے قطعہ سے بھی جو کتاب کے آخر میں درج ہے ، نکلتی ہے ؎

مرتب کر چکا جب تذکرہ میں | زرد لے حق یہ بولے شیخ اور رند
کہی تاریخ اس کی حیدری خوب | اسے کہتا ہے ہر اک گلشن ہند

۱۲۱۴ھ = ۱۲۰۶ + ۸

لطف علی کی گلشن[1] ہند کی طرح حیدری کا تذکرہ بھی شائع ہوجاتا تو اردو میں ایک مفید تذکرہ کا اضافہ ہوتا۔ حیدری نے الفبائی ترتیب سے شعرا کا حال لکھا ہے۔ سب سے پہلے آفتاب، شاہ عالم بادشاہ کا حال درج ہے۔ میر شیر علی افسوس کا حال لکھتے ہیں۔

"افسوس تخلص، نام شیر علی اور ان کے والد بزرگوار کا نام مظہر علی خاں ہے حیدر علی خاں حیران، فی الحال مسند حیات پر موجود ہیں اور شعر اس طرح کہتے ہیں ؎

بزم میں اس کی نہ ہنستے ہیں نہ رو سکتے ہیں ❊ چپکے بیٹھے ہوئے ہر ایک کا منہ تکتے ہیں

توتا کہانی حیدری کی توتا کہانی کو وہی مقبولیت حاصل ہو جو باغ و بہار، مذہب عشق اور آرائش محفل و قصہ حاتم طائی کو ہوئی۔ بعض لوگوں نے توتا کہانی کی تصحیح کر کے طوطا کہانی لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ حیدری نے خود اس کا نام 'تے' سے لکھا ہے اور طوئے سے گریز کی وجہ لکھی ہے۔

ظاہرًا معلوم ہوتا ہے کہ ہندی لفظ طوتے نہیں اور اس احقر نے طوطی نامہ فارسی کو زبانِ ریختہ میں لکھا، اس واسطے طوطی کی طوئے کو 'تے' سے "بدل"[2] کیا۔ کہانی کے خاتمہ پر حیدری کا قطعہ تاریخ بھی درج کیا ہے ؎

کہانی ہوئی ختم جب حیدری ❊ تو ہاتف نے نام اس کا سنکر کہا
سر آہ کو کھینچ کر تو نے خوب ❊ رکھا نام توتا کہانی بجا[3]

حیدری کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ حیدری نے توتا کہانی کا ترجمہ سنسکرت

---

[1] مختارالدین احمد آرزو نے گلشن ہند کو ترتیب دے کر سنوارا اور مفید حواشی کے ساتھ شائع کر دیا ہے اس میں ۲۸۹ شعرا کا حال درج ہے۔ [2] ملاحظہ ہو قلمی نسخہ دیباچہ۔ [3] مطبوعہ نسخہ سنہ ۱۸۱۲ء صفحہ ۲۰۲

کی اصل کتاب "شکا سب تتی" سے نہیں بلکہ طوطی نامہ سے کیا تھا۔ شکا سب تتی، قدیم سنسکرت کتاب ہے۔ اس کے معنی، توتا کی کہی ہوئی ستر کہانیاں ہیں۔ ہندوستان کی قدیم ادبی کتابوں کو مسلم حکمرانوں نے عربی اور فارسی میں منتقل کرانے کا عمدہ کام کیا تھا۔ سنہ ۷۳۰ھ میں مولانا ضیا رالدین نخشبی نے جو اپنے زمانے کے مشہور عالم تھے، شکا سب تتی کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ اور اس کا نام طوطی نامہ رکھا۔ طوطی نامہ کی زبان مرصع، ادق اور ثقیل ہے، مگر اس کے باوجود اپنے زمانے میں اس کتاب کو قبول عام نصیب ہوا۔ طوطی نامہ کی تمام کہانیاں انتہائی دلچسپ اور عبرت آموز ہیں۔

ارباب نثر اردو کے مولف کا کہنا ہے کہ حیدری کے قبل ایک نامعلوم شخص نے سنہ ۱۱۷۳ھ میں دکھنی زبان میں اس کا ترجمہ کیا تھا۔ میری نظر سے دکھنی ترجمہ نہیں گذرا۔ البتہ مولوی قادری کا ترجمہ ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے جو مولانا نخشبی کے طوطی نامہ کا خلاصہ ہے۔ اس کو حیدری نے جان گل کرسٹ کی فرمائش پر سنہ ۱۸۰۱ء میں زبان ریختہ میں منتقل کیا تھا۔ حیدری نے اس کتاب کا سبب تالیف بیان کیا ہے۔

"یہ سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری شاہ جہاں آبادی تعلیم یافتہ مجلس خاص نواب علی ابراہیم خاں بہادر مرحوم وشاگرد غلام حسین خاں غازی پوری ..... موجب فرمائش صاحب موصوف گل کرسٹ کے، سنہ ۱۲۱۵ھ مطابق سنہ ۱۸۰۱ء کے ..... قاری کے طوطی نامہ کا جس کا ماخذ طوطی نامہ ضیا، الدین نخشبی (بدایونی) ہے زبان ریختہ میں ترجمہ کیا اور نام اس کا توتا کہانی رکھا۔[۱]

۱؎ دیکھئے دیباچہ توتا کہانی مطبوعہ سنہ ۱۸۱۲ء ہندوستانی پریس

قادری کی طوطی نامہ میں ستر کہانیاں درج نہیں ہیں۔ بلکہ پینتیس[۳۵] کہانیوں کا خلاصہ درج ہے۔ مبہم، بے چیدہ اور غیر ضروری حصے حذف کر دئے گئے ہیں۔ توتا کہانی سب سے پہلے ہندوستانی پریس سے ۱۸۱۲ء میں شائع ہوئی جس کا ایک بوسیدہ نسخہ ہوگلی محسن کالج کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ توتا کہانی کی زبان آسان اور عام فہم ہے اور کہانی از حد دلچسپ، اس لئے کالج کے نصاب میں داخل کر دی گئی تھی۔ اور اس کے بعض قصوں کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوا ہے۔

توتا کہانی کی زبان سلیس اور سادہ ہے۔ گو فارسی الفاظ اور تراکیب کا بھی حیدری نے بے دریغ استعمال کیا ہے۔ پھر بھی عوام میں یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی، اور اس کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ حیدری نے طوطی نامہ کا ترجمہ بڑی محنت سے کیا ہے اور فارسی طرز پر اس کے عنوانات بھی قائم کئے ہیں۔

"پہلا قصہ میمون کے تولد کا اور خجستہ کے ساتھ بیاہے جانے کا اور خجستہ و شہزادے کا آپس میں عاشق ہونے کا۔"

"اگلے دولتمندوں میں سے احمد سلطان نام ایک شخص بڑا مالدار اور صاحب فوج تھا، لاکھ گھوڑے، پندرہ سو زنجیر فیل اور نو سو (سو) قطار بار برداری کے اونٹوں کی اس کے در دولت پر حاضر رہتے تھے۔ پر اس کا لڑکا بالا کوئی نہیں تھا کہ گھر اپنے باپ کا روشن کرتا۔

اس بات کا اس کے تھا دل پہ داغ　　نہ رکھتا تھا وہ اپنے گھر کا چراغ

اس واسطے صبح و شام خدمت میں خدا پرستوں کے جاتا اور ان سے درخواست دعا کی کرتا۔ غرض تھوڑے دنوں کے بعد خالق زمین و آسمان نے ایک بیٹا خوبصورت

مہر دگہر ماہ جبیں اسے بخشا۔ احمد سلطان اس خوشی سے گل کی طرح کھلا اور نام اس کا میمون رکھا۔ کئی ہزار روپئے اور دہن فقیروں کو بخش کر سجدہ شکر بجالایا۔[۱]"

میمون جوان ہوا تو اس کی شادی خجستہ بانو سے کردی گئی۔ میمون کا ایک دوراندیش اور نجومی توتا تھا۔ اس نے اپنے محبوب توتا کی تفریح کے لئے ایک مینا بھی لے رکھی تھی۔ میمون توتے کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ میمون سفر پر گیا تو توتے کو اپنے گھر کی حفاظت کے لئے چھوڑ گیا۔ میمون کی غیر حاضری میں اس کی حسین وجمیل بیوی خجستہ ایک پردیسی کو دل دے بیٹھی۔ خوبرو پردیسی کے لئے وہ اتنی بے تاب اور بے قرار ہوئی کہ اس نے اپنے شوہر سے بے وفائی اور شربت وصال پینے کی ٹھان لی۔ توتا اپنے مالک کی عزت لٹتے دیکھ کر مضطرب ہو گیا۔ خجستہ بانو کو ہر رات ایک دلچسپ اور نصیحت آموز کہانی سناتا۔ ہر کہانی دوسری کہانی اس طرح لپٹی ہوئی تھی کہ لغیر سنے چین نصیب نہیں ہوتا۔ الف لیلہ کی طرح مربوط اور سرور انگیز کہانیاں تھیں۔ اس طرح ستّر کہانیاں سنا کر توتے نے ستّر دن کاٹ دئے۔ اپنے مالک کی عزت اور آبرو کی حفاظت کی۔ خجستہ بانو کو اپنے محبوب سے ملنے اور اختلاط کرنے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ اور ستر دن بعد جب سوداگر میمون سفر سے لوٹا تو اسے اپنی بیوی کی بیوفائی کا پتا چلا۔ اس نے اپنی بیوفا بیوی کا کام تمام کر دیا۔ پوری کتاب پر لطف، مزیدار اور ہر کہانی سبق آموز اور انجام عبرت آموز ہے

"— آقا مجھے اپنے پیدا کرنے والے کی قسم بی بی نے ایک نوجوان کو یار کیا تھا۔ اس کے واسطے وہ (مینا) ماری گئی۔ اس کے سنتے ہی وہ (میمون) تاب نہ لاسکا۔

---

[۱] ملاحظہ ہو توتا کہانی صٓ

ایک ہی تلوار سے خجستہ کا کام تمام کیا۔[۵] ''

حیدری کا یہ ترجمہ اس کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں بھی عام فہم آسان اور سلیس ہے۔ توتا کہانی بلا شبہ ایک مفید کتاب ہے لیکن اب پرانی کہانیوں کا زمانہ نہیں رہا۔ لوگ زندگی کی بے شمار تلخ حقیقتوں کی تصویریں افسانے اور کہانیوں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل حیدری کی توتا کہانی کی مقبولیت بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن آج بھی اردو کی ابتدائی نثری داستانوں کی اہمیت باقی ہے۔ کیونکہ انھی نثری داستانوں پر ہمارے نئے افسانوں کا عالیشان محل تعمیر ہو سکا ہے۔

---

[۵] دیکھئے توتا کہانی ص ۱۸۲

میر امّن دلّی وَالے

فورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں میرامن دلی والے کو جو شہرت اور قبولِ عام نصیب ہوا وہ کسی اور ادیب اور شاعر کو نہیں ہوا۔ میر امّن کالج سے بہت دنوں تک وابستہ نہیں رہے اور مختصر قیام کے دوران میں صرف دو کتابیں لکھیں، جو ان کی دائمی شہرت اور مقبولیت کا ذریعہ بنیں۔ میرامن کو باغ و بہار نے جو منفرد مقام عطا کیا ہے وہ ان کے کسی بھی ہم عصر اور بے شمار کتابوں کے مؤلفین کو بھی نصیب نہیں ہوا۔

میرامن کی پہلی اور عظیم کتاب باغ و بہار ہے جو اصل میں مرزا تحسین کے نوطرز مرصع کو سامنے رکھ کے لکھی گئی۔ باغ و بہار، امیر خسرو کی تصنیف قصہ چہار درویش کا براہ راست ترجمہ نہیں ہے۔ یہ باغ و بہار مطبوعہ ۱۸۴۷ء سے ثابت ہوتا ہے۔

"باغ و بہار تالیف کیا ہوا میرامن دلی والے کا ماخذ اس کا نوطرز مرصع کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین کا ہے فارسی قصہ چہار درویش سے"۔

باغ و بہار کے مولف کا حال خود ان کی کتابوں کے دیباچوں سے ملتا ہے میر امّن شاعر بھی تھے اور لطف تخلص کرتے تھے۔ باغ و بہار کے دیباچے میں امّن نے اپنے حالات خود تحریر کئے ہیں۔

"پہلے اپنا احوال یہ عاصی گنہگار میرامن دلی والا بیان کرتا ہے۔ میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ

کی رکاب میں پشت بہ پشت جاں فشانی بجالاتے رہے۔ اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدردانی جتنی چاہیے فرماتے رہے جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایات سے سرفراز کرکے مالامال اور نہال کر دیا۔ اور خانہ زاد اور منصبداری قدیمی زبانِ مبارک سے فرمایا۔ چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر کے سب آباد تھے) یہ نوبت پہونچی کہ ظاہر ہے (عیاں کہ اچہ بیاں) تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا۔ اور احمد شاہ درانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر ویسے شہر سے (کہ وطن اور جنم بھم (بھوم) میرا ہے اور انول ونال گڑا ہے، جلاوطن ہوا، اور ایسا جہاز (کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا) غارت ہوا، میں بے کسی کے سمندر میں غوطہ کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا آسرا (سہارا) بہت ہے۔ کتنے برس بلادِ عظیم آباد میں دم لیا، کچھ بنی کچھ بگڑی۔ آخر وہاں سے بھی پاؤں اکھڑے۔ روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہوا، اشرف البلاد کلکتے میں آب و دانے کے زور سے آ پہنچا۔ چندے بے کاری میں گذری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گل کرسٹ صاحب دام اقبالہ کے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جواں مرد کا دامن ہاتھ لگا ہے۔ چاہیے کہ دن کچھ بھلے آویں نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں۔ اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پاکر دعا اس قدرداں کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے[۱]۔

---

[۱] ملاحظہ ہو دیباچہ صفحہ ۱۳، ۱۴

میرامن نے اپنے مختصر حال کے ساتھ زبان اُردو کے نشو و نما اور تدریجی ارتقا پر بھی عمدہ اور ناقدانہ تبصرہ کیا ہے۔ انھوں نے اردو کو ایک لچکدار، عام فہم اور عالمانہ زبان قرار دیا ہے۔ اور ان کی رائے میں اس سے زیادہ دلکش، لطیف اور جاندار زبان ہندوستان میں نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی یہ رائے جذبات کی بنیاد پر قائم کی گئی ہو۔ تاہم اردو کے نشو و نما سے متعلق بہت سی عمدہ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

"حقیقت اردو زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے۔ انھی کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور بھاکا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا۔ پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ آخر امیر تیمور نے جن کے گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے، ہندوستان کو لیا۔ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا۔ اس واسطے شہر کا بازار اُردو کہلایا۔ پھر ہمایوں بادشاہ پٹھانوں کے ہاتھ سے حیران ہو کر ایران ولائت گئے۔ آخر وہاں سے آن کر پس ماندوں کو گوشمالی دی، کوئی مفسد باقی نہ رہا کہ فتنہ و فساد برپا کرے۔

جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف، سوال جواب کرتے ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی جب حضرت شاہ جہاں

صاحب قران نے قلعہ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا۔ اور تخت طاؤس میں جواہر جڑوایا اور دل بادل سا خیمہ چوبوں پر استادہ کرطنابوں سے کھچوایا۔ اور نواب علی مراد خاں نہر کو لے آیا۔ تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنا دار الخلافہ بنایا۔ تب سے شاہ جہاں آباد مشہور ہوا۔ اگرچہ دلی جدا ہے۔ وہ پرانا شہر اور نیا شہر کہلاتا ہے اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلیٰ خطاب دیا۔

امیر تیمور کے عہد سے محمدؐ شاہ کی بادشاہت بلکہ احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے وقت تک پیڑھی بہ پیڑھی سلطنت یکساں چلی آئی۔۔۔۔ زبان اردو منجھتے منجھتے ایسی منجھی کہ کسو شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھاتی لیکن قدر دان منصف چاہیے جو تجویز کرے۔ سو اب خدا نے بعد مدت کے جان گل کرسٹ صاحب دانا نکتہ رس پیدا کیا کہ جنھوں نے اپنے گیان اور تلاش و محنت سے قاعدوں کی کتابیں تصنیف کیں اس سبب سے ہندوستان کی زبان کا ملکوں میں رواج ہوا اور نئے سر سے رونق زیادہ ہوئی۔ نہیں تو اپنی دستار و گفتار و رفتار کو کوئی برا نہیں جانتا اگر ایک گنوار سے پوچھئے تو شہر والوں کو نام رکھتا ہے اور اپنے تئیں سب سے بہتر سمجھتا ہے۔ خیر عاقلاں خود می دانند۔ جب احمد شاہ ابدالی کابل سے آیا اور شہر کو لٹوایا۔ شاہ عالم پورب کی طرف تھے کوئی وارث اور مالک ملک کا نہ رہا شہر بے سر ہو گیا۔ سچ ہے بادشاہ کے اقبال سے شہر کی رونق تھی۔ ایکبارگی تباہی پڑی۔ رئیس وہاں کے، میں کہیں تم ہو کر جہاں جس کے سینگ سمائے وہاں نکل گئے۔ جس ملک میں پہونچے وہاں کے آدمیوں کے ساتھ سنگت سے بات چیت میں

فرق آیا۔ اور بہت ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کسو سبب سے دلی میں گئے اور رہے، وہ بھی کہاں تلک بول سکیں گے کہیں نہ کہیں چوک ہی جائیں گے۔ اور جو شخص سب آفتیں سہہ کر دلی کا روڑہ ہو کر رہا اور دس پانچ نشتیں اسی شہر میں گذریں اور اس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے، عرس، چھڑیاں، سیر تماشا اور کوچہ گردی اس شہر کی مدت تلک کی ہوگی اور وہاں نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔ یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا دیکھتا یہاں تلک پہونچا ہے۔[۵]"

اس مختصر تاریخ زبان کے بعد میرامن نے 'چہار درویش' کا قصہ بیان کیا ہے پہلے درویش کی کہانی ہے۔

بادشاہ کو اولاد نہیں ہوتی تھی۔ چاروں طرف مایوسی اور غم کی گہری تاریکی پھیلی ہوتی ہے۔ وہ تاج و تخت، سلطنت، عیش اور ٹھاٹھ باٹھ سب تیاگ دیتا ہے۔ عزلت نشیں ہوجاتا ہے۔ رعایا بے چین اور امراء اور درباری مضطرب، سلطنت میں بغاوتیں اور شورشیں سر اٹھانے لگتی ہیں۔ آخر وزیر دانا، خردمند بادشاہ کے پاس جاتا ہے۔ سمجھاتا ہے لیکن اولاد کی آگ نے اس کے خرمن عقل کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ تمام باتیں، حجتیں اور دلیلیں بے سود ثابت ہوتی ہیں بادشاہ کے انکار میں کتنا غم پنہاں ہے اس کا اظہار شدت سے ملتا ہے۔

"سُن اے خردمند مری ساری عمر اسی ملک گیری کے درد سر میں گئی۔ اب یہ سن و سال ہوا، آگے موت باقی ہے۔ سو اس کا بھی پیغام آیا کہ سب بال سفید

---

[۵] ملاحظہ ہو باغ و بہار مطبوعہ ۱۸۰۴ء ص ۲

باغ و بہار

تالیف کیا ہوا میر امن دلی والی کا

ماخذ اُسکا نو طرزِ مرصّع کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خان کا ہی
فارسی قصّۂ چار درویش سی

دار الحکومت لندن میں نئی سر سی چھاپا گیا
فرمایش سی صاحبانِ عالیشان کمپنی بہادر دام اقبالہم کی
کہ وی حامیِ و حاکمِ و حافظ مملکتِ ہند کی ہیں

سنہ ١٨٥١ عیسوی مطابق سنہ ١٢٦٧ ہجری کی
ولیم واٹس کی چھاپی خانی میں
تیسری نسخہ چھاپا گیا

BĀGH O BAHĀR:

CONSISTING OF ENTERTAINING TALES

IN THE

HINDŪSTĀNĪ LANGUAGE,

BY

MĪR AMMAN OF DIHLĪ,

ONE OF THE LEARNED NATIVES FORMERLY ATTACHED TO THE COLLEGE OF FORT WILLIAM, BENGAL.

PUBLISHED UNDER THE AUTHORITY

OF

THE HON. THE EAST-INDIA COMPANY

NEW EDITION,

CAREFULLY CORRECTED, AND COLLATED WITH ORIGINAL MSS.,

HAVING THE ESSENTIAL VOWEL POINTS AND PUNCTUATION MARKED THROUGHOUT

TO WHICH IS ADDED,

A VOCABULARY OF ALL THE WORDS OCCURRING IN THE WORK

BY

DUNCAN FORBES, LL.D.,

PROFESSOR OF ORIENTAL LANGUAGES IN KING'S COLLEGE, LONDON;

MEMBER OF THE ROYAL ASIATIC SOCIETY OF GREAT BRITAIN AND IRELAND;

MEMBER OF THE ASIATIC SOCIETY OF PARIS;

AND AUTHOR OF SEVERAL WORKS ON THE HINDUSTANI AND PERSIAN LANGUAGES.

جو کوئی اِس کو پڑھیگا گویا باغ کی سَیر کریگا - بلکہ باغ کو آفت

خزاں کی بھی ہَے - اَور اِس کو نہیں - یہ ہمیشہ سرسبز رہیگا ۔

LONDON:

WM. H. ALLEN & Co.,

Booksellers to the Honourable East-India Company

7, LEADENHALL STREET

ہو چلے، وہ مثل ہے ساری رات سوئے اب صبح کو بھی نہ جاگے۔ اب تلک ایک بیٹا پیدا نہ ہوا، جو میری خاطر جمع چاہیے۔[1]... الخ

میرامن کو اس بات کا مکمل احساس تھا کہ ان کی یہ کتاب یادگار زمانہ ہوگی اور رہتی دنیا تک ان کا نام اُردو ادب میں زندہ جاوید رہے گا۔ اس کا اظہار میرامن نے خود کیا ہے۔

"جو کوئی اس کو پڑھے گا باغ کی سیر کریگا۔ بلکہ باغ کو آفت خزاں کی بھی ہے۔ اور اس کو نہیں۔ یہ ہمیشہ سرسبز رہے گا۔[2]"

باغ و بہار سے متعلق میرامن کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف صادق آئی۔ باغ و بہار کی تصنیف و تالیف کو ڈیڑھ سو سال سے اوپر ہو گئے مگر آج بھی باغ و بہار سرسبز و شاداب ہے۔ خزاں کے طوفان اور وقت کی تیز آندھی اس کو ویران نہیں کر سکی اور اردو داستانوں میں اس کے شگفتہ اسلوب اور دلکش انداز بیان اور طرز نگارش، نئی تراش خراش کے باوجود داستانوں میں بہت کم ایسی کتابیں ہیں جو باغ و بہار کے شگفتہ اسلوب اور طرز نگارش کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

ڈاکٹر فوربس نے ۱۸۰۳ء کے پہلے ایڈیشن کو سامنے رکھ کر ۱۸۴۶ء میں انگریزوں کے لیے دوبارہ ترتیب دیا تھا۔ ۱۸۴۶ء کے دیباچے میں فاربس نے لکھا ہے:۔

"ہندوستانی زبان میں جتنی کتابیں اب تک لکھی جا چکی ہیں۔ ان میں باغ و بہار بہترین اور عظیم ترین کتاب ہے۔" باغ و بہار نصف صدی تک کمپنی بہادر کے

---

[1] باغ و بہار مطبوعہ ۱۸۴۹ء ص ۲ [2] ایضاً ص

سول افسروں کے امتحان کے نصاب میں شامل رہی۔

باغ و بہار کے قصوں میں ایشیا کے رسم و رواج، روایات، ثقافت اور سماجی اور معاشی زندگی کا واضح خاکہ بھی ملتا ہے۔ میر امن نے اس کا ترجمہ اتنا خوبصورت کیا ہے کہ ان کی اپنی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ باغ و بہار کی بے پناہ مقبولیت اور دائمی شہرت کا یہی راز ہے۔

باغ و بہار کے قصے زبان زد خواص و عوام ہیں۔ یہ چار بادشاہوں (درویشوں) کی سیر کی کہانیاں ہیں۔ ہر ایک کہانی دوسری کہانی سے مربوط ہے اور تسلسل کہیں بکھرنے نہیں پاتا۔

باغ و بہار آج بھی مقبول ہے آج جب اُردو افسانوں نے ترقی کے کئی مدارج طے کر لئے ہیں اور نئے افسانے زندگی سے اس قدر قریب ہو گئے کہ پرانی داستانیں بیکار معلوم ہوتی ہیں مگر اس کے باوجود باغ و بہار کی مقبولیت ختم نہ ہو سکی۔ اسکا سبب یہ ہے کہ باغ و بہار کا انداز بیان بڑا دلکش اور رواں ہے۔ اس کی سلاست اور فصاحت کو ہر طبقہ کے نمائندہ نقادوں نے سراہا ہے۔ اردو کے محسن اور محقق مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کے اس خیال سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ

"اُردو کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب زبان کی فصاحت اور سلاست کے لحاظ سے اس سے لگا نہیں کھاتی[1]"

باغ و بہار کی اسی خوبی نے اسے اردو ادب کا ہر زمانہ میں زندہ جاوید شاہکار بنا دیا ہے۔ اردو کے بے باک نقاد پروفیسر کلیم الدین نے بے لاگ تنقید کی ہے کہ میر امن کی عبارت میں ایک خاص آہنگ تناسب و جاذبیت ہے

---

[1] دیکھئے گلشن ہند کا دیباچہ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ باغ و بہار کی عبارت میں ایک خاص آہنگ، تناسب، جاذبیت اور دلکشی نے اسے لازوال شہرت اور بے پناہ مقبولیت عطا کی ہے۔ میر امن کے اسلوب کی سادگی، شگفتگی اور دلکشی سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے اور ہر جگہ روانی، سلاست، لطافت اور حلاوت کا دریا بہتا ہوا نظر آتا ہے اور ہم پڑھتے وقت اس دریا میں اسقدر ڈوب جاتے ہیں کہ ابھرنے کو جی نہیں چاہتا۔ باغ و بہار کا یہ طلسم ہمیشہ قائم رہے گا۔ اور اردو ادب کے شائقین کے دلوں کو گرماتا رہے گا۔

گنج خوبی گنج خوبی میر امن کا دوسرا کارنامہ ہے۔ یہ اصل میں ملّا واعظ کاشفی کی مشہور کتاب 'اخلاق المحسنین' کا آسان اور عمدہ ترجمہ ہے۔ پروفیسر جان گل کرسٹ کے ایما پر میر امن نے ترجمہ کیا تھا۔ خطی نسخہ کے دیباچہ میں امن نے ترجمہ اور تالیف کا حال لکھا ہے۔

"صاحب خلق مستر جان گل کرسٹ[۱] صاحب زبان اردو کے قدردان اور فلک زدوں کے فیض رساں، اس بعید الوطن میر امن دہلی والے کو لطف اور عنایت سے فرمایا کہ اخلاق المحسنین جو فارسی کتاب ہے اس کو اپنی زبان میں ترجمہ کرو تو صاحبان عالیشان کی درس کی خاطر مدرسہ میں کام آوے۔ بموجب حکم سر آنکھوں سے قبول کیا اس لئے کہ مرہون احسان ہوں۔ آدمی سر پر سے تنکا اتارنے کا احسان لیتا ہے۔ انھوں نے تو روزی سے لگایا تھا۔ اور میں نے بھی انھی کے سبب سے یہ پیشہ قبول کیا۔ اور بامید صلہ کے حکم عام حضور کا ہوا ہے واسطے پرورش اطفال کے اس کثیر العیال نے ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء کے باغ و بہار کو تمام کرکے

---

[۱] خطی نسخہ میں اس نے گل کرسٹ کو گل کرس ہی لکھا ہے جس سے ظاہر ہے کہ امن انگریزی سے بالکل ہی نابلد تھے [۲] ملاحظہ ہو قلمی نسخہ گنج خوبی ص ۳-۴

کر کے اس کو لکھنا شروع کیا عجب یہ کہ جتنی خوبیاں انسان کو چاہئیں اور دنیا کی نیک نامی اور خوشی معاشی کے لئے درکار ہیں، سب اس میں بیان ہوئیں اس واسطے اس کا نام بھی گنج خوبی رکھا[1]"

گنج خوبی کے آغاز میں شہر کلکتہ کی خوبصورتی وسعت اور بڑی عمارتوں اور اس کی ترقی کا حال بھی لکھا ہے جس سے اس عہد کے کلکتے کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے اور مارکوئیس ولزلی اور گل کرسٹ کی شان میں قصیدے لکھے ہیں وہ مبالغہ کی حدیں پار کر جاتے ہیں۔ انگریزی حکومت اور فوج کے مظالم اور بالادستیوں کو نظر انداز کر کے ان کی ستائش میں جو زورِ بیان صرف کیا ہے اس سے انکی غلامانہ ذہنیت کا نشان ملتا ہے۔

جان گل کرسٹ اور مارکوئیس ولزلی کی تعریف بیان کرنے کے بعد انگریزی اور مرہٹہ فوج کا مقابلہ کیا ہے اور یہ قطعہ درج کیا ہے ؎

پلٹنیں اور توپیں جب سمکھ ہوئیں   مرہٹے ہیبت کے مارے مر گئے

فیر سنتے ہی فُرفُرو ہو چلے   چھوٹی جب بندوق کوّے اڑ چلے

ایسی خوشامدانہ باتیں اور غلامانہ ذہنیت صرف میر امن کے یہاں ہی نہیں ملتی بلکہ اس دور کے ہر منشی کے یہاں یہ کمزوری نمایاں ہے۔

گنج خوبی کا خطی نسخہ ضخیم ہے۔ ۵۰۰ سے زیادہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں نصیحت آمیز کہانیاں درج ہیں۔ گنج خوبی چالیس ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں پند و نصائح سے بھری حکایتیں ملتی ہیں۔ پہلا باب عبادت میں ہے یعنی خدا کی بندگی کرنے میں

---

[1] ملاحظہ ہو قلمی نسخہ گنج خوبی ص ۳ - ۴

"۔ خدا پاک اور برتر ہے لیکن ساتھ ادا کرنے فرض واجب کے اور ترک کرنا بدی وحرام کا اور حکم ہونا ان کے حکم کا اور نہ کرنا جو اس نے منع کیا ہے اور تابع ہونا اور پیروی کرنا حضرت رسالت پناہ کی۔ اور یہ یقین جاننا چاہئے۔ بندگی حق سبحانہ تعالیٰ کی دنیا میں سلامتی اور رہنمائی کا ہے اور آخرت میں وسیلہ محض رہائی کا ہے۔"

گنج خوبی کا دوسرا باب اخلاص میں یعنی اپنے دل کو خدائے برتر کے ساتھ راست و درست رکھے۔ اس ضمن میں ایک نصیحت آمیز کہانی دی گئی ہے۔

کہتے ہیں کہ کسو خلیفہ مصر کے حکم سے ایک بے ادب کو سیاست گاہ میں کرکے فراشی کوڑے مار رہے تھے۔ اس شخص نے عین مار کھانے کی حالت میں بدزبانی شروع کی اور خلیفہ کو بے تحاشہ گالیاں دینے لگا۔ سلطان نے فرمایا کہ اس کی تعذیر سے ہاتھ اٹھا او آزاد کرو۔

اس طرح دعا، شکر، صبر، رضا، عفت، توکل، علو ہمت، عزم، جد و جہد، سخاوت خیرات، رعایت، حقوق میں، سیاست وغیرہ اور چالیسواں باب حشم و خشم کی تربیت میں ہے۔

گنج خوبی کا خطی نسخہ خود میرامن دلی والے کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے۔ قلمی نسخہ فریدوں کی حکایت پر ختم ہوتا ہے لیکن مطبوعہ نسخہ اصمعی کی حکایت پر ختم ہوتا ہے۔ فریدوں کی حکایت مختصر سی ہے۔ شاید مطبوعہ نسخوں سے نکال دی گئی ہے:۔

"فریدوں کو ابتدائی سلطنت میں کہ روز بروز اقبال کی دولت کی ترقی تھی، خیال آیا کہ جو ملک غنیموں کے تصرف میں، اپنے عمل میں لاؤں۔ مگر اس کے حواریوں نے اسے ملک گیری اور خون خرابہ سے روکا۔ فریدوں نے اپنے حواریوں کی باتیں سن کر

---

[۱] قلمی نسخہ ورق ۱۰، [۲] قلمی نسخہ ورق ۲۲

کہا" قناعت چارہ پایہ جانوروں کا کام ہے، کہ سرنیچا کئے جو کچھ پایا پا چرچگ کر بیٹھ رہے۔ اور گوشہ پکڑنا کم ہمت خروں کو لائق خوکوں کو نہیں۔ آدمیوں کو لازم ہے کہ فرصت کو غنیمت جانے کہ بادل کی بس چلتی پھرتی چھاؤنی ہے۔ بس اپنا مطلب حاصل کرنے میں خوف و دہشت کا اندیشہ نہ کرے۔[1]"

گنج خوبی کے ۱۸۴۸ء کے مطبوعہ ایڈیشن میں فریدوں کی کہانی شامل نہیں ہے اصمعی ہی کی حکایت پر ختم ہوئی ہے۔

"اصمعی کہتا ہے کہ ایک روز میں ہارون رشید کے پاس گیا۔ دیکھتا ہوں کہ تخت پر بیٹھا ہے اور ایک لڑکی برس پانچ ایک کی نزدیک اسکے کھیلتی ہے۔ مجھے دیکھ کے بولا کہ تو جانتا ہے کہ یہ کس کی بیٹی ہے۔ میں نے جواب دیا مجھے معلوم نہیں۔ میرے بیٹے کی بیٹی یعنی پوتی ہے آ کر اس کا ہاتھ چوم۔ یہ سُن کر میں گھبرایا اور حیران ہوا۔ دل میں غور کر دیکھا کہ اگر اس کا حکم بجا نہیں لاتا ہوں تو تنگی میں پڑتا ہوں۔ اور اگر اس کا کہنا کرتا ہوں تو شاید غیرت کو کام فرما دے اور مجھے قتل کر دے۔ لاچار ہو کر اپنی آستین اس لڑکی کے سر سے چھوائی اور آستین کے سرے کو بوسہ دیا۔ خلیفہ نے یہ حرکت جو دیکھی میرا ادب کرنا اسے خوش آیا، بولا کہ اگر یہ دانائی تو نہ کرتا تو بے اجل مرتا میں تیرے قتل کا حکم کرتا[2]"

مطبوعہ نسخہ اس حکایت پر ختم ہوتا ہے اور اختتام پر قطعہ درج ہے ؎

گنج خوبی یہ جب ہوا معمور	تب دعا مانگی میں نے یا اللہ
دوستوں کے تئیں مبارک ہو	نہ پڑے حاسدوں کی اس پہ نگاہ

---

[1] قلمی نسخہ گنج خوبی آخری ورق [2] مطبوعہ نسخہ ۱۸۴۸ء فاربس ص ۵۸

گنج خوبی ۱۸۰۲ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد کئی بار چھپی فرانسی انگریزی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ گنج خوبی میں چھوٹی اور نصیحت آموز حکایات زود فہم اور آسان زبان میں تھیں۔ لہٰذا سول افسروں کے نصاب میں یہ بھی شامل تھی گنج خوبی کی زبان صاف اور ستھری ہے لیکن اس کا انداز بیان باغ و بہار کی طرح شگفتہ نہیں ہے۔ اخلاقیات کے موضوع پر لکھی ہوئی کتابیں خشک اور سپاٹ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرامن اپنی جادو بیانی اور قلم کی بے پناہ طاقت کے باوجود اس میں وہ دلکش نقوش ابھار نہ سکے جو باغ و بہار میں ملتے ہیں میرامن کا بس اتنا کمال ہے کہ محاوروں میں ڈوبی ہوئی ٹکسالی زبان پر عبور کی وجہ سے خشک کہانیوں کو دلچسپ بنا دیا ہے۔

فورٹ ولیم کے دوران ملازمت میں میرامن نے باغ و بہار اور گنج خوبی کے علاوہ اور کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اور گل کرسٹ کی واپسی کے بعد وہ کچھ دنوں تک ہی کالج میں رہ سکے تھے۔ ۱۸۰۶ء میں کالج کے نئے منشیوں کی فہرست میں میرامن کا نام نہیں تھا خود امن کے بیان کے مطابق وہ کثیر العیال تھے لیکن کسی بھی تذکرے اور اردو تاریخ میں یہ نہیں ملتا کہ ان کے کتنے بیٹے اور بیٹیاں تھیں۔ میرامن کے بیٹوں نے بھی کوئی کتاب لکھی یا نہیں کالج سے علحدگی کے بعد کی حیات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ سخت تلاش اور جستجو کے باوجود کالج کے بعد میرامن کی زندگی کا کوئی قابل ذکر پہلو اجاگر نہ ہو سکا۔ بس اتنا پتا چلتا ہے کہ میرامن ملازمت سے علحدگی کے بعد کلکتے میں سکونت پذیر ہو گئے تھے اور نجی کاروبار کرنے لگے تھے۔ غالباً ان کا انتقال بھی کلکتہ ہی میں ہوا۔

مظہر علی خاں ولاؔ

مظہر علی خاں ولا بھی فورٹ ولیم کالج کے مشہور اہل قلم تھے ضعیفی کے باعث جب میر تقی میرؔ کا کالج کے لئے انتخاب نہ ہوسکا اور میرؔ کو بلانے کی تجویز مسترد کردی گئی تو ان کی جگہ مظہر علی خاں ولاؔ، اور کاظم علی جواںؔ کالج کے منشی مقرر ہوئے اُردو کے کسی تذکرے میں ولاؔ کا حال تفصیل سے درج نہیں جستہ جستہ حال بعض تذکروں میں ملتا ہے۔ مظہر علی خاں کا نام مرزا لطف بھی تھا۔ مگر وہ مظہر علی خاں کے نام سے ہی مشہور ہوئے۔ شروع میں ولاؔ نظام الدین ممنونؔ کے شاگرد تھے۔ اور جب ۱۸۰۰ء میں کلکتے آئے تو اس وقت مرزا جان طپش دہلوی کا کلکتے میں شہرہ تھا ولاؔ نے ان سے بھی مشورۂ سخن کیا تھا۔

ولاؔ کا حال ان کے کلیات کے خطی نسخہ کے دیباچے میں ان کے دوست کاظم علی جواںؔ نے فارسی میں لکھا ہے۔

"کاظم علی بہ سمع اہل دانش و فرہنگ می رساند کہ ایں دیوان مظہر فصاحت و مجمع بلاغت ریختۂ فکر صواب گزیں دردلئے اعجاز آئیں مستجمع کمالات صوری و معنوی، ناظم مملکت فارسی و ہندی، کشور معجز بیانی یوسف بازار حسن معانی یعنی مظہر علی خاں متخلص ولاؔ است کہ نام نامی بزرگوارش سلیمان علی خاں متخلص بہ وداد بود...... الخ"

جواںؔ نے مظہر علی خاں کے خاندانی حالات وہی لکھے ہیں جو جہانگیر شاہی کے دیباچے

میں وؔلا نے خود بیان کئے ہیں۔ بقول کاظم علی جوآں مظہر علی خاں کے جد امجد آقا محمد صادق ترک النسل تھے۔ اور اصفہان سے شاہ جہاں آباد آئے تھے۔ آقا محمد حسین ان کی اولاد ہیں اور وؔلا کے دادا تھے۔ نواب سعد الدین خاں بہادر کی وساطت سے محمد شاہ کے دربار میں ان کی رسائی ہوئی۔ اور ان کے مرتبہ ذاتی صفات، کمالات اور خوبیوں کے پیش نظر محمد شاہ نے رسالداری اور داروغگی کی خدمات پر مامور کیا۔ اور علی قلی خاں کے خطاب سے سرفراز کیا۔ علی قلی خاں کی وفات پر ان کے بڑے بیٹے محمد زماں مخاطب بہ سلیمان علی خاں متخلص بہ وؔداد اپنے اوصاف حمیدہ اور کمالات علمی کی بدولت نواب نجم الدولہ محمد اسحاق خاں بہادر نواب شہر کے توصل سے منگباشی کے منصب پر سرفراز ہوئے۔ نواب صاحب جوہر شناس تھے۔ ان کے علم کی نواب صاحب نے بڑی قدر کی۔ وہ ان کے ہمراز دوست ہو گئے۔ شاہ عالم بادشاہ کے عہد سلطنت میں نواب عزت الدولہ صولت جنگ خاں بہادر کی رفاقت اختیار کی اور فارسی و ہندی (اردو) زبان میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ مرزا وداد اپنے زمانے کے ایک کامیاب شاعر تھے۔ اور استاد مانے جاتے تھے۔ مرزا رفیع سوؔدا اپنے ودادؔ ہی کے شاگرد تھے اور مرزا وؔداد نے بھی ان سے اصلاح لی تھی۔ دیباچے میں کاظم علی جوان نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"فخر الشعراء رفیع سوؔدا خاکسار خادم قدم شریف سرمایہ افتخار ریختہ گوئی از تلمذ آنجناب اندوختہ۔ و مرزا احمد علی موجد طرز اشعار فارسی از فیض مصاحبتش آموختہ[1]"

یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ احمد شاہ ابدالی کی دلی پر چڑھائی اور

[1] دیکھئے دیوان وؔلا خطی نسخہ دیباچہ ورق ۳

تاخت و تاراج کے وقت وداد کا فارسی اور اردو کلیات بھی تاراج ہو گیا۔ کاظم جواں نے وداد کے فارسی اشعار بھی نقل کیے ہیں ؎

سراز جور تو ہر چند بیداد م رفت — تا بکوئی تو رسیدم ہمہ از یادم رفت

وفا را اگر طلبی از تلاش پا ئی بکش — زگردش است نہ ایں آسماں بجائے خود است

وداد ایا کہ تواں گفت طرفہ حالت ایں — کہ دل نماندہ غم ہمچناں بجائے خود است

باید وداد مسلک آموختن — با دوستاں بلطف با دوستاں مدارا

پندرہویں جمادی الاول ۱۱۸۱ھ کو وداد کا انتقال ہوا۔ فارسی کے اس کامیاب شاعر وداد کے سب سے چھوٹے صاحبزادے مظہر علی خاں ولا تھے۔ ولا کا سنہ پیدائش معلوم نہیں۔ لیکن کوائف سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں ۱۱۷۵ھ کے لگ بھگ دہلی میں پیدا ہوئے۔ باپ کی وفات پر ولا نے سیف الدولہ بخشی الملک بخت قلی خاں بہادر مظفر جنگ کی رفاقت اختیار کی اور پھر شہزادہ جہاندار شاہ ملقب بہ صاحب عالم کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور پھر کچھ دنوں تک نواب آصف الدولہ کے دربار میں رہنے کے بعد مہاراجہ ٹکیٹ رائے بہادر سے رشتہ جوڑا۔ جب رائے بہادر کا زوال ہوا اور آزادی و خودمختاری جاتی رہی تو کچھ دنوں تک ولا گھومتے رہے لیکن بیکاری کا یہ چکر بہت دنوں تک نہیں رہا۔ تقدیر نے پھر یاوری کی اور ۱۸۰۰ء میں جعفر خاں بہادر کی وساطت سے ولا مسٹر اسکاٹ کے نوکر ہوئے اور مارچ ۱۸۰۰ء میں مسٹر اسکاٹ کے ہمراہ کلکتہ آئے اور ان کی سفارش پر جان گل کرسٹ نے ولا کو فورٹ ولیم کالج میں درس و تدریس کے علاوہ ترجمہ تالیف اور تصنیف کے کام پر مامور کیا۔

اس میں فورٹ ولیم کالج سے ہی ولا کی ادبی زندگی کا آغاز باضابطہ ہوتا ہے۔ ولا اسی فورٹ ولیم کالج کے ان خوش نصیب منشیوں میں ہیں جنکو دائمی شہرت نصیب ہوئی۔ یوں تو ولا کو اردو ادب میں نثر نگار کی حیثیت سے شہرت ملی لیکن وہ نثر سے زیادہ کامیاب اور قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ اُنھوں نے ہر صنف شاعری پر طبع آزمائی کی۔ ان کے کلیات کے خطی نسخہ میں غزلیات کے علاوہ قصائد، رباعیات، ترجیع بند اور قطعات سب ملتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نثر نویسی میں اپنا پورا وقت اور زور دماغ صرف نہ کرتے تو اپنے عہد کے ایک عظیم شاعر ہوتے اور ان کو کامیاب اور منفرد شاعروں کے خانے میں ضرور رکھا جاتا۔

ولا بھی زود نویس تھے۔ انھوں نے کالج کے دس سال میں سات آٹھ کتابیں ترجمہ اور تالیف کیں۔ ولا کی مشہور و معروف کتابوں میں جہانگیر شاہی تاریخ شیر شاہی، بے تال پچیسی، ہفت گلشن، مادھونل اور کام کنڈلا اور کلیات ولا ہیں۔

بے تال پچیسی ولا کی یہ کتاب بھی عوام میں بے حد مقبول ہوئی بے تال پچیسی دراصل راجہ بکرماجیت کے عہد کے قصے ہیں۔ اس کے متعلق ولا نے خود لکھا ہے کہ راجہ جے سنگھ والی جے نگر کے سورت نام کیشور سے کہا کہ بے تال پچیسی کو جو زبان سنسکرت میں ہے اس کو تم برج کی بھاکا میں کہو تب، اس نے موجب حکم راجہ کے برج کی بولی میں کہی نواب عالی گوہر بادشاہ کے عہد کے بیچ اور عہد میں امیر الامرا زبدۂ نوئیان عظیم الشان مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان اشرف الاشراف مارکوئس ولزلی بہادر گورنر جنرل ممالک محروسہ سرکار کمپنی انگریز متعلقہ کشور ہندوی شاہ عالم بادشاہ غازی کے مظہر علی خاں شاعر جس کا تخلص ولا ہے، واسطے سیکھنے اور

سمجھنے صاحبان کے بموجب زمانے جناب گل کرسٹ صاحب دام اقبالہ سے کے زبانِ سہل میں جو خاص وعام بولتے ہیں اور برج کی بھاکا کے اکثر الفاظ اسمیں ہوتے، سنہ ۱۸۰۲ء میں للولال جی کب کے تعاون سے ترجمہ کیا[1]۔"

جیسا کہ دیباچہ سے ظاہر ہے، بے تال پچیسی سورت کبیشور کی برج کتاب کا براہ راست ترجمہ ہے۔ ولا نے اس کتاب میں برج اور ہندی الفاظ جوں کے توں رہنے دئے ہیں۔ یہ کتاب فارسی اور دیوناگری لپیوں میں شائع ہوئی تھی۔

اس میں پچیس کتھائیں ہیں جنھیں بے تال نامی ایک تیلی نے بھوت بن کر راجہ بکرماجیت کو سنائی تھیں۔ یہ کہانیاں عبرتناک اور اخلاق آموز ہیں۔ ان کہانیوں میں اس عہد کے سماجی اور سیاسی حالات کے علاوہ عورت کی چھل کپٹ، سادھوؤں کی ابلہ فریبی، زر اور زمین کے لئے قتل اور خون کی داستانیں قدیم روایتی ناصحانہ انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ بے تال پچیسی اس طرح شروع ہوتی ہے۔

"دھارانگر نام ایک شہر تھا کہ وہاں کا راجہ گندھرپ سنگھ سین اور اسکی چار رانیاں تھیں۔ ان چار رانیوں سے اس کے چھ بیٹے تھے۔ ایک سے ایک پنڈت اور زور آور تھا۔ قضائے کردگار، بعد چند روز کے وہ راجہ مر گیا۔ اور اس کی جاگہ (جگہ) بڑا بیٹا سنگ رام راجہ ہوا۔ اس کے چھوٹے بھائی بکرم نے بڑے بھائیوں کو مار کر آپ راجہ ہوا اور بخوبی راج کرنے لگا۔ دن بدن اس کا راج بڑھتا گیا اور اتنا بڑھا کہ تمام جنبو (جنوب) دیس کا راجہ ہوا[2]۔"

بے تال پچیسی کی تمام کہانیاں دلچسپ ہیں۔ اس کی پہلی کہانی جو بے تال بکرم

---

[1] ملاحظہ ہو قلمی نسخہ بے تال پچیسی، ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری ص۲۔ [2] خطی نسخہ ص۹

کو سناتا ہے۔ خوبصورت، لطیف اور نصیحت آموز ہے۔

"ایک راجہ پرتاپ مکٹ نام بنارس کا تھا۔ اس کا ایک بیٹا تھا بجر مکٹ نام، جس کی رانی مہادیوی تھی۔ ایک دن اپنے دیوان کے بیٹے کو لیکر شکار کو گیا۔ اور بہت دور جنگل میں جا نکلا۔ اور اس کے بیچ ایک سندر تالاب دیکھا اور اس کے کنارے ایک خوبصورت ہرن[1]...... الخ

بے تال نے باری باری راجہ بکرم کو ۲۴ کتھائیں سنائیں۔ راجہ بکرم کی معصومیت پر اسے ترس آنے لگا۔ اس نے اپنی ۲۵ ویں کتھا اس طرح شروع کی۔

"راج دکھن دیس میں دھرم پور نگر ہے۔ وہاں کے راجہ کا نام مہابل تھا۔ ایک سمے اس دیس کا ایک اور راجہ فوج لے کر چڑھ آیا۔ جب سینا اس کی مل گئی (دشمن سے) اور کچھ کٹ گئی، تب لاچار رانی کو بیٹی سمیت لے جنگل کی راہ لی۔ جنگل میں راجہ ایک جنگلی قوم کے ہاتھ لڑتے لڑتے مارا گیا۔ مگر رانی اور راج کنیا بچ نکلیں۔ وہ راستے میں بھٹک رہی تھیں۔ جنگل میں راجہ چندر سین اور اس کے بیٹے شکار کھیل رہے تھے۔ دونوں کو بھٹکتے بھٹکتے مل گئیں۔ رانی اور راج کنیا کو دلاسا دے کر گھر لے آئے راجہ نے راج کنیا کو اپنے پاس رکھا اور راج کنور نے رانی کو۔[2]"

جب کہانی یہاں تک پہونچتی ہے تو بے تال راجہ بکرم سے دریافت کرتا ہے راجہ ان کی اولادوں کا کیا رشتہ ہوگا۔ راجہ بکرم سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ کوئی جواب نہیں بن پڑتا۔ بے تال کو راجہ اگیان پر ترس آجاتا ہے۔ جوگی کا ڈھونگ، فریب اور ریاکاری سب کچھ بتا دیتا ہے۔ اور بھوت کی باتوں پر عمل کر کے بکرم جوگی کو

---

[1] قلمی نسخہ ص۱۱ [2] دیکھئے خطی نسخہ ص ۱۲۶

کو ختم کر دیتا ہے۔ اور عیش و عشرت سے راج کرتا ہے۔

بیتال پچیسی اس کتاب پر ختم ہوتی ہے اس کی تمام کہانیاں اپنے دامن میں نصیحت کے انمول موتی سمیٹے ہیں لیکن وِلا کی دوسری تالیفات کی بہ نسبت اس کی زبان مختلف ہے۔ اس میں سنسکرت اور برج بھاشا کے وقت کے متروک الفاظ کی کثرت ہے۔ وِلا نے مرگھٹ، سنسر شدہ، استنٹ، مستان وغیرہ بے تکلف استعمال کئے ہیں جس کی وجہ سے عبارت میں جھول اور ثقل پیدا ہو گیا ہے اور پڑھتے وقت ذہن کو الجھن ہونے لگتی ہے۔ بیتال پچیسی بھی کئی بار شائع ہوئی ہے لیکن اس کا خطی نسخہ اور مطبوعہ ایڈیشن کی عبارت میں بہت فرق ہے۔ کئی کہانیوں میں بھی کچھ رد و بدل ہوا ہے۔

ہفت گلشن ہفت گلشن وِلا کی دوسری مقبول کتاب ہے ہفت گلشن بھی ترجمہ ہے۔ ناصر علی خان بلگرامی کی فارسی کتاب ہفت گلشن کا۔ اس کے ترجمہ کا سبب مظہر علی خاں نے دیباچے میں خود بیان کیا ہے۔ کہ مارکویس ولزلی کے عہد میں ڈاکٹر جان گل کرسٹ کے ایماپر نو آموز صاحبان کے لئے اُردو زبان میں اسے منتقل کیا۔ ہفت گلشن کا سنہ تالیف ۱۲۱۶ھ ہے۔ وِلا نے اختتام پر خود بھی تاریخ درج کی ہے۔

"شکر اس خدا کا کہ جس کے فضل و عنایت سے یہ نصیحت آموز کتاب ہفت گلشن تاریخ چودھویں جمادی الثانی ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۱ء روز جمعہ دوپہر اول وقت نماز ظہر شہر کلکتے میں بہ محاورہ اُردو زبان و تاریخ سمیت ختم ہوئی[1]"

[1] دیکھئے قلمی نسخہ گلشن ہند صفحہ ۶

ہفت گلشن کا حجم مختصر ہے۔ اس کا قلمی نسخہ ۶ × ۱۰ سائز ہے۔ و ۱۰۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر گلشن میں کئی کئی چھوٹی نصیحت آموز کہانیاں آسان زبان میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن ولاؔ کی طرزِ تحریر گنجلک اور بھونڈی ہے۔ اگرچہ دلچسپ ہے چھوٹی حکایات کے باوجود تعقید لفظی، مصنوعی عبارتیں اور غلط تراکیب اور بھونڈی تشبیہیں سماعت پر بار گراں گذرتی ہیں۔ ہفت گلشن کی مقبولیت میں یہ بڑی رکاوٹیں ہیں۔

ہفت گلشن جیسا کہ نام سے ظاہر ہے عبارت ہے سات ابواب سے پہلا گلشن بعض نصیحتوں کے متعلق ہے۔ دوسرا زمانے کے تبدیل ہونے پر مشتمل نصیحت مصلحت پر، تیسرا آداب گفتار، چوتھا مباحثے کے آداب۔ پانچواں آداب نوکری کے۔ چھٹا حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب کے نصائح اور ساتواں حضرت محمدؐ کے کلمات طیبات سے عبارت ہیں ہے پہلے گلشن کی پہلی حکایت ہے۔۔۔

پہلی حکایت زاغ کے ساتھ روباہ کے،

کہتے ہیں کہ ایک روز ایک کوا انبا کی ڈال پر بیٹھا تھا اور ایک آم گدرا چونچ میں لئے تھا کہ ناگاہ لومڑی درخت کے نیچے آئی اور کوے کے منہ میں کھنے گدھ کچا انبا (آم) ہے گا۔ یہ دیکھ کر کے بہت خوش ہوئی اور نہایت تمنا سے کہا اے زاغ میرے تئیں ایک مدت ہوئی کہ بہ تیں ظرافت آمیز تیری نہیں گر اس دم میرے سرس تھ کچھ باتیں کرے تو کیا خوش ہوں۔ زاغ نے جب یہ حال سنا تو اس کے حال پر رحم آیا۔ چاہا کہ کچھ میٹھی میٹھی باتیں کرے۔ ہنوز بات درست ہونٹوں سے نہ نکلی تھی کہ وہ انبا اس کے ہونٹوں سے گرا اور روباہ نے

اسے زمین سے اٹھا کر افتاں وخیزاں راہ جنگل کی لی - فائدہ اس قصہ کا یہ ہے کہ ہرگز کسو (کسی) کی باتوں پر فریفتہ نہ ہووے۔[1]"

چھٹا گلشن امیر المومنین حضرت علی کی نصیحتوں سے پُر ہے۔ اس باب میں ۸ نصیحتیں درج ہیں۔

"پہلی نصیحت ہے عزیز حق تعالیٰ کے سوا اعتماد نہ کرنا پشیمان نہ ہووے تو دوسری حق سبحانہ تعالیٰ سے غافل مت رہ، تا نزدیک تیرے شیطان راہ نہ پاوے تیسری کسی چیز پر مغرور نہ ہو، کیونکہ ہلاک نہ ہووے۔ چوتھی دل خالی رکھ تا آرام پاوے پانچویں سوائے ذات حق تعالیٰ کے اپنا دوست نہ کر کسی کو تو خراب نہ ہووے تو۔[2]"

آخر میں ساتواں گلشن ہے جس میں انیس نصیحتیں قلمبند کی گئی ہیں

"پہلی باعلی علم سیکھ کہ فائدہ دین و دنیا کا حاصل ہو، دوسری علماء کے ساتھ محبت رکھ ..... تیسری کاہلی نہ کر کام دین و دنیا کا اس سے آراستہ ہوتا ہے چوتھی غسل روز جمعہ کا ناغہ نہ کر تو کہ گناہ ترے درختوں کے پتوں کے جھڑ جائیں۔ پانچویں نماز جماعت میں پڑھ کہ ایک رکعت کا ثواب برابر ہزار رکعت کے ہے۔[3]"

اس طرح رسول صلعم کی انیس نصیحتیں دی گئی ہیں۔ ہر نصیحت نیکی اور سبق لئے ہے ۱۸ویں نصیحت میں کہا گیا ہے کہ سفر کے وقت پہلی منزل بڑی معلوم ہوتی ہے اور درماندگی کا احساس انسان کو پریشان کر دیتا ہے۔ اس لئے سفر پر روانہ ہوتے وقت گھر سے باہر قدم ڈالتے ہی تین بار آیت الکرسی اور سورہ فاتحہ پڑھے کہ جس کام کو جاوے گا وہ کام بخوبی سرانجام پاوے گا۔[4]"

---

[1] دیکھیے قلمی نسخہ ہفت گلشن ورق ۳ [2] ورق ۲۸ [3] ایضاً ورق ۲۹ [4] ن ورق ۲۹، ۵۸

ہفت گلشن کے خاتمہ پر ولا نے کوئی تاریخی قطعہ نہیں لکھا ہے۔ ہفت گلشن مذہبی کتاب ہے۔ اور اس کی نصیحتوں پر عمل کر کے اپنی زندگی کے ساتھ اپنی عاقبت بھی سنوار سکتا ہے۔ اس اعتبار سے ولا کی یہ کتاب مفید ہے۔

جہاں گیر شاہی ولا کا تیسرا کارنامہ جہاں گیر شاہی ہے۔ یہ دراصل اقبال نامۂ جہانگیر کا ترجمہ ہے۔ ولا نے ۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸۰۵ء میں لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر کے عہد میں کپتان جیمس موئیٹ کے ایما پر اقبال نامۂ جہانگیر کا ترجمہ اردو میں کیا تھا اور نام اس کا جہاں گیر شاہی رکھا[1]۔

جہاں گیر شاہی میں عہد اکبری کے آخری ایام میں فتوحات، جنگیں، سماجی کشمکش سیاسی قلابازی اور دشمنوں کے ساتھ جہانگیری سپاہ کی خونریز معرکہ آرائیوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ جہاں گیر کے عہد میں یہ تاریخ ترتیب پائی تھی۔ اس لئے اس عہد پر لکھی جانے والی تاریخوں کے لئے ماخذ سمجھی جاتی ہے۔

جہانگیر شاہی نور محمد خاں جہانگیر کی تخت نشینی اور زمام سلطنت ہاتھ میں لینے کے حال سے شروع ہوتی ہے۔

جمادی الثانی کی گیارہویں تاریخ پنجشنبہ کے روز ایک ہزار چودہ ہجری میں منجمان ہند نے جس وقت مبارک اور نیک ساعت اختیار کی تھی۔ تخت سلطنت و سریر خلافت نے اکبرآباد کے قلعہ میں اللہ تعالیٰ اسے جمیع مکروہات آفات سے اپنی حفاظت میں رکھے۔ بہ سبب جلوس جہاں افروز کے بلندی فلک کیسی اور روشنی مہر و ماہ کیسی پائی۔ جہانگیری اور گیتی ستانی کا خطبہ اس کے نام پڑھا گیا اور القاب

---

[1] دیکھئے ق ن جہانگیر شاہی ص۴

بزرگ ساتھ خوشی خرمی کے سننے والوں کے کان میں پہونچا اور دولت واقبال کے سکے نے اسم مبارک سے چہرہ مراد کا روشن کیا، اور جب خطیب نے القاب بزرگ حضرت شہنشاہی سے زبان کو در بار کیا، خرمن خرمن زر و گوہر نثار ہوا۔ محتاجوں کے دلوں کی مراد برآئی اور آرزومندوں نے جیب اپنی کو موتیوں سے بھرا اور زر مسکوک نے مراد کا چہرہ تازہ روئی سے روشن کیا۔ خطاب مبارک القاب ابو المظفر نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی کے زمانوں پر لکھا گیا۔[۱]

اس کے بعد ولانے خسرو پرویز کی بغاوت اور شکست کا حال درج کیا ہے۔ ولانے بھی فارسی کتاب کے انداز میں عنوانات قائم کئے ہیں۔

"شروع احوال سال اول جلوس میمنت مانوس جہانگیری سے اور بھاگنا خسرو کا اکبرآباد سے پنجاب کی طرف اور متوجہ ہونا بادشاہ کا اسکے تعاقب میں۔"

جہانگیر شاہی کے عنوانات سے پتا چلتا ہے کہ جہانگیر شاہی بھی افسانوی رنگ میں لکھی گئی اور تاریخی واقعات سے زیادہ افسانے بیان کئے گئے ہوں گے۔ ولا کا انداز ترجمہ کا بڑا شگفتہ ہے۔ اس میں بے پناہ روانی ہے اور دوسری تالیفات سے بالکل جدا نظر آتی ہے مگر فارسی کا اثر اس پر بھی غالب نظر آتا ہے خسرو کی بغاوت کے حال میں لکھتے ہیں۔

ماہ ذی قعدہ کی گیارہویں تاریخ ۱۰۱۴ھ میں نیر اعظم نے ساعت نیک میں حمل سے آ بیت الشرف میں تحویل کی۔ ابتدا سال جلوس کی میمنت خوش وخرمی سے شروع ہوئی۔ اور زمانے کے خاک نشیں وافسردہ دل سرگرم نشاط ہوئے۔

---

[۱] دیکھئے خطی نسخہ جہانگیر شاہی ورق ۱۴۔

یہ بھی ہے

درخت گل میں لگے غنچے، بلبلیں ہیں مست — سبھوں کی محفلِ عیش و نشاط میں ہے نشست
ہوا بہ پائے طرب سبزہ پائمال تمام — کرے وجد میں اگر ہر ایک جو ہر دم جست[1]

جہانگیر شاہی کا خطی نسخہ جو ایشیاٹک سوسائٹی کتب خانہ میں محفوظ ہے کئی کئی آدمیوں کے ہاتھ کا تحریر کردہ معلوم ہوتا ہے۔ کم از کم تین آدمیوں نے یہ نسخہ لکھا ہے۔ ولاؔ کی تمام کتابوں میں جہانگیر شاہی سب سے زیادہ ضخیم ہے۔ اس کا خطی نسخہ ۸۹، صفحات پر ۶ × ۱۰ سائز میں پھیلا ہوا ہے۔ اقبال نامہ جہانگیری میں جہانگیر کے جلوس فتوحات اور شورشوں کا حال لکھا ہوا ہے، اس لئے بادشاہ کی بہادری و شجاعت اور سخاوت و دریا دلی کے قصے مبالغہ کی سرحد میں داخل ہو جاتے ہیں اور جہانگیر کے ہر کمزور پہلو اور کردار کی ہر خرابی کو ڈھانپنے کی سعی بلیغ کی گئی ہے۔ اس کی حکومت، ذاتی دانائی اور عہد سلطنت میں دولت کی ریل پیل اور خوشحالی کے ذکر میں مبالغہ کا دریا بہا دیا گیا ہے۔ والیٔ بنگالہ شیر افگن کے متعلق جو باتیں اس میں ملتی ہیں ان سے ہی مبالغہ، جھوٹ اور واقعاتی غلطیوں کا ثبوت مل جاتا ہے۔

مرزا غیاث بیگ کی بیٹی مہر النسا کے (کی) شادی علی قلی بیگ (شیر افگن) سے کردی اور شیر افگن کے خطاب سے سرفراز کیا۔ . . . اور بادشاہ ہونے کے بعد بنگالے کے صوبے میں جاگیر مرحمت کی۔ اس طرف رخصت کیا۔ قطب الدین خاں کے مرے جانے کا احوال سابق ورقوں میں لکھا گیا ہے اور جب شیر افگن اپنے مکافات عمل میں گرفتار ہوا۔ آوارۂ صحرائے عدم کا ہوا مطابق حکم حضور کے قطب الدین

---
[1] ورق ۲۲ ب قلمی نسخہ

کے بیٹے اور اس کے ہمراہیوں نے مرزا غیاث کی بیٹی کو جو جلوس اشرف کے بعد اعتماد الدولہ کے خطاب سے سرفراز ہوا تھا بنگالے سے حضور والا کی طرف روانہ کیا۔ ۔ ۔ ۔ اور جب خواب غفلت سے طالع جاگی نیک بختی حاصل ہوئی، دولت جلوہ آرا ہوئی زمانہ نے مشاطہ گری کی، غنچہ ہوس نہال اُمید کا تازہ ہوا۔ آرزو نے ہر طرف سے ہجوم کیا۔ بند دروازوں کے لئے کنجی آئی۔ خستہ دلوں کو شفا ہوئی۔ الغرض جشن نوروز، جہاں کے درمیان بادشاہ کی حرموں کے زمرہ میں داخل ہوئی۔ ۔ ۔ ۔ اور کتنے روزوں کے بعد نور جہاں بیگم کا خطاب مرحمت ہوا[۱]۔"

شیر افگن کے قتل اور نور جہاں کے ساتھ جہانگیر کے نکاح ثانی کے حال میں کوئی ایسی بات نہیں لکھی گئی جس سے جہاں گیر کے کردار پر معمولی دھبہ بھی آتا ہو مہر النسا اور جہانگیر کے معاشقے کا حال بھی حذف کر دیا گیا ہے۔ الٹے شیر افگن کو غدار، بد کردار اور مکار لکھا گیا ہے جو یقیناً درست نہیں ہے۔

جہاں گیر شاہی کی یہی کمزوریاں اور واقعاتی غلطیاں اسے قابل وثوق کتاب قرار دینے میں مانع ہوتی ہیں لیکن اس میں وِلّا کا کچھ قصور نہیں۔ کیونکہ جیسے دیباچے میں بیان ہوا ہے یہ اقبال نامۂ جہانگیر کا حرف بحرف ترجمہ ہے۔ اور ترجمہ میں وِلّا کامیاب ہیں۔ ان کا انداز بیان بھی اچھا ہے۔ اس میں برج یا سنسکرت کے نامانوس الفاظ کے استعمال سے پرہیز کیا گیا ہے۔ جہانگیر شاہی میں عہد جہانگیر کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی کے واضح اور نمایاں خاکے بھی ملتے ہیں۔ گو واقعاتی غلطیوں نے ان خاکوں پر غلط رنگ بھی تھوڑا بہت چڑھا دیا ہے۔

---

[۱] ق ن جہانگیر شاہی ورق ۸۰

جہانگیر شاہی کے ترجمے کو حسن علی خاں عرف مرزا جوآن نے بے حد پسند کیا تھا جس کی تصدیق وِلا کے اس بیان سے ہوتی ہے۔

جب جہانگیر شاہی کو شاعر بے ہمتا زبان داں یکتا فصاحت میں بے نظیر، ملاحت میں بے عدیل حسن علی خاں عرف مرزا کاظم علی جوآن نے ملاحظہ کی (کیا) بہت سی تعریف و توصیف از راہ الطاف و مہربانی زبانِ مبارک سے یہ قطعۂ تاریخ موزوں کیا۔ احقر نے اس ترجمہ کی زیب و زینت کے لئے اس کو مندرج کیا ؎

جہانگیر کا جو ہے اقبال نامہ — یہ اردو زباں ترجمہ دل کو مرغوب
کیا لفظاً لفظاً اسے جواں وِلا لے — ہوئی طبع کو میری تاریخ مطلوب
سنہ عیسوی میں زباں سے یہ نکلی — ہوا ہے وِلا ترجمہ تجھ سے خوب[1]

وِلا کی تاریخ جہانگیر شاہی بھی شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکی ہے اور اب اس کے چھپنے کی بھی امید نہیں۔

تاریخ شیر شاہی جہانگیر شاہی کے چار سال قبل جان گل کرسٹ کے قائم مقام کپتان جیمس موئیٹ کی فرمائش پر وِلا نے تاریخ شیر شاہی کا ترجمہ کیا۔ تاریخ شیر شاہی کے ترجمے کے متعلق وِلا نے لکھا ہے کہ

"ترجمہ تاریخ شیر شاہی کا پانچویں تاریخ جمادی الاول بعد از نماز جمعہ سن بارہ سو بیس ہجری مطابق دوسری ماہ اگست ۱۸۰۵ء میں سرانجام ہوا"[2]

بے مثال کیسی اور ہفت گلشن سے فراغت پانے کے بعد وِلا نے تاریخ شیر شاہی کا ترجمہ شروع کیا تھا۔ اس میں تاریخ شیر شاہی مغل اعظم شہنشاہ اکبر کے حکم سے

---

[1] ملاحظہ ہو قلمی نسخہ جہانگیر شاہی ۲۹۲ ورق ۵۹۹ء [2] ملاحظہ ہو دیباچہ شیر شاہی ق ن ص ۲

عباس خاں لگبور نے ہمایوں اور شیر شاہ کے واقعات فارسی میں لکھے تھے اور اپنی اس کتاب کا نام تاریخ شیر شاہی رکھا تھا۔ تاریخ شیر شاہی کے دیباچہ سے پتا چلتا ہے، کہ شیر شاہ کی اوائل زندگی، ہمایوں کے ساتھ لڑائی، سلطنت پر قبضہ، افغان حکومت کی بحالی اور مغلوں کی شکست، شیر شاہ کے جانشینوں کی نا اہلی اور ہمایوں کی مراجعت کا حال ایمانداری سے بیان کیا گیا ہے۔ عباس خاں لگبور نے یہ کتاب جلال الدین اکبر بادشاہ کے حکم سے تصنیف کی تھی۔ لیکن اس نے واقعات بیان کرنے میں ایمانداری کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور صحیح حالات اور واقعات لکھنے کی سعی بلیغ کی ہے اقبال نامۂ جہانگیر کی طرح اس میں مغلوں کی عظمت اور شجاعت کی افسانوی داستان بیان نہیں کی گئی ہے۔ ولا نے تاریخ شیر شاہی کا بے کم و کاست ترجمہ کیا۔ تاریخ شیر شاہی شروع ہوتی ہے۔

"حمد و ثنا اُس خالق خلق کے لئے لائق ہے جس نے عادل بادشاہوں کی تیغ آبدار کے ابر سے سر سبزی عطا کی اور والا قدر بادشاہوں کی تیغ سیاست سے فتنہ و فساد کے کدورت و غبار کو دنیا و دین کے گھر کے صحن سے ..... کیا، درود بے شمار راہ ہدایت کے ہدایت کرنے والوں پر کہ وے راہ گمراہی سے بھٹکے ہوؤں کو ہدایت کی شاہراہ میں پہنچا دیتے ہیں، ہو جیو۔ تحفہ اکبر شاہی کا تیسرا طبقہ گروہ سور کی سلطنت کے احوال میں کہ وہ لودی پٹھانوں کی قوم میں سے تھا۔ فصل تین باب پہلا باب کہ شیر خاں سور کی سلطنت کے بیان میں۔ دوسرا باب شیر خاں کے بیٹے اسلام خاں کے بعد، سلطنت کا دعوی کر کے خطبہ و سکہ اپنے نام کا پڑھوایا اور جاری کیا۔"[1]

---

[1] ملاحظہ ہو ق، ن صد

جیسا کہ فارسی دیباچہ سے ظاہر ہے کہ اس کتاب کا اصل نام تحفہ اکبر شاہی ہے جس کے تیسرے طبقے کے حصے کا ترجمہ ملّا نے تاریخ شیر شاہی کے نام سے کیا۔ اکبر کے عہد کے واقعات مہمات، لڑائیوں اور فتح و شکست اور نظام حکومت کا جو مفصل حال ہے، اس حصہ کا ترجمہ نہیں ہو سکا ہے۔ تاریخ شیر شاہی، شیر شاہ سوری کے عہد حکومت اور اس کے جانشینوں کے اقتدار کے حصول کے لئے خانہ جنگی اور شاہ ہمایوں کے ساتھ شیر خاں کی معرکہ آرائیوں کی دستاویزی تاریخ ہے۔ عباس خاں لکھنور بن شیخ علی شروانی نے اس میں ہمایوں اور شیر شاہ کی جنگوں کا، مغل افواج کی پسپائی، ہمایوں کی شکست اور فرار کا حال بے کم و کاست لکھا ہے، کہیں لیپ پوت کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس کتاب کی یہی بہت بڑی خوبی ہے اور شیر شاہ اور ہمایوں کے عہد کا قابل وثوق ماخذ کی جاتی ہے۔

تاریخ شیر شاہی میں شیر خاں کی ابتدائی اور گھریلو زندگی پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے شیر خاں کے دادا سے واقعات شروع ہوتے ہیں اور پوتے پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ خاندانی نیز وہ واقعات بھی نظر انداز نہیں کئے گئے جن کا شیر خاں کی بعد کی زندگی پر اثر پڑا تھا۔ سوتیلی ماں کی ناراضی، سات بھائیوں کی شیر خاں کے ساتھ عداوت اور دشمنی، باپ کا عتاب اور شہر بدر ہونے کا حال بھی بڑے دلچسپ پیرائے میں تحریر ہوا ہے۔

دلی سلطنت پر قبضہ کے قبل جاگیر کے انتظام اور انصرام میں شیر شاہ نے جس فراست ذکاوت اور ہوشمندی کا ثبوت دیا تھا وہ اس کے مستقبل میں ایک عظیم حکمراں بننے کے نشان وہ تھے۔ اور ہوا بھی ایسا ہی۔ شیر شاہ کے باب میں اس کی فراست، ذکاوت اور شجاعت کا حال بھی ایمانداری سے بیان کیا گیا ہے جس سے اکبر کی فراخدلی اور وسیع القلبی کا مظاہرہ ہوتا ہے اور یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ واقعات کی ترتیب

کے وقت عباس خاں پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا۔ اور انھیں تمام واقعات صحیح صحیح بیان کرنے کی کھلی آزادی دی گئی تھی۔ تاریخ شیر شاہی، شیر خاں کے دادا ابراہیم خاں کے بیان سے شروع ہوتی ہے :-

"سلطان بہلول کے عہد میں شیر خاں سور کا دادا ابراہیم اپنے بیٹے حسن کو جو شیر خاں کا باپ تھا پٹھانوں کی بستی کے اس مقام سے کہ جسے پشتو میں ژغری اور زبان ملتانی میں روہری کہتے ہیں اور روہری ایک ٹکڑا پہاڑ کا ہے کہ کوہ سلیمان سے نکلا ہے۔ اس کا طول بگی سات کوس کا ہے۔ ہندوستان میں میٹھے خاں سور داؤد رجبل کے پاس بھیجا کہ جس کی جاگیر میں سلطان بہلول نے پرگنہ ہریانہ اور جھنگ کا عنایت کیا تھا، آکر اس کا نوکر ہوا اور بجواڑے میں رہنے لگا۔ سلطان بہلول کے عہد میں شیر خاں پیدا ہوا اور نام اس کا فرید رکھا۔[۱]"

سلطان بہلول کے عہد میں ملک میں بدنظمی، انتشار اور بدامنی کا حال اختصار سے بیان ہوا ہے۔ فرید خاں کی پرورش، ابتدائی تعلیم اور صغر سنی میں اس کی دانشمندی اور فراست کا حال عباس خاں لگبور نے اس چابکدستی سے بیان کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ شیر خاں کو قابلیت استعداد اور عظمت خدا کی جانب سے ودیعت کی گئی تھی۔ باپ کے ساتھ انتظام جاگیر سے متعلق عہد نامے سے شیر خاں کی عقلمندی، بزرگی اور ذکاوت کا پتا چلتا ہے۔

"اگر تم نے رعیت پر کچھ ظلم کیا ایسی سزا دوں گا نہ کسو نے دیکھی نہ سنی ہو گی بعد اس کے انھوں نے ظلم کرنا موقوف کیا۔ رعیت آباد ہوئی اور خزانہ معمور رہا۔ بادشاہ نے سرداروں کو القاب دئے اور سپاہی بھی آسودہ ہوئے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ یہ نتیجہ عدل وداد کا ہے

---

[۱] ملاحظہ ہو ق ۵ ورق ۹

اے پدر والا عز ور یا ملازموں سے کوئی پرگنے میں ظلم کریگا اگر سیاست کے لائق ہوگا سیاست کروں گا، ورنہ جاگیر اس کی ضبط کروں گا۔ جب میاں حسن نے (شیر خاں کی) یہ باتیں سنیں بہت خوش ہو کر کہا۔ سپاہیوں کی بحالی برطرفی وغیرہ کا تجھے مختار کیا اور جو کچھ تو کرے گا اس کے خلاف عمل نہ آئے گا[1]"

شیر خاں جوانی میں بابر کا ملازم ہوا تھا، وہ مغلوں کے تمام پہلوؤں سے واقف تھا مگر اس کے باوجود مغلوں کی زبردست عسکری طاقت سے وہ ٹکر لینے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ ہمایوں کے بھائی سلطنت پر قبضہ کرنے کے لئے ریشہ دوانیوں میں مصروف ہیں تو مغلوں کے خلاف اس نے افغانوں کو متحد کرنا شروع کیا۔

"جب شیر خاں نے معلوم کیا کہ اب پٹھان میرے ساتھ متفق ہیں اور مغلوں کی لڑائی پر دلیر ہیں۔ رہتاس کے پہاڑوں سے نکل کر ہمایوں بادشاہ کے لشکر کی طرف روانہ ہوا۔ اور ہر منزل میں لنگر باندھتا اور شہر شہر کو تھوڑا تھوڑا کوچ کرتا۔ جب ظل سبحانی نے سنا کہ شیر خاں آتا ہے بادشاہ نے بھی مراجعت فرمائی اس نے عرضی لکھی کہ اگر حضور سے بنگالے کا ملک بندے کو مرحمت ہو تو سکہ اور خطبہ بادشاہ کے نام کا رائج ہوئے[2]۔"

عباس خاں گکھور نے شیر خاں اور ہمایوں کی جنگ کی تفصیل وہی لکھی ہے جو دوسری مستند تاریخوں میں ملتی ہے۔ اور ہمایوں کی شکست اور بادشاہ بیگموں کی قید کا حال، شیر خاں ان کے ساتھ مؤدبانہ برتاؤ کا چشم دید شہادت کے حوالے سے لکھا ہے:-

"[3]— میں شیر خاں کے پاس کھڑا تھا کہ بیگم جمیع اور حرم محترم ہمایوں بادشاہ کی بہت سی رنڈوں کے ہمراہ لائے جس وقت شیر خاں نے ان کو دیکھا گھوڑے سے اتر کر

---

[1] ملاحظہ ہو خطی نسخہ ورق ۱۰-۱۷، [2] ایضاً ورق ۲۲-۲۵ [3] فورٹ ولیم کی تمام (ب ق ۹؍۱ ر)
(12)

بہت تعظیم و حرمت کی۔ [1]"

شیر خاں کے کردار کی یہی پختگی اور خوبیاں تھیں جو اسے ہندوستان کا ایک عظیم ، ہر دلعزیز اور نامور شہنشاہ بنا سکی تھیں ۔ اور اپنے چار سالہ عہد حکومت میں ایسے کارنامے سر انجام دئے تھے جو اس کی رعایا کے ذہن پر مرتسم ہو گئے تھے ۔ اور دنیا کی قومیں آج بھی اسے احترام اور عقیدت کی نظر سے دیکھتی ہیں ۔ اس نے اپنی حکمت عملی ، تدبر اور دانشمندی سے نظم و نسق کا ایک ایسا ڈھانچہ تیار کیا جو آج بھی بدلی ہوئی شکل میں موجود ہے ۔ اس کی ذہانت اور تدبر کا کمال تھا کہ مختصر عہد میں آپ نے ایک بڑی اور وسیع سلطنت کا ایسا بندوبست کیا کہ اس کی سلطنت میں امن و شانتی اور خوشحالی کا دور دورہ ہوا ، اور بدی کو نیکی کے ہاتھوں بری شکست ہوئی تھی ۔ اکبر اعظم نے بھی اسی کے بنائے ڈھانچے پر عظیم الشان سلطنت مغلیہ کا عالیشان قصر تعمیر کیا تھا ۔

ولاکی تاریخ شیر شاہی ختم ہوتی ہے :۔

"شیر خاں عقل و کاردانی میں یکتائے زمانہ تھا ۔ اور تھوڑے دنوں میں بندوبست ملک کا ، امن راہ اور آبادی ملک کی اور آسودگی رعیت و سپاہ کی تھی ۔ لکھا گیا ۔ تیسرا طبقہ تحفۂ اکبر شاہی کا ہے ۔ پٹھانوں کے احوال سے احوال بادشاہ یکتا اکبر کا ۔ [2]"

تاریخ شیر شاہی کا یہ خطی نسخہ ۶×۱۰ سائز پر ۱۰۲ اوراق پر پھیلا ہوا ہے ۔ خوبصورت نستعلیق میں لکھا ہے ۔ تاریخ شیر شاہی بڑی مفید تاریخ ہے ۔ یہ اردو ادب کی خوش قسمتی

(بقیہ صفحہ گزشتہ) کتابوں میں "عورت" کو رنڈی لکھا گیا ہے اس زمانے میں رنڈی عورت کے بدل میں استعمال ہوتی تھی ۔ اسکا غلط مطلب بعد میں نکالا گیا [1] دیکھئے خطی نسخہ ورق ۱۰۰ [2] ق ن ورق ۱۰۱ - ۱۰۲ ۔

ہے کہ پاکستان سے یہ مفید تاریخ حواشی، ترمیم اور اضافے کے ساتھ شائع کر دی گئی ہے۔ اس تاریخ میں افغان اور مغل سلطنتوں کے زمانے کی سماجی، سیاسی معاشی اور تہذیبی زندگی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ اور عہد وسطیٰ کے خوش حال اور آسودہ ہندوستان کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھیل جاتا ہے۔

مادھونل اور کام کندلا ولاؔ کا یہ ابتدائی نثری کارنامہ ہے۔ ولاؔ نے صاحبان کونسل اور جان گل کرسٹ کی فرمائش پر یہ کتاب سنسکرت سے ترجمہ کیا تھا۔ یہ رومانی داستان بھی قصہ گل بکاؤلی، حاتم طائی اور توتا کہانی کی طرح اپنے زمانہ میں بے حد مقبول ہوئی تھی۔

مادھونل اور کام کنڈلا، مدھو برہمن اور کام کنڈلا نامی ایک نرتکی (رقاصہ) کے معاشقے کا افسانہ ہے جس میں محبت تمام رسمی قیود کو توڑ دیتی ہے۔ اور طاقت اور حکومت کو بھی اس کے آگے پسپا ہونا پڑتا ہے۔ مادھو برہمن اپنی محبت کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اس افسانہ میں اس عہد کی سماجی زندگی شاہی پابندیوں میں جکڑی ہوئی سسکتی اور کراہتی ہوئی ملتی ہے۔ ۱۸۰۳ء میں ولاؔ کی یہ کتاب شائع بھی ہوئی تھی لیکن اس کا مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخہ اب نایاب ہے۔ مولف ارباب نثر اردو سید احمد نے لکھا ہے کہ اس کا خطی نسخہ برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے لیکن کلکتہ کے کسی بھی بڑے کتب خانہ میں اس کا کوئی نسخہ مل نہ سکا۔ ولاؔ نے یہ عشقیہ داستان بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کی ہے اور ترجمہ دوسرے ترجموں سے صاف ستھرا اور رواں دواں ہے۔ مادھونل اور کام کنڈلا کی یہ کہانی سنگھاسن بتیسی میں بھی دہرائی گئی ہے۔ موتی رام کبیشور نے برج بھاشا میں اس کا ترجمہ کیا تھا اور جواں

نے للولال کب کی معاونت سے کالج کے لئے آسان اُردو میں اس کا ترجمہ کیا تھا سنگھاسن بتیسی کی ۳۲ ویں کہتا، مادھونل اور کام کنڈلا کا افسانہ ہے ۔ غالباً سنگھاسن بتیسی میں کہانی درج کئے جانے کے باعث وِلا کا ترجمہ پس منظر چلا گیا اور اس کی دوبارہ اشاعت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ۔

دیوان وِلا وِلا اردو کے ایک کامیاب نثر نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ وِلا ایک کامیاب اور نغز گو شاعر بھی تھے ۔ وِلا نے ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ۔ ان کے دیوان میں غزلیات، رباعیات، قطعات، مثنوی اور قصائد سب ہی کچھ ملتے ہیں ۔ ان کے کلام میں حلاوت اور مٹھاس ہے ۔ انکی غزلوں میں گو میر سا سوز و گداز نہیں لیکن بلا کا تغزل ہے اور شوخی بھی ۔ خوبصورت الفاظ، بندش چست اور لطیف تراکیب ان کی غزلوں میں امتیازی رنگ بھرتی ہیں ۔ اصل میں شعر و شاعری کی محفل میں ان کی غزلیں شمع کی حیثیت رکھتی ہیں جو پژمردہ اور اداس دلوں میں زندگی کی بجلیاں دوڑاتی ہیں ۔

وِلا نے اپنے کلیات کے دیباچے میں خود لکھا ہے کہ انھوں نے جناب والا مناقب مدرس مدرسہ ہندی جان گل کرسٹ کی فرمائش پر اپنے قصائد، غزلیات، رباعیات اور قطعات وغیرہ کو یکجا کر کے اپنے دیوان کی ترتیب و تدوین ۱۸۰۳ء میں شروع کی تھی لیکن کام ابھی ادھورا ہی تھا کہ جان گل کرسٹ صاحب عازم لندن ہوئے گل کرسٹ کے جانے کے بعد وِلا کچھ دنوں تک شش و پنج میں پڑے رہے ۔ تمام منشی صاحبان کونسل کی نئی ہدایات کے منتظر تھے . . . . جب گل کرسٹ کی سبکدوشی پر صاحبان کونسل نے جیمس موبت کو جان گل کرسٹ کا قائم مقام کیا تو انھوں نے ازراہِ عنایت ولا کو بھی

دیوان کی ترتیب وتدوین کے ادھورے کام کو پورا کرنے کی ترغیب دی چنانچہ جیمس موبت کپتان جوزف ٹیلر اور ہندوستانی پریس کے مالک ولیم ہنٹر کے زمانے میں یہ کام پورا ہوا۔ ۷ اگست ۱۸۱۰ء میں ولا کا دیوان ترتیب پاسکا۔ ولا کا یہ دیوان بھی دوسری کتابوں کی طرح زیور اشاعت سے آراستہ نہ ہو سکا۔ بلکہ صرف مخطوط کی شکل میں کلکتہ میں موجود ہے۔[۱]

ولا کا یہ کلیات بڑے سائز میں ۲۰۷ اوراق پر پھیلا ہوا ہے اور خطی نسخہ خوشخط لکھا ہوا ہے۔ ولا نے اپنے کلیات کی ترتیب وتدوین میں بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ اور وہ اسے اپنی کل ادبی متاع خیال کرتے تھے۔

دیوان ولا میں حمد خدا، نعت رسول اور منقبت حضرت علی کے بعد جان گل کرسٹ جیمس موبت، ٹیلر اور ولیم ہنٹر کے قصائد ہیں۔ یہ تمام قصائد بیس بائیس صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ قصائد کے بعد ردیف وار غزلیں شروع ہوتی ہیں۔

حق سبحانہ تعالیٰ وتقدس کے عنوان سے دیوان کا آغاز ہوتا ہے ؎

اے دل تو سدا شکر کر اللہ کا	الحق نہیں کم ہے زبان ورابد کا
صاف کر آئینے کو دل کے ولا	طوطی طبع تا کہ ہو گویا

اس قلمی دیوان کی پہلی غزل کا مطلع ہے ؎

جس میں جب سے لا گل کو تاج شاہی کا	تب ہی سے شیفتہ ہوں اسکی کج کلاہی کا

ولا نے چھوٹی بحر میں میر کے رنگ میں بھی غزلیں کہی ہیں گو وہ میر کی غزلوں کے معیار کو چھو نہیں سکیں لیکن ان میں سوز وگداز ہے شگفتگی اور لطافت ہے جو غزل کے لئے

---

[۱] ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں کلیات ولا کا خطی نسخہ زمانہ برد ہونے سے بچ رہا ہے ۔ قلمی نسخہ ص ۲

لازمی ہوتی ہے۔

غـــزل

آپ کے دل میں گر غبـار نہیں کیوں پھرا گلا سا وہ پیار نہیں
پاس جاکس کے اب کروں فریاد تجھ سوا کوئی غمگسا رنہیں
جھوٹی قسمیں یہاں کھایا نہ کر بات کا تیری اعتبا رنہیں
دل ہے بیتاب عشق میں کسی کے روز و شب جو اسے قرار نہیں

کیوں ہے تو اسقدر ودّا مغموم
گر تجھے اب خیال یار نہیں

بلا دغم سے سروکار کچھ نہ تھا ہم کو یہ عشق کی ہے نوازش کرم محبت کا
اگرچہ اور بھی عالم میں ہیں الم لیکن عجب ہی قہر ہے یارب الم محبت کا

تری طرف سے ہو جو کچھ وہی قبول یہاں نہ شکر وصل کا ہے نے گلا جدائی کا
رات دن رونا ہمیشہ نوحہ و زاری و غم حضرت دل یہ بھی کچھ ہے زندگانی آپ کی
آیا تھا شب وہ ماہ جبیں کیا ہوا ودّا خواب گراں سے آنکھ یہ کافر جھپک گئی
ممکن نہیں کہ خاک نشینوں کی تو سنے ہے ان دنوں دماغ تیرا آسماں پر
کہاں یہ حسن سدا اور کہاں یہ جوانی ہے نہ کر غرور پیارے یہ جائے فانی ہے
صد شکر اب جہاں سے میں سیر ہو گیا حرص و ہوا کی کچھ مجھے حسرت نہیں رہی
ہو چشم تلطف سے نگہ ایک ودّا پر بیٹھا ہے تیرے در پہ گنہگار کی صورت
مژدہ ہے تباہی کا مری کشتیٔ دل کو اس بحر عشق کا ساحل نہیں معلوم

دیکھے بہار دامن گر چشم خوں فشاں سے — بلبل کو شوق دل میں پھر کب رہے چمن کا
ہستی کو خواب دیکھا جاتے ہیں ہم عدم کو — در پیش اندنوں میں یہاں عزم ہے وطن کا

عاشق کو تیرے ہرگز خطرہ نہیں کسو کا — نے ننگ، نے حیا، نے پاس آبرو کا
کہتے تھے دل کسی کو ہرگز ولاؔ نہ دینا — کہنا اپنا نہ مانا اے یار خوب جو کا
نے غنچہ کا ہوں عاشق نے میں گل چمن کا — دلدادہ ہوں کسی کے رخسار و دہن کا
نا گذر گیا مرا دامنِ کوہ سے — لیکن نہ دل میں آکے ہرگز رسائی کی
در گذر کیجے کو ولاؔ کے تو مان لے — پیارے یہ بات خوب نہیں کج ادائی کی

بلاشبہ ولاؔ کے ہاں بھی بھرتی کی غزلوں کی بھرمار ہے لیکن اس عیب سے اردو کا بڑے سے بڑا شاعر بھی بچا نہیں ہے۔ میر تقی میرؔ کے یہاں بھی یہ کمزوری نمایاں نظر آتی ہے دیوان میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن میں جوانی کی امنگ طبیعت کی ترنگ اور خوشی سرمستی اور مدہوشی کے ساتھ عشق و محبت اور لطیف جذبات کا اظہار شدت سے ملتا ہے۔ محبوب سے شوخی اور بے باکانہ اظہارِ عشق کی جھلک ولاؔ کے ان اشعار میں ملتی ہے اور بعض شعروں میں یہ ذہنی عیش کوشی اور ابتذال کی سرحدیں بھی پار کر جاتی ہیں سہ

جو ایک بوسہ میں مانگوں تو دو سو دشنام — یہی تو آپ سے ہووے گا اور تو معلوم
بن ٹھن گئے تھے آپ کہاں سچ بتائیے — سج آج ہے تمہاری نہایت بنی ہوئی
کسی طرح کا کرو تم کلام آج کی رات — دکھے گا آپ کو یہاں یہ غلام آج کی رات
لے ولاؔ بوسہ دو شنام و زبان و لب — مری جاں بخشی کو یکجا ہووے یہ چار سیج

وہ شام وسحر کون سی ہے وصل کی یارب — وعدہ کیا ہے یار نے جس شام وسحر کا
عمر گذری ہے ترے ہجر میں دکھ ہی ہوتے — آج کی شب تو مرے ساتھ مقرر سونا
آشنا کہتے ہیں اسے جگ میں — آشنائی کا جو نباہ کرے

ولا کے یہاں صرف سستا اظہار عشق اور رومان کی شدت ہی نہیں ملتی ہے بلکہ عشقیہ غزلوں کے علاوہ ایسی غزلیں بھی ہیں جن میں نور وحدت اور عارفانہ تجلیاں کوندتی ہوئی نظر آتی ہیں ؎

تلاش اسکی میں پھرتا ہوں جابجا شب و روز — ولے نہ آج تلک اس کا کچھ سراغ لگا
شب وصل تھی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا کہ طلسم تھا — کھلی آنکھ اپنی جو لے ولاؔ نہ وہ بزم نہ وہ یار تھا

ولاؔ دلی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کو دلی کی گلیوں سے عشق تھا اور اس کی خاک انکی بصیرت کے لئے سرمہ تھی۔ انکے عنفوانِ شباب کے وقت سلطنت مغلیہ کی عالیشان عمارت غیر ملکی یورشں اور تاخت وتاراج کی وجہ سے ڈول رہی تھی۔ اور اسکی مضبوط بنیاد اینٹیں نکلنے کی وجہ سے کمزور ہو گئی تھی۔ احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ کے علاوہ جاٹوں اور فرنگیوں کی مسلسل یورش نے دلی کے حسن کو لوٹ لیا تھا۔ دلی تاخت وتاراج ہو رہی تھی اور قتل وغارت گری کا بازار گرم تھا۔ دلی جو عالم میں ایک شہر انتخاب تھا ان ظالموں کے ہاتھوں لٹتی اور تباہ ہوتی رہی۔ طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی اور دلی کے شہریوں کے لئے شام سے صبح کرنا دودھ کی نہر کاٹ لانے سے کم مشکل کام نہیں تھا۔ ایسے پرآشوب دور میں شاعروں اور ادیبوں کا قافلہ بھی دوسرے عزت داروں کے کاروان کے ساتھ دلی کو خیرباد کہہ کر ہندوستان کے مختلف شہروں کی طرف سمٹتا جا رہا تھا۔ ولاؔ کو تارکان وطن کے کاروان کے ساتھ جانا پڑا۔ اس کا گھر بھی اجڑ اٹھا۔ اپنی دلی کی

کی تباہی کا نقشہ اس نے اپنی پیاری غزل میں اس طرح کھینچا کہ تباہ حال دلی کی اجڑی ہوئی ویران سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں میں رقصاں ہوجاتی ہے ؎

غزل

نہ جاڑو چمن سے بلبل کو — اس کے تم آشیاں کو رہنے دو
یہ کہا پاسباں سے کل اس نے — میرے اس مہرباں کو رہنے دو
نہ مدارا کرد کوئی میرا — جگر خونچکاں کو رہنے دو
درد دل جب سناؤں کہتا ہے — یہیں تک داستاں کو رہنے دو
بزم سے ہم تمہارے جاتے ہیں — تو تم اپنے مکاں کو رہنے دو

نہ مٹاؤ ولاؔ کی قبر کو تم
بے نشاں کے نشاں رہنے دو

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ولاؔ کے کلیات کا خطی نسخہ ۱۲ ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ دیوان کی آخری غزل کے تین شعر نقل ہیں ؎

ملنے کو وا اس نے جو آغوش کر دیا — ہم کو اسی ادا نے بے ہوش کر دیا
باعث نہ پوچھ ہمدم تو بیخودی کا مری — صورت نے اس کی مجھکو بے ہوش کر دیا
ساقی ولاؔ سے تونے کیا چھیڑ کر رکھی ہے — آنکھیں دکھا کے اپنی مدہوش کر دیا

کلیات ولاؔ میں غزلوں کا حصہ اس غزل پر ختم ہوتا ہے۔ غزلوں کے بعد رباعیات، قطعات اور مخمس ملتے ہیں۔ اس خطی نسخہ میں ولاؔ کی فارسی غزلیں بھی جا بجا ملتی ہیں جو اس کے ایک کامیاب فارسی گو شاعر ہونے کی شہادت دیتی ہیں۔ ولاؔ کے کلام میں شوخی، لطافت،

درد، کسک اور رنگینی جابجا نظر آتی ہے۔ اگر ولاؔ شعر و شاعری پر زیادہ توجہ دیتے اور نثری داستان اور تاریخی کتابیں ترتیب دینے میں ان کی تخلیقی قوتیں برباد نہ ہوتیں تو شاعری میں ان کا ایک بلند مقام ہوتا۔ ان کی ایک فارسی غزل کے مطلعے اور مقطعے نمونتاً درج ہیں ؎

دلم بردی بہ جادو نگاہی — بتے شوخی، دشنگی کج کلاہی

نشان او کسے یابد ولاؔ آہ — چنیں بے دست و پا گم کردہ راہی[1]

ولاؔ کے فارسی کلام میں اردو سے زیادہ زور، شوخی اور رنگینی ہے بمقام افسوس ہے کہ اردو کے کسی تذکرے میں ولاؔ کی پیدائش یا موت کی تاریخ نہیں ملتی۔ بلاشبہ ۱۸۲۹ء تک وہ کلکتہ میں ہی تھے کیونکہ ان کے معاون بینی نرائن جہاںؔ نے دیوان جہاںؔ میں ولاؔ کو بقید حیات بتایا ہے۔ غالباً ۱۸۳۰ء اور ۱۸۴۰ء کے درمیان وہ کلکتہ سے جا چکے تھے اور ہندوستان[2] میں ہی ان کا انتقال ہوا ہوگا۔

---

[1] ملاحظہ ہو قلمی نسخہ ورق ۲۰۱ [2] ۱۹ ویں صدی کی تمام کتابوں میں شمالی ہندوستان کو صرف "ہندوستان" ہی لکھا گیا ہے۔

مرزا کاظم علی جوآں

مرزا کاظم علی جوآں دلی کے رہنے والے تھے اور مظہر علی خاں ولاؔ کے یار غار تھے کاظم علی جواں فورٹ ولیم کالج کے تنخواہ دار منشی تھے اور ان کا تقرر بھی ولاؔ کے ساتھ عمل میں آیا تھا۔ جواں کا اصل نام حسن علی خاں تھا لیکن ادبی دنیا انھیں مرزا کاظم علی جوآں کے نام سے ہی جانتی ہے۔ انھوں نے اپنی مشہور تالیف شکنتلا ناٹک کے دیباچے میں اپنا حال اختصار سے لکھا ہے۔ جوآں دلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے آبا و اجداد بھی عہد مغلیہ میں ہندوستان ہجرت کر آئے تھے۔ دلی سے جوآں تلاش معاش میں لکھنؤ آئے اور پھر کچھ دنوں تک عظیم آباد میں مقیم رہے۔ ۱۸۰۰ء میں کرنل اسکاٹ کی سفارش پر فورٹ ولیم کالج کے پروفیسر جان گل کرسٹ نے انھیں کالج کا منشی مقرر کیا۔ افسوس ہے کہ جوآں کا مفصل حال معلوم نہیں ہو سکا لیکن انکی تالیفات و تصنیفات کے دیباچوں اور تاریخی قطعوں سے ان کا جستہ جستہ حال معلوم ہوتا ہے۔ ولاؔ نے تاریخ جہانگیر شاہی کا ترجمہ مکمل کیا تھا تو جوآں نے تاریخی قطعہ تحریر کیا جس کے بارے میں ولاؔ نے لکھا ہے۔

"جہانگیر شاہی کے خاتمہ پر حسن علی خاں عرف مرزا کاظم علی جوآں نے جہانگیر شاہی کا ملاحظہ کیا، اور اسے بے حد پسند کیا اور قطعہ تاریخ بھی درج کیا[۱]..."

ولاؔ کی اس عبارت سے پتا چلتا ہے کہ جواں کا اصل نام حسن علی خاں تھا لیکن انھیں شہرت ملی کاظم علی جوآں کے نام سے، اور بہت کم لوگوں کو ان کے اصل نام کا پتا

---

[۱] دیکھیے قلمی نسخہ تاریخ جہانگیر شاہی ص ۔۔۔

بھی ہے۔ جواں ۱۸۰۰ء میں کلکتہ آئے اور ۱۸۱۶ء تک کالج سے وابستہ رہے اور تالیف،
ترجمے اور تصحیح کے کام میں لگے رہے۔ غالباً جواں نے کلکتے کو ہی اپنا مسکن بنا لیا تھا
ان کے دو صاحبزادے اچھے اور کامیاب شاعر ہوئے ہیں لیکن بیٹوں کو باپ جیسی شہرت
نصیب نہ ہوسکی۔ بینی نرائن جہاں نے اپنے تذکرے دیوان جہاں میں ان کے نام، مرزا
قاسم علی ممتاز اور مرزا ہاشم علی عیاں اور ان کی غزلیں بھی دیوان جہاں میں نقل کی ہیں
جواں کے سنہ وفات پر اختلاف ہے لیکن ۱۸۱۲ء تک وہ بقید حیات تھے۔ انکا انتقال
بھی کلکتہ میں ہوا۔ قیاس ہے کہ ۱۸۱۶ء اور ۱۸۲۵ء کے درمیان جواں دار فانی سے
عالم جاودانی کو کوچ کر چکے تھے۔ کیونکہ اس زمانے کے بعد کے تذکروں میں جواں کا ذکر
شاذونادر ہی ملتا ہے۔

شکنتلا ناٹک کاظم علی جواں اپنی شاعری کو سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے لیکن
شعری ادب میں ان کا سرمایہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور اردو نثر جو وہ بقول خود،
روٹی کمانے کے لئے لکھتے تھے۔ ان کے لئے ذریعۂ شہرت بنی۔ انھوں نے اپنے عہد ملازمت
میں کئی کتابیں ترجمہ و تالیف کیں جن میں سے شکنتلا ناٹک، سنگھاسن بتیسی، بارہ ماسہ
اور ترجمہ قرآن پاک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ تالیفات اردو ادب میں ان کے
نام کو زندہ رکھنے کی ضمانت ہیں۔ ان کا سب سے مشہور نثری کارنامہ شکنتلا ناٹک
ہے جس کی تالیف اور ترجمہ کا حال انھوں نے خود دیباچے میں لکھا ہے۔ انکے دیباچہ
سے معلوم ہوتا ہے کہ جواں کو برج کی زبان پر عبور کامل نہیں تھا لہٰذا پروفیسر جان گل کرسٹ
کی ہدایت خاص پر کالج کے برج بھاشا کے شعبہ کے پنڈت للو لال جی کب شکنتلا کا ترجمہ بلا ناغہ
لکھوایا کرتے تھے۔ ابتدا میں جواں کو اپنی نثر نگاری پر اعتماد نہیں تھا۔ انھوں نے دیباچے

میں بلا جھجک اس کا اعتراف کیا ہے کہ وہ شاعر پہلے ہیں اور نثر نگار بعد میں۔ اصل میں نثر نگاری سے انھیں کوئی خاص رغبت اور دلچسپی نہیں تھی مگر "بفضل الٰہی سوکنتلا ناٹک کو ترجمہ کرنے میں مجھے کامیابی ہوئی"[1]۔

"شکنتلا ناٹک" سنسکرت کے مشہور شاعر کالی داس کی تصنیف ہے۔ سنسکرت میں اس کا نام "ابھی گیان شکنتلم" ہے۔ کالی داس کے اس ڈرامے کو لازوال شہرت اور مقبولیت ہوئی ہے۔ جوآن نے اس مقبول و معروف ڈراما کا ترجمہ سنسکرت سے نہیں کیا۔ فرخ سیر بادشاہ (۱۱۲۴ھ تا ۱۱۳۱ھ) کے ایک فوجی سردار مولی خاں کی فرمائش پر نواز کبیشر نے برج کی زبان میں لکھا جو بے حد مقبول ہوا۔ نواز کبیشر نے ترجمہ کبت اور دوہوں میں کیا تھا جس کا ترجمہ آسان نہیں تھا۔ اس دشواری کا ذکر جوان نے خود کیا ہے۔

"کبت اور دوہرے کا ترجمہ جیسا چاہئے ویسا زبان ریختہ میں کیسے ہو سکتا ہے اسکے اور اس مضمون کی بندش کا فرق کھلا ہوا ہے بیان کی احتیاج کیا، طرز اس کی ہے جدی اس کا نرالا طور۔ اور اس کا عالم اور ہے۔ قطع نظر اس سے کہ کبت ہو یا دوہرا نظم کا ترجمہ نثر میں طبیعت کو منتشر کرتا ہے"[2]۔

ان تمام پابندیوں اور رکاوٹوں کے باوجود جوان نثر نگاری کے امتحان میں پورے اترے اور شکنتلا ناٹک کا ترجمہ عام فہم اور سلیس زبان میں کیا۔ بلاشبہ جوآن نے باغ و بہار جیسا شگفتہ انداز نہیں پایا اور مقفیٰ اور مسجع عبارت کی وجہ سے تصنع پیدا ہو گیا ہے پھر بھی دلچسپ اور اثر انگیز قصے کی وجہ سے شکنتلا ناٹک

---

[1] دیکھیے قلمی نسخہ ورق ۲۲۔ قلمی نسخہ میں شکنتلا کو سوکنتلا ہی لکھا گیا ہے [2] ق، ن ورق ۲

دلچسپی اور شگفتگی برقرار رہتی ہے۔ اور پڑھتے وقت لوگ اسکے ہوش ربا ماحول میں گم ہو جاتے ہیں۔

شکنتلا ناٹک میں جوان نے قافیہ پیمائی کا بڑا خیال رکھا ہے اور غالباً ڈراما کے زور کو برقرار رکھنے کے لئے بیسویں صدی کے شروع تک اردو میں جتنے ڈرامے لکھے گئے ان میں قافیہ پیمائی اور مرصع و مسجع عبارت نمایاں ملتی ہے۔

جوان کی شکنتلا شروع ہوتی ہے :۔

"اگلے زمانے میں وسوامتر نام کا ایک شخص تھا۔ شہر کو چھوڑ کر جنگل میں رہا کرتا تھا اور اپنے طور کی عبادت اور ریاضت دن رات کیا کرتا تھا۔ اپنے صاحب کی بندگی میں تن بدن کی کچھ اسے خبر نہیں تھی۔ اس کے تصور کے سوا کبھی نگاہ اِدھر اُدھر نہیں تھی یہاں تک دبلاپے سے لٹا تھا کہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ بدن پھول سا سوکھ کر کانٹا ہوا تھا۔ ریاضت کے مارے وہ جیتا موا تھا۔ ان دکھوں سے اس کو کبھی آرام نہیں تھا۔ سوائے ان اٹھانے جفاؤں کے کچھ کام نہ تھا، تاکہ اس خاکساری سے آرزو دل کی بر آئے اور معرفت سے مدعا کے پھل کھاوے[1]۔"

اور وشوامتر کی اس عبادت (تپشیا) سے دیوتاؤں کی نگری میں کھلبلی آگیا، سارے دیوتا ایک انسان کے ہاتھوں اپنی شکست اور ذلت کے تصور سے بے تاب ہوگئے اور رشی وشوامتر کی تپشیا بھنگ کرنے کے لئے آکاش کی بے حد سندر اپسرا کو زمین پر بھیجا۔ اس طرح وشوامتر کی عبادت اور بندگی کی پونجی عورت کے شعلۂ بار حسن

---

[1] ق ن ورق ۲

میں جل کر بھسم ہو گئی۔

"تب پری مینکا دم دلاسے اسے ہوش میں لائی، اپنی چاہت جتا گرم جوشی کر کے اسے مزے میں لائی۔ اس کے دل نے پہلے بوس و کنار سے نہایت لذت پائی پھر تو کام دیو نے آ کر اپنا کام کیا کہ ایک آن میں اس کا وہ کام تمام کیا۔ اس نے اپنے اس بھوگ کا یہ پھل پایا کہ ایک دم مزے کی خاطر سب کچھ گنوایا۔ پھر بہت سا پچھتایا کہ میں نے کیا برا کام کیا۔ اپنے تئیں تمام بھلوں میں بدنام کیا[1]۔"

اس طرح لمحاتی عیش اور جنسی تلذذ کی وجہ سے وشوامتر کا برسوں کا تپسیا بھنگ ہو جاتا ہے اور دھرم نشٹ۔ مینکا ایک لڑکی کو جنم دیتی ہے جو شکنتلا کے نام سے مشہور ہوئی اور پھر ابتلا آزمائش اور سخت امتحانات سے گذرنے کے بعد راجہ دشنت اسے بیوی کے روپ میں قبول کرتا ہے اور راجہ دشنت اور شکنتلا کے ایک لڑکا ہوتا ہے جو بھرت کہلاتا ہے اور ہندوستان کی تاریخ اس عظیم حکمراں کو کبھی نہیں بھلا سکتی ہے۔

جوان کی شکنتلا ناٹک اس بیان پر ختم ہوتی ہے

"راجہ اندر نے کہا کہ جو ہمیں منظور تھا وہ مقصد راہ میں پورا ہوا۔ اب تم اپنے مکان کی طرف پھر جاؤ۔ یہ سنتے ہی ڈنڈوت کر اور تخت پر شکنتلا اور لڑکے کو بٹھا آپ بھی سوار ہوا اور گھر آیا۔ اس طور آپس میں ان کی ملاقات ہوئی۔ طالع سوئے ہوئے جاگے۔ دکھ درد انکے دلوں سے یک لخت بھاگے۔ دونوں خوش و خرم ہوئے۔ شکنتلا رانی ہوئی اور راجہ اپنے راج میں حکمرانی کرنے لگا۔ تمام رعیت انکی خوشی سے شاد ہوئی[2]۔"

---

[1] دیکھئے قلمی نسخہ ورق ، [2] ایضاً ورق ۸۴

"سوکنتلا ناٹک" ۸۴ اوراق پر مشتمل ہے۔ یہ تاریخی نام ہے۔ اس سے سال ہجری ۱۲۱۵ نکلتا ہے۔ جوآن نے کالج کے نو سکھ سول افسروں کے لیے اس کتاب کا ترجمہ کیا تھا۔ شکنتلا ناٹک کا ترجمہ کرتے وقت کہیں کہیں تحریف کی گئی ہے مگر یہ معمولی ہیں اور اس کمی وبیشی کا کہانی کی اصل اور روح پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ شکنتلا ناٹک کا انداز بیان شگفتہ اور عام فہم ہے۔ اگر جواں ادق اور نامانوس سنسکرت الفاظ کے استعمال سے اجتناب کرتے تو اس کتاب کو بھی وہی مقبولیت حاصل ہو سکتی تھی جو مذہب عشق اور آرائش محفل کو ہوئی۔

سنگھاسن بتیسی | سنگھاسن بتیسی اپنے زمانے میں بے حد مقبول ہوئی شکنتلا ناٹک اور سنگھاسن بتیسی کے بعد جواں نے بارہ ماسہ یا دستور ہند منظوم لکھا تھا۔ سنگھاسن بتیسی اور شکنتلا ناٹک دونوں ہی کو اردو داں طبقوں میں بڑی مقبولیت اور شہرت نصیب ہوئی اور یہی دو نثری داستانیں جواں کے نام کو ادبی دنیا میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ سنگھاسن بتیسی کے متعلق ارباب نثر اردو کے مولف جناب سید احمد کا یہ خیال غلط ہے کہ یہ للو لال جی (کب) کی تالیف ہے اور کاظم علی جوآن نے للو لال جی کب کو مدد دی تھی بلکہ بات اِس کے بالکل برعکس ہے۔ جواں نے خود ترجمہ کیا تھا اور جان گل کرسٹ کی ہدایت پر للو لال جی نے ترجمہ میں کاظم علی جوآن کو مدد دی تھی۔ اس کا ثبوت سنگھاسن بتیسی کے دیباچہ میں ملتا ہے۔ کاظم علی نے اس کتاب کا سبب تالیف خود بیان کیا ہے۔

"سنگھاسن بتیسی کہانی اصل میں سنسکرت میں تھی لیکن شاہ جہاں بادشاہ کی فرمائش پر سندر کبیشور نے برج کی بولی میں کہی۔ اب شاہ عالم بادشاہ کے عہد

یہ موافق ارشاد جناب گل کرسٹ صاحب دام اقبالہٗ ۱۲۱۸ھ مطابق سنہ ۱۸۰۳ء
کاظم علی شاعر نے جس کا تخلص جوانؔ ہے بہ محاورۂ خاص و عام میں اہل ہند کے لکھی
اس لیے کہ نوسکھ صاحبوں کے سیکھنے اور سمجھنے کو سہج ہو اور ہر ایک کے روزمرے
کی اچھی سمجھ ہووے۔"

اس دیباچے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کاظم علی جوانؔ نے سنگھاسن بتیسی کو اردو میں لکھا تھا اور اسے لولو لال جی کب کی تالیف سمجھنا غلط ہے۔ سنگھاسن بتیسی اصل میں اجین نگر کے راجہ بکرماجیت کے عدل و انصاف کی ۳۲ کہانیاں ہیں۔ جو ۳۲ پتلیاں سنگھاسن کی راجہ بھوج کو تخت پر بیٹھنے سے باز رکھنے کو سناتی ہیں۔ سنگھاسن بتیسی کی پہلی کہانی شروع ہوتی ہے۔

"راجوں میں ایک راجہ بھوج اجین نگری کا راجہ تھا۔ بڑا بلی۔ بڑا دھنی۔ جس دھرم اس میں سب کچھ تھا۔ جتنے لوگ اس کے راج میں بستے تھے سب چین کرتے تھے۔ راجہ پرجا سب سکھی۔ کسی کو کوئی دکھ نہیں دے سکتا تھا۔ یہ نباہ اس میں تھا کہ ایک بڑی ایک گھاٹ پر آئی بیٹھے تھے اور سب اسکے آس پاس بیٹھے تھے۔"

سنگھاسن بتیسی دیوناگری لپی میں بھی شائع کی گئی ہے جس میں نام مؤلف کا سوندر کب دیا گیا ہے۔ شاید اسی بنا پر اردو سنگھاسن بتیسی کو بھی مورخین اور محققین لولو لال کب کا ترجمہ سمجھتے ہیں۔ سنگھاسن بتیسی بڑی دلچسپ اور نصیحت آموز کہانیوں کی کتاب ہے لیکن اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے کہ اس میں بیتال پچیسی کی کئی کہانیاں بدلی ہوئی صورت میں دہرائی گئی ہیں۔ مثلاً ان کے لیے راجہ کو سر دھونے

۱۔ مطبوعہ دیباچہ قلمی نسخہ ص ۲۰ سنہ ۱۸۰۵ء ایضاً ص ۳

سیب ملنے، پھر رانی کو دینے، رانی سے سیب کے کوتوالی کے پاس جانے اور پھر طوائف کے ہاتھ سے راجہ کو واپس ملنے کی کہانی بے تال پچیسی میں بھی موجود ہے۔ ایسی کئی اور بھی ملتی جلتی کتھائیں بے تال پچیسی میں بھی ملتی ہیں۔ مادھو برہمن اور کام کنڈلا کی کہانی بھی ہو بہو دہرائی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

راجہ بکرما جیت کے عہد میں ایک برہمن مادھو نامی تھا، بڑا گنی اور ہوشیار۔ اس کا علم اور گن اسکے لئے ایک مصیبت بن گیا تھا کسی راجہ کے دربار میں ایک مہینہ سے زیادہ نہیں ٹک سکتا تھا اور دیس دیس بھٹکتا کہ مان نگر میں آیا جہاں کا راجہ کام سین تھا۔ اسکے یہاں ایک نرتکی حسین اور اروشی سے زیادہ سندر کام کنڈلا تھی۔ گندھرب بدیا (علم) میں یکتائے روزگار تھی۔ وہ راجہ کے دربار میں نرت کر رہی تھی۔ مادھو بھی راجہ کے دوار پر جا پہنچا۔ دربانوں سے کہا کہ راجہ کو جا کر خبر دو کہ ایک برہمن اس سے ملنے آیا ہے دربانوں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور ہار مان کر ڈیوڑھی پر بیٹھ گیا۔ جوں جوں وہاں سے مردنگ کی آواز اور گانے کی صدا آتی توں توں یہ سر دھن کر کہتا کہ راجا مورکھ ہے۔ اس کی سبھا میں سب کور ہیں۔ اس نے سات بار راجہ کو مورکھ اور درباریوں کو بے وقوف کہا تو دربان اندر گیا اور راجہ کو ہاتھ جوڑ کر مادھو برہمن کی گستاخی سنائی اور برہمن کی تمام باتیں دہرادیں۔ راجہ نے کہا کہ برہمن سے جا کر پوچھ کہ سبھا کے لوگ مورکھ اور کور کیوں ہیں؟ دربان نے یہی باتیں برہمن مادھو سے کہہ سنائیں اور سبھا کے لوگوں کی بے وقوفی کی وجہ دریافت کی۔ اس نے کہا کہ جو بارہ آدمی مردنگ بجاتے ہیں ان میں پورب منھ والے کا انگوٹھا نہیں ہے اسکی وجہ سے سم پر ہلکی تھاپ پڑتی ہے اس لئے سب کو کور اور احمق کہا۔ نہ مانو جا کر

دیکھ آؤ۔ دربان واپس گیا اور راجہ کو حال کہہ سنایا جب راجہ نے سب کو بلایا اور جانچ کی تو ایک کا انگوٹھا موم کا بنا ہوا تھا۔ راجہ اسکے گن سے خوش ہوتا ہے اس کو انعام اور خلعت عطا کرتا ہے اور راجہ کے حکم سے نرتکی کام کنڈلا فن کا مظاہرہ کرنے لگتی ہے۔ دورانِ رقص میں ایک بھونرا کام کنڈلا کے پاؤں میں چپک جاتا ہے اس کے ناچ میں خلل پڑنے لگتا ہے اس نے سانس روک کر بھونرا کو اڑا دیا۔ اور پھر مدہوش ہو کر رقص کرنے لگتی ہے۔ کام کنڈلا کے اس گن نے مادھو کو فریفتہ کر دیا۔ در راجہ کام سین نے اسے جو انعام اور خلعت عطا کیا تھا وہ سب کام کنڈلا کی نذر کر دیتا ہے۔ راجہ کو مادھو برہمن کی گستاخی پسند نہیں آتی ہے۔ اس کا عتاب برہمن پر نازل ہوتا ہے اور اپنے دیس سے نکل جانے کا حکم دیتا ہے۔ کام کنڈلا بھی اس کے عشق میں باؤلی ہو جاتی ہے۔ اسے اپنے گھر لے آتی ہے عیش و نشاط کی محفل جمتی ہے۔ راجہ کو خبر ملتی ہے۔ مادھو کو بھاگنا پڑتا ہے اور راجین نگر کا راجہ بکرماجیت کام سین کو شکست دیکر کام کنڈلا کو مادھو سے ملا دیتا ہے۔ اکیسویں پتلی کی کہانی اس پر ختم ہوتی ہے اور پھر بائیسویں[۲۲] پتلی بکرماجیت کے انصاف کی ایک نئی کہانی سناتی ہے۔ اور اس طرح تینتیسویں[۳۲] پتلی بھان متی اپنی آخری کہانی راجہ بھوج کو سناتی ہے۔ راجہ بھوج دنگ رہ جاتا ہے اور پتلیاں سنگھاسن لے اڑتی ہیں۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے کہ بتیس کہانیاں اپنے دامن میں عبرت اور نصیحت کے موتی سمیٹے ہوئے ہیں اور یہ کتھائیں اس عہد کی سماجی زندگی کے واضح خاکے بھی ابھرتے ہیں۔ سنگھاسن بتیسی کے کچھ قصوں کا ترجمہ مسٹر ٹی پی ملینول[۱] نے انگریزی

---

[۱] ملینول کا انگریزی ترجمہ کا مطبوعہ نسخہ محسن کالج چنیوٹ میں موجود ہے

میں بھی شائع کیا ہے۔ جو انگریزی داں طبقے میں بے حد مقبول ہوا سنگھاسن بتیسی کی عبارت میں نامانوس اور متروک الفاظ کی کثرت ہے۔ جنش، مردنگ، ات مورکھ، نرت (ناچ) اپسرا، پرش، مکھ (منہ)، ڈنڈوت، پیڑ (درد) جیسے نامانوس الفاظ ہر کتھا میں ملتے ہیں جس کی وجہ سے عبارت بوجھل ہو گئی ہے اور طرز بیان میں ثقل پیدا ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنگھاسن بتیسی کچھ دنوں تک ہی مقبول رہی۔

سنگھاسن بتیسی کا خطی نسخہ ۱۳۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور سائز ۵×۷ ہے خطی نسخہ خوشخط نہیں ہے۔ پڑھنے میں الجھن ہوتی ہے۔

ترجمہ قرآن شریف فورٹ ولیم کالج میں تواریخ اور قصہ کہانیوں کی کتابوں کے ساتھ مذہبی کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ قرآن شریف، انجیل مقدس اور بھگوت گیتا کے ترجموں کا کام بھی اس کالج میں ہوا۔ گورنر جنرل لارڈ ولزلی کے عہد میں پروفیسر جان گل کرسٹ کے ایما پر مرزا کاظم علی جواں، مولوی فضل حق، مولوی امانت اور میر بہادر علی حسینی نے قرآن شریف کے ترجمے کا کام شروع کیا تھا یہ کام ۱۲۱۷ھ میں شروع ہوا لیکن ۱۲۱۹ھ یعنی پورے دو سال کے بعد پورا ہوا اس تاخیر کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ مولوی امانت اور مولوی فضل حق کے درمیان نزاع لفظی چھڑ گئی۔ الفاظ کے استعمال پر اختلاف نے اسقدر شدت اختیار کر لی کہ کالج نے مولوی امانت کی جگہ مولوی غوث کو اس کام پر مامور کیا اور گل کرسٹ کی لندن کو واپسی (۲۲ر فروری ۱۸۰۴ء مطابق دس ذیقعد ۱۲۱۸ھ) کے نو مہینے بعد ۱۳ر دسمبر ۱۸۰۴ء مطابق نویں تاریخ ماہ مبارک رمضان ۱۲۱۹ھ میں ترجمہ زبان ریختہ میں تمام ہوا۔[۵]

---

(۵) دیکھیے قلمی نسخہ نمبر ۱۳

قرآن شریف کے ترجمہ کا حال مرزا کاظم علی جوان نے کتاب کے خاتمہ پر درج کیا ہے اور گل کرسٹ اور اس کے عہد کے مولف جناب عتیق نے اسے پورا نقل بھی کیا ہے۔[1]

کاظم علی نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ سخت اور دقت طلب تھا۔ ہر لفظ کے صحیح صحیح معنی اور اردو کے مناسب اور درست متبادل الفاظ کا استعمال کرنا پڑا تھا۔ یہ نہایت ہی نازک اور مشکل کام تھا۔ ان کے تین مترجمین کو سخت آزمائش اور امتحان سے گذرنا پڑا۔ لفظی جنگ، چھڑی۔ مولوی امانت اللہ ہٹا دیئے گئے۔ اس دقت طلب اور مشکل کام کے پیش نظر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جوان، مولوی فضل اللہ اور مولوی غوث نے بڑی محنت سے ترجمہ کیا ہے اور بھرپور کوشش اس بات کی کی ہے کہ کہیں معنی غلط اور مطلب خبط نہ ہونے پائے۔ ترجمہ کی دشواری اور الفاظ کے استعمال میں احتیاط کی وجہ سے تعقید لفظی پیدا ہو گئی ہے اور عبارت میں جھول بھی۔

قرآن شریف کا ترجمہ شروع ہوتا ہے، سورہ فاتحہ کے (کہ) مدینہ میں نازل ہوا سات آیات کا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔۔۔۔

"ہر ایک حمد خدا کے لئے ہے کہ وہ مالک سب کا بخشنے ہارا (والا) روزی دینے والا اور خاوند روز قیامت کا ہے۔ ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے ہی مدد چاہتے ہیں دکھا ہمکو سیدھی راہ۔ ان کی راہ کہ جن کو تو نے نعمت دی۔ نہ انکی راہ جن پر غضب کیا گیا ہے اور نہ گمراہوں کی راہ"[2] ۔۔

---

[1] دیکھیے گل کرسٹ اور اس کا عہد[2] [2] ملاحظہ ہو قلمی نسخہ قرآن شریف کا ورق ۱-۲

سورہ کورت مکے میں نازل ہوا، انیس[۱۹] آیات کا۔ اس کا ترجمہ جو ان نے کیا ہے اس کی عبارت دوسری آیتوں کے ترجموں کی بہ نسبت زیادہ صاف اور رواں ہے۔

"جب آفتاب بے نور ہو اور جب ستارے سیاہ ہوں اور جب پہاڑ ہوا میں اڑیں۰ اور جب وہ اونٹنیاں جن کی مدت حمل دس مہینے سے گذری ہے چھوڑی جائیں یعنی کسی کو ان کی پروانہ ہو۰ اور جب پرندہ جمع کئے جائیں۰ اور جب دریا خشک کئے جائیں اور جب جانیں جوڑی جائیں۰ اور جب وے لڑکیاں جو جیتی گاڑی گئی ہیں پوچھی جائیں کہ کس گناہ سے ماری گئی ہیں ۰ اور جب نامۂ اعمال کھولے جائیں ۰ اور جب آسمان پھٹے جائیں ۰ اور جب بہشت نزدیک کی جائے، ہر شخص جو کہ نیک و بد سے حاضر کیا ہوا جانے لے[۱]"

قرآن شریف کے ترجمہ کا خطی نسخہ ضخیم ہے، ۵۵۶ اوراق پر پھیلا ہوا ہے۔ اور سائز ۶ × ۱۰ ہے۔ خطی نسخہ کئی ہاتھوں کا لکھا ہوا ہے۔ کچھ جوان نے تحریر کئے ہیں۔ کچھ دوسرے مولویوں نے۔ خطی نسخہ میں کاٹ چھانٹ اور ترمیمیں بھی جا بجا ملتی ہیں۔ ترجمے کی صحت کا خیال ہر ممکن رکھا گیا ہے۔ صحت کے خیال کی وجہ سے عبارت گنجلک اور مبہم سی ہو گئی ہے اور طلبا کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔

ترجمہ قرآن شریف ختم ہوتا ہے سورہ ناس پر جو مکے میں نازل ہوا تھا۔

"کہا کہ میں آدمیوں کے رب کی پناہ لیتا ہوں جو بادشاہ ہے آدمیوں کا معبود ہے آدمیوں کا ...[۲] الخ

مقام افسوس ہے کہ پروفیسر جان گل کرسٹ کی مراجعت لندن کی وجہ سے

---

[۱] دیکھئے خطی نسخہ ورق ۵۲۶ [۲] خطی نسخہ ورق ۵۵۶

ترجمہ قرآن شریف شائع نہیں ہوسکا۔ ان کے جانشین جمیس موبٹ ترجمہ قرآن شریف کی اشاعت کے حامی نہیں تھے۔ یہ مفید ترجمہ چھپ جاتا تو کاظم علی جوآن اور دوسرے مولویوں کی محنت سوارت ہوجاتی۔ قرآن شریف کے ترجمہ کا خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری میں محفوظ ہے اور دست برد زمانہ سے بچ رہا ہے۔"

بارہ ماسا یا دستور ہند بارہ ماسا یا دستور ہند مرزا کاظم علی شاعر کا واحد شعری سرمایہ ہے جو زمانہ برد ہونے سے بچ رہا ہے۔ جوآن بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن کسی تذکرے میں یہ نہیں ملتا کہ جوآن نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا یا نہیں۔ ان کی شاعرانہ صلاحیت کا پتا بارہ ماسہ سے چلتا ہے۔ بارہ ماسہ انھوں نے جان گل کرسٹ کی فرمائش پر تالیف کی۔ ان کا یہ منظوم کارنامہ ۱۸۰۳ء میں مکمل ہوا۔ مگر پورے نو سال بعد ۱۸۱۲ء میں یہ کتاب ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی۔ اس کا کوئی خطی نسخہ دستیاب نہیں ہوسکا۔ بارہ ماسہ یا دستور ہند مطبوعہ ۱۸۱۲ء کلکتے کے کتب خانے میں موجود ہے۔ جوآن کی یہ مثنوی ۱۱۴ صفحات ۴×۸ سائز میں ہے اور آہنی حروف میں چھپی ہے۔ ٹائپ خوبصورت نہیں ہے اور دیمک کتاب کو جابجا چاٹ گئی ہے اس لئے پڑھی نہیں جاتی۔ جوآن نے بارہ ماسا حمد خدا باری سے شروع کی ہے۔ پھر نعت رسول اور منقبت حضرت علی کے بعد گورنر جنرل لارڈ ولزلی اور جان گل کرسٹ کے قصیدے ہیں۔ جوآن نے نظم میں ہی بارہ ماسا کا سبب تالیف بیان کیا ہے۔[۵]

سبب تالیف کا کہتا ہوں میں	لگا کر دل سنو اسکے تئیں سب
کتابیں کرچکا تالیف جب دو	کہا اس صاحب والا نے مجکو

کہ جس کے تابع فرمان ہوں میں — رہینِ شکر او راحسان ہوں میں
بہ تصحیح کتب دل لگا کر — حضوری مری حاضر رہا کر
بجالایا وہیں ان کا حکم تھا جو — کہا پھر بعد یک مدت کے مجکو
کہ یہاں حاضر بھی رہ اور نہ کر کچھ — نوازش ہم کو ہے مدِ نظر کچھ
چنانچہ تھا یہی ارشاد ان کا — کہ منظوم ایک لکھ تو بارہ ماسا
کیا میں نے قبول ان کا ارشاد — وہیں سے اس کی ڈالی بنیاد
سنائے بعد چندے کتنے اشعار — پسند انکی ہوئے اور کی گفتار
اجازت تجھکو یہ دیتے ہیں اب ہم — بہ خاطر جمع مضمون کر فراہم
تو اپنے بیٹھ کر گھر میں کر اتمام — سپرد اب ہم نے تیرے کیا کام
دلے چھوٹے نہ اسمیں کوئی تہوار — موافق مہر و مہ کے کیجئو اظہار
اور اسمیں رسمیں جو گبر و مسلماں — بجالاتے ہیں، لکھیو اس کے عنواں
بروج اور کواکب[1] در ہر رت کا احوال — لکھا میں نے بتفصیل و باجمال
مہینا جو ہے شمسی اور ہلالی — ہر ایک کی گردشیں ہینگی نرالی[2]
یہی اب اپنے دل میں کیجئے غور — برابر مہر و مہ کا کیونکہ ہو دور
کرے جن برجوں کو وہ سال میں طے — مہینے میں یہ سیر انکی کرے ہے
تطابق میں نہ دیتا گر انھوں کو — تو یکجا جمع ہوتے کب یہ یارو
ہلالی اور شمسی کر سکے لازم — لکھا ہے جو نہیں ہوتا وہ دائم
یہاں بس ہے عقل کو اشارہ — کنایہ اس کا پھر ہوگا دوبارہ
زبس دستور ہند اس میں لکھا ہے — یہی اب نام بھی میں نے رکھا ہے[3]

---

[1] ہیں [2] دیکھئے بارہ ماسا مطبوعہ سنہ ۱۸۱۲ء ص

بارہ ماسہ کی تالیف کا سبب بیان کرنے کے بعد جوان نے فنکارانہ چابکدستی سے ہندوستان کے بارہ مہینوں اور ان مہینوں میں ہندوستان کے رسم و رواج اور مشہور تہواروں، رت اور موسم اور جشن کے قصے بڑے دل نشیں انداز میں بیان کیے ہیں جو ہوش ربا اور طلسمی فضا قائم کردیتے ہیں اور انسان ان کے حال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بارہ ماسا ۱۹ ویں صدی کی خوبصورت اور اثرانگیز مثنوی کہی جاسکتی ہے۔

بارہ ماسا میں پہلا منظوم حال بہار بسنت رت کا بیان ہوا ہے ؎

جو برج حوت میں آیا خورشید   دل عالم کی برائی ہے امید
نہیں پژمردہ دل ہرگز کسو کا   ہوا سر سبز نخل اب آرزو کا
بہ شمسی جو مہینا چیت کا ہے   حساب اختر شناسوں نے کیا ہے
کہ پورے تیس دن میں ہوا یہ اتمام   کیا ہے کر کے تحقیق [illegible]

چمن کی میں کیا نیرنگی بتاؤں   بہار اس کی کیا جا کر دکھاؤں
ہزاروں رنگ کے پھولے ہیں وہ پھول   کہ رضواں دیکھ جنت کو گیا بھول
ہرے پتوں میں ہر گل کا ہر دہ رنگ   کہ ہووے دیکھ کے جسکو جو ہری دنگ
فقط میں نے باغ کا یہ رنگ دیکھا   ہوا ہے رشک گلشن کوہ و صحرا
نہ بلبل زمزمے ہی کر رہی ہے   دام الفت کو گل کے بھر رہی ہے
کدھر ہے ساقی گل پیرہن تو   کہاں ہے کہ مطرب شیریں سخن تو

۱۔ ملاحظہ ہو دستور ہند ص ۱۰

شراب ارغوانی جام میں بھر — نہ کر دیر اب گذر گلزار میں کر
صبا پیغام تو اس گل کو لے جا — کہ آتی ہے بہار اے گلشن آرا
خراماں تو بھی اسدم ناز سے ہو — بہار اپنی دکھا اہل چمن کو

بسنت بہار رت کے بیان کے بعد صفت سراپا کی، پھر بیان چرخ پوجا کے میلے کا، نوروز، ناگ پنچمی، جنم اشٹمی، چوک چندہ، شعبان کا چاند، دسہرے کا، دیوالی، مرغ بازی، کبوتر بازی، بٹیر بازی، شیورا تری اور دیگر تہواروں کے علاوہ فصلوں کی پیداوار اور ان کے کاٹے جانے کے مناظر، شعری سانچے میں ڈھلتے چلے گئے ہیں۔ اور جشن اور تہواروں کی جیتی جاگتی دلفریب تصویریں آنکھوں میں رقصاں ہوتی چلی جاتی ہیں۔ بارہ ماسا آخری چہار شنبہ کے بیان پر ختم ہوتی ہے۔ بارہ ماسا منظوم سے جوآن کی شاعرانہ صلاحیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جوآن کو جزویات نگاری اور منظر نگاری میں کمال تھا۔ مرغ بازی اور کبوتر بازی، دیوالی اور شعبان کا چاند میں یہ پوری تابانی اور پوری شدت سے نمایاں نظر آتی ہیں۔

مرغ بازی کا بیان ملاحظہ ہو ؎

جہاں ہوتی ہے پالی لوگ اس جا — ہزاروں دیکھتے ہیں آ تماشا
ہمیشہ مرغوں کی ہوتی ہے پالی — لڑاتے ہیں وہ جو ہیں لاابالی
شجاعت انکی ہے عالم میں مشہور — لڑائی کا کروں کیا ان کی مذکور
وہ لڑتے لڑتے اکثر جاتے ہیں مر — لکھا میں نے یہ خوب امتحان کر

؎ دیکھئے دستور ہند بارہ ماسا ص۱۱

بیان کبوتر بازی کا

کبوتر بازی بھی دیکھی ہے ہر جا　　اڑانے کا ہے ان کو طور کیا کیا
ہوا پر بھاگتے ہیں ساتھ ان کے　　ہزاروں گھریاں کرتے بھی دیکھے
لڑائی کے بھی ساتھ ایسے نہیں　　بیان کرتا ہوں کچھ جنکا اب میں
بھڑ گئے دیکھ کر کشتی کو بھر دد　　گھسیٹے ساتھ کو آتے ہیں گھر کو[۱]

بارہ ماسا میں جواں نے اپنی شاعری کا پورا زور دکھایا ہے۔ مثنوی کے لئے جزدیات نگاری، منظر نگاری، کردار نگاری اور دلکش اسلوب اور انداز بیان میں تیکھاپن ضروری ہے۔ بارہ ماسا میں منظر نگاری، پرکاری سے طلسمی فضا ضرور پیدا کرتی ہے لیکن کردار نگاری میں جواں کامیاب نظر نہیں آتے ہیں۔

کتاب کے خاتمہ پر اس دور کے طریقے کے مطابق جوان نے منظوم قطعہ تاریخ درج کیا ہے۔ خاتمہ پر فہرست بھی دی گئی ہے اور چار صفحات میں اغلاط نامے ہیں۔ آخر میں سرورق ہے جو انگریزی میں درج ہے۔

جوان بحیثیت شاعر | جوان بنیادی طور پر شاعر تھے۔ انھوں نے جابجا اپنی تالیفات میں شاعر ہونے پر فخر کیا ہے لیکن یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ ادبی دنیا میں جوان کو شاعر کی حیثیت سے کم شہرت ملی اور وہ انیسویں صدی کے ایک کامیاب نثر نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ جوان کا کوئی دیوان یا کلیات قلمی نسخہ کی شکل میں بھی کہیں دستیاب نہیں ہے۔ نسخہ دلکشا، سخن شعراء اور دیوان جہاں میں جواں کو شاعر قرار دیا گیا ہے۔ کاظم علی جواں کے ذکر میں

---

[۱] دیکھئے بارہ ماسا ص ۸۴

جہاںؔ لکھتے ہیں۔

"جوانؔ تخلص، نام مرزا کاظم علی، دہلی کے رہنے والے ہیں، کلکتے میں تشریف رکھتے ہیں اور اس فقیر کو بھی انکی خدمت عالی میں نہایت بندگی ہے۔ یہ ان سے ...[1]"

دیوان جہاں الفبائی ترتیب سے مرتب ہوا ہے۔ جوان اسکے ۲۸ ویں شاعر ہیں۔ وہ چونکہ بینی نرائن جہاں کے دوست اور مربی تھے اور جہاںؔ کو ان سے دلی ارادت اور عقیدت تھی لہٰذا ان کی کئی غزلیں بھی نقل کر دی ہیں ان کی ان غزلوں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جوان شاعری میں کیا مقام رکھتے تھے۔

غزل

دیکھ داغ عشق دل میں فکر نے دیواں کیا — ہم نے وہ خورشید تاباں طلع دیواں کیا

سوز ہے سینے میں اسکا جس نے ابراہیم پر — آتش نمرود لالہ اور نافرماں کیا

کشتہ اسکے تیغ کا ہوں جس پہ اسمٰعیل نے — جان کر عید آپکو کس شوق سے قرباں کیا

کوئی بےخود کوئی دیوانہ کوئی مجذوب ہے — عشق نے اسکے یہ رنگ عالم امکاں کیا

وجہ حیرانی کہوں میں تجھ کو کیا اے عکس یار — میرے اس آئینۂ دل نے مجھے حیراں کیا

اے جوان تو عندلیب گلشن توحید ہے
کیوں برنگ گل گریباں چاک تا داماں کیا

غزل (۲)

---

[1] دیوان جہاں ورق ۳۳

چشم ہر چند میں نے تر کر دی ۔ مے نہ ساقی نے جام بھر کر دی
آجکل ہے اسے خفا پایا ۔ ایں چہ اے آہ بے اثر کر دی
تیری تیغ نگہ کے آگے جان ۔ ہم نے کس شوق سے سپر کر دی
ناز و غمزے کی فوج نے اس کے ۔ یہ مہم کیا ہے ، قلب سر کر دی
تو نے بہر سفر کسی جو کر ۔ ہم نے بھی جان ہمسفر کر دی
جان پر آبنے گی وہاں مت جا ۔ دل تجھے ہم نے یہ خبر کر دی
آگے تو جان مان یا مت مان ۔ بات یہ گوش زد مگر کر دی

شام سے چشم منتظر نے جواں
جاگتے جاگتے سحر کر دی

کریں ہم کوہ آتش نالۂ شبگیر سے پانی ۔ وہ پتھر دل نہ ہو سکا کسی تدبیر سے پانی

جہاںؔ نے جواں کی طویل طویل غزلیں (۲۰ تا ۲۵ اشعار کی یہ غزلیں ہیں) اپنے تذکرے میں نقل کی ہیں لیکن اکثر اشعار بھرتی کے ہیں۔ جواںؔ نے شاعر ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اپنی نثر نگاری کو ہمیشہ اپنی شاعری سے کم درجہ دیا ہے لیکن جواں کے جتنے بھی اشعار ملے ہیں ان سے بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ انکی غزلیں بے کیف ہیں اشعار روکھے پھیکے ہیں اور ان میں نہ تغزل ہے اور نہ لطف ہے اور اپنے عہد کے ایک معمولی شاعر نظر آتے ہیں۔ انکی غزلیں یا ان کا کوئی شعر بھی دیرپا اثر ذہن پر قائم نہیں کرتا۔

تاریخ بہمنی | مرزا کاظم علی جواںؔ کا نثر میں ایک اور کارنامہ تاریخی کتاب ہے جو تاریخ فرشتہ کا ترجمہ ہے۔ ارباب نثر کے مؤلف نے اس کا سنہ تالیف ۱۸۱۹ء

لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ جوان نے لارڈ منٹو کے ایما پر فرشتہ[1] کی مشہور تاریخ کے ایک باب کا جو دکن کے بہمنی خاندان سے متعلق تھا، ترجمہ شروع کیا تھا۔ ۱۸۰۹ء میں جوان نے یہ کام شروع کیا ہوگا کیونکہ فروری ۱۸۱۰ء میں تاریخ فرشتہ کا ترجمہ مکمل ہو چکا تھا ۲۷ رفروری ۱۸۱۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے سالانہ کنووکیشن میں وزیٹر کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے لارڈ منٹو نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ

"اس وقت مجھے یہ بیان کرنے میں خوشی ہو رہی ہے کہ مرزا کاظم علی جوان نے دکن کے بہمنی خاندان کی تاریخ مرتب کی ہے۔ اصل میں فرشتہ کی ضخیم تاریخ کے ایک حصے کا ترجمہ[2] ہے۔"

مقام افسوس ہے کہ جوان کی یہ تاریخ بھی دوسری تاریخوں کی طرح شائع نہ ہو سکی اور نہ ہی اس کا کوئی خطی نسخہ دریافت ہو سکا۔ اگر یہ شائع ہو جاتی تو بڑی مفید اور کارآمد تاریخ کا اردو ادب میں اضافہ ہو جاتا۔

---

[1] فرشتہ کا نام ملا محمد قاسم ہندو شاہ ابن مولانا غلام علی ہندو شاہ تھا، اور فرشتہ تخلص۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے ایما اور حکم سے فرشتہ نے ہندوستان کی ضخیم تاریخ مرتب کی۔ دوسری جلد میں فرماں روائے دکن کے حال میں بہمنی خاندان کا مفصل حال لکھا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ تاریخ فرشتہ کے نام سے حال ہی میں عبدالحیٔ صاحب نے کیا ہے جو لاہور سے شائع ہوا ہے تاریخ فرشتہ ۱۶۱۱ء میں [illegible] ہوئی۔ [illegible] کی ترتیب میں ۳۲ کتابوں سے مدد لی گئی تھی۔ ج۔ ن [2] دیکھئے اینالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم تامس روبک، ضمیمہ۔

حفیظ الدین احمد بردوانی

حفیظ الدین احمد بردوانی بھی فورٹ ولیم کالج کے مشہور منشیوں میں ہیں فورٹ کالج کے لئے مولوی حفیظ نے صرف ایک کتاب ترتیب دی لیکن اس ایک تالیف کی بدولت وہ اردو ادب میں لازوال شہرت کے مالک بن سکے۔ حفیظ الدین کی کتاب کا نام خرد افروز ہے جو علامہ ابوالفضل کی کتاب "عیار دانش" کا عمدہ اور سلیس ترجمہ ہے۔ مولوی حفیظ الدین کی یہ خوش بختی ہے کہ ان کی کتاب خرد افروز کو اپنے عہد میں اور بعد میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ خرد افروز کا پہلا اڈیشن ۱۸۱۵ء میں شائع ہوا تھا جسے کالج کے پروفیسر تامس روبک نے کالج کے ایک منشی کی اعانت سے ترتیب دیا تھا۔ اسکے بعد ۱۸۴۷ء میں کلکتہ سے ہی اس کا دوسرا اڈیشن شائع ہوا۔ ہینول نے اس کے بعض حصوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے جو نصاب میں بھی داخل تھا۔

فورٹ ولیم کالج کے اکثر ادیبوں اور شاعروں کی بدقسمتی ہے کہ انکے عہد یا فوراً بعد کے تذکرہ نویسوں نے ان کو قابل اعتنا نہ سمجھا۔ اردو کے اکثر تذکروں میں ان ادبا اور شعرا کا حال دو چار سطروں میں ملتا ہے۔ اور انکی حیات پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑتی ہے۔ خوش قسمتی سے خرد افروز کے خطی نسخہ اور شروع کے مطبوعہ نسخہ میں حفیظ الدین کی زندگی کا حال مل جاتا ہے خرد افروز کے دیباچے میں مولوی صاحب نے اپنا حال اختصار سے لکھا ہے۔

"مولوی حفیظ الدین کا کہنا ہے کہ انھوں نے کالج کونسل کا اشتہار پڑھ کر خرد افروز کا ترجمہ کیا تھا۔ عام خیال ہے کہ پروفیسر جان گل کرسٹ کی فرمائش پر مولوی صاحب نے خرد افروز کو مرتب کیا۔ لیکن خرد افروز کے خطی نسخہ یا مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۱۵ء اور ۱۸۴۷ء سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انھوں نے جان گل کرسٹ یا کسی اور شخص کے ایما پر خرد افروز کا ترجمہ کیا تھا۔ بلکہ انعام کا اشتہار پڑھ کر عیار دانش کا ترجمہ بڑی محنت اور عرق ریزی سے کیا اور کالج کونسل کو پیش کیا۔

خرد افروز کے ترجمہ اور تالیف کا سبب بیان کرتے ہوئے مولوی حفیظ نے لکھا ہے۔

"صاحبان عالیشان نجیبوں کے قدرداں کو خدا سلامت رکھے۔ فدوی نے حکم اشتہار سن کر عیار دانش کو کہ فی الحقیقت جواہر بے بہا ہے اور اب تک جواہر خانہ فارسی میں مقفل تھی کلید کوشش سے کھول کر زبان ریختہ میں آب و تاب دے اردو معلا میں جلوہ گر (کیا) امیدوار ہے کہ نظروں میں خرد افروز کہلائے اور اس دعا گوئے دولت کا دامن امید تفضلات کے جواہر سے مالا مال ہووے، امید کہ یہ نامی گرامی ہووے آرائش بزم کامی ہووے، اگر عین عنایت سے نظر ہو اس پردہ نام جس سے نامی ہووے ۵

ہے درخشاں تا فلک آفتاب ہو تجلی بخش عالم یہ جناب

عرض فدوی شیخ حفیظ الدین احمد کی[1]

مولوی حفیظ الدین نے سبب تالیف بیان کرنے کے ساتھ اپنا حال بھی اختصار سے لکھا ہے۔

---

[1] دیکھیے قلمی نسخہ ورق ۲

برزویہ طبیب نے انوشیروان عادل کے حکم سے ہندوستان میں آکر کتاب کرٹک[1] دمنک کو زبان پہلوی میں ترجمہ کرکے وادی طلب کے پیاسوں کو سیراب کیا تھا بعد اسکے ابو منصور دوانقی کے وقت میں جب ابوالحسن عبدالمقفع نے اس پردہ نشین شبستان فکر کے تیئں لباس عربی پہنایا پھر سلطان محمود غزنوی کی جب فرمائش ابوالمعالی نصراللہ متوفی اسے زیور فارسی سے آراستہ کیا لیکن نقاب استعارات عرب کے اس کے چہرے پر اس طرح ڈالے کہ دیدار کے طالب جمال مقصود کو نہ دیکھنے سے گھبرائے۔ اس واسطے امیر شیخم سہیل کے حکم سے مولانا حسین واعظ کاشفی نے ان پردوں کو اٹھایا لیکن اس نے آپ نئے سہرے نقاب ڈال کر شتاقوں کو ملال کا موجب ہوا۔ پھر اگرچہ ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی کے حسب الحکم ابوالفضل بن مبارک نے ان نقابوں کو بالکل اٹھاکر اس کے حسن عالم افروز کا جلوہ گر کیا۔ پھر صورت ہندی کو لباس ہندی پھبت ہے۔ شکر خدا کا کہ عہد خداوند عالیشان امیر کبیر شاہ انگلستان کے اس لعبت ہندی سے آرائش پائی اور جس طرح سے مسافر پہونچے وطن میں۔

اُمید ہے کہ میری یادگاری زمانے کے صفحہ پر باقی رہے، سہ

لکھا ہے میں اسے صرف کر روزگار　　رہے گی میرے بعد یہ یادگار
آئی ہاتف سے ندا یوں فی الفور　　خرد افروز جہاں یہ ہیگی[2]

مولوی صاحب کی یہ تالیف فضل خداوندی سے یادگار زمانہ ہوئی۔ اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، انگریزی اور دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۱۵ء میں چھپا۔ ارباب نثر اردو کے مؤلف نے لکھا ہے کہ خرد افروز سب سے پہلے

[1] کلیلہ و دمنہ　[2] ۱۲۱۵ھ دیکھئے قلمی نسخہ ص۳

۱۸۰۸ء میں چھپی تھی۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ ۱۸۴۷ء کے مطبوعہ نسخہ میں سرورق پر اس کی دوبارہ اشاعت کی وجہ اس طرح بیان کی گئی ہے

عیار دانش کا جسے مولوی حفیظ الدین نے زبان اردو میں ترجمہ کیا تھا اس کو کپتان تامس روبک صاحب نے اصل فارسی سے مقابلے کے بعد ساتھ استصحاح مولوی کاظم علی جواں صاحب وغیرہ کے ۱۸۱۵ء میں چھپوایا تھا۔ اب خاکسار فیض اللہ نے جو دیکھا کہ یہ کتاب انتخاب روزگار ہے تو ساتھ شراکت دی رجارو صاحب کمپنی شہر کلکتہ کے محمدی چھاپے خانے جو واقع مچھوا بازار ہے ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۷ء کے چھاپا[۱]

۱۸۴۷ء کے مطبوعہ نسخہ اور خطی نسخہ میں تھوڑا فرق ہے۔ کاظم علی نے ادق فارسی الفاظ استعارات اور دور از کار تشبیہات نکال دی ہیں جسکی وجہ سے ترجمہ میں زیادہ سلاست اور شگفتگی پیدا ہو گئی ہے۔

ابوالفضل نے عیار دانش ملا واعظ حسین کاشفی کی فارسی کتاب انوار سہیلی کو سامنے رکھ کر مرتب کی تھی۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا ابوالفضل نے شہنشاہ اکبر کی ہدایت خاص پر آسان زبان میں عیار دانش کو تالیف کیا۔ جو ادق الفاظ، نامانوس تراکیب اور بے محل تشبیہات اور استعارے انوار سہیلی میں استعمال ہوئے تھے وہ سب نکال دئے خرد افروز کے دیباچے کے مطابق

"ابوالفضل نے حکم سے بادشاہ کے کتاب کو انوار سہیلی کے دستور پر ترتیب دیا لیکن وے دو باب جسے ملا حسین واعظ کاشفی نے کلیلہ دمنہ سے نکال دیا تھا اس کتاب میں لکھے کیونکہ ان دونوں باب کو اگرچہ اصل قصے سے

---

[۱] مطبوعہ نسخہ، سرورق [۲] خطی نسخہ ص۱

علاقہ نہیں لیکن ان سے اکثر اچھی اچھی باتیں داناؤں کے ذہن نشین ہوتی ہیں"[1]

واعظ حسین کاشفی نے مقفع کی عربی کلیلہ دمنہ سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا مقفع نے برہمن بیدپائے کی تصنیف کرتک دمنک کے پہلے پہلوی ترجمے سے عربی میں منتقل کیا تھا۔ اصل کرتک دمنک کی تصنیف کے متعلق یہ لکھا گیا ہے کہ

"اگلے زمانے میں حکیم بیدپائے برہمن نے رائے داشلم ہندی کے حکم سے جو ہندوستان کی کسی سرحد کا حاکم تھا کتاب کلیلہ دمنہ جسے ہندی زبان میں کرتک دمنک کہتے ہیں تصنیف کی تھی۔ جب رائے داشلم نے سمجھا کہ دل ہر وقت حکمت کی باتوں کے سننے پر مائل نہیں ہوتا اور طبیعت افسانوں پر کمال رغبت رکھتی ہے حکیم مذکور سے درخواست کی کہ اگلے داناؤں کی نصیحتیں جو دانش کی ترازو میں تولی گئی ہیں بطور افسانوں کے بے زبانوں کی زبان سے ادا کرنا کہ غرض سے پاک ہو کر [illegible] خوشی کیا تشویش میں اس کتاب کے پڑھنے سے جی نہ اکتاوے، اور ملال نہ آوے۔ سچ ہے کہ یہ کتاب بادشاہوں کے واسطے جہانداری کے قواعد کے حق میں ایک یادگار ہے اور عالی جاہ بادشاہوں کے لئے مردم شناسی اور رعیت پروری کے ضابطوں کی ایک فہرست ہے نوشیروان کو اس کتاب مبارک کو دیکھنے کا شوق ہوا تب برزویہ طبیب کو جو دانش وتدبر میں یکتائے عصر تھا۔ اس کے دستور العمل خرد کی تلاش کے واسطے ہندوستان کو بھیجا۔ طبیب مذکور نے ہندوستان میں آکر بہت مدت تلاش کے بعد ایران کو.....[2] لایا"

نوشیروان عادل کے حکم سے طبیب برزویہ نے ہندوستان کا سفر کیا۔ ہندوستان میں اسکے قیام جستجو اور سخت مشکل کے بعد حکیم بیدپائے کی کتاب پانے کی داستان

[1] خطی نسخہ ص۱ [2] دیکھئے قلمی نسخہ ص۳-۲

دلچسپ پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ کتاب پا کر وہ خوشی سے جھوم اٹھتا ہے
اور اپنے استاد برہمن سے رخصت ہو کر "گنج گراں مایہ" کے ساتھ ایران پہونچتا ہے
برزویہ کی واپسی کی خبر سے ایران میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ نوشیرواں کتاب
دیکھنے کے لیئے بے تاب ہوجاتا ہے اور اپنے عاقل وزیر بزرگ جمہر کو ترجمہ کا
حکم دیتا ہے۔ اس کتاب کے بدلے نوشیرواں برزویہ کو ہفت اقلیم کی بادشاہت
دینے کے لیئے تیار ہوجاتا ہے۔ برزویہ کے سلئے خزانوں کے منہ کھول دئے جاتے
ہیں۔ لیکن برزویہ کو قیمتی سے قیمتی چیز بھی پسند نہیں آتی اور اپنی آرزو اور تمنا کا
اظہار کرتا ہے کہ اس کے متعلق بھی ایک باب لکھا جائے اور کتاب میں شامل کیا جائے۔
"اس نے (برزویہ نے) آداب بجا لا کر عرض کی کہ جہاں پناہ کی نوازش نے
مجھے مال سے بے نیاز کر دیا ہے لیکن جو اتنی نعمتیں دی ہیں ایک خلعت اور عنایت
فرمایئے۔ پھر کہا کہ اگر میں نے اس کام میں محنت اٹھائی اور خوف و رجا میں گذران
کی۔ . . . . اس نے عرض کی کہ بزرگ جمہر کو جو اس کے ترجمے کی ترتیب دینے کے
واسطے حکم ہوا ہے، امر ہو کہ اس میں ایک باب جدا میرے احوال کا لکھے اور اس
میں میرے پیشے کو اور نسب و مذہب کو درج کر دے اور اس باب کو جس مقام
میں جہاں پناہ کی مرضی ہووے داخل کرے تا بندے کی یہ شرافت زمانے میں باقی
رہے اور شہرہ آپکی نیک نامی کا ہر جگہ پہونچے۔ . . ."[1]

نوشیرواں نے طبیب برزویہ کی درخواست قبول کر لی۔ چنانچہ بزرگ جمہر
کے ترجمہ میں ایک باب برزویہ سے متعلق ہے اور اس کے سفر، قیام ہندوستان،

---

[1] دیکھئے خطی نسخہ خرد افروز ورق ۸ ،

مقصد میں کامیابی اور مشکلات کا تفصیل سے ذکر ہے ۔ اس باب اور بزرگ جمہر سے متعلق باب کا ترجمہ انوار سہیلی میں نہیں ہے ۔

خرد افروز مولوی حفیظ الدین احمد بردوانی کا تنہا نثری کارنامہ ہے جسے اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا ہے ۔ خرد افروز عبرت آموز اور اصلاحی کہانیوں اور دلچسپ حکایتوں پر مشتمل ہے ۔ یہ بڑی مفید ہیں ۔ تیسرے باب میں ملک چین کے بادشاہ کے متعلق ایک طویل کہانی بیان کی گئی ہے جس کے بعد رائے دابشلم اور حکیم بیدپائے کا قصہ اس طرح بیان ہوا ہے

"وزیر نیک تدبیر بیان کرنے لگا کہ سخنوری کے شکرستان کی طوطیوں سے اور ہنرمندی کے گلزار کی بلبلوں سے سنا ہے میں نے کہ سواد عظیم ہندوستان کی ایک سرحد میں کہ وہ رخسارۂ عالم کا خال ہے کوئی بادشاہ تھا بیدار بخت فتح نصیب روشن عقل، رعیت نواز، ظالم کش کہ تخت شاہی نے زیور عدالت سے اس کی زیبائش پائی تھی اور دولت گوہر وجود سے اس کے آرائش، لوگ اسے رائے دابشلم کہتے تھے یعنی وہ بادشاہ بڑا تھا، اسکی فوج لڑاکا سپاہیوں اور جنگی مردوں سے آراستہ تھی اور دس ہزار مست ہاتھی اس کے لشکر میں تھے ۔ ساتھ اس بزرگی کے وہ خود رعیت کی (دکھ) غور کو پہنچتا اور متوجہ ہو کر معاملہ ہر ایک دادخواہ کا فیصل کرتا بقول کسی بزرگ کے

مثنوی

جو ہیں زیر دست انکی غمخواری کر ۔۔۔ زبردستی دہر سے دل میں ڈر
حکومت کی مسند تو اس جا لگا ۔۔۔ جہاں دادخواہوں کی پہنچے صدا

نہ دے عمل فعل کو کچھ اس میں راہ کہ شاید انھیں پردہ ہوں داد خواہ[1]

خرد افروز کے سولہ باب ہیں ہر باب کا خلاصہ در خلاصہ بھی لکھ دیا گیا ہے۔ پندرہویں باب کے خلاصہ کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

"ــ خلاصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حلب کا بادشاہ اس بد ذات کو اگر سرفراز نہ کرتا شاہزادی کیوں ناحق خون کرتی اور کس لئے شیر کے ہاتھ ماری جاتی۔ پس چاہیے کہ ہمیشہ حاکم آدمی کے بڑھانے میں کمالِ احتیاط بجالادیں کمینوں کو اپنا مقرب نہ کریں اور دخل بات کرنے کا نہ دیں تو اقبال ان کا قائم رہے گا اور زمانے کے حوادث کے آسیب نہ دیکھیں گے[2]۔"

خرد افروز ایک جاندار کتاب ہے مولانا حفیظ الدین کا انداز بیان بھی صاف اور ستھرا ہے آسان اور عام فہم ہونیکی وجہ سے نوواردانگریزوں میں یہ بیحد مقبول ہوئی تھی۔ تھامس روبک نے اسکے دیباچہ کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا۔ ۱۸۱۵ء کے مطبوعہ نسخہ میں روبک کا عالمانہ دیباچہ شامل ہے بلاشبہ ترجمہ کی وقت کے پیش نظر مولوی حفیظ الدین نے بعض استعارات اور تشبیہات فارسی کی لکھ دی ہیں اور فارسی جیسی رنگین سنگین عبارتیں بھی جا بجا ملتی ہیں لیکن انکی کثرت نہیں ہے۔

خرد افروز کا خطی نسخہ ۲۹ اوراق پر پھیلا ہوا ہے۔ سائز ۷×۶ ہے۔ یہ نسخہ خوشخط لکھا ہوا ہے مسٹر ٹی پی مینویل نے خرد افروز کے بعض ابواب کے خلاصوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو ہوگلی پریس سے شائع ہوا ہے اور اس وقت کے نصاب میں شامل تھا۔

خرد افروز سچ یادگار زمانہ کتاب ہوئی اور صرف اسی ایک کتاب کی وجہ سے اردو ادب میں مولوی حفیظ الدین کا نام زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ و جاوید رہیگا۔

---

[1] دیکھئے ورق ۲۳ قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کا [2] ایضاً ورق ۲،۳،۴، ۵، ۳

خلیل علی خاں اشک

خلیل علی خاں اشکؔ فورٹ ولیم کالج کے بدنصیب منشیوں میں ہیں۔ بدنصیب اس لئے کہ ان کی کتاب داستان امیر حمزہ کو شہرت دوام اور قبول عام نصیب تو ہوا لیکن ادبی دنیا میں ان کو وہ مقام اور شہرت نہ مل سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ اور اکثر لوگ ان کے نام سے بھی ٹھیک طور پر واقف نہیں ہیں۔ ان کی کتاب داستان امیر حمزہ اب بھی اکثر لوگوں میں اتنی ہی مقبول اور مرغوب ہے جتنی مختصر کہانیاں اور ناول۔ میرامن کے باغ و بہار عرف قصہ چہار درویش کی طرح لوگ اب بھی حصے کی شکل میں اسے پڑھتے ہیں۔ اور سنتے ہیں۔

کالج کے دیگر منشیوں کی حیات اور ان کے ترجموں اور تالیفات کا تھوڑا بہت حال تو قدیم اور جدید تذکروں میں مل جاتا ہے لیکن اکثر تذکرہ نگاروں نے نہ تو خلیل خاں اشک کا حال ہی لکھا ہے اور نہ ہی ان کی بعض اہم اور قابل قدر کتابوں کا ذکر ہی کیا ہے۔ اشکؔ کی حیات گمنامی کی دبیز چادروں میں لپٹی ہوئی ہے اور ان کی زندگی کے حالات جو بعض کتابوں میں ملتے ہیں وہ صحیح بھی نہیں۔ وہ ساتھ ساتھ گمراہ کن بھی۔ اشک نے اپنی ایک غیر مطبوعہ تالیف "انتخاب سلطانیہ[1] اردو" میں اپنا اور اپنے خاندان کا حال لکھا ہے۔

"حمد و نعت کے بعد یہ احقر العباد محمد خلیل علی خاں اشک فیض آبادی کہ تولد

---

[1] انتخاب سلطانیہ اردو خلیل اشک کی تصنیف ہے۔ ۱۲۲۹ھ میں اشک نے مادرت (باقی اگلے صفحہ پر)

اس کا شاہ جہاں آباد دلّی ہے۔ لیکن سن تمیز کو فیض آباد میں آکر پہونچا اور علم وادب موافق اپنے حوصلے کے تقید (تاکید) سے بزرگوں کی اور صحبت سے امیروں اور وزیروں کی اس خطہ حسن افزا میں کہ رشک فردوس ہے، تحصیل کیا۔ اور اکثر محفلوں میں شہزادوں کے (کی) معزز رہا۔"

"سن ۱۲۰۹ ہجری میں آب و خور ملک میں بنگالے کے کھینچ لایا ۱۲۱۵ھ مطابق سنہ ۱۸۰۱ء میں شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہٗ کے اور عصر میں صاحب عدل مارکویس ولزلی دار الحکومت کلکتہ میں وارد ہوا.... لیکن احوال یہاں کا دیکھ کے اکثر لوگوں سے ترک ملاقات کر کے خانہ نشینی اختیار کی۔ ایک روز مخدوم زادہ واشکوہ خلف الرشید قاضی القضاہ قاضی محمد نجم الدین خاں صاحب مولوی سید الدین صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ صاحب عالیشان نے لکھنؤ سے شاعر بلوائے ہیں۔ چنانچہ ان میں مرزا کاظم علی صاحب کہ جواںؔ تخلص کرتے ہیں یہاں تشریف لائے ہیں۔ اس سے دل کو نہایت خوشی حاصل ہوئی کیونکہ احقر نے انہی کے فیض کلام سے شعر و شاعری کا اور فن سخن آوری کا حاصل کیا تھا۔ اسی وقت بے تامل انکی خدمت میں جا کر حاضر ہوا .... انھوں نے ارشاد کیا کہ تعجب ہے کہ تم اس شہر میں ہو اور مسٹر گل کرسٹ سے ملاقات نہ کرو کہ جوہر شناس گوہر لفظ معانی ہیں اور فن نکتہ دانی میں

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ نوٹ) گلکرسٹ صاحب کی فرمائش پر جدید مدرسہ کیلئے یہ کتاب لکھی۔ دلی کی ابتدا سے شاہ عالم کے عہد کے تاریخی واقعات افسانوی انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ شاہ معز الدین مشام یعنی شہاب غوری کی تاریخ سے کتاب شروع ہوتی ہے۔ دلی کی وجہ تسمیہ بھی اس سے قبل لکھی ہے۔ سلطانیہ اردو کا قلمی نسخہ ۱۱۵ اوراق پر مشتمل ہے۔

لا ثانی ۔ ۔ ۔ ۔ چنانچہ اپنے ہمراہ لیجا کر ملازمت کروائی ۔ صاحب عالی قدر ملاقات کے وقت گفتگو سے اس احقر کے نہایت خوش ہوئے ، ور فرمایا کہ ہمارے لئے قصہ امیر حمزہ کا ریختہ میں ترجمہ کرد ۔ بموجب فرمانے کے احقر اس کام میں مشغول ہوا ۔ اور چند داستانیں لکھی تھیں کہ سبب سے زمانے کی ناتواں بینی کے طبیعت پر گرانی گذری ۔ پھر آکر خانہ نشیں ہوا اور گوشۂ عافیت کو اختیار کیا ۔ یہ احوال سُن کر مولوی سعید الدین صاحب نے لے جا کر خداوند نعمت ہربرٹ ہرنگٹن صاحب عالی جاہ سے ملازمت کروائی جنھوں نے کہا کہ تمہاری خاطر کونسل میں لکھیں گے اور سب دفتر امیر حمزہ کے قصے کے تصنیف کرو ۔ چنانچہ انہی کی شفقت بے پایاں کے سبب روزگار ہوا ۔ اور پھر مسٹر جان گل کرسٹ صاحب نے احقر کو مانگ لیا ۔"[1]

خلیل علی خاں اشک کی اس مختصر خود نوشت سوانح حیات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ خلیل علی خاں اشک دلّی میں پیدا ہوئے تھے مگر ان کی زندگی کا بیشتر حصہ فیض آباد اور پھر بنگالہ (غالباً مرشد آباد) میں گذرا ۔ اور یہ کہ وہ مرزا کاظم علی جواں کے تلامذہ میں سے تھے ۔ مولوی اکرام علی مولف اخوان الصفا سے ان کا رشتہ نہیں تھا ۔ مولوی اکرام علی یا ان کے بھائی کے ساتھ خلیل علی خاں اشک کا دور کا بھی رشتہ ہوتا تو اپنے کسی بھی مخطوطہ میں اس کی طرف وہ کم از کم ہلکا سا بھی اشارہ ضرور کرتے ۔

انتخاب سلطانیہ اردو کے دیباچہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اشک شروع میں کلکتے کے ادبا و شعرا سے دل برداشتہ سے تھے ۔ کاظم علی جواں کی سفارش پر

---

[1] ملاحظہ ہو دیباچہ انتخاب سلطانیہ اردو قلمی ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کلکتہ ، ٹرالکا جلد ، ص ۳۰۱

ان کو کالج میں ملازم ضرور رکھ لیا جاتا ہے مگر کالج کے دیگر با اختیار منشیوں اور شاید میر منشی بہادر علی حسینی سے ان کا نباہ نہ ہو سکا۔ اور پہلی بار چند مہینوں کے اندر ان کو چھٹی دیدی گئی تھی ۔۔۔ اور جب دوسری بار ہرنگٹن صاحب کی سفارش پر ان کو دوبارہ ملازمت ملی تو انھوں نے داستان امیر حمزہ مکمل کی۔ اور اس سے فراغت پانے کے بعد انھوں نے واقعات اکبر انتخاب سلطانیہ اردو قصہ رضوان شاہ اور منتخب الفوائد جیسی مفید اور پُراز معلومات کتابیں ترجمہ اور تالیف کیں۔ مگر یہ اُردو ادب کی بدبختی تھی کہ داستان امیر حمزہ کے سوا ان کی کوئی دوسری کتاب چھپ کر منظر عام پر نہ آسکی۔

واقعات اکبر اور منتخب الفوائد چھپ جائیں تو اردو ادب کے سرمایہ میں بڑا اضافہ ہوتا ہے۔ واقعات اکبر" کا ذکر تو تذکروں میں مل جاتا ہے۔ مگر اشک کی منتخب الفوائد کے بارے میں شاذ و نادر ہی کہیں کوئی ذکر کیا گیا ہو۔ اس وقت اشک کی اس مفید کتاب پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

دراصل منتخب الفوائد خلیل علی خاں کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ یہ ان کی اپنی تصنیف نہیں ہے بلکہ محمد منصور ابو الفرح خلیل کی ضخیم فارسی تالیف کا ترجمہ ہے۔ اشک نے اس کی اردو میں تالیف و ترجمہ کا حال دیباچے میں خود لکھا ہے:۔

"یہ حقیر العباد محمد خلیل خاں کہ تخلص جس کا اشک ہے سن ہجری بارہ سو چھبیس کے درمیان مطابق سنہ ۱۸۱۰ء کے وقت میں محمد اکبر بادشاہ غازی خورشید نزاک حکومت کے عہد میں، صاحب عدل و داد، آبادی ملک، مراد عادل جہاں

باذل زماں امیر الامراء زبدۂ نوئیناں عظیم الشان نواب اشرف الاشراف لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر ممالک محروسہ سرکار کمپنی انگریز متعلق کشور ہند کے اور حکومت میں خداوند نعمت کپتان ٹیلر صاحب دام حشمتہ کی انتظام میں فلاطون زماں مسیحائے وقت صاحب عالیشان ڈاکٹر ولیم ہنٹر صاحب دام دولتہ کے کتاب اوصاف الملوک وطرق خرد بھم کو کہ سلطان شمس الدین التمش کے حکم سے جس کو محمد منصور سعید ابو الفرج خلیل نے بہ مشقت تمام بڑی جد و جہد سے ہزاروں کتابوں کا انتخاب کرکے تالیف کیا تھا، زبان اردو میں موافق محاورے کے واسطے مدرسہ عالیہ کے ترجمہ کیا، ازبسکہ بعضے بعضے علم و کسب جو مؤلف نے بیان کئے ہیں اس کے مطلب کو قلمبند کرکے ان میں جس جس فن میں ترجمہ کو بھی دخل تھا مطابق اپنے حوصلے کے تزاید کیا ۔ لیکن اتمام اس نسخے کا بارہ سو چھبیس ہجری میں ہوا ۔ اس خاطر نام اس کا منتخب الفواید رکھا کیونکہ تاریخ بھی اس کی بھی پائی ۔

رباعی (قطعہ تاریخ)

آیا تھا خیال حسن کے رنگین یہ کلام — تاریخ کا پہنچائے اس کا انجام
اداب کا یا بڑھا کے ہاتف بولا — رکھ منتخب الفوائد اس کا نام[۱]

جیسا کہ دیباچے سے ظاہر ہے منتخب الفوائد میں بادشاہوں کے اوصاف خصائل اور عدل و انصاف اور طریق حکومت سے متعلق سبق آموز کہانیوں کا

[۱] ملاحظہ ہو دیباچہ قلمی نسخہ ۔ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کلکتہ

خزانہ سمٹا ہوا ہے۔ یہ حکایتیں مذہبی رنگ میں بیان کی گئی ہیں۔ جو قاری کے ذہن کو بہت جلد متاثر کرتی ہیں۔ منتخب الفوائد ۲۷ ابواب پر مشتمل ہے۔ اشک نے اپنی تالیف کی فہرست اس انداز سے ترتیب دی ہے۔

منتخب الفوائد کی اس طویل فہرست میں گھوڑوں کا بیان سب سے طویل ہے۔ اور تقریباً ۲۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ گھوڑے کے باب کا ترجمہ خلیل علی خاں اشک نے بڑی محنت سے کیا ہے اور حسب ضرورت کمی بیشی کر کے دلچسپی برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یوں تو پوری کتاب مفید، دلچسپ اور پند و نصائح میں ڈوبی ہوئی ہے اور مذہب اور اخلاق کے بیش بہا موتی اپنے دامن میں سمیٹے ہے مگر اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بادشاہ سے لیکر معمولی سپاہی، تونگر سے لیکر ادنیٰ فقیر کے لئے عبرت اور سبق کے موتی بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ اور ان موتیوں سے انسان اپنے دامن کو بھرے اور ان انمول نصائح پر کاربند ہو تو حیات انسانی کو وہ معراج حاصل ہو جائے گی جس کے لئے اس کی تخلیق ہوتی ہے۔

منتخب الفوائد کا پہلا باب بادشاہوں کے کرم و حلم اور عفو کے بیان میں ہے اس سے کتاب شروع ہوتی ہے۔

"چنانچہ آیہ کلام اللہ ہے کہ جس کا ترجمہ یوں ہے کہ کھانے والے غصہ کے اور اور بخشنے والے آدمیوں کے حق تعالیٰ دوست رکھتا ہے احسان کرنے والوں کو،

یہ آیہ بہشت کے ایک دروازے پر لکھی ہوئی ہے جو کوئی دنیا میں اس آیت پر عمل کرے گا قیامت کے دن اس دروازے سے بہشت کے اندر جائے گا، روایت معتبر ہے کہ جب پیغمبر علیہ السلام کو رسالت ہوئی، وحی نازل ہونے لگی حکم جناب ایزدی سے نماز پڑھنے اور عبادت کرنے کا آیا۔ پیغمبر اسلام نے لوگوں سے پوشیدہ نماز پڑھی اور بندگی کرنی شروع کی کیونکہ جب تک اسلام کو ایسی قوت نہ ہوئی تھی کہ آشکارا نماز پڑھتے۔ جہاں کہیں مکان خالی گوشے کا دیکھتے نماز ادا کرتے ایک دن نماز پڑھتے تھے کہ مکہ کے کافروں نے دیکھا کہ پیغمبر علیہ السلام نماز میں مشغول ہیں۔ جس وقت حضرت مسجد میں گئے ان ناپاک بت پرستوں نے نجاست حضرت کی گردن مبارک پر ڈال دی۔ جناب فاطمہ علیہا السلام یہ حالت دیکھ کر بہت روئیں اور وہ نجاست گردن مبارک سے جناب پیغمبر کی اٹھا کر پھینک دی، اس طرح کی بے ادبیاں کفار اکثر کرتی تھیں (کرتے تھے) اور پیغمبر علیہ السلام کرم و حلم کے سبب عفو فرماتے تھے۔ جب ظلم ان کا حد سے گذرا، اجناب پیغمبر نے درگاہ ایزدی میں گریہ و بکا کیا اسی وقت حضرت جبرئیل اور میکائیل انکی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ خدا تعالیٰ نے سلام فرمایا ہے اور ہم کو دیا ہے کہ جو کچھ آپ ارشاد کریں ہم ان کو بجا لائیں۔ . . . . . .

جناب پیغمبر نے دونوں ہاتھ بلند کئے اور دعا طلب کی لے بارخدایا قوم اور امت کو مری راہ راست دکھاؤ کہ یہ نہیں جانتے۔ حضرت جبرئیل و میکائیل یہ کرم و حلم دیکھ کر کمال تعجب میں آ گئے[۱]"

---

[۱] ملاحظہ ہو قلمی نسخہ ص۱۰۶

کرم وحلم اور عفو کا باب خاصہ طویل اور مفید ہے اور اس باب میں متعدد نصیحت آموز حکایتیں بیان کی گئی ہیں، بعض امیرالمومنین حضرت علیؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ بعض حضرت عثمانؓ اور بعض حضرت عمرؓ سے روایت ہیں۔ ہر حکایت نصیحت سے پُر ہے اور ہر میں یہ بات لوگوں کو ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ کرم، حلم اور عفو ایسی صفات ہیں جو ذہن انسانی کو صیقل کرتی ہیں اور اسے اعلیٰ مرتبہ بخشتی ہیں۔

دوسرا باب عدل اور نظام حکومت سے متعلق ہے۔ اس باب کی تمام حکایتوں میں بادشاہوں کو راہِ نجات دکھائی گئی ہے۔ نظم ونسق چلانے کے طریقے بتائے گئے ہیں اور ان کو عدل وانصاف کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اسی بادشاہ کو ابدی زندگی اور دائمی شہرت ملتی ہے جو انصاف کے پرخار راستے پر قدم جماکر سفر جاری رکھتا ہے جس کے انصاف کی ترازو کے پاٹ برابر ہوتے ہیں اور جو انصاف کے لئے اپنی بادشاہت بھی قربان کرنے کے لئے تیار رہتا ہے اور کسی قیمت پر بھی انصاف کا خون ہونے نہیں دیتا۔ اور وطن اور قوم کی ترقی، آزادی اور خوشحالی کے لئے وہ عظیم سے عظیم قربانی دینے میں تامل نہیں کرتا۔ ایثار کے جذبے سے معمور دل کو ہی معراج حاصل ہوتی ہے ظالم اور جابر حکمراں کی ناؤ چند دنوں کے اندر قہرِ خداوندی کے طوفان میں ڈوب جاتی ہے۔ اس باب میں کئی عمدہ، موثر اور مفید حکایات بیان کی گئی ہیں، جو حضرت رسول صلعم اور خلفائے دین سے روایت ہیں۔ حضرت عمر عبدالعزیز امیہ خاندان کے سب سے زیادہ عادل، پارسا اور خداترس خلیفہ گذرے ہیں۔ ان کے دل میں خدا کا خوف، ان کا انصاف اور اپنی رعایا کے لئے جذبۂ ایثار یہ سب

ضرب المثل بن چکے ہیں۔ اس خدا ترس خلیفہ کی ایک حکایت نقل کی گئی ہے۔

سید عبداللہ کہتا ہے کہ جب عمر عبدالعزیز مدینہ کا حاکم ہوا ایک کشتی بھرا اناج بکنے کو آیا۔ محمد عبداللہ شرقی نے اس کو منع کیا اور اس کے بیچنے سے باز رکھا۔ کہا پیغمبر علیہ السلام سے میں نے سنا ہے کہ جو بادشاہ یا امیر واسطے تجارت کے غلہ مول لے اس ارادہ پہ کہ پھر رعیت کے ہاتھ بیچے وہ رعیت مقرر ہلاک ہوگی یہ سنکر فرمایا کہ تمام غلہ کو خیرات کردو۔ اور فرمایا کہ کشتی کے بھی تختے نکال لو اور غریبوں اور فقیروں کو دیدو۔"

منتخب الفواید میں حکمرانوں کے عدل و انصاف سے متعلق متعدد حکایات درج کی گئی ہیں جو اتنی دلچسپ ہیں کہ ایک حکایت کو بھی چھوڑ کر آگے بڑھنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ نصیحتوں کی دولت سے پُر یہ حکایتیں آج بھی حکمرانوں کے لئے مشعل راہ بن سکتی ہیں۔ اور ان پر سختی سے عمل پیرا ہو کر ایک حکمران اپنی سلطنت میں خوشحالی کے پھول کھلا سکتا ہے۔

اس کتاب میں ہتھیار، لڑائی اور گھوڑے اور کسب علم کے احوال دلچسپ اور معلومات افزا بھی ہیں اور محیر العقول بھی۔ ہتھیار اور لڑائی کے باب کی ہر حکایت انسان کو امن و شانتی کی زندگی گذارنے اور جنگ سے نفرت کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ ان حکایات میں جو پیغمبر اسلام اور خلیفۂ دین سے روایت ہیں بتایا گیا ہے کہ وہی خلیفہ یا حاکم عظیم المرتبت اور نامور ہوتا ہے جسے اپنے ملک اور اپنی قوم کی پر حسرت زندگی سے الفت ہوتی ہے جو جنگ اور خون ریزی سے کوسوں دور بھاگتا ہے۔ ان میں جنگ سے حتی الامکان بچنے پر زور

دیا گیا ہے۔ آج بھی ساری دنیا جنگ کے تصور سے ہی کانپ رہی ہے۔ آج بھی قومیں جنگ سے نفرت کر رہی ہیں اور امن و شانتی کی زندگی بتانے پر زور ڈال رہی ہیں۔ اپنی سلطنت میں امن وامان برقرار رکھنے کے لئے بادشاہوں کو یہ نصیحت بھی ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ ہمیشہ ایسے وزیر مقرر کرو جو دانا و بینا ہوں، جنگ کرنے اور رعیت کا خون چوسنے کی ترغیب نہ دیتے ہوں۔

"نوشیرواں کہتا ہے کہ وزیروں میں بدترین خلائق وہ ہے کہ بادشاہ کو تحریص لڑائی کی دے یا لڑائی پر چڑھا لے جائے۔ ہر ایک کام اور خرچ ہو ہمیشہ طمع زر و مال کی رکھتا ہو اور لڑائی کے وقت اپنی جان بچانے کی فکر میں رہے۔"

حضرت سلیمان، بہرام گور، سکندر ذوالقرنین کی بھی حکایات نقل کی گئی ہیں۔ یہ حکایتیں بڑی محنت اور کاوش سے جمع کی گئی ہیں۔ جن میں بار بار یہی کہا گیا ہے کہ ایک فرماں روا کو خونریزی اور لڑائی سے آخر آخر تک گریز کرنا چاہیے اور جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد مفتوح حکمرانوں کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا چاہیئے۔ اس ضمن میں حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کی دلچسپ و معلوماتی حکایت درج کی گئی ہے۔

سلیمانؑ جب کسی لڑائی پر جاتے تھے آصف برخیا کو اپنے ساتھ لے جاتے اس واسطے کہ وزیر کافی اور کارداں عالم تھا۔ دوسرے یہ کہ ولی صاحب کمال تھا۔ اس کے (کی) کراماتوں میں سے ایک یہ تھی کہ جس وقت بلقیس (سبا) حضرت سلیمان کی خدمت میں روانہ ہوئی لشکر کثیر لیکر اپنے شہر سے نکلی اور اپنے

لے ملاحظہ ہو کتاب ہذا ص۱۵۱

تخت کو سات حجروں کے اندر رکھوایا۔ اور سب دروازوں میں مہر کی۔ ہدہد نے حضرت سلیمانؑ کو یہ خبر دی سلیمانؑ نے فرمایا کہ چاہئے کہ وہ تخت قبل اس کے آنے کے یہاں ہو، دیو عفریت نے آکر عرض کیا کہ جس روز سے حضرت تخت حکومت اور مسند تخت پر بیٹھے ہیں، میں حکم بردار ہوں۔ اگر حکم ہو تو بندہ جاوے اور اس تخت کو لے آوے کہ کسی طرح اس میں خلل نہ آوے کوئی عدد جواہر کا برباد نہ ہو، فرمایا مجھے اس سے بھی جلد چاہئے۔ یہ فرما کر طرف آصف کے دیکھا اور کہا یہ کام تمہارا ہے۔ آصف اس وقت اٹھا اور دو رکعت نماز ادا کی جبکہ اس سے فارغ ہوا طرف آسمان منہ کر کے دعا طلب کی۔ جناب عزت نے اسی وقت اس کو مستجاب فرمایا۔ اس وقت آصف نے طرف سلیمان کے دیکھا اور کہا دیکھو خدا نے فرشتوں کو بھیجا ہے کہ تخت بلقیس کا اٹھا کر زمین کی راہ سے لاویں یہ بات تمام کی تھی کہ فرشتوں نے اس کا تخت زمین کے قلعہ سے نکال کر حضرت سلیمان کے آگے رکھ دیا۔ اس دعا کے احوال جو آصف نے پڑھی تھی اہل تفسیر نے اختلاف کیا ہے۔ بعضے کہتے ہیں کہ یا حی و قیوم پڑھا تھا اور بعضے کہتے ہیں کہ یاذوالجلال والاکرام۔ غرض جب تخت پہنچا حضرت سلیمان نے چاہا کہ عقل و کیاست و ہوشیاری میں بلقیس کی آزمائش فرمائیں۔ حکم کیا کہ اس تخت سے ایک تختی جواہر کی کم کر دو اور تخت کو پھیر کر رکھو۔ دیکھیں پہچانتی ہے یا نہیں۔ لوگوں نے حسب ارشاد وہی کیا۔ جب بلقیس آئی اور حضرت سلیمان کے ہاتھ مسلمان ہوئی، سلیمان علیہ السلام نے اس سے پوچھا کہ یہ تخت تیرا ہے۔ اس نے دیکھا کہ اگر کہتی ہوں کہ میرا ہے تو میں اس کو سات در بند میں رکھ کر آئی ہوں اور اگر کہتی

ہوں کہ میرا نہیں تو شاید میرا ہو تو چھوٹی ہوں گی، کچھ سوا اس کے نہ کہا کہ صورت اس کی اس تخت کی سی ہے۔ حضرت سلیمان نے اس کی عقل پر آفریں کی اور نکاح باندھا اور اس کے دارالملک کی طرف روانہ فرمایا۔ اس واسطے ہر بادشاہ کو لازم ہے کہ اہلِ سلاح سے اتفاق رکھے اور ان پر احسان کرے۔[۵]

ہتھیاروں کی فضیلت کے باب میں جو حکایتیں لکھی گئی ہیں وہ سخت کوشی اور عرق ریزی کے بعد ہی جمع کی گئی ہیں۔ منتخب الفواید کے مؤلف ابوالفرح خلیل نے ہتھیار کی ساخت، اس کے استعمال کے آغاز کی حکایت دلچسپ انداز میں لکھی ہے۔

دریافت کیا چاہئے کہ پہلے سلاح کو حضرت آدمؑ اپنے کام میں لائے اس کا احوال اس طرح ہے کہ جب جناب باری نے حضرت آدم کو بہشت میں بھیجا کہ نعمت برخورداری بہشت سے حاصل کرے۔ شجاعت، مردانگی جو اس کی ذات میں تھی حرکت میں آئی۔ حضرت آدم اس سے کمال تعجب میں تھے۔ یہ کیا کہ جبرئیل ان کے پاس تشریف لائے۔ حضرت آدم نے حضرت جبرئیل سے اس حرکت کا احوال پوچھا یہ کیا ہے حضرت جبرئیل نے کہا یا آدم یہ حرکت شجاعت مردانگی ہے آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ اسباب اس کا کیا ہے کہا کہ ایک ساعت صبر کر کہ میں اسباب اس کا تجھے دکھاؤں۔ اس وقت فرمان ایزدی سے گیا۔ اور خزانے سے عرش کے ایک کمان لایا کہ یاقوت احمر کی تھی اور چلّا اس کا مروارید کا اور تین تیر یاقوت زرد کے کہ سریاں ان کی زمرد کی اور پیکان نیلم کے تھے۔ آدم علیہ السلام کو دیا اور

---

۵ ملاحظہ ہو منتخب الفوائد قلمی نسخہ ص ۵۸۵

کمان کھینچنا، شست باندھنا اور تیر لگانا سکھایا کہ تیر اس طرح مارتے ہیں۔ حضرت آدم نے پہلا تیر بہشت کے کوے پر مارا، خطا ہوا، حضرت جبرئیل ہنسے اور حضرت آدم شرمندہ ہوئے اور دوسرا تیر مارا کہ تین ہشہ پر کوے کے گر پڑے، چنانچہ تین طرف تیر کے جو پر گیری ہوتی ہے اس کی ابتدا اس سے ہوتی ہے[1]۔۔۔۔

"تیر و کمان کی ابتدا اور آدم کی تربیت کے بعد تیر اندازی، تیغ زنی اور چوگان بازی کی اقسام اور صفتیں بالتفصیل بتائی گئی ہیں۔ بقراط کا قول نقل کیا گیا کہ تیراندازی اور چوگان بازی سے بہتر کوئی ہنر نہیں ہے۔"

اگلے زمانے میں جب توپ اور بم ایجاد نہیں ہوئے تھے تو اس وقت تیر اور نشانہ باز تیر انداز جنگ جیتنے کا بڑا ذریعہ ہوتے تھے۔ تیر سے ایک بادشاہ کی شکست اور اس کے لشکر جرار کی پسپائی کی حکایت ناصحانہ انداز میں بیان کی گئی ہے۔

"کہتے ہیں کہ جب امیر سبکتگین نے قلعہ کرویز کا محاصرہ کیا تھا ترکوں نے اس لڑائی میں کمال سستی کی۔ امیر لشکر کی یہ حالت دیکھ کر مارے غصہ کے پیادہ ہوا اور آپ قلعے کی ہور چلا کہ فتح کرے۔ ایک حکم انداز نے قلعے کے اوپر سے ناوک کا تیر مارا کہ اس جگہ شہید ہوا کہ لشکر وہاں سے پھرا[2]۔۔۔"

ایسی حکایتیں اور روایتیں کئی کئی بیان کی گئی ہیں۔ ہر اولوالعزم بادشاہ، بہادر سپاہی اور حوصلہ مند شخص کو تیر اندازی کا ہنر سیکھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

---

[1] منتخب الفوائد ق ، ۱۶ ، ورق [2] ملاحظہ ہو قلمی نسخہ صفحہ ۳۴۲

یوں تو منتخب الفواید کے تمام باب دلچسپ اور سبق آموز ہیں مگر سب سے دلچسپ اور مفید باب گھوڑے کی فضیلت کے بیان میں ہے۔ گھوڑوں کی فضیلت اور خوبیوں، ان کی اقسام کا دلچسپ حال ملتا ہے۔ خلیل نے گھوڑے کی وجہِ آفرینش کا حال مفصل اور انتہائی دلچسپ انداز میں لکھا ہے

"جناب امیر المومنین یہ روایت جناب رسولِ خدا کی زبان سے فرماتے تھے کہ روایات متن میں سے مشہور ہے کہ جناب ایزد سبحانہ تعالیٰ نے چاہا کہ گھوڑا پیدا کرے۔ باد جنوب سے فرمایا کہ میں تجھ سے ایک خلقت پیدا کروں گا کہ اس پیشانی میں سفیدی ہو اور اس سے عزت و زیبائش ہو، میرے دوستوں اور اہل طاعت کو اور ذلت دشمنوں کو، ہوا نے جواب دیا جو مرضی تیری، پس جناب حق تعالی نے باد جنوب سے گھوڑا پیدا کیا اور فرمایا کہ خیر و برکت تیری پیشانی کے بالوں میں میں نے رکھی ہے۔ تیری سواری کو غنیمت جانیں گے۔ تجھ میں خاصیت غنیم کے روبرو جانے کی اور دشمن کے مقابل سے بھاگنے کی دی ہے اور تجھے فراخ روزی پیدا کیا ہے اور مبارک دیدار اور سب چارپایوں پر تجھے فضیلت دی ہے اور تیرے خاوند کو تجھ پر مہربان کیا ہے کہ بھاگنے اور پکڑنے کے وقت بے بال و پر اڑو گے۔ اور میں آدمی پیدا کروں گا کہ تمہاری پیٹھ پر تکبیر و تسبیح کریں گے اور جو کوئی گھوڑے کی پیٹھ پر تکبیر یا تسبیح کرے گا اور اس کی آواز وہ سنے گا وہ بھی اسی طرح کرے گا[۵]..... الخ

"..... اور جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تمام اشیا اور حیوانات

---

۵ کتاب ہذا ص ۲۰

کو آدم علیہ السلام کے روبرو حاضر کیا اور فرمایا آدم جن چیزوں میں جس چیز کو چاہتا ہولے۔ حضرت آدم نے گھوڑے کو لیا۔ اس وقت جناب باری نے ارشاد کیا کہ آدم جس چیز کو تم نے پسند کیا اس سے تیرے اور تیری فرزند کی عزت ہے اور یہ تیرے فرزندوں کے پاس رہیں گے[۱]۔۔۔"

گھوڑوں کی وجہ تخلیق بیان کرنے کے بعد گھوڑوں کی اقسام، تعریف، اور خصوصیات بالتفصیل بیان کی گئی ہیں۔ خدائے بزرگ برتر نے دنیا میں مختلف رنگ و روپ اور نسل کے گھوڑے پیدا کئے جو حضرت آدم کی اولاد کے لئے بے حد کارآمد ہیں اور وفادار ہیں۔ بعض گھوڑے مالک کے لئے اقبال مند ہوتے ہیں۔ بعض صرف جنگ اور معرکہ آرائیوں کے لئے ہوتے ہیں۔ بعض اتنے منحوس ہوتے ہیں کہ اپنے آقاؤں کی شان و شوکت اور آن بان کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوتے ہیں۔ مولف نے گھوڑوں کے خوش قسمت، منحوس یا مفید یا ضرر رساں ہونے کی پہچان ان کے ایال بتائے ہیں۔

اس بیان میں مختلف اقسام کے چھ گھوڑوں کے پنسل اسکیچ (لکیری خاکے) بھی دئے گئے ہیں۔ ان خاکوں میں مختلف رنگ کی پنسلوں سے رنگ آمیزی بھی کی گئی ہے۔ پنسل کی بنی ہوئی تصویریں فنکارانہ ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اشک کے لئے یہ تصویریں کالج کے یوروپین آرٹسٹوں نے بنائی ہیں۔ اس میں گھوڑوں کی متعدد بیماریوں اور ان کے علاج کے بھی طریقے مفصل لکھے گئے ہیں۔

گھوڑوں کی فضیلت اور اقسام کا بیان ظاہرًا تو خشک نظر آتا ہے

---

[۱] ملاحظہ ہو قلمی نسخہ ص ۲۰۰

اور طویل بھی ہے لیکن اشک کے جاندار انداز بیان اور آسان اسلوب نے ان میں بلا کا زور بھر دیا ہے اور پورا باب بے حد دلچسپ ہو گیا ہے اور پڑھتے وقت کسی قسم کی جھنجھلاہٹ یا اُوب نہیں ہوتی۔

نامہ بر اور تحفہ بھیجنے کا باب بھی خاصا دلچسپ اور مؤثر ہے۔ اس باب کی کہانیوں میں بتایا گیا ہے کہ حکمرانوں کو احتیاط سے نامہ بر اور قاصد کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ ذی ہوش اور باشعور نامہ بر اپنے مالک کے مشکل سے مشکل کام کو خوش اسلوبی سے انجام دیتا ہے۔ اس میں ایک حکایت طراخ کی ہے جو حضرت علی کی طرف سے پیغام لے کر حضرت معاویہ کے پاس جاتا ہے۔ حضرت معاویہ کا بیٹا فاسق یزید اسے زک دینے اور ذلیل کرنے کی حتی الوسع کوشش کرتا ہے لیکن طراخ اپنی ذہانت سے پانسا اپنے اور حضرت علی کے حق میں پلٹ دیتا ہے۔ اور معاویہ اور یزید دونوں ہی ذلیل ہوتے ہیں۔

"حصول تعلیم کے متعلق بھی بڑی جاندار حکایت بیان کی گئی ہے اور لوگوں کو کہا گیا ہے کہ حصول علم میں کبھی کوتاہی نہیں برتنی چاہیئے۔ خیرات، زکوٰۃ میں بے پروائی نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ انسان کی نجات کی سیڑھیاں ہیں۔"

پیغمبر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب فرزند آدم دنیا سے رحلت کرتا ہے تمام اعمال خیر اور نیکیوں کے منقطع ہو جاتے ہیں مگر تین چیز۔ ایک یہ کہ واسطے مسلمانوں کے خیرات وقف جو اس نے مقرر کیا ہے کہ بعد اس کے بھی جاری ہے دوسرے علم و تصنیف کہ لوگ پڑھیں اور فائدہ اٹھائیں کہ ثواب اس کو ہو یا فرزند اہل ہو کہ بعد اس کے دعائے مغفرت کرے جو کہ حلال ہے۔ حساب اس کا

قیامت میں لیں گے اور جو کہ حرام ہے عذاب کریں گے ، لازم ہے کہ بدکام سے پرہیز کرے کہ اس کا مواخذہ قیامت میں ہووٹے گا۔[1]

اس طرح ہر باب کے متعلق ناصحانہ حکایات درج ہیں۔ جاسوس بھیجنے افواج کی صف آرائی اور شب خون مارنے کے متعلق بے حد مفید اور جنگی نقطۂ نظر سے کارآمد باتیں ان کہانیوں میں ملتی ہیں۔

منتخب الفوائد کی آخری حکایت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے حضرت موسیٰ کو پیغمبری اور خدا کی تجلی ان کی سادہ لوحی اور معصومیت کی وجہ سے ملی تھی۔ جب پہلی بار انہیں یہ معلوم ہوا کہ خدا نے اپنے کروڑوں بندوں میں سے ان کو ہی اپنا قاصد اور پیغمبر مقرر کیا ہے تو وہ حیرت واستعجاب کے سمندر میں ڈوب گئے تھے۔ اور کوہ طور پر بیٹھے مناجات کرتے تھے۔ اور دریافت کرتے تھے کہ اے معبود تجھے میرا کون سا عمل پسند آیا جو پیغمبری عطا ہوئی۔

حضرت موسیٰ نے کوہ سینا پر مناجات کی اور اپنی درخواست کے بعد عرض کیا، بارخدایا بندہ موسیٰ سوال رکھتا ہے اور چاہتا ہے پوچھے لیکن شرم میں غرق ہے۔ فرمان آیا، موسیٰ جو پوچھتا ہے مجھ سے پوچھ جو مانگتا ہے مانگ کہا بارِ خدایا تیرے موسیٰ سے کون سا عمل ایسا سرزد ہوا اور طاعت کی کہ پیغمبر کیا اور شرف رسالت ومکالمت کا عنایت فرمایا۔ آواز آئی یا موسیٰ یاد ہوگا کہ ایک وقت تو بکریاں شعیب کی چرا رہا تھا۔ اور پھرتے وقت چھوٹے بچے بکریوں کے اپنی ماں سے جدا ہو کر پیچھے رہ گئے تھے تو نے آواز دی تھی کہ آ کر

---

[1] دیکھئے ق، ن صفحہ ۶۵۵

اپنی ماؤں سے ملیں۔ وہ اس آواز سے ڈرے اور دشت کی طرف بھاگے تو ان کے پیچھے دوڑا، اس طرح تو نے ان کو پکڑا کہ ہرگز ان کو اپنا پکڑنا معلوم نہ ہوا اور تو نے (انہیں) پیار کیا اور کہا کہ اے بچو تم اپنے تئیں اور مجھے ماندہ کیا۔ مانند بے رحم گڈریوں کے ان کو نہ مارا، اسی سبب میں نے یہ کرامت ارزانی فرمائی۔ پس جناب باری نے بیکام وزبان فرمایا، اے موسٰی سُن قسم ہے مجھے عزّ و جلال کی اگر تو اس پیر سے پاؤں آگے بڑھاتا اور رِل پر چلے جاتا اور اس کی حرمت نہ کرتا پیغمبروں سے تیرا نام نکال ڈالتا۔ حضرت موسٰی اس بات سے کانپ گئے، آواز آئی بڑوں کی بڑی حرمت کر اگرچہ وہ کافر ہو۔ لازم ہے کہ بادشاہ و وزیر اور سپہ سالاران لشکر بلکہ تمام خلائق اس پر عمل کرے (کریں) کہ نیک بختی اور ادب حاصل ہو۔[۵]

خلیل علی خاں کی یہ مفید اور کار آمد کتاب اس حکایت پر ختم ہوتی ہے یہ ضخیم و حجیم ہونے کے باوجود عمدہ اور قابل مطالعہ کتاب ہے۔ خلیل کی منتخب الفوائد شائع ہوجاتی تو اردو کے کلاسیکی ادب میں کلیلہ دمنہ (خرد افروز) اخلاق ہندی (ہتو پدیش) گلستاں، بوستان (سعدیؒ) اور بہارستان جامیؒ سے اس کی افادیت اور اہمیت ہرگز کم نہ ہوتی۔ منتخب الفوائد بھی گلستاں، بوستاں اور خرد افروز کے ڈھنگ پر لکھی گئی ہے لیکن اس پر ان کی کتابوں کی بہ نسبت مذہبی رنگ زیادہ گہرا اور نمایاں ہے اور اسکے ہر باب کی ہر حکایت ناصحانہ ہونے کے ساتھ حضرت پیغمبرؐ خلفائے راشدینؓ یا اصحاب

---

[۵] دیکھئے ق، ن صـ ۵۵۵

سے عبارت ہے۔ مذہبی اور اخلاقی پند و نصائح کے علاوہ فرماں رواؤں کے ضوابط نظم ونسق، طریق انصاف اور انداز جہانداری اس کتاب کی افادیت اور اہمیت کو اور بھی بڑھا دیتے ہیں۔

افسوس کا مقام ہے کہ خلیل علی خاں کا یہ عظیم کارنامہ بھی اس کی دوسری مفید اور جان دار تالیفات واقعات اکبر، اور انتخاب سلطانیہ اردو کی طرح چھپ کر منظر عام پر نہ آسکا۔ یہ کتاب چھپ جاتی تو لوگوں میں مقبول بھی ہوتی اور ساتھ ساتھ اردو ادب کے سرمایہ میں ایک قیمتی جواہر کا اضافہ ہوتا۔ اشک کی منتخب الفوائد ۶۵۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور سائز ۷×۹ ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کا یہ خطی نسخہ جو ہمارے سامنے ہے کسی کم تعلیم یافتہ کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں بہت ساری غلطیاں ہیں، لفظ کے املے تک غلط لکھے گئے ہیں۔ انصرام کو انسرام لکھا گیا ہے۔ اسباب کو ہر جگہ واحد اور نے کا بھی استعمال کہیں کہیں غلط ہوا ہے۔ اس کتاب کی زبان گو سیدھی سادی اور عام فہم ہے لیکن باغ و بہار سے لگا نہیں کھاتی۔ کہیں کہیں عبارتیں مبہم اور پیچیدہ لکھی گئی ہیں۔ اور جملوں کی تعقید کی وجہ سے سلاست کے ساتھ مطلب کا بھی خون ہو کر رہ گیا ہے۔ زبان اور انداز بیان کی ان بعض خامیوں اور کوتاہیوں سے قطع نظر خلیل علی خاں اشک کی یہ نایاب تالیف قدیم اردو ادب کا گراں بہا سرمایہ ہے، اور اسے اردو ادب کی خوش قسمتی یا اتفاق زمانہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ اب تک اس کا کم سے کم ایک غیر مطبوعہ نسخہ تو زمانہ برد ہونے سے بچ رہا ہے۔

اسباب واحد بھی لکھا جاتا ہے۔

قصہ رضوان شاہ خلیل علی خاں اشک کی یہ ایک دلچسپ رنگین نثری داستان ہے جو حاتم طائی، توتا کہانی، بہار دانش اور مذہب عشق کے طرز پر لکھی گئی۔ یہ کتاب نووارد صاحبوں اور افسروں کے لئے لکھی گئی تھی۔ اس لئے اسکی زبان آسان اور عام فہم ہے۔ اس کی عبارت سلیس، دلچسپ اور سہل ہے۔ قصے کے کردار، پلاٹ اور واقعات کے جزئیات کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

قصہ رضوان شاہ کا دوسرا نام نگار خانہ چین بھی ہے لیکن خطی نسخہ میں اس کا نام قصہ رضوان شاہ ہی درج ہے۔ اس میں رضوان شاہ جن اور پری زاد روح افزا کے معاشقے کی سنگین اور رنگین کہانی بیان کی گئی ہے۔ مسلسل قصہ اور اس کے مختلف مافوق العادت کردار ہونے سے باوجود یہ طویل افسانہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ ناول کی فضا تکنک اور ماحول اس میں نہیں ملتا ہے۔ اور یہ بھی کالج کی دوسری نثری داستانوں کی مانند ایک ہلکی پھلکی اور دلچسپ داستان ہے جو انعام کی امید پر ترتیب دی گئی۔ اس قصہ کا ماخذ بھی فارسی معلوم ہوتا ہے مگر اشک کے دیباچے میں ہلکا سا اشارہ یہ بھی ملتا ہے کہ یہ مصنف کی ذہنی اپج ہے سبب تالیف میں اشک نے لکھا ہے کہ

"مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر ممالک محروسہ سرکار کمپنی انگریز متعلقہ کشور ہند کے سن ہجری بارہ سو انیس (۱۲۱۹ھ) اور اٹھارہ سو چار عیسوی (۱۸۰۴ء) اس بے نام و نشان خلیل علی خاں نے جس کا تخلص اشک مشہور ہے، اس قصہ کو اس اختراع اقبال جوہر درج جاہ و جلال نیر اعظم سپہر کرم، دریائے سخاوت کان عطا مطلع امارت قطب شجاعت، دستگیر درماندگاں وادی حسرت مستر اردنت

رکنٹس صاحب کی خاطر زبان اردوئے معلاّ (کی) میں تیار کیا کہ اس کے مطالعہ فرمانے سے طبیعت کو فرحت حاصل ہو[1]۔"

دیباچے میں اشک نے لکھا ہے کہ انھوں نے یہ قصّہ کسی فارسی کتاب سے اردو میں نہیں لیا ہے لیکن داستان کے عنوانات فارسی داستانوں کے طرز پر قائم کئے ہیں۔ اور طرز نگارش بھی فارسی کی ہی ہے اور افسانوی ماحول ہندستانی سے زیادہ ایرانی معلوم ہوتا ہے جس سے یہ شبہ یقین میں بدل جاتا ہے کہ اشک کی یہ داستان بھی کسی فارسی داستان کا چربہ ہے لیکن اشک کے اسلوب نے اس میں اوریجنلٹی پیدا کر دی ہے۔

قصہ اس عنوان سے شروع ہوتا ہے۔

شروع قصہ رضوان شاہ، بادشاہِ جن اور روح افزا پری زاد دختر شہنشاہ چین کا راوی شیریں زبان اس داستان کیفیت نشان کا بیان اس طرح کرتا ہے کہ بلاد چین میں ایک عادل و باذل، رعیت پرور، غریب نواز دادگر ایسا تھا کہ اقلیم سبعہ میں آفتاب مہتاب کی شکل اس کے فیض سخاوت و عدالت سے روشن تھی۔ جناب باری نے اسے ہر ملک کی شہریاری دی تھی۔ روز و شب عیش و عشرت میں رہتا تھا۔ اس کے شہر میں ہمیشہ دن عید اور رات شب برات رہتی تھی۔ کسی کو کسی بات کا غم نہ تھا۔ مگر بادشاہ کو سدا ایک غم فرزند رہتا تھا کہ اس کے گھر اولاد نہ تھی ؎

چشم دل تھی اس سے اس کی سیاہ   تھا نہ برج حمل میں اس کے ماہ[2]

---

[1] ملاحظہ ہو قلمی نسخہ ورق ۲-ب [2] سات (ہفت اقلیم) [3] دیکھئے ق۔ ن ورق ۴-ب

قصہ رضوان شاہ میں کوئی نیا پن نہیں۔ اس کے طبعزاد ہونے کو بھی مان لیا جائے تو بھی یہ کوئی نئی داستان نہیں۔ اصل میں ایسی کہانیاں اس عہد میں بے شمار لکھی گئیں پورب دیش کا بادشاہ ہوتا ہے۔ اس کے کوئی اولاد نہیں ہوتی۔ اولاد کے غم میں بادشاہ تاج و تخت چھوڑ دیتا ہے۔ پھر کسی درویش کے ذریعہ اس کی مراد برآتی ہے۔ قصہ چہار درویش، سنگھاسن بتیسی، بے تال پچیسی اور دوسری کہانیوں کا بھی آغاز اس طرح ہوا ہے۔ اس عہد کی تمام داستانوں کی عمارتیں ایک ہی بنیاد پر کھڑی ہیں کوئی نیا پلاٹ تیار نہیں کیا جاتا ہے۔ قصہ موجود ہوتا ہے اس کو سنانے کا انداز بدل دیا جاتا ہے کردار، مقام، ماحول اور فضا میں تھوڑا بہت نیا پن پیدا کیا جاتا ہے۔ اس طرح پرانی شراب نئی بوتل میں ایک نیا سرور بخش جاتی ہے جو یقیناً وقتی ہوتا ہے۔

قصہ رضوان شاہ بھی ایسا ہی ایک قصہ ہے، اس داستان میں بھی بادشاہ اولاد کے غم میں حواس باختہ ہو کر پہاڑوں اور جنگلوں میں بھٹکتا رہتا ہے۔ ناکامیاں سائے کی طرح لپٹی رہتی ہیں کہ اچانک ایک بزرگ سے ملاقات ہوتی ہے۔ تاریکیاں اس کے اردگرد سے ہٹ جاتی ہیں اور بزرگ کی وساطت سے بادشاہ کی آرزو پوری ہوتی ہے۔

ایک انار کی کرامت سے رضوان شاہ کا جنم ہوتا ہے اس عہد کے دوسرے افسانوی شہزادوں کی طرح دنیا بھر کی تمام خوبیاں اس کی ذات میں جمع ہو گئی ہیں گیارہ سال کی عمر میں وہ علامہ، فن کار، نڈر، شجاع، سپاہی، ماہر شمشیر باز غرضکہ ہر فن مولا ہو جاتا ہے۔ سحر البیان، مذہب عشق، بے تال پچیسی، قصہ مہر و ماہ اور ایسی بے شمار داستانوں میں رضوان شاہ جیسے فرضی اور افسانوی کردار کی محیر العقول

شجاعت و مردانگی اور عجیب و غریب کارناموں کی ناقابل یقین داستان ملتی ہے قصہ رضوان شاہ میں ایسے ہی کردار جابجا ملتے ہیں۔ ان میں کوئی نئی یا چونکا دینے والی بات نہیں، مگر انداز بیان دلکش ہے۔ طرز تحریر شگفتہ و سلیس ہونے کی وجہ سے قصہ میں کہیں ٹھہراؤ کا احساس نہیں ہوتا ہے۔

قصہ رضوان شاہ اور داستان امیر حمزہ کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ خلیل علی خاں اپنے عہد کے ایک کامیاب داستان گو تھے، ان کی داستانیں دلچسپ پرکیف اور مزیدار ہوتی ہیں۔ اشک نے ان میں اپنی طبیعت کا بڑا زور دکھایا ہے جاندار اسلوب اور شگفتہ طرز بیان، سادگی اور پرکاری سے سحرانگیز منظرنگاری کی فضا پوری داستان پر محیط ہے۔ قصہ کا ہر کردار جاندار ہے۔ جہاندار شاہ، روح افزا اس کی حریف میمونہ اور منوچہر سب جاندار متحرک ہیں۔ ان میں رجائیت ہے اور آخر آخر تک شکست خوردگی ان پر غالب نہیں ہوتی۔

رضوان شاہ کا خطی نسخہ خوشخط ہے۔ غالباً اشک کا ہی تحریر کردہ ہے کیونکہ اس نسخے میں املے کی غلطیاں نہیں ہیں۔ اشکؔ نے اپنے اس رنگین قصہ میں اپنی شاعرانہ طبیعت کی بہار بھی دکھائی ہے۔ نثر لکھتے لکھتے جب وہ اُب جاتے ہیں تو قصہ میں زور پیدا کرنے کے لئے جابجا نظم بھی لکھ جاتے ہیں۔

قصہ رضوان شاہ کی داستان بڑے دلچسپ انداز میں آگے بڑھتی ہے رضوان شاہ باغ میں سیر کرتے وقت خوبصورت ہرن کو دیکھ کے اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ وہ ہرن اصل میں پری زاد روح افزا ہوتی ہے۔ اس کے عشق میں رضوان شاہ سدھ بدھ کھو دیتا ہے۔ دنیا اسے جہنم نظر آنے لگتی ہے۔ پاگلوں جیسی حالت

کرلیتا ہے اور اپنی وفادار دائی کے توسل سے اپنی محبوبہ روح افزا سے مل جاتا ہے روح افزا بھی رضوان کے مردانہ حسن پر پہلی نظر میں فریفتہ ہو جاتی ہے۔ اس کے غم میں موم کی شمع کی طرح پگھلنے لگتی ہے۔ رضوان شاہ کی دائی سے اپنے عشق کا اظہار بنا جھجک کرتی ہے۔

"میں بیٹی بادشاہ جن کی ہوں۔ نام میرا روح افزا پری زاد ہے۔ بیچ دریائے محیط کے ایک جزیرہ ہے کہ لوگ اس کو شہرستان تبت کہتے ہیں۔ اس مکان میں بعد ستارگان و ایک بیابان ہماری قوم بستی ہے۔ وہاں کے ایک بادشاہ کی بیٹی ہوں۔ بطریق اکثر کوہ و بیابان میں آتی ہوں[1]۔"

شہزادی روح افزا اپنے دل کا حال بے کم و کاست بیان کرتی ہے لیکن جیسے پریوں (محبوباؤں) میں عام خیال ہے کہ آدم زاد (عاشق) بے وفا ہوتا ہے اس لئے وہ شہزادے سے کھل کر اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتی۔ اس افسانے میں روح افزا کی حریف اور حاسد وزیر زادی میمونہ ہوتی ہے۔ جو شہزادہ رضوان پر عاشق ہو جاتی ہے۔ اپنے عشق کو پانے کے لئے اپنی جان بھی داؤں پر لگا دیتی ہے اور جب قصہ میں ٹھہراؤ پیدا ہونے لگتا ہے تو اپنی سازشوں کا جال بننے لگتی ہے قصہ متحرک ہو جاتا ہے مگر دوسری داستانوں کی طرح میمونہ کا فریب طشت از بام ہو جاتا ہے۔ سازش بے نقاب ہوتی ہے اور میمونہ اور اس کے ساتھ منوچہر کو اپنے کئے کی سزا ملتی ہے۔

اور رضوان شاہ ان کی قید سے رہا ہو کر روح افزا کو پا لیتا ہے دوسری

---

[1] دیکھیے قلمی نسخہ ورق ۲۵

داستانوں کی طرح اس کا بھی انجام طربیہ ہے۔ اور اس لئے کہ انیسویں صدی میں المیہ انجام لوگوں کے ذہن کو بوجھل اور قصہ کی دلکشی کو زائل کر دیتا تھا۔

رضوان شاہ بھی اپنے عہد کے جاں باز عاشقوں کی مانند عشق کی منزل تک رسائی کے لئے خوفناک نشیب و فراز سے گذرا، جنگلوں، پہاڑوں اور دریاؤں کو پار کیا۔ کالے کنویں کی قید سخت کاٹی اور موت کے ہر دار کو روکا اور اسے شکست دیکر اپنے محبوب کو حاصل کیا اور غاصبوں سے اپنی سلطنت کو واپس لینے کے لئے خونریز جنگ بھی کی۔ اس خونیں معرکہ آرائی پر قصہ رضوان شاہ ختم ہوتا ہے۔

"شاہ ختن مسلح ہو کر گھوڑے پر سوار ہوا اور نکل کر اپنی سپہ گیری کا کسب دکھانے کے بعد نصف میدان میں آکر رضوان شاہ کو للکارا۔ جوں ہی اس نے نعرہ بلند کیا۔ رضوان شاہ نے چوں شعلۂ آتش اپنے مرکب کو اسکی طرف ڈالا اور بڑھ کر ایک گرز اسکے سر پر ایسا مارا کہ کئی قدم پشت پا ہو گیا اور کہا کہ کس قوت پر میدان میں نکلا ہے علامت بہادری کی کیا رکھتا ہے۔ شاہ خطن (ختن) نے تلوار آبدار جوہر دار مانند تختہ دکان عطار دشمن کش بے حجاب برنگ سیماب کمر سے نکال کر سر پر رضوان شاہ کے ماری۔ اس نے سپر روک کر بزور قوت بازو اور علم سپہ گری سے روکی اور اپنی کمر سے تلوار چوں الماس نکال کر کہا کہ خبردار ہو۔ یہ نہ کہتا کہ خبردار نہیں کیا۔ اور رکاب سے رکاب ملا کر اس کے سر پر ہاتھ مارا کہ اس نے اسی تلوار کو سپر فولادی پر روکا تھا۔ لیکن رضوان شاہ کے بازو پر قوت تھے اور تلوار لنگر دراز تھی اور اس کے

سر کو مانند پنیر سر قلم کیا۔ اور جس وقت لاش اس کی گھوڑے سے گری۔ فوج میں بھگدڑ مچ گئی ولہ"

خاتمہ کتاب پر دستور کے مطابق قطعہ درج ہے۔ اس قطعہ سے پتا چلتا ہے کہ قصہ رضوان شاہ کا نام اشک نے نگارخانۂ چین بھی تجویز کیا تھا لیکن قلمی نسخہ میں یہ نام درج نہیں۔

ق

ہوا تمام جس وقت قصۂ رنگیں	ہر ایک اہل سخن نے مجھے کیا تحسین
کہا کہ واقعی کیا خوب لکھے یہ	جز بجا کہے گر اسکو نگارخانۂ چین

قصہ رضوان شاہ کا مخطوطہ ۶۲ اوراق یا ۱۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۶ × ۷ سائز ہے۔ سرورق پر کالج کی مہر ثبت ہے۔ مقام افسوس ہے کہ کالج کی بہت سی داستانوں کی طرح یہ بھی چھپ نہ سکی۔

انتخاب سلطانیہ اردو | اشک کی قیمتی اور مفید تالیف ہے۔ مگر یہ بھی زمانے کی چشم بے التفاتی کی وجہ سے شائع نہ ہو سکی۔ اس کے غیر مطبوعہ نسخے کی اہمیت اور افادیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کتاب میں اشک نے اپنا حال لکھا ہے۔ اشک کی خود نوشت حیات نے بہت ساری غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا ہے اور بہت سی فرضی داستانیں غلط ہو گئی ہیں۔

اشک کا یہ اپنی تصنیف ہے اور اس نے اپنی ذہنی اپج سے کام لیکر دلی اور بادشاہوں کے احوال و کوائف میں ایسے واقعات بھی دئے ہیں جو کسی تاریخ میں نہیں

لہ دیکھیے نسخہ قصہ رضوان شاہ ص ۱۲۳۔

ملتے ہیں ۱۸۰۲ء (۱۲۱۹ھ) میں مسٹر ماردنت رکٹس کے ایما پر اشک نے یہ کتاب ترتیب دی تھی۔ کتاب کی تصنیف کا سبب دیباچے میں درج ہے۔

"بموجب صاحب موصوف (جان بارتھوک گل کرسٹ) کے فرمانے اس عدیم فرصت میں اپنے احباب کے پڑھانے اور سرکار کی فرمائشات بجالانے کے بعد راتوں کو محنت کر کے دو جلدیں امیر حمزہ کی لکھیں اور رسالہ کائنات جو کہ فن حکمت سے تعلق رکھتا ہے تصنیف کر کے حضور عالی میں گذرانا اور قصہ رضوان شاہ کا کہ نگارخانہ چین (چین) موسوم ہے واسطے صاحب عالیشان خداوند نعمت مسٹر ماردانت رکٹس صاحب بلند اختر کے، واسطے مدرسہ جدید کے اس تاریخ کو لکھا۔ چنانچہ صاحب عالی قدر کی یہ فرمائش کی ابتدا میں بنیاد دلی سے تا سن حال شاہ عالم کے شہر مذکور کتنے بادشاہ ہوئے، اس احوال کو لکھو، سو احقر نے یہ کتاب لکھی اور نام اس کا انتخاب سلطانیہ اردو رکھا۔ کیونکہ تاریخ بھی یہی ہے۔[1]"

انتخاب سلطانیہ اردو کا مخطوطہ شاہ معزالدین شام شہاب الدین محمد غوری کی تاریخ سے شروع ہوتا ہے اور شاہ عالم بادشاہ کی تاریخ پر ختم ہوتا ہے، لیکن جیسا کہ مصنف نے دیباچے میں لکھا ہے۔ بادشاہوں کا حال لکھنے کے قبل دلی کی بنیاد اور وجہ تسمیہ بھی لکھی ہے اور واقعی دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔

"دلی قدیم سے بڑی بستی ہے۔ ابتدا میں اس کا نام اندرپت (پرست) تھا۔ بکرماجیت کے سن چار سو انتیس میں انک پال نام راجا نے کہ قوم تونور سے تھا، اپنی حکومت میں اس کو آباد کیا۔ اور دلی نام رکھا۔ چنانچہ اس نے اٹھارہ برس راج کیا

---

[1] قلمی نسخہ ورق ۱۲

بعد اس کے سن مذکور ۴۲۸ھ میں نزدیک اس شہر کے پرتھی راج اور بلدیو چوہان سے لڑائی ہوئی۔ پرتھی راج مغلوب ہوا۔ شیخ عبدالحق دہلوی نے لکھا ہے کہ سنہ ۳۰۷ھ میں دلی آباد ہوئی۔ قریب تین ہی سی برس کے ہندوؤں اور توروں اور چوہانوں نے راج کیا۔[۱]

دلی کی وجہ تسمیہ اور آفرینش کی تاریخ بیان کرنے کے بعد خلیل علی خاں نے ہندوستان پر شہاب الدین کی یلغار اور دلی کی تاخت و تاراج کی داستان لکھی ہے۔ خلیل علی خاں کے مطابق ۵۸۸ھ میں شاہ معز الدین شام جو شہاب الدین کے نام سے مشہور تھا، ہندوستان آیا۔ اسے فتح کیا اور ملک قطب الدین ایبک کے حوالے کیا۔ معز الدین شام کی ہندوستان پر فوج کشی اور جلوس کا حال اس طرح درج ہے۔

" سلطان معز الدین شام کہ شہاب الدین مشہور تھا ۵۸۸ھ کے درمیان ہندوستان کے آیا اور فتحیاب ہوا۔ بعد زبط (ضبط) و نسق کے ملک قطب الدین ایبک اپنے غلام کو یہاں قائم مقام کیا اور چھوڑ پھر غزنیں کی طرف روانہ ہوا۔ ملک قطب الدین ایبک نے بعد اس کے جانے کے ۵۹۰ھ میں دلی کو دارالخلافت کیا اس تاریخ سے دلی تخت گاہ سلاطین اسلام ہوئی لیکن سلطان معز الدین پھرتے وقت دمیک نام ایک قصبے میں کہ تابع غزنیں کے ہے، ہاتھ سے فدائی کے شہید ہوا مدت اس کے دن کی سلطنت کی ۳۲ برس اور کئی مہینے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بعد اس کے مرنے کے پانسو الماس نفیسی اس کے جواہر خانے سے نکلا تھا۔ باقی اور اسباب ہو

---

[۱] قلمی نسخہ ورق ۱۲

اس سے قیاس کیجیے کہ کتنا ہو گا۔[1]

اس طرح غلام، تغلق، خلجی، سید اور لودھی خاندانوں کے سلاطین کا مختصر حال بیان کیا گیا ہے۔ بادشاہوں کا حال افسانوی رنگ میں اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ نوسکھ صاحبوں اور افسروں کی سمجھ میں جلد آجائے مغل حکمرانوں کی عظمت شان وشوکت اور دبدبہ کے واقعات کی خوبصورت تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

احمد شاہ اور دوسرے بادشاہوں کے حالات کے قبل سلطان علاء الدین خلجی کی بادشاہت اور فرماں روائی کا حال بے حد دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ گو اس نے بہت سی مفروضہ باتیں بھی لکھی ہیں لیکن بنیادی واقعہ میں کوئی الٹ پھیر نہیں کیا ہے۔

"۱۲) داں جلوس سلطان علاء الدین کا"

"سلطان علاء الدین نے ۲۲ ویں تاریخ ذی الحجہ کی سن ہجری چھ سو پچانوے (۶۹۵ ہجری) میں شہر کرتے میں تخت سلطنت کے اوپر قدم رکھا اور خطبہ اپنے نام کا پڑھوایا۔ اس نے اپنے وقت میں مغلوں کی فوج کو بارہا شکست دی اور اکثر سرداروں کو ان کے پکڑ لئے۔ از بسکہ دلاور تھا اس سبب بیشتر ملک بھی اس نے مسخر کر کے اپنے اختیار میں کئے۔ سن ہجری سات سو سولہ پیمانہ اس کی عمر کا لبریز ہوا عالم فنا سے عالم بقا کو انتقال کیا۔ بیس برس چھ مہینے اور کئی روز اس نے بادشاہت کی۔"[2]

---

[1] دیکھئے قلمی نسخہ ورق ۱۴ [2] قلمی نسخہ انتخاب سلطانیہ اردو، ورق ۳۰

سلاطین افغان کی تاریخ پانی پت میں ابراہیم لودی کی شکست اور موت پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد مغل سلاطین کی تاریخ شروع ہوتی ہے جو بہت زیادہ محنت اور لگن سے لکھی گئی ہے۔ اور طویل بھی ہے مغل شہنشاہ بابر کا حال کم از کم بارہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ پٹھان حکمرانوں میں سے کوئی بھی ایسا خوش نصیب بادشاہ نہیں ہوا ہے جس کا حال تین صفحوں سے زیادہ میں درج ہو۔ حتیٰ کہ ہندوستان کے سب سے بڑے مدبر اور لایق بادشاہ شیرشاہ سوری کا حال بھی دو صفحات میں سمیٹ دیا گیا ہے۔

"جبکہ شیرشاہ بادشاہ ہوا اور اس نے خطبہ اور سکہ اپنے نام کا جاری کیا۔ ۹۴۶ھ میں دلی داخل ہوا، اور اس نے سندھ سے لیکر ملک گوڑ اور بنگالے تک ایک ایک کوس کے فاصلہ پر سرائیں بنا کر آباد کیں۔ اور راہوں میں دونوں طرف سائے کے واسطے درخت لگوائے کہ مسافروں کو بے آرامی نہ ہو اور ہر جگہ ہندو مسلمانوں کے واسطے لنگر مقرر کئے۔ اور یہ سررشتہ چودھری اور قانون گوئی کا اس سے ایجاد ہے سن ہجری نو سو اکاون (۹۵۱ھ) میں قلعہ کالنجر کے فتح کرنے کے لئے گیا تھا۔ اتفاقاً بارود خانہ میں آگ لگ گئی۔ اس آگ میں جل موا[۱]۔"

اس کے برخلاف سلاطین مغلیہ، جلال الدین اکبر اور محی الدین اورنگ زیب کے عہد حکومت کے واقعات بیس بائیس صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ خلیل علی خاں اشک نے شیرشاہ اور دوسرے پٹھان بادشاہوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے اور ان کے حال میں بہت سے تاریخی واقعات جن کا نظم و نسق سے براہ راست تعلق تھا،

---

[۱] قلمی نسخہ ورق ۵۶

نظرانداز کر دئے ہیں۔ لیکن جب مغلوں کا حال لکھتے ہیں تو ان کا قلم تیز دھاروں کی طرح چلتا ہے اور ہر صفحہ میں مغل حکمرانوں کی عظمت، شان و شوکت اور دبدبے کی قلمی تصویر نظر آتی ہے۔

شاہ عالم کے مختصر حال پر انتخاب سلطانیہ اردو ختم ہوتی ہے۔

شاہ عالم شاہ ۱۱۷۳ھ میں تخت سلطنت پر رونق افروز ہوا جب سے اب تلک ملک میں الٰہی کی سلطنت ہے احوال اس شاہ کا اس واسطے نہیں لکھا کر رفیع و شریف پر ظاہر ہے۔"[1]

انتخاب سلطانیہ اردو ۱۵۲ اوراق پر پھیلی ہوئی چھوٹی سی افسانوی تاریخ ہے اس میں گو بے شمار تاریخی غلطیاں ہیں۔ پھر بھی اس کی اہمیت اس لئے ہے کہ انیسویں صدی عیسوی میں آسان اور عام فہم زبان میں نوارد صاحبوں اور طالب علموں کے لئے مفید تھی۔ مگر نوٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ہے۔ مقام افسوس ہے کہ انتخاب سلطانیہ اردو بھی شائع نہ ہو سکی، اور اشک کی بہت سی قیمتی کتابوں کی طرح خطی نسخہ کی شکل میں دستبرد ہونے سے بچ رہی ہے۔

واقعاتِ اکبر یہ خلیل علی خاں اشک کا ایک عظیم تاریخی کارنامہ ہے۔ واقعاتِ اکبر اصل میں علامہ ابوالفضل کی شہرۂ آفاق تصنیف اکبر نامہ کا ترجمہ ہے۔ ابوالفضل نے اکبر اعظم کی فرمائش پر عہد اکبری کی ٹھوس اور جامع تاریخ ترتیب دی تھی جو دنیا کے تمام مشہور مؤرخین کے لئے زبردست ماخذ بنی اور جس کے ترجمے انگریزی اور دوسری کئی غیر ملکی زبانوں میں بھی ہوئے۔ اشک نے بڑی محنت اور عرق ریزی

---

[1] قلمی نسخہ ورق ۱۵۲

سے اس ضخیم کتاب کا ترجمہ مکمل کیا۔ اس کی تالیف اور ترجمے کا حال اشک نے دیباچہ میں خود لکھا ہے۔

"بعد حمد و نعت کے اس احقر العباد محمد خلیل علی خاں نے جس کا تخلص اشک ہے ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۰۹ء کے عہد میں سلطان محمد اکبر بادشاہ غازی خورشید فلک حکومت کے اور وقت میں صاحب عدل و داد آبادئ فلک مراد عادل باذل زمان ..... لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر کے جن دنوں گوہر برج اقبال نیر سپہر جاہ و جلال، دریائے سخن، کان عطا، مطلع شجاعت، مقطع شہامت   خداوند نعمت مسٹر کپتان ٹیلر دام ظلہ نے اپنے نسیم قدم سے گلستان مدرسہ کو گلہائے معنی سے زینت دی تھی۔ اور غنچہ خاطر کو شگفتہ اور معطر کیا تھا۔ حکومت افلاطون زمان میں سنے وقت ڈاکٹر ولیم ہنٹر ...... کی اکبر نامہ کو جو تصنیف کیا ہوا ابوالفضل بن مبارک کا ہے زبان اردو میں موافق محاورے میں ترجمہ کیا اور نام اس کتاب کا واقعاتِ اکبر رکھا، کیونکہ تاریخ بھی اس کی یہی ہے لیکن دیباچہ کو اس کے موقوف کر کے ابتدائے پیدائش سے جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کی لکھا۔ ازبسکہ قید ترجمہ کی بھی بہت سی کی ہے لیکن محاورے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور بیشتر اصطلاحیں اس کی رکھیں ہیں[1]۔"

اشک کے اس مختصر تعارف سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے اس ضخیم و جسیم اور دشوار کتاب کا ترجمہ سخت محنت اور جانفشانی سے کیا ہے اور ترجمہ کی اکثر پابندیاں نباہی ہیں۔ اکبر نامہ جیسی مشکل کتاب کا ترجمہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا پھر بھی

---

[1] دیکھیے "واقعات اکبر" خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری و ق ۲

اشک نے ترجمے کی ذمہ داریاں بڑی ایمانداری سے نباہی ہیں۔ اور ترجمے کے اصول وضوابط پر سختی سے کاربند رہنے کی وجہ سے واقعاتِ اکبر کے انداز بیان میں لطافت اور شگفتگی پیدا نہ کر سکے، مگر اکبر نامہ کی روح ہر جگہ برقرار ہے۔ اور یہی اشک کی بڑی کامیابی کہی جاسکتی ہے۔

اشک کی یہ کتاب شہنشاہ اکبر کی ولادت سے شروع ہوتی ہے۔

" طلوع ہونے کا نیر اقبال کے مطلع سعادت سے یعنی حضرت شہنشاہی کے تولد کا سترِ مقدس سے حضرت عصمت مآب، عفت نقاب، پردہ نشیں سرادقات آسمانی حضرت مریم مکانی حمیدہ بانو بیگم دام والا اقبالہٗ کے برکت ذات سے[1] ...الخ"

اور اکبر کی ولادت کی جیتی جاگتی تصویر اس طرح کھینچی ہے

"... اس گفتگو میں تھے کہ حضرت مریم مکانی درد کی شدت سے جاگ پڑیں اور اس نیک ساعت میں وہ گوہر یکتا، خلافت ساتھ طالع بیدار کے تولد ہوا۔ حرم سرائے خاص میں جشن کی آگے سے تیاری ہو رہی تھی، تمام پردہ گیارہ حریم دعزت و اقبال نے مشاہدہ کرنے اس جمال جہاں آرا کے اپنی آنکھوں کو روشن کیا اور آبروئے وسمہ[2] طرب و نشاط سے زینت دیا۔ اور اس مژدہ دلخواہ سے ہر ایک نے اپنے کانوں میں گوشوارہ باندھا۔ چہرہ آرزو کو گلگونۂ عیش سے رنگین کیا[3]"

اکبر بادشاہ کی ولادت کے حال سے قبل فضا کائنات کی تخلیق آدم اور حضرت حوا کی اولادوں کے ذکر میں حضرت شیث کا بھی دلچسپ حال بیان کیا گیا ہے "شیث فرزندان بے واسطہ میں سے آدم کے بزرگ تھا۔ بعد سانحہ ہابیل

---

[1] دیکھئے قلمی نسخہ ورق ۸ [2] نیل کی پتی خضاب [3] قلمی نسخہ واقعات اکبر ورق ۹

تولد اس کا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب حوا حاملہ ہوتی تھیں ایک بیٹا اور ایک بیٹی اُن سے ہوتی تھی مگر شیث کہ وہ تنہا پیدا ہوا تھا اور اقلیما بہن سے قابیل کی اس کا عقد ہوا تھا جب عمر حضرت آدم ہزار برس کی ہوئی اس کو اپنا ولی عہد کیا اور سب کو اس کی اطاعت و فرماں برداری کا حکم دیا۔ بعد آدم کے انتظام عالم ظاہری و باطنی کا اس کی عقل درست کے استوار ہوا۔ ہمیشہ جمعیت ظاہری میں اور معموری باطنی میں اپنی ہمت کو معروف رکھتا تھا۔ نوح کے طوفان میں سوائے اس کی اولاد کے اور کوئی باقی نہ رہا۔ اس کو اوریائے اوّل کہتے ہیں؎۱

اس میں ہمایوں کی وفات سے لیکر اکبر کی پیدائش تک کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ شیر شاہ کے ہاتھوں ہمایوں کی شکست، بھائیوں مرزا کامران، اور عسکری کے ساتھ جنگیں۔ شاہ ایران طہماسپ کی مدد سے ہمایوں کی مراجعت، دلی سلطنت پر قبضہ اور اکبر کی اقبال مندی کے واقعات میں مغلوں کی عظمت، شان و شوکت اور رفعت کی پر جلال تصویریں نمایاں نظر آتی ہیں۔

دلی سلطنت پر دوبارہ قبضہ کے ساتھ ہی ہمایوں نے اکبر کو معرکہ آرائیوں کی سختیوں کا تجربہ اور فنون جنگ میں مہارت و ملکہ حاصل کرنے کی غرض سے سرپرستی اور اتالیقی میں غزنیں کی مہم پر بھیجدیا تھا۔ ابوالفضل کے حوالے سے واقعات اکبر میں لکھا گیا ہے۔

"جبکہ حضرت جہانیاں نے دن بدن روشنی رشد و کامرانی کی حضرت شاہنشاہی (اکبر) کے ناصیہ اقبال سے تابندہ پائی خوشحال روزوں میں کہ وقت زمانے کی آسائش

؎۱ یہ سریانی زبان کا لفظ ہے۔ اوریا کے معنی معلم کے ہیں چنانچہ اوریائے اول معلم اول ہوا۔ دیکھئے قلمی نسخہ ورق ۶

کا تھا، رائے عالی میں بموجب الہام غیبی کے یہ بات آئی کہ اس نونہالِ سلطنت کو ظاہر میں اپنے سے چند روز کے لئے جدا کریں تا امتحان (امتحان) بزرگی اس گوہر والا کا کیا جائے۔ اور فراخ حوصلگی بھی اس سپہر مرتبہ کی سب پر معلوم ہو[1]۔"

واقعات اکبر حضرت جہانبانی ہمایوں پاشاہ کے زینے سے اتفاقاً گرنے اور وفات پانے اور بیرم خاں کے کوچ دلی پر ختم ہوتی ہے۔ اپنے اس ترجمے میں خلیل علی خاں نے اکبر نامہ کی بہت سی جزوی تفصیلات نکال دی تھیں جس کا مولف نے خود اعتراف کیا ہے۔

" الحمد للہ کہ ذکر اس خاندان عالی کا ابتدائے حضرت آدم سے تا حضرت شاہنشاہی عبارت تازہ سے لکھا۔ راقم اس فہرست رفعت عنوان کا ابوالفضل ہے۔ بہت سے احوال اور نکات حکمت کے جا بجا چھوڑ دے ہیں۔ اگر سب تحریر میں آویں تو اور کتاب مرتب ہو[1]۔"

اسی پر واقعات اکبر کا ضخیم نسخہ جو تقریباً ایک ہزار صفحات پر پھیلا ہوا ہے ختم ہوتا ہے۔ واقعات اکبر شائع ہو کر دستیاب ہوجاتی تو خلیل علی خاں کی محنت سوارت ہوتی کیونکہ واقعات اکبر ایک مختصر عہد کی عمدہ اور قابلِ وثوق تاریخ ہے جو غیر ملکی مؤرخین کے لئے ماخذ بنی ہے اور اس کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

داستان امیر حمزہ فورٹ ولیم کالج کے لئے خلیل علی خاں اشک کی پہلی تصنیف داستان امیر حمزہ ہے۔ یہ گل کرسٹ کے ایما پر لکھی گئی تھی لیکن دو تین دفتر لکھنے

---

[1] ورق ۲۳۴ ق۔ن واقعات اکبر [2] ملاحظہ ہو قلمی نسخہ ورق ۵۸۰

کے بعد ہی اشک کو کالج سے علیٰحدگی اختیار کرنا پڑی تھی۔ اور دوبارہ ملازمت کے
بعد اسے مکمل کیا۔ یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن نکلے اور متعدد
ادیبوں نے اشک کی نقالی کر کے داستان امیر حمزہ ترتیب دی چونکہ یہ انتہائی
دلچسپ رنگین اور حیرت انگیز قصہ ہے اس لیے مقبول انام ہوا۔ داستان امیر
حمزہ محیر العقول کارناموں، انوکھے اور ناقابل یقین واقعات اور ہر قدم پر طلسمی
دنیا اور اس کی حشر سامانیوں سے معمور ہے۔ اور کسی قدیم رزمیہ نظم کے کردار کی طرح
داستانِ امیر حمزہ عمرو عیار، عدی کرب اور اکثر دوسرے کردار بھی اس دنیا کے ہوتے
ہوئے بھی اس کے نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ پریوں اور جنوں کے دیش
سے آئے ہیں۔ یا آسمانی فرشتے ہیں جن کو حریف کو زیر کرنے کا ہر علم اور ہر گر معلوم ہو۔

طلسم ہوشربا اور بوستان خیال میں بھی ایسے ہی کردار جا بجا ملتے ہیں۔ ان کے
حیرت انگیز کارناموں، ناقابل یقین توانائی اور عمل تسخیر سے ساری خلقت بھونچکا
رہ جاتی ہے۔ داستان امیر حمزہ بھی اس سے مستثنیٰ کیسے ہو سکتی ہے۔ امیر حمزہ ایک
نڈر جانباز، سپاہی اور رستم زماں ہی نہیں بلکہ خدا کی خاص عنایت ان پر ہے۔ وہ
اپنے طاقتور حریف کو چشم زدن میں مغلوب کر لیتے ہیں۔ یوں تو داستانِ
امیر حمزہ کا ہر کردار جاندار ہے مگر اس کا سب سے جاندار کردار عمرو عیار ہے
اس کردار میں عجیب و غریب نقوش بھرے گئے ہیں۔ فنکارانہ چابکدستی سے اس
کی دلآویز شخصیت کو ابھارا گیا ہے۔ اور پوری داستان اسی کردار کے محور پر
گھومتی ہے اور عوام کے دلوں کا احاطہ کرتی چلی جاتی ہے

پروفیسر کلیم الدین احمد نے عمرو عیار کی جاندار اور حقیقی تصویر کھینچی ہے۔

".... لیکن سب سے ممتاز ہستی خواجہ عمرو کی ہے۔ ان کی عجیب وغریب صورت، ان کی بخالت اور طمع، ان کا امیر حمزہ اور امیر کے فرزندوں سے عشق، ان کا لحن داؤدی، ان کی حیرت انگیز پرواز یہ سب چیزیں انھیں ذات سے وابستہ ہیں۔ وہ عجیب "مجموعہ اضداد" ہیں۔ تمسخر اور سنجیدگی، بزدلی اور جانبازی، سختی اور نرم دلی بیک وقت ان کی شخصیت میں موجود ہیں[۱]۔"

عمرو عیار کی چالاکی، ذہانت اور باغ و بہار شخصیت داستان امیر حمزہ کی طوالت کے باوجود لوگوں کے ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہے کہ کبھی بھی ذہنی تھکاوٹ اور بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ داستان امیر حمزہ کی یہی خصوصیات اور اشک کا آسان اور عام فہم طرز بیان اس عہد کے دوسرے داستان گویوں میں اشک کو ممیز و ممتاز کرتی ہے۔

داستان امیر حمزہ بھی اس عہد کی دوسری داستانوں کی خامیوں اور عیوب سے خالی نہیں ہے۔ یہ بھی ایرانی قصہ ہے۔ ماحول، فضا، سماجی تصاویر جو داستان میں ملتی ہیں وہ خالص ایرانی ہیں اور اس قصے کا تانا بانا بھی ایران کی سماجی سیاسی اور ثقافتی زندگی سے بنا گیا ہے لیکن اس میں جا بجا ہندوستانی طرز زندگی، ہندوستانی کردار، لکھنوی ماحول اور تہذیب بھی مسکراتی ہوئی نظر آتی ہے۔ نوشیرواں سے عمرو عیار کی گفتگو صوبہ اودھ کے ایک گاؤں کی بولی عام میں ہوتی ہے۔ عمرو کی شرارتیں، ہندوستانی معاشرہ میں مخصوص پائی جاتی ہیں۔ جب عمرو عیار نوشیرواں کے دربار میں جاتے ہیں تو ان کی خوب آؤ بھگت ہوتی ہے۔ شربت پلایا جاتا ہے

---

[۱] دیکھیے فن داستان گوئی کلیم الدین احمد ص۵۱

خوبصورت طشت میں سجا کر گلوریاں پیش کی جاتی ہیں۔ ان سب میں لکھنؤ کی معاشرتی زندگی کا پرتو نمایاں۔ یہ خامیاں انیسویں صدی کی تمام داستانوں میں جابجا ملتی ہیں اس کا اظہار عبدالقادر سروری نے بھی کیا ہے۔

"ہندی قصوں کے لئے عربی اور ایرانی اشخاص قصہ کے انتخاب کرنے میں ارباب قلم کو پس و پیش نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مشاہیر بھیم، ارجن، بدھ بکرماجیت کے بجائے رستم، بہمن، موسیٰ اور جمشید اور نل دمن کے بجائے لیلیٰ مجنوں شیریں فرہاد وغیرہ کے نام اردو زبان میں مرتسم ہو گئے[1]"

اشک اور دوسرے داستان گویوں کے قصوں کا خمیر ایک ہی طرح گوندھا گیا ہے۔ اس کی عمارت میں ایک ہی طرح کی اینٹ پتھر، چونے اور گاروں کا استعمال ہوا ہے۔ داستان امیر حمزہ چاہے اشک کی ہو یا مرزا تصدق حسین کی۔ ان تمام خوبیوں یا خامیوں سے خالی نہیں ہے۔ اشک کی داستان امیر حمزہ کا بوسیدہ خطی نسخہ مولانا آزاد کالج کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

داستان امیر حمزہ کے قبل خلیل علی خاں نے رسالہ کائنات بھی مرتب کیا تھا کالج کے روح رواں پروفیسر جان گل کرسٹ کی فرمائش پر یہ رسالہ ۱۸۰۳ء میں مکمل ہوا تھا۔ لیکن کلکتے میں اس کی کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کاپی موجود نہیں ہے۔ اس کا ایک خطی نسخہ لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی (ASIATIC S.L) لائبریری میں موجود ہے۔

اشک شاعر بھی تھے لیکن کامیاب اور مشہور نہیں ہوئے۔ موٹی موٹی داستانیں

---

[1] دیکھئے فن داستان گوئی۔ کلیم الدین احمد ص ۱۶۱

لکھنے سے ان کو اتنی فرصت ہی کہاں ملتی ہوگی کہ وہ شاعری کریں۔ ان کی طویل نظمیں یا مختصر مثنویاں قصۂ رضوان شاہ اور داستان امیر حمزہ میں ملتی ہیں۔ لیکن یہ شاعری کا کوئی اچھا نمونہ نہیں ہیں ۔ دیوان جہاں، سخن شعرا، گلزار ابراہیم اور عمدہ منتخبہ یعنی تذکرہ سرور میں ان کا حال نہیں ملتا، جس سے اس خیال کو تقویت پہونچتی ہے کہ شاعری کی دنیا میں اشک گمنام ہی رہے۔
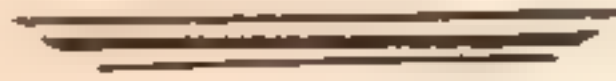
بینی نرائن جہاں

بینی نرائن جہاں بھی فورٹ ولیم کالج سے وابستہ رہے اور کالج کے لئے دو تین مفید کتابیں بھی لکھیں مگر ان کو زیادہ شہرت یا بلند مقام حاصل نہ ہو سکا غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ تذکرہ نویسوں نے انھیں قابل اعتنا نہ سمجھا۔ کالج کے لئے جہاں نے اپنا تذکرہ بعنوانِ دیوانِ جہاں مرتب کیا اور چار گلشن کا ترجمہ کیا دیوان جہاؔں میں انیسویں صدی کے آغاز کے اُن شاعروں کا حال ہے جو زیادہ مشہور نہ ہوئے۔ اور ان کی شاعری رنگین اور جاندار ہوتے ہوئے بھی قبول عام کی سند حاصل نہ کر سکی۔ جہاؔں نے اپنے عہد کے کم شہرت یافتہ شاعروں کا حال لکھ کر ان پر بڑا احسان کیا ہے۔

دیوان جہاؔں کے مصنف کی یہ کم نصیبی ہے کہ اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کو فراموش کر دیا۔ عبدالغفور خاں نساخ نے بھی سخن شعرا میں طپش۔ حیدری افسوس اور میر علی لطف کا ذکر تو کیا ہے لیکن بینی نرائن جہاؔں کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ اُردو کے اکثر تذکرے جہاؔں کے ذکر سے خالی ہیں۔ انکی حیات گمنامی کی نقاب سے ڈھکی ہوئی ہے۔ چار گلشن اور دیوان جہاؔں کے منظوم دیباچے سے جہاں کا تھوڑا بہت حال معلوم ہوتا ہے۔

جہاؔں کا نام بینی نرائن تھا۔ وہ لاہور کے رہنے والے تھے۔ ان کے پتا کا نام شیو دشٹ نرائن تھا۔ اور ان کے نانا لچھمی نرائن تھے۔ بینی نرائن کے بڑے

بھائی لالہ کھیم نرائن رند تھے ۔ جو ادیب و شاعر تھے ۔ لیکن وہ بھی جہاں کی طرح ادبی دنیا میں زیادہ شہرت نہ پا سکے ۔ بینی نرائن جہاں کھتری قوم سے تعلق رکھتے تھے ۔ جب افلاس و ادبار کی گھٹاؤں میں ان کی زندگی ڈوب گئی تھی تب بھی ان کی خودداری اور غیرت نے انھیں کسی کے آگے ہاتھ بڑھانے اور کسی سے نوکری کی بھیک مانگنے پر مجبور نہیں کیا ۔ کئی برس تک وہ تلاشِ معاش میں شہر شہر کی خاک چھانتے رہے ۔ لاہور سے دلی، دلی سے لکھنؤ اور بنگالہ کی راہ بڑھائی کلکتے میں ان کو پناہ ملی ۔ لیکن کلکتے میں بھی بارہ سال عسرت اور بیکاری میں کٹے ۔ اس کا اظہار دیوانِ جہاں کے منظوم دیباچے میں اس طرح کیا ہے ؎

کروں ہوں اب میں ظاہر اپنا احوال	مجھے غم نے کیا از بسکہ پامال
رہا ہندوستان[1] میں بادلِ شاد	بفضلِ حق تھا گھر میرا آباد
کیا کرتا تھا میں نت سیرِ گلزار	نہ تھا غم سے کبھی مجھکو سروکار
حسد پر چرخ جو آیا یکایک	تو چوں خورشید دل میرا گیا یک
جو گردش نے مجھے وہاں سے اٹھایا	نصیبوں نے یہ کلکتہ دکھایا
چھٹا مجھ سے ہندوستان کا گلشن	کیا میں ملک بنگالہ میں مسکن
جو میرے کمیں میں تھا یہ چرخ دوار	رہا بارہ برس میں یہاں بھی بیکار
جو تھی آٹھوں پہر فکر خور و پوشش	ہمیشہ غم سے رہتا تھا ہم آغوش
ہے حیدر بخش نام نامی جن کا	ہیں فن شعر میں جو در یکتا
انھوں نے میرے گھر تشریف لاکر	میری حالت کو دیکھ افسوس کھاکر

---

[1] ہندوستان اس وقت بنگالی ہندوستان، یوپی، دلی، لاہور وغیرہ کے خطے کو کہتے تھے ۔

یہ فرمایا مجھے از راہِ الفت　　نکال اب دل سے تو اندوہ کلفت[۱]

جہاں نے کلکتے میں بھی بارہ برس تک عسرت اور بیکاری کے خلاف جدوجہد میں گزاری۔ حیدر بخش حیدری کی جن سے جہاں کے بڑے بھائی لالہ کھیم نرائن رند کو دلی ارادت تھی، جہاں سے ملاقات کھیم نرائن کے گھر پر ہی ہوئی ہوگی اور اپنے دوست اور معتقد کی خاطر حیدری نے ٹامس روبک سے سفارش کر کے بینی نرائن جہاں کو فورٹ ولیم کالج کی ملازمت دلائی۔ جہاں نے ٹامس روبک کے ایما پر ہی اپنا تذکرہ مرتب کیا۔ دیوان جہاں کے دیباچے میں اس کا ذکر بھی ملتا ہے ؎

کیا ارشاد یوں اس نے کرم سے　　تجھے جو لطف کی ہے چشم ہم سے
تو کر شعر و غزل کتنے فراہم　　کریں اس کے صلے کا فکر تا ہم
ہوا یہ بات سنتے ہی دل میں شاد　　بجا لایا کیا جو کچھ کہ ارشاد
تلاش و سعی تب کر کے فراواں　　جو ہیں اس عصر میں باہم سخنداں
انھوں کے جمع کر اشعار یکسر　　سوا ان کے جو تھے نامی سخنور
خدا کے فضل سے دے اس کو انجام　　دیا ترتیب میں نے جمع کر نام
کیا تھا چار گلشن پہلے تحریر　　صلے سے اس کے پائی میں نے توقیر
یہ چند اشعار دیباچے کے مانند　　کئے ہیں اس مولف نے قلمبند
دعا پر ختم کر بینی نرائن　　کہ مستحسن سخنور کو ہے یہ فن
رہے جب تک کہ طرز نظم یارب　　پسند اس کو کریں اہل جہاں سب[۲]

اس دیباچے سے ظاہر ہے کہ دیوان جہاں میں انھی شاعروں کا حال درج

---

[۱] دیکھئے قلمی نسخہ دیوان جہاں ص ۲۰

ہے جو کم شہرت یافتہ تھے، مشہور شاعروں پر کئی تذکرے فارسی میں ترتیب پا چکے تھے
اسی بنا پر دیوانِ جہاں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بینی نرائن کا یہ تذکرہ سنہ ۱۸۱۲ء
مطابق سنہ ۱۲۲۷ھ میں مرتب و مکمل ہوا تھا۔ جس سے ان کے بعد کے اکثر تذکرہ نویسوں
اور مشہور فرانسیسی ادیب گارساں دتاسی نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ ادب
ہندوستان (HISTORIC DE LITEERATURE HINDOUI ET HINDUSTHANI)
کی تالیف میں اس سے خاصہ استفادہ کیا ہے۔

دیوان جہاں کی ترتیب کے وقت بینی نرائن کے سامنے نکات شعرا میر، تذکرہ
شعرا میر حسن جیسے مفید تذکرے ضرور ہوں گے کیونکہ دیوان جہاں بھی نکات شعرا کے
طرز پر ترتیب دیا گیا ہے۔ نکات شعرا کی طرح دیوان جہاں بھی مختصر اور تشنہ تذکرہ
ہے اس میں شاعروں کا حال بھی ٹھیک ڈھنگ سے درج نہیں ہے۔ صرف کلام کا
انتخاب ہے۔ دیوان جہاں میں کسی شاعر کی سیرت کا کوئی پہلو اجاگر نہیں ہوتا۔ اور
نہ ہی کلام پر تنقید کا ہلکا سا عکس بھی کہیں نظر آتا ہے۔ دیوان جہاں کی ترتیب لقبائی
انداز سے ہوئی ہے، سب سے پہلے شاہ عالم بادشاہ متخلص بہ آفتاب کا حال اور کلام
درج ہے۔

"آفتاب تخلص مہر سپہر جہانیاں شاہ عالم جنت آرام گاہ ابن عالمگیر ثانی کا
یہ تصنیف حاصل ہے ؎

غـــزل

کہو بلبل کو لے جاوے چمن سے آشیاں اپنا
پڑھے گر وہ ہزار افسوں نہ ہو گا باغباں اپنا

ہوئی جب باغ سے رخصت کہا رو رو کے یا قسمت
لکھا تھا یوں کہ فصل گل میں چھوڑیں خانماں اپنا
مرا جلتا ہے جی اس بلبل بے کس کی غربت پر
کہ گل کے آسرے پر یوں لٹایا خانماں اپنا
چلی جب باغ سے بلبل لٹا کر خانماں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
الم کو اس طرح روئی کہ رسوا ہو گئی بلبل
دبایا ہائے آنکھوں نے تمامی خانماں اپنا
مگر دل سے بنا رکھتا علی گوہر سے پیارشے کو
وہ حکم شاہی رکھتا تھا دے تھا مہرباں[۱] اپنا

حضرت شاہ عالم آفتاب کی سات غزلیں دیوانِ جہاں میں دی گئی ہیں ساتویں غزل کا مقطع ہے ؎

ہوں آفتاب عالم مجھ پر ہے فضلِ یزداں
دیں گے خراج مجھ کو شاہانِ عرب و عجم کے

آفتاب کے بعد وزیر الملک آصف جاہ کا حال لکھا گیا ہے۔

آصف، تخلص، نام نواب آصف الدولہ، وزیر الملک آصف جاہ یحیٰی خاں بہادر ہر بر جنگ مرحوم ابن نواب شجاع الدولہ مغفور ابن نواب ابو المنصور خاں منصور جنگ کی یہ تصنیف خاص ہے ؎

---

[۱] علی گوہر ہی شاہ عالم تخلص کرتے تھے [۲] دیکھیے قلمی نسخہ دیوانِ جہاں ورق ۳

غزل

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے | ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے[1]
تیرے کوچے میں نقشِ پا کی طرح | ایسے بیٹھے کہ پھر نہ واں سے گئے
عشق ہاتھوں سے تیرے کیا کہیے | نام سے گذرے اور جہاں سے گئے
شمع کی طرح رفتہ رفتہ ہم | سینوا اک دن کہ جسم و جاں سے گئے

آصف کی بھی سات غزلیں دیوانِ جہاں میں درج ہیں۔ ساتویں غزل سے پہلے ایک قطعہ بھی ان کا ملتا ہے۔ ساتویں غزل کا مقطع ہے ؎

یہ تیرے وصل و جدائی کا لکھیے کیا آصف

یہ اتفاق ہے باہم رہے نہ نہ رہے

دیوان جہاں کی افادیت اور اہمیت اس لئے بھی ہے کہ دیوانِ جہاں میں ایسے شاعروں کے حالات اور کلام مل جاتے ہیں جن کا دوسرے تذکروں میں ذکر نہیں ملتا۔ اور بنگال کے شعرا جن کو میر حسن، میر تقی میر، نواب سرور، نواب شیفتہ اور فتح علی گردیزی نے قابل التفات و ذکر نہیں سمجھا ان کے متعلق کچھ مواد دیوانِ جہاں میں موجود ہے۔ انھی شاعروں میں حیدری، امید، معروف، حیف، شیدا اور روا کی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حیدری کا حال نرائن نے اس طرح لکھا ہے

"حیدری تخلص، حیدر بخش نام، دلی کے رہنے والے ہیں۔ راقم الحروف کے .... یہ ان سے ہے ؎

---

[1] تذکرہ سرور یعنی عمدۂ منتخبہ میں آصف کا بس یہی ایک شعر نقل ہوا ہے دیکھیے تذکرہ سرور مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

غزل

جب وہ شمشیر بے نیام کرے | دم میں عالم (کا) قتل عام کرے
دیکھ لینے میں جان مارے ہے | اس سے کیونکر کوئی کلام کرے
حشر تک پھر رہے پریشاں وہ | زلف میں اس کی جو مقام کرے
آج شاہی سے لوں میں ہاتھ اٹھا | آج اپنا جو وہ غلام کرے

حیدری ہو گیا ہے وہ سرکش
بُت کو تیرے خدا ہی رام کرے[1]

دیوان جہاں میں مولوی امانت اللہ کا تشنہ مگر مفید حال ملتا ہے۔ مولوی امانت اللہ کالج کے منشی تھے اور کالج کے لئے کئی کتابیں لکھی تھیں لیکن شاعر کی حیثیت سے شاذ شاذ ہی لوگ ان کو جانتے ہیں۔ جہاں نے لکھا ہے

"شیدا تخلص، نام مولوی امانت اللہ، کلکتے میں تشریف رکھتے ہیں یہ ان سے ہے ؎

تیری گلی میں آکے بہت رو کے ہم چلے | اور ہاتھ تیرے وصل سے اب دھو کے ہم چلے
شیدا پر جفا رقیبوں سے یہ دفا | ہو شکوہ مند یاں تری خو کے ہم چلے[2]

جہاں نے اپنے تذکرہ میں ہوگلی اور مرشد آباد کے کم مشہور شاعروں کا حال لکھ کر بنگال کے شاعروں اور تذکرہ نگاروں پر بڑا احسان کیا ہے۔ ہوگلی کے ایک گمنام شاعر آلی کے حال کے ساتھ ان کی دو مکمل غزلیں لکھی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنگال کی خاکستر میں کیسی کیسی چنگاریاں چھپی ہوئی ہیں۔

---

[1] دیکھئے قلمی نسخہ دیوان جہاں ورق ۵۵ [2] ایضاً ورق ۷۹ ۔ ناموزوں

واؔلی تخلص، نام منشی محمد والی، پنڈوا کے رہنے والے اب ہگلی میں ہیں۔ ان سے یہ ہے ....[1]"

غـــزل

کیا پوچھتے ہو یارو حالِ تباہ میرا	بے مہر ہو گیا ہے وہ رشکِ ماہ میرا
رگ رگ میں میری خواہش تجھ زلف کی بھری ہے	نشتر لگے تو نکلے لوہو (لہو) سیاہ میرا
تیری یہ کم نگاہی اور میرا یہ ترپھنا (تڑپنا)	ظالم بتا تو کیونکر ہوگا نباہ میرا
محشر کا ہول مطلق اتنا نہیں ہے مجھ کو	ہے گا حسینؑ والی پشت پناہ میرا[2]

دیوانِ جہاں کے اس خطی نسخے میں ۱۲۶ شاعروں کا حال ملتا ہے۔ اوران کے کلام کا انتخاب بھی جو خاصہ وزنی ہے۔ ان کے انتخاب سے پتا چلتا ہے کہ جہاں گو خود اچھے شاعر نہ تھے، لیکن سخن فہم ضرور تھے۔ ان کا تذکرہ یقیںؔ کے حال پر ختم ہوتا ہے۔

"یقیںؔ تخلص، نام انعام اللہ خاں، اظہرالدین خاں کے بیٹے مرزا جانجاںؔ[3] اور موجد ریختہ، دلی کے رہنے والے، یہ ان سے ہے....."

جہاںؔ نے یقیںؔ کی ایک غزل بھی نقل کی ہے اور اس کے بعد بیس بائیس صفحات پر فرد، رباعیات اور قطعات درج ہیں۔ یہ اشعار آوارہ گرد کے عنوان سے درج ہیں ان کے ساتھ کسی شاعر کا نام نہیں کیا گیا ہے۔

دیوان جہاں کا یہ مخطوطہ ۱۵۶ اوراق پر مشتمل ہے۔ خوبصورت نستعلیق میں لکھا گیا ہے لیکن کسی کم سواد کاتب کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس غیر مطبوعہ

---

[1] دیکھیے دیوان جہاں قلمی نسخہ ورق ۹۶ [2] ایضاً ورق ۹۰ [3] مرزا جانجاناں کو ۱۹ ویں صدی کے اکثر تذکروں میں جانجاں لکھا گیا ہے۔

نسخہ میں جابجا غلطیاں رہ گئی ہیں اور جابجا مناسب الفاظ چھوڑ دیئے گئے ہیں ان خامیوں کے علاوہ جہاںؔ کا یہ تذکرہ بے حد تشنہ بھی ہے۔ کسی شاعر کا مفصل حال نہیں ملتا۔ اور کسی کی شخصیت کے کسی خاص پہلو کو بھی اجاگر نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہی گلشن بے خار یا تذکرہ سرور کی طرح اس میں ہلکے تنقیدی اشارے ملتے ہیں۔ اس قبح سے یہ تذکرہ پاک ہوتا تو انیسویں صدی کا ایک مفید اور اہم تذکرہ ہوتا اور بنگال کے شعری ادب کا گرانمایہ سرمایہ بھی۔

صاحبان کونسل نے جہاںؔ کی اس تصنیف و تالیف کو بے حد پسند کیا تھا اور اس پر بینی نرائن صاحب کو پانچسو روپے بطور انعام بھی ملے تھے[۱]۔

چار گلشن | چار گلشن بینی نرائن جہاں کی دوسری تالیف ہے۔ یہ اصل میں افسانوی داستان ہے جو حاتم طائی، قصہ رضوان شاہ اور گل وصنوبر کے طرز پر لکھی گئی۔ چار گلشن کے نام سے دھوکا ہوتا ہے کہ محمود شبستری کی گلشنِ راز کی مانند فلسفہ حکمت یا پند و نصائح کا مجموعہ ہے۔ لیکن یہ بالکل ہلکی پھلکی ایک عشقیہ کہانی ہے جو شاہ کیواں اور شہزادی فرخندہ بخت کے رومان سے شروع ہوتی ہے۔ چار گلشن میں بھی اس عہد کی دوسری طویل عشقیہ داستانوں کی طرح عجیب و غریب کردار، طلسمی فضا اور مشکوک ماحول اور مافوق العادت خصوصیات اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہیں۔

چار گلشن کی اہمیت اس لئے ہے کہ یہ بھی اردو کی دوسری داستانوں کی نہج پر لکھی گئی، اور یہی عشقیہ داستان جہاں کے لئے وسیلۂ روزگار بنی تھی، اور اسے

---

[۱] دیکھئے THE ANNALS OF THE FORT WILLIAM COLLEGE P. 425

سننے کے بعد تامس روبک نے بینی نرائن سے دیوانِ جہاں ایسا مفید تذکرہ لکھوایا تھا، چار گلشن میں جہاںؔ نے کتاب کی تالیف کا سبب یوں بیان کیا ہے۔

"یہ ذرہ بے مقدار، عاصی گنہگار، بندہ بینی نرائن جہاں ابن رلئے سو وشٹ نارائن نبیرہ جہاراجہ لچھمی نرائن مرحوم قوم کھتری، مہتر، ساکن دارالسلطنت لاہور جو بیچ ۱۲۱۵ھ کے عہد میں نواب معلی القاب مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر کے ہمرکاب برادر رکھیم نرائن صاحب کے بہ عہدۂ وکالت وزیر الممالک ہندوستان نواب سعادت علی خاں بہادر کے بیچ شہر لطافت بہر کلکتہ کے آئے تھے، وارد ہوا۔ اس بات کو گیارہ برس کا عرصہ ہوا کہ حالتِ بیکاری میں گرفتار ہے اور اب کہ ۱۲۲۵ھ میں عہد دولت میں گورنر جنرل لارڈ منٹو صاحب کے ایک دن اس کہانی کو کہ بہت دنوں سے اس گنہ گار کو یاد تھی، بر سبیل مذکور کے روبرو منشی صاحب مہربان صدق و احسان امام بخش صاحب کے بیان کیا۔ منشی صاحب ممدوح اس کہانی کے سننے سے نہایت محظوظ ہوئے اور عاصی کو فرمایا کہ اس قصہ لطیف اور کہانی نادر کو قلم زبان سے زبان قلم میں لائے اور زمین ریختہ ہندی میں اوپر صفحہ کاغذ کے لکھے۔"[1]

چار گلشن کے اس مختصر دیباچے سے ظاہر ہے کہ دیوان جہاںؔ کی تصنیف و تالیف کے قبل یہ لکھی جا چکی تھی۔ یہ رومانی داستان، شاہ کیوان کی بیدار بخت کی بیٹیوں سے شادی اور سب سے ذہین، زیرک اور دانا لڑکی فرخندہ بخت کے ہاتھوں بادشاہ کی ذلت اور شکست کا قصہ ہے۔ چار گلشن کی پہلی کہانی شاہ کیوان کے ایک فقیر سے تین لاکھ انمول باتوں کے خریدنے اور اپنی بدکار بیٹی اور اسکے آشنا کو

---

[1] دیکھئے قلمی نسخہ چار گلشن ص۳

سزا دینے کے احوال میں ہے۔

شاہ کیوان ایک فقیر درویش سے تین لاکھ کے عوض میں تین باتیں خریدتا ہے، جو بادی النظر میں معمولی ہوتی ہیں لیکن ان باتوں پر عمل کرنے سے وہ بادشاہزادی کی عیاشی اور بدکاری معلوم کر پاتا ہے اور ان کو سزا دیتا ہے۔ درویش کی پہلی بات سونے سے جاگنا خوب ہے، دوسری جاگنے سے اٹھ بیٹھنا خوب ہوتا ہے، تیسری اٹھ بیٹھنے سے چلنا پھرنا خوب تر ہوتا ہے۔

تین لاکھ کی یہ باتیں بادشاہ نے اپنی خواب گاہ میں جلی حروف میں لکھوا کر آویزاں کردی تھی۔ ایک رات سوتے سوتے جاگ گیا۔ پھر جاگ کر بیٹھ گیا۔ اور درویش کی تیسری باتوں پر عمل کرنے کی وجہ سے بالکنی میں چہل قدمی کرنے لگا اور اسی وقت اس نے دیو ہیکل حبشی کو محل میں پھلانگ کر آتے دیکھا۔ وہ ڈر گیا لیکن چھپ کر حبشی کی تمام حرکتوں کو دیکھنے لگا۔ حبشی سیدھے محل سرا میں گیا۔ دروازہ کھولا۔ شاہزادی محوِ خواب تھی۔ حبشی نے پہونچتے ہی شہزادی کی کمر پر لات ماری بادشاہ کا دل تلملا اٹھا لیکن خاموش رہا۔ شہزادی نے اٹھ کر اپنے آشنا سے معافی مانگی۔ پھر پلنگ کے نیچے کی تختی الٹی اور سرنگ کے راستے سے شہزادی، اس کا یار اور بادشاہ ایک خوبصورت باغ میں آئے۔ اور وہاں بدکار شہزادی عیش و گناہ کے نیل میں غوطہ لگانے لگی جس کی جیتی جاگتی تصویر جہاں نے اس طرح اتاری ہے۔

جب اس کارِ بد سے فراغت کی، اور ہوائے نیند دونوں پر غالب آئی تو دونوں مست ہو کر سو گئے۔ بادشاہ نے فرصت وقت غنیمت جان کے دوڑ کر

بزورِ تمام ایسی ایک تلوار دو دستی لگائی کہ سر دونوں بے حیاؤں کے تن سے جدا ہو گئے۔ بادشاہ نے ان کو مار کر سجدہ شکر ادا کیا۔"[1]

اس قتل سے فراغت پا کر وہ وزیر زادی کی بدکاریوں سے بھی واقف ہوا اور اسے بھی وزیر کی مدد سے کیفرِ کردار کو پہونچایا۔ اور دونوں کی لاشیں بیچ بازار میں ڈلوا دیں۔

اور یہیں سے چار گلشن کی اصل کہانی شروع ہوتی ہے۔ ان لاشوں کی وجہ سے شاہ کیواں کو ہندوستان کے راجہ بیدار بخت کی چار ذہین اور ہوشیار بیٹیوں کا علم ہوتا ہے۔ شاہ بیدار بخت کی چار بیٹیاں تھیں۔ دل آرام، دلربا، زیب النساء اور فرخندہ۔ چاروں بلا کی ذہین تھیں۔ چاروں کو شادی بیاہ سے چڑ تھی اور مردانہ لباس پہن کر شکار کو جاتی تھیں، بے پروا اور آزادانہ زندگی بسر کرتی تھیں۔ ایک شام جب شکارگاہ سے واپس شہر گئیں تو سڑک پر دو عورتوں کی لاشیں پڑی دیکھیں جہاں لوگوں کا ازدحام تھا۔ ان لاشوں کو دیکھ کے دل آرام بولی:۔

"یہ دونوں رنڈیاں (عورتیں) مسی خوب لگاتی تھیں۔ سب آدمی سنتے ہی اس بات کے سخت حیران ہوئے کہ اس سوار نے عجب طرح بات کہی۔ یہ لاشیں سر نہیں رکھتی تھیں۔ پس مسی لگانا ان کو کس طرح ثابت ہوا۔ دوسری بہن کہ جس کا نام دلربا تھا، بولی، ان کو کاجل لگانے کا بھی بڑا سلیقہ تھا۔ اس بات کے سنتے ہی لوگوں کو اور تعجب ہوا۔ پھر تیسری بہن بولی کہ بال ان کے سر کے بڑے بڑے تھے۔ اس بات کے سنتے ہی لوگوں کو سکتہ سا عالم ہو گیا کہ چوتھی جس کا فرخندہ

---

[1] ق۔ن، چار گلشن ص۳۲

نام تھا ہنس کے کہنے لگی کہ ان دونوں بے وقوفوں نے کیا پر کرنا نہ جانا سب آدمی اس کا منہ دیکھ کے بھچک رہ گئے؛ ۔"

جب شاہ کیوان نے راجہ بیدار بخت کی بیٹیوں کی دانشمندی اور ذکاوت کی باتیں سنیں تو اس کو یہ معلوم کرنے کا شوق چرایا کہ ان لڑکیوں نے کیسے ساری باتیں جان لیں۔ وہ اسقدر اشتیاق دید سے بیتاب ہوا کہ راجہ بیدار بخت کو شادی کا پیغام بھیجدیا۔ راجہ بیدار بخت شادی کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔

شاہ کیوان اپنی تین بیگموں یعنی دلآرام، دلربا اور زیب النسا کا راز جان لیتا ہے۔ لیکن فرخندہ بڑی چالاک ہوتی ہے۔ وہ ایک شرط پر بادشاہ کو راز بتانے کے لئے تیار ہوتی ہے۔ وہ شرط یہ تھی کہ چالیس گھڑے بھر کے بادشاہ اس کے پلنگ کے اردگرد چھڑکاؤ کرے۔ اس بات سے بادشاہ کی غیرت اور شاہی نخوت ابال کھاتی ہے۔ وہ غیظ وغضب میں آتا ہے۔ فرخندہ پر شاہی عتاب نازل ہوتا ہے، فرخندہ کو قید کر دیتا ہے۔

"فرخندہ کو اس گنبد میں اتار دیا، اور ایک توڑ ہزار روپے کا روبرو اس کے رکھدیا۔ اور فرخندہ سے کہا کہ میں واسطے ملک گیری کے جاتا ہوں۔ ایک برس کے عرصہ میں پھر اس شہر میں آؤں گا لیکن تجکو لازم ہے کہ پانچسو روپے اس توڑے سے خرچ کیجیو اور پانسو روپے باقی رکھیو، لیکن مہر اس توڑ کی بجا رہے اور دوسری بات یہ کہ اس گنبد کے بیچ ایک بیٹا حلال کا پیدا کر رکھیو[2]۔"

بادشاہ کی تمام شرطیں فرخندہ نے قبول کیں اور بادشاہ رخصت ہو گیا

---

[1] دیکھئے قلمی نسخہ ورق ۔ ۴۹ ص ۵۰ [2] ایضاً ورق ۵۲

اس کے بعد ہی کہانی ختم ہونے لگتی ہے۔ ایک عجیب ٹھہراؤ کا احساس ہونے لگتا ہے مگر بینی نرائن جہاں ایک چابکدست فن کار اور کامیاب داستان گو کی طرح ایک عقلمند سوداگر کے کردار کی تخلیق کرتے ہیں۔ اور پھر کہانی آگے بڑھتی ہے۔ دانشمند سوداگر فرخندہ کے عشق میں مبتلا ہو کر زر کثیر سے گنبد تک جانے کی تہہ دار سرنگ بناتا ہے۔ فرخندہ آزاد ہوتی ہے لیکن سوداگر کی محبوبہ نہیں بیٹی بنتی ہے۔ اور سوداگر کی مدد سے فرخندہ بادشاہ سے میدان جنگ میں ملتی ہے۔ اپنی تمام شرطیں پوری کرتی ہے۔ شاہ کیواں کو فریب میں رکھ کر لوٹتی ہے۔ آخر میں بادشاہ پر تمام راز عیاں ہوتے ہیں۔ شاہ کیواں فرخندہ کی فراست کا قایل ہو جاتا ہے۔ تقصیر معاف کرتا ہے اور اپنی بیگم اور ولی عہد کو ساتھ لے کر دارالسلطنت لوٹتا ہے۔ دانشمند سوداگر کو امید سے زیادہ انعام ملتا ہے۔ وزارت کے منصب جلیلہ پر فائز ہوتا ہے اور شاہ کیواں اپنی بیگمات کے ساتھ ہنسی خوشی کے دن گزارنے لگتا ہے۔ پانچویں اور آخری کہانی یہیں ختم ہوتی ہے۔ اور انیسویں صدی کے رواج کے مطابق جہاں نے بھی اپنی عشقیہ رومانی داستان نظم پر ختم کی ہے۔ سه

کہانی جو فرخندہ کی میں کہی — غلط بھو مت یہ ہے سب ہی (صحیح)

بہت خونِ دل اس میں کھایا ہے میں — مزا خوب سا اس میں پایا ہے میں

رکھا چار گلشن جو میں اس کا نام — رہے گی خزاں دور اس سے مدام

سنے جو کوئی اس کو کچھ کر یقیں — کرے گا مصنف کو بس آفریں

کہانی ہوئی اب یہاں سے تمام — بحق محمد علیہ السّلام

تمام شد کار من، نظام من، ۱۸۱۲ء مطابق ۱۲۲۵ھ

چار گلشن بینی نرائن جہاں کی ذہنی اپج ہے۔ دیباچے میں جہاں نے لکھا ہے کہ بہت دنوں سے ان کے ذہن میں کہانی کا پلاٹ تیار کیا تھا۔ اور منشی امام بخش کی خواہش کے مطابق اس پلاٹ کو قصہ کا روپ دیا۔ مگر اصل میں یہ قصہ بھی بالکل نیا اور طبعزاد نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت جہاں کے سامنے ایسی بہت سی کہانیاں اور داستانیں تھیں۔ ان میں مذہب عشق، گل وصنوبر، قصہ رضوان شاہ ہفت سیر حاتم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چار گلشن اور ان کتابوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے، چار گلشن میں بھی پورب دیش کا بادشاہ ہے اسکی بیٹی بھی دوسری داستانوں کی شہزادیوں کی طرح عیاش اور بدکار ہے حبشی سے ناجائز تعلقات رکھتی ہے۔ اور انہی داستانوں کی طرح یہ داستان بھی ختم ہوتی ہے۔ جہاں کی اس کہانی میں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں۔ اسکا ہیرو شاہ کیواں چار ذہبی شہزادیوں سے شادی کرتا ہے جو ہندوستان کی ہوتی ہیں جہاں نے بھی دیگر داستان گویوں کی طرح چار شادیوں پر ہی اکتفا کیا ہے۔ لیکن جہاں سے ایک لغزش ضرور ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ یہ چار شہزادیاں سگی بہنیں ہوتی ہیں۔ اور اسلامی رسم ورواج کے مطابق چار بہنوں کے ساتھ بیک وقت شادی حلال نہیں۔ اس کہانی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ قصے میں ہندوستان کی تالعف، معاشرت اور سماجی زندگی کے ہلکے خاکے جا بجا ملتے ہیں۔ اب دوسرے قصوں کی طرح اس قصے کو بھی ادبی اہمیت نہیں رہی۔ مگر ابتدائی نثر کا یہ عمدہ نمونہ ضرور ہے اور ایسی دلچسپ اور رنگین کہانیوں اور عام فہم عبارت کے لئے اس وقت شاعری کے آگے نثر کا چراغ جلتا رہا۔ اور نثر نگاری عوام میں مقبول

ہوتی گئی۔

تنبیہہ الغافلین بینی نرائن نے مولوی شاہ رفیع الدین[1]، مولانا شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی فارسی کتاب کا ترجمہ اپنے پیرو مرشد مولوی سید احمد بریلوی کے ایما پر کیا تھا۔ بینی نرائن کو مولوی سید احمد بریلوی سے اس قدر گہری ارادت وعقیدت تھی کہ آخری ایام میں وہ مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ جہاں نے اس مفید اور مذہبی کتاب تنبیہہ الغافلین کا ترجمہ ہندوستانی میں کیا۔ یہ کتاب مسلمانوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ مسلم شریعت اور احکامات سے متعلق وضاحت کے ساتھ مفید باتیں اس کتاب میں ملتی ہیں۔ اس کی بنیاد رسول اللہ کی احادیث پر رکھی گئی ہے۔ بینی نرائن کے ترجمے کے بعد بھی متعدد لوگوں نے اس کا ترجمہ اضافہ کے ساتھ کیا۔ بینی نرائن کی تنبیہہ الغافلین بیس ابواب پر پھیلی ہوئی ہے لیکن بعد کی ترتیب شدہ کتابوں میں ۲۵ ابواب ملتے ہیں۔

بینی نرائن کی تنبیہہ الغافلین شروع ہوتی ہے

"اچھی اچھی نعتیں اور تعریفیں اللہ کی ثابت ہیں کہ خدا تعالیٰ پیدا کرنے والا تمام خلق عالم کا ہے اور درود نا محدود اس کے پیغمبر کے اوپر۔۔۔"[2]

اس کے دیباچے سے پتا چلتا ہے کہ جہاں نے تنبیہہ الغافلین کے ترجمہ

---

[1] مولانا شاہ رفیع الدین زبردست عالم دین تھے۔ شمالی ہند میں شاہ صاحب نے قرآن پاک کا اردو ترجمہ سب سے پہلے کیا تھا مسلمانوں کے فائدے کے لئے مولوی سید احمد بریلوی کی فرمائش پر فارسی میں تنبیہہ الغافلین مرتب کی تھی۔ شاہ صاحب کے مریدوں کا حلقہ وسیع تھا۔ شاہ صاحب نے مذہبی تبلیغ واشاعت کے کام کے ساتھ فارسی اور اردو ادب کی بھی خدمت کی۔ ان کا انتقال ۱۲۵۲ھ میں ہوا

[2] فہرست مخطوطات ہندوستانی انڈیا آفس لائبریری۔

کے وقت ہندی الفاظ کے کثرت استعمال سے پرہیز کیا ہے۔ اور فارسی الفاظ وتراکیب بھی جوں کی توں رہنے دی ہیں۔ تنبیہ الغافلین کا کوئی قلمی نسخہ کلکتہ کے بڑے بڑے کتب خانوں میں بھی دستیاب نہیں ہو سکا لیکن انڈیا آفس لائبریری میں اس کا ایک خطی نسخہ موجود ہے۔ اس کا انداز بیان آسان ہے۔ مگر ترجمے میں لغزشیں اور غلطیاں رہ گئی ہیں۔ بعد کے مطبوعہ نسخوں میں ان غلطیوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا نام تنبیہ الغافلین ہے۔ اور احوال اس کتاب کا یوں ہے کہ پہلے کسی شخص نے اس کو جس میں بیس ابواب ہیں۔ فارسی سے ہندی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ لیکن اکثر الفاظ بے محاورہ اور نادرست ہیں۔ اور حدیثیں غلط تھیں[1]" عربی پر عبور کامل نہ ہونے کے باعث ان سے ترجمے میں لغزشیں ہو گئیں اور جا بجا غلطیاں رہ گئی تھیں۔ پھر بھی جہاں کے اس کام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ان تین کتابوں کے علاوہ بینی نرائن جہاں کی کسی اور تصنیف یا تالیف کا نشان نہیں ملتا ہے۔ بینی نرائن جہاں تخلص کرتے تھے جس سے ظاہر ہے کہ وہ شاعر بھی ہوں گے۔ مگر دیوانِ جہاں کے منظوم دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعری کے میدان میں جہاں کا رخشِ قلم تیز نہیں دوڑتا۔ ان کی شاعری روکھی پھیکی اور بے جان نظر آتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ نساخ نے بھی اپنے تذکرہ سخن شعرا میں دیوان کا مختصر سا حال بھی نہیں لکھا ہے۔

---

[1] دیکھیے قلمی نسخہ ص ۲ بحوالہ دریائے شادِ (؟) ص ۲۵۹ مرتبہ بلوم ہارٹ ص ۲

للولال جی کب

للولال جی کب (کوی) فورٹ ولیم کالج کے شعبہ بھاکا (برج بھاشا) کے میر منشی تھے۔ ایسی حالت میں اس کتاب میں ان کا ذکر محل نظر معلوم ہوتا ہے۔ مگر للولال جی نے بھاکا کے علاوہ ہندوستانی زبان میں کتابیں لکھیں اور وکلا اور جوان کو ترجمے کرنے میں مدد دی تھی۔ لہٰذا ان کی تالیفات اور ہندوستانی زبان کے لئے ان کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔

للولال جی کب گجرات کے رہنے والے تھے۔ لیکن ان کا خاندان بہت دنوں سے آگرہ میں آباد ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ گجراتی کم اور اکبرآبادی زیادہ ہیں انھوں نے برج بھاکا اور ہندوستانی زبانوں کی مشہور تالیف 'لطائفِ ہندی' میں اپنا حال نہیں لکھا ہے۔ 'لطائفِ ہندی' مطبوعہ ۱۸۲۱ء کے آغاز میں ان کا بس مختصر سا ذکر ہے۔

"راجہ بکرماجیت کے —— اور اشرف الاشراف لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر کے راج میں خداوند نعمت کپتان جان ولیم ٹیلر صاحب اور لپٹن (غالباً لفٹنٹ کی خرابی ہے) ابراہیم لائف صاحب کے حکم سے شری للولال کوی براہمن گجراتی ساہتیہ ادی آگرے والے نے ایکسو نقل زبان ریختہ میں بنائی جمع کرکے چھپوائی کالج کے نوسکھ صاحبوں کے پڑھنے کو[1]"

[1] دیکھئے دیباچہ لطائف ہندی مطبوعہ ۱۸۲۱ء دیوناگری رسم الخط میں ص۱

للولال جی نے لطائفِ ہندی کے علاوہ پریم ساگر، بدیا درپن، راج نیتی، مہادیو بلاس اور سب بلاس کتابیں کالج کے لئے تالیف کیں۔ ان میں سے لطائف ہندی، ودیا درپن اور پریم ساگر دیوناگری لپی کے علاوہ فارسی رسم الخط میں بھی شائع ہوئی تھیں۔ دونوں لپیوں کی زبان ایک ہے۔ لپیوں کے علاوہ عبارت میں معمولی فرق بھی نہیں ہے۔ للولال جی کب کی لطائفِ ہندی کے کئی ایڈیشن نکلے۔ پہلی بار للولال جی کی یہ کتاب ۱۸۱۰ء میں کلکتے کے انڈیا گزٹ پریس سے شائع ہوئی تھی۔ لطائف ہندی مطبوعہ ۱۸۲۱ء دیوناگری اور فارسی لپیوں میں ایک ساتھ شائع ہوتی ہے۔ اس میں ایکسو چھوٹی چھوٹی حکایات ہیں جو نقل کے عنوان سے دی گئی ہیں۔ یہ ایکسو کہانیاں ۱۵۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ انگریزی اور ہندوستانی زبانوں میں برج بھاشا کے ادق اور مشکل الفاظ کے معنیٰ بھی دئے گئے ہیں۔ یہ فرہنگ بڑی مفید ہے

لطائف ہندی کی پہلی حکایت اس طرح شروع ہوتی ہے۔

"ایک ساہوکار پوتروں کا راجہ جنم جنم کا خوشحال زمانے کے بیچ پاپ میں اپنی دولت سب کھو بیٹھا اور لگا دکھ پانے۔ فاقے کڑاکے کے کھینچے۔ نیدان اس کے جی میں یہ خیال گذرا کہ جو میں کسی جاپرس کے پاس جاؤں تو دکھ مٹے کیونکہ سنا ہے کہ سادھ (سادھو) کے درشن سے بیادہ (تکلیف) جاتی ہے۔ آخر بچار جلد جلد کر ایک جوگی کے پاس گیا۔ یہ اسے کچھ کہنے نہ پایا کہ اس نے اپنے جوگ سے اس کا مطلب دریافت کر کے کہا۔

سکھ دکھ ہرت[1] دن سنگ ہے میٹ سکے نہ کوئی
جیسے چھایا دیہہ[2] کی نیارؔی[3] نیک نہ ہوئے
یہ معقول جواب پاکر بے چارہ صبر کرکے اپنے گھر آیا[4]

یہ چھوٹی چھوٹی نقلیں اپنے دامن میں نصیحت کے موتی سمیٹے ہوئی ہیں۔ اس کتاب کی ہر نقل میں ساہوکار، پنڈت، رشی، راجا، مولوی، وزیر اور بادشاہ کے کردار مختلف رنگ اور روپ میں نظر آتے ہیں۔ پانچویں نقل ایک ملا سے عبارت ہے۔

"پٹھانوں کی بستی میں ایک ملا تھا جو کچھ فاتحہ درود کا ان کے کام ہوتا، اس کو بلا لیتے اور اپنا کام کروا لیتے۔ اس میں شب برات جو آئی تو ہر ایک گھر سے بلاہٹ ہوئی۔ تب اس کے کسی آشنا نے پوچھا کہ کہو دوست آج تم اکیلے کیا کروگے اور کس طرح گھر گھر فاتحہ پڑھوگے۔ بولا بھائی مجھے فاتحہ پڑھنے سے کیا کام۔ مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت۔ مجھے اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے"[5]

للولال جی کی یہ نقل پڑھتے وقت ذہن پر نامانوس اور ادق سنسکرت لفظ کا بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس عہد میں ایک عام فہم سہل اور رواں دواں ہندوستانی لکھنے کی تحریک کو قبول عام حاصل ہو چکا تھا۔ للولال جی کی ایک بڑی خوبی اور صفت یہ ہے کہ کہانیوں کے کردار اور ماحول کے مطابق زبان لکھتے تھے۔ اور جیتی جاگتی تصویر پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ پہلی نقل ساہوکار کی ہے۔ اس کے کردار، ماحول اور طرز معاشرت کا

---

[1] ہردن [2] بدن [3] جدا [4] دیکھیے لطائف ہندی ص۔ [5] ایضاً ص۔

خیال رکھ کر زبان لکھی گئی۔ ملا کی حکایت میں زبان بدلی گئی۔ یہ بڑے کمال کی بات ہے کہ انیسویں صدی کی معمولی حکایتوں میں بھی ان تمام باتوں کا خیال رکھا جاتا تھا۔

آخری نقل شاہ جہاں کے عالم بیٹے دارا شکوہ کے دربار کے ہم پیشہ جوتشیوں اور نجومیوں کی ہے۔ ہم پیشہ وروں میں ایک دوسرے سے اتنی نفرت دشمنی اور کینہ پوری ہوتی ہے کہ وہ اپنی بھلائی برائی کے درمیان بھی تمیز و تفریق نہیں کر سکتے۔ اور اپنے ساتھ سارے جگ کی ناؤ نفرت کے طوفان میں ڈبو دینے میں نہیں ہچکچاتے ہیں۔

"شاہ جہاں کے شہزادے دارا شکوہ کو علم نجوم سے بڑا شوق تھا۔ نجومی اور جوتشی ہمیشہ اس کے نوکر رہتے تھے...... ایک سے ایک عداوت رکھتا تھا پر شہزادہ کے خوف سے کوئی کسی کا کچھ نہیں کر سکتا تھا...[1] الخ"

اسی سویں نقل پر لطائف ہندی ختم ہوتی ہے۔ اس کی ہر نقل دلچسپ ہونے کے ساتھ نصیحت آموز ہے۔ ہندوستان کے قدیم ادب میں ایسی اخلاقی اور نصیحت آموز حکایات کی کمی نہیں۔

للو لال جی کی لطائف ہندی بھی قدیم ادب کا نمونہ ہے جس کی افادیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی ہے۔

پریم ساگر 'پریم ساگر' اصل میں بھگوت گیتا کے دسویں باب کا ترجمہ ہے۔ للو لال جی کے بہت پہلے سنسکرت کے ایک عالم پنڈت چتر بھوج مسر نے

---

[1] ملاحظہ ہو لطائف ہندی صفحہ ۱۵

برج بھاکا میں اس کا ترجمہ کیا تھا۔ لیکن اس ترجمے میں ثقیل، ادق اور نامانوس سنسکرت الفاظ کی بھرمار تھی۔ اس بنا پر عوام میں مقبول نہ ہوسکی چنانچہ صاحبان کونسل کی ہدایت پر للولال جی نے اپنے شعبہ کے لئے اس کا دوبارہ ترجمہ کیا۔ اور ثقیل اور ادق الفاظ اور غیر مانوس استعارات اور تراکیب پریم ساگر سے نکال دیں۔ اور آسان زبان میں یہ کتاب ترتیب دی۔ پریم ساگر میں سری کرشن جی بھگوان کی روایتی رومانی داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ ۱۸۰۳ء میں دیوناگری لپی میں یہ پہلی بار شائع ہوئی تھی اور کچھ سال کے بعد نول کشور پریس لکھنؤ سے پریم ساگر فارسی خط میں شائع ہوئی جس کا ایک نسخہ نیشنل لائبریری (کلکتہ) میں موجود ہے۔ سرورق دو رنگ میں ہے بھگوان کرشن کی تصویر بھی اس میں دی گئی ہے۔

"پریم ساگر مذہبی کتاب ہونے کے باوجود خشک نہیں ہے بلکہ دلچسپ ہے۔ انگریزی میں اس کے دو ترجمے ہوئے۔ ایک کپتان ولیم ہولنگس نے ۱۸۴۸ء میں کلکتے سے شائع کیا تھا۔ اور دوسرا ایڈورڈ ایسٹ رک نے ۱۸۶۷ء میں لندن[1] سے"

بدیا درپن للولال جی کی ایک اور مشہور کتاب بدیا درپن یعنی مراۃ العلوم ہے۔ بدیا درپن میں شری رام کی کہانی تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ باپ کے وچن اور آگیہ نباہنے کے لئے شری رام ہنسی خوشی بن باس لیتے ہیں۔ اجودھیا ویران اور سوگوار ہو جاتا ہے۔ بن میں راون بھیس بدل کر

---

[1] ملاحظہ ہو ارباب نثر اردو ص ۲۶۶

سیتا جی کو اٹھالے جاتا ہے اور پھر رام جی جنوبی ہند کی پراچین قوم (ہنومان جی) کی مدد سے لنکا پر چڑھائی کرتے ہیں۔ راون کو شکست اور ہلاکت نصیب ہوتی ہے اور سچ کا بول بالا ہوتا ہے۔ بدیا درپن شری رام کی مفصل داستان اور تاریخ مفصل انداز میں بیان کی گئی ہے۔ مسٹر تامس روبک نے اپنی مشہور تصنیف انالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم میں بدیا درپن کا مختصر تعارف کرایا ہے۔

" بدیا درپن (مرأۃ العلوم) اودھ بلاس کی تصنیف ہے، یہ ۷۰ سال قبل لکھی گئی تھی۔ شری للولال کوی نے اس کا ترجمہ پوربی زبان میں کیا تھا۔ اس وقت ہندوستانی (جو سپاہیوں کی زبان ہے) میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس میں رام کی کہانی ہے اور ہندوستان کے تمام علوم وفنون پر مکمل تبصرہ ہے۔ کیپٹن روبک اور کالج کے نائب سکریٹری کی نگرانی میں اس کا ترجمہ مرزا بیگ نے ہندوستانی میں کیا۔ مرزا بیگ اودھ کا رہنے والا تھا[1]۔ "

بدیا درپن کے اس چھوٹے سے تعارف سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ بدیا درپن کا کالج کے اردو شعبہ کے لئے ہندوستانی زبان میں ترجمہ ہوا تھا۔ مرزا بیگ اس کے مترجم تھے۔ وہ بھی کالج سے وابستہ ہوں گے۔ لیکن سخت جستجو اور چھان بین کے باوجود مرزا بیگ اودھی کے حالات دستیاب نہ ہو سکے اور نہ ہی فارسی لپی میں بدیا درپن کا کچھ پتہ چل سکا۔ غالباً یہ زیور طباعت سے آراستہ نہ ہو سکی اور خطی نسخہ زمانہ برد ہو گیا۔

---

[1] ANNALS OF THE COLLEGE OF FORT WILLIAM (T. Roback) P. 424

راج نیتی | یہ للولال جی کی اپنی تصنیف نہیں ہے۔ راج نیتی دراصل سنسکرت میں لکھی گئی جو پنڈت نراین کی تصنیف ہے۔ بدیا درپن کی طرح اس کا ترجمہ اردو میں شائع نہ ہو سکا۔ للولال جی کب نے ڈاکٹر ولیم ٹیلر کی فرمائش پر ۱۸۰۹ء میں راج نیتی کا ترجمہ آسان بھاکا میں کیا۔ اور اسی سنہ میں یہ دیوناگری لپی میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی تھی۔ راج نیتی میں راجاؤں کی فوجی انتظامی اور اقتصادی پالیسی اور اخلاقیات سے متعلق متعدد سبق آموز حکایات درج کی گئی ہیں۔ کالج کے نصاب میں بھی یہ داخل تھی۔ چونکہ یہ مفید اور کارآمد کتاب تھی اس لئے عوام میں یہ انتخاب بے حد پسند کیا گیا۔ اور کئی اڈیشن اسکے نکلے۔

سبھا بلاس | سبھا بلاس ہندی کی معیاری، کامیاب اور دلکش نظموں کا انتخاب ہے۔ غالباً یہ دل پسند ہندی کویتاؤں کا پہلا انتخابی مجموعہ ہے۔ یہ کالج کے نو وارد اور نوسکھے صاحبوں کے لئے مرتب کی گئی تھی۔ اور عوام میں یہ انتخاب بے حد پسند کیا گیا تھا۔ اس کا ایک انگریزی ترجمہ بھی بنارس سے شائع ہوا تھا جو اب نایاب ہے۔ سبھا بلاس پہلی بار ۱۸۱۰ء میں کلکتے میں شائع ہوئی اور کالج کے نصاب میں داخل تھی۔

ہندی مثنوی | للولال جی کی دوسری منظوم تالیف 'مادھو بلاس' ہے۔ یہ اصل میں ہندی مثنوی ہے جو مادھو اور سلوچنا کے معاشقے کے متعلق ہے۔ یہ رزمیہ رومانی منظوم داستان ہے جس میں حصولِ مطلب کے لئے جنگ کے واقعات مؤثر، دلنشین اور افسانوی رنگ میں تحریر کئے گئے ہیں۔ اس کا ماخذ بھی قدیم سنسکرت کی ایک رزمیہ نظم ہے۔ للولال کب نے سنسکرت سے برج کی عام فہم

بولی میں اسے نظم کیا تھا یہ بھی ہندی داں طبقہ میں بجد مقبول ہوئی تھی لیکن اس کا پتا نہیں چل سکا۔ کہ اردو قالب میں بھی یہ مشہور رزمیہ نظم ڈھلی تھی یا نہیں۔

ان تالیفات کے علاوہ اردو منشیوں کے ترجے میں کوی جی نے معاونت کی تھی۔ لیکن سنگھاسن بتیسی کے متعلق ارباب نثر اُردو کے مولف کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ یہ للولال جی کی تصنیف ہے۔

للولال جی ۱۸۲۳ء تک کلکتے میں تھے اور کالج سے وابستہ بھی۔ اسکے بعد ان کی حیات پردۂ گمنامی میں ڈھکی ہے۔ غالباً کاشی میں انھوں نے انتقال کیا۔

تارنی چرن مترا
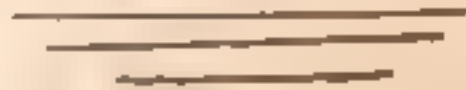
تارنی چرن مترا کو فورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ فادر ولیم کیری (W. CARREY) جب کالج کے شعبۂ بنگلہ کے صدر نشیں ہوئے تو غالباً ان کی سفارش پر ہی تارنی چرن مترا کو فورٹ ولیم کالج کی ملازمت ملی۔ تارنی چرن مترا بنگال کے سپوت ہیں جن کو ہندوستانی زبان سے زبردست شغف تھا۔ ضلع ہوگلی کے ایک گاؤں میں ۱۷۷۲ء میں ان کا جنم ہوا تھا مگر ان کا خاندان کلکتے میں آباد ہو گیا تھا۔ تارنی چرن مترا کا خاندان مغلوں کے زیر اثر رہنے کی وجہ سے فارسی، عربی اور اردو زبان کا دلدادہ تھا۔ اور انھیں خود فارسی، عربی اور اردو زبان میں استعداد کامل تھی۔ تارنی چرن مترا کئی برس تک بنگلہ اور ہندوستانی کے منشی رہے اور ۱۸۰۹ء میں میر منشی شیر علی افسوس کے انتقال کے بعد ان کے جانشیں مقرر ہوئے اور جب تک کالج سے وابستہ رہے وہ اسی عہدے پر فائز رہے تھے۔

یہ کسقدر تعجب کا مقام ہے کہ ہندوستانی شعبہ کے میر منشی ہونے کے باوجود اردو کے تذکروں میں تارنی چرن مترا کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ بنگلہ ادب کی تاریخ میں بھی ان کا کوئی مفصل ذکر نہیں ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ بنگالی ہوتے ہوئے بھی انھیں بنگلہ ادب سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اور بنگلہ زبان میں ان کے

کسی ادبی کارنامے کا کوئی نشان بھی نہیں ملتا۔

ہندوستانی زبان میں بھی تارنی چرن مترا کا کوئی خاص کارنامہ منظر عام پر نہ آسکا ہے۔ پروفیسر جان گل کرسٹ کے ایما اور فرمائش پر انھوں نے چھوٹی چھوٹی حکایتوں کی ایک کتاب تالیف کی۔

ان کی یہی ایک مفید تالیف ہے جو ہندوستانی پریس کلکتے سے شائع ہوئی تھی۔ تارنی چرن مترا کی اس کتاب کا نام نقلیات لقمانی ہے۔ یہ فارسی دیوناگری اور رومن لپیوں میں شائع ہوئی تھی۔ اور پروفیسر گل کرسٹ نے اس پر ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا تھا جس میں اس نے نقلیات لقمانی کے فارسی دیوناگری اور رومن خطوں میں چھاپے جانے کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ گل کرسٹ کا کہنا ہے کہ

"تینوں رسم الخط میں یہ حکایتیں اس لئے شائع کی گئی ہیں کہ نوسیکھ حضرات کی سمجھ میں جلد آئے۔ اور ان کا مطلب سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔"

اس میں قواعد کے ضوابط بھی بتائے گئے ہیں۔

نقلیات لقمانی ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوئی تھی، اور ایک سال بعد چھپ کر منظر عام پر آئی۔ اس میں ۸۰ حکایات "نقل" کے عنوان سے بیان کی گئی ہیں۔ یہ حکایتیں گلستانِ سعدی، کلیلہ دمنہ، بہارستان جامی اور ایسی دوسری کتابوں سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ اور ہر نقل ناصحانہ انداز میں سلیس اور عام فہم انداز میں لکھی گئی ہے۔ مگر خشک اور سپاٹ نہیں ہے ادبی چاشنی اور رنگینی کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ نقلیات لقمانی کی پہلی نقل بالکل مختصر ہے۔

"ایک بادشاہ نے اپنے وزیر سے پوچھا کہ سب سے بہتر مرے حق میں کیا ہے

عرض کی کہ عدل کرنا اور رعیت کا پالنا۔"[1]

دوسری نقل بھی مختصر ہے لیکن اس میں اپنے حکمراں اور آقاؤں سے وفاداری کرنے کا جو سبق دیا گیا ہے۔

"ایک شخص نے ایک کو کہا تو تو آگے محتاج تھا۔ کیا کام کیا جو دولتمند ہو گیا۔ جو کوئی اپنے آقا کی خیر خواہی کرے گا تھوڑے میں مالدار ہو گا۔"[2]

اکیسویں حکایت ایک کمینے اور اشراف کی دوستی کے بارے میں ہے۔ کمینا کا کمینہ پن ایک دن ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ اور لوگوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ کمینے سے دوستی سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہیے۔

"ایک کمینے اور ایک بھلے آدمی سے افلاس میں دوستی ہوئی۔ کمینہ دولتمند ہوتے ہی نجیب زادے سے لگا آنکھیں چرانے، تب وہ خفا ہو کر بولا کہ یہ سچ ہے کہ کمینے کی دوستی جیسی بالو کی بھیت۔"[3]

نقلیات لقمانی ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۰۰ ویں نقل عوام میں مقبول اور مشہور ہے۔ اور امیر تیمور اور اندھے گویے کے متعلق ہے۔

"— امیر تیمور جب ہند میں آیا تب یہ بات کہی کہ میں نے لوگوں سے یوں سنا ہے کہ ہند میں راگ خوب ہوتا ہے۔ کسی گوے کو بلاؤ تو میں سنوں۔ ایک اندھا کلاونت بڑا لسان بادشاہ کی خدمت میں آن حاضر ہوا، ایسا گایا جو (کہ) امیر تیمور سنکر بہت خوش ہوئے۔ اندھے کو پوچھا تیرا نام کیا ہے۔ کہا دولت ا بادشاہ نے کہا کہ کیا دولت بھی اندھا (اندھی) ہوتا (ہوتی) ہے۔ جواب دیا اندھا

---

[1] ملاحظہ ہو نقلیات لقمانی ص۳۲ [2] ایضاً ص۳۳ [3] دیکھیئے نقلیات لقمانی ص۱۱

(اندھی) نہ ہوتا (ہوتی) تو تجھ لنگڑے کے گھر کیوں آتا (آتی) اس جواب سے امیر بہت راضی ہوئے اور انعام جو دیا چاہتے تھے اس سے دو چند دیا۔"[1]

آخری حکایت ایک طبیب اور جلی روٹی کھانے والے حجام کی ہے جو بے حد مشہور ہے۔ اس نقل پر نقلیات لقمانی ختم ہوتی ہے۔ یہ بھی لطائف ہندی جواہر اخلاق اور دوسری حکایتی کتابوں کے طرز پر ترتیب دی گئی ہے۔ نقلیاتِ لقمانی میں ایک بات بے حد کھٹکتی ہے۔ وہ زبان کی ناہمواری ہے۔ اس کے مؤلف کو زبان پر مہارت نہ تھی۔ تذکیر و تانیث کی جا بجا غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اور انداز بیان بھی پھیکا پھیکا ہے۔

نقلیات لقمانی ۶۸ صفحات پر ختم ہوتی ہے۔ آخری چار صفحات اغلاط نامے کے ہیں۔

پرش پریچھا | پرش پریچھا اصل میں پرش پریکھیا[2] (امتحان انسان) ہے یہ بھی ہندوؤں کی اخلاقی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کا ترجمہ براہ راست سنسکرت سے کیا گیا ہے۔ تارنی چرن مترا نے آسان اور عوامی زبان اردو میں اس کا ترجمہ کالج کے لئے کیا ہے۔ تامس روبک نے اسکے متعلق لکھا ہے۔

"اس وقت ۱۸۱۲ء میں ہندوستانی شعبہ کے میرمنشی تارنی چرن مترا ہیں۔ انھوں نے پرش پریچھا کا آسان ہندوستانی میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب شائع بھی ہو گئی ہے۔ اس کا بنگلہ ترجمہ ہری پرشاد نے کیا ہے۔"[3]

---

[1] نقلیات لقمانی ص۱۱ [2] ممکن ہے کہ کتاب الانسانی کا تعارف یا پرش پریچھے ہو جسکو غلطی سے پرکھیا لکھدیا ہو
[3] ANNALS OF THE COLLEGE OF FORT WILLIAM P. 422

اس بیان سے ظاہر ہے کہ پریش پرکچا کلکتہ سے شائع بھی ہوئی تھی۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ اخلاقی حکایات اور پند و نصائح کا یہ گلدستہ زمانہ برد ہوگیا۔

تارنی چرن مترا کا ۱۸۴۰ء اور ۱۸۴۳ء کے درمیان بنارس (کاشی) میں غالباً انتقال ہوا۔

میر معین الدین فیض

میر معین الدین[1] فیض بھی فورٹ ولیم کالج کے تنخواہ دار منشی تھے۔ اور گل کرسٹ کی ان پر خاص عنایت ہونے کی وجہ سے انھیں کالج میں سہولت اور آسانی حاصل تھی۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی خاص ہدایت پر میر معین الدین فیض نے جناب فرید الدین عطار کے پندنامہ کا منظوم ترجمہ خاص صاحبوں کیلئے کیا تھا اور اس کا نام چشمۂ فیض رکھا۔ چشمۂ فیض کا خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور عنوان کے نیچے ذیل کی عبارت نقل ہے۔

"چشمۂ فیض ترجمہ پندنامہ شیخ فرید الدین عطار قدس سرہ نیشاپوری کا واسطے زبدہ نوئنیان عظیم الشان شاہ کیوان بارگاہ انگلستان اشرف الاشراف مارکولیس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کے مسٹر جان گل کرسٹ صاحب دام ثروتہ کی فرمائش سے کیا ہوا میر معین الدین فیض کا[2]"

میر معین الدین فیض کا چشمۂ فیض جہاں تک مجھے علم ہے پندنامہ عطار کا پہلا اردو ترجمہ ہے۔ میر فیض کے بعد بنگال کے مشہور شاعر اور ادیب جناب عبدالغفور خاں نساخ نے پندنامہ عطار کا ترجمہ کیا۔ عجب اتفاق ہے کہ ان کا ترجمہ بھی منظوم ہے اور نام بھی چشمۂ فیض ہے۔ مقام افسوس ہے کہ میر معین الدین

---

[1] ارباب نثر اردو کے مولف نے ڈاکٹر اسپرنگر کے حوالہ سے انکا نام میر محی الدین فیض لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے کیونکہ مخطوط میں فیض نے ہر جگہ اپنا نام میر معین الدین لکھا ہے [2] دیکھئے عنوان کا صفحہ چشمۂ فیض خطی نسخہ

فیضؔ کو شہرت نصیب نہ ہو سکی اور فورٹ ولیم کالج کے گمنام منشیوں میں ہیں
لساخ نے بھی سخن شعرا میں ان کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ چشمۂ فیض ان کی کل ادبی متاع
ہے جو اب نایاب ہے۔ خوش قسمتی سے اس کا خطی نسخہ اب بھی بچ رہا ہے۔ اس
نسخے کی افادیت اور اہمیت اس لئے بھی بڑھ گئی ہے کہ دیباچے میں میر معین الدین
فیضؔ نے اپنا حال بھی درج کیا ہے۔

میر معین الدین فیضؔ دیباچے میں اپنا اور اپنے خاندان کے حال میں لکھتے ہیں
" بندہ کمترین عاصی میر معین الدین فیض ابن سید فخر الدین ابن سید زین العابدین
قوم سادات حسنی الحسینی، اپنا احوال یوں بیان کرتا ہے کہ اصل وطن اس نیاز مند
کے بزرگوں کا خاص سمرقند تھا۔ انھوں نے کسی تقریب سے مع قبائل دہلی دارالسلطنتِ
ہند میں درمیان پرانے شہر کے تشریف لا کر سکونت اختیار کی اور جائے جاگہ زر خرید
کر کے حویلیاں بنائیں، رعیتیں بسائیں، ریاست پیدا کی اور محلے کا نام بے حبل مسجد
یا سید واڑہ رکھا۔ اکثر بزرگ دولت خواہ کے ساتھ روزگار، عمدہ اور خدمات
بادشاہی کے ممتاز و مقرب رہے تھے۔ البتہ اس واردات کو کہ وے ہندوستان
میں آئے گیارہ بارہ پشت کا عرصہ ہوا۔ آخرش برہم ہونے سلطنت کے کہ شہر پر
صدمے تواتر گزرنے لگے، موجب ویرانی کا ہوا۔ اور اکثر رؤسا وہاں کے تاراج
و تباہ ہو کر چاروں طرف نکل گئے۔ چنانچہ عاصی کا بھی اس سبب اتفاق لواحقوں
سمیت غازی پور ضلع بنارس میں آنے کا ہوا۔ جس عرصے میں صاحب خداوندِ
نعمت (جان گل کرسٹ) غازی پور تشریف لے گئے تھے، نحیف خانہ نشیں تھا
ازراہِ نوازش یاد کر کے واسطے سند پہونچانے محاورات شاعرانِ ہند کے فقیر کو

نوکر رکھا۔ جب تک صاحب وہاں تشریف فرما رہے ان کی بدولت بندہ نے پرورش پائی۔ اور تربیت اتنی پائی کہ قابل محبت صاحب والاشان کے ہوا بالفعل جب غازی پور میں اپنا قدرداں کوئی نظر نہیں آیا اور سوائے اس کے یہ کہ وہاں صرف خوش باش تھا کوئی وجہ حیثیت اور وسیلہ زندگی کا کچھ نہ تھا۔ اور خداوند نعمت کے اخلاق و غربا پروری پر اعتقاد کمال رکھتا تھا۔ اس سبب تکلیفیں راہ اور سختیاں سفر کی عین راحت بوجھ کر در دولت پر صاحب کے اپنے تئیں کلکتہ تک لے آیا۔ بارے میر بہادر علی حسینی کہ میر منشی مدرسہ شعبہ ہندی اور رفیق قدیم صاحب خداوند نعمت کے ہیں از راہ مہربانی اپنے سائے تلے اس مسافر کو جگہ آرام دنیا کے بخشے اور کھانے پینے وغیرہ ضروریات کی طرف سے مع آدمیوں کے بفراغت خبر لی۔[۱]

اس دیباچے سے یہ پتا چلتا ہے کہ میر معین الدین فیضؔ کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو مغل دربار کا پروردہ تھا اور بڑی آن بان اور شان و شوکت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کے پیچھے ایک روایتی تہذیب اور ثقافت تھی۔ اور دلی کے تاخت و تاراج ہونے پر ان کا خاندان غازی پور میں آباد ہوا تھا۔ غازی پور میں جب گل کرسٹ نیل کی کاشت کرتے تھے تو ان کی ملاقات صاحب ممدوح سے ہوئی۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کی سفارش اور میر بہادر علی حسینی کی کوششوں سے فورٹ ولیم کالج میں میر فیضؔ کو ملازمت ملی۔

میر صاحب نے کالج کے عہد ملازمت میں ڈاکٹر جان گل گرسٹ کی ایما پر

---

[۱] ملاحظہ ہو چشمۂ فیض خطی نسخہ ورق ۱-۲

چشمۂ فیض ترتیب دیا تھا۔ پندنامہ عطار کا اردو میں یہ پہلا ترجمہ ہے میر فیضؔ کا یہی سرمایہ ہے کیونکہ اس مثنوی کے علاوہ انھوں نے کوئی اور کتاب تالیف یا ترجمہ نہیں کیا۔

جان گل کرسٹ کی مراجعت کے بعد میر فیض الدین فیضؔ کو بھی دوسرے منشیوں کی طرح کالج سے نکلنا پڑا۔ میر بہادر علی حسینی کو میر منشی کے عہدے سے الگ کر دیا گیا۔ ان کی جگہ ۱۸۰۶ء میں میر شیر علی افسوسؔ کو میر منشی مقرر کیا گیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گل کرسٹ کے تمام چہیتے منشی ایک ایک کرکے کالج سے علیحدہ کر دئے گئے۔ میر امنؔ، مرزا لطف علی کا یہی حشر ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ فیضؔ پر بھی گل کرسٹ کے جانشینوں کا عتاب نازل ہوا ہوگا۔ اور انھیں بھی چھٹی دیدی گئی ہوگی۔

مقامِ افسوس ہے کہ میر معین الدین فیضؔ کا ترجمہ پندنامہ عطار شائع نہ ہو سکا مگر خوش نصیبی سے چشمۂ فیض کا مخطوطہ محفوظ ہے۔ چشمۂ فیض خدا کی حمد سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد نعت رسول اور آلِ اطہار کی منقبت درج ہے اور اس کے بعد گورنر جنرل ولزلی اور پروفیسر جان گل کرسٹ کی شان میں قصائد ہیں۔ جن سے خوشامد کی بو آتی ہے۔

چشمۂ فیض کی 'صبر کے فائدوں میں' کے عنوان سے ابتدا ہوتی ہے۔ یہ پہلی نظم ہے۔ اس میں بارہ ۱۲ اشعار ہیں ؎

ہے وہ عاقل جو کوئی شاکر رہے   نفس بد پر اپنے وہ قاہر[۱] رہے

---

[۱] قادر

اپنا غصہ جو کوئی کھاتا ہے یار | کیجیو اس کو رستگاروں میں شمار
گرچہ درویشی ہے مشکل اے عزیز | پر نہیں کچھ اس سے بہتر اور چیز
جس نے قابو میں کیا یہ نفس بد | ساتھ نیکی کے ہوا وہ نام زد
غیبتِ مردم کا مت کیجیو خیال | کہ عذابِ حق سے چھٹنا ہے محال
جس نے غیبت کی کا ڑھی منہ سے بات | اس نے روزِ آخرت پائی نجات[1]

اس آغاز کے بعد متعدد عنوان کے تحت چھوٹی چھوٹی نصیحتوں کو موتی کی لڑی میں پرو دیا گیا ہے۔ نساخ نے اپنی مثنوی چشمۂ فیض میں اسکا عنوان "بیان مخالفت نفس امارہ" قائم کیا ہے۔ نساخ کا ترجمہ تقابلی مطالعہ کے لئے دیا جا رہا ہے

وہی ہے عاقل جو شاکر رہے | اور اپنے نفس پر قادر رہے
اپنے غصے کو یہاں جو کھائے گا | وہ جگہ جنت میں بیشک پائے گا
گرچہ درویشی ہے مشکل اے پسر | لیک درویشی ہے سب سے خوب تر
چاہئے نفس شقی کو گوشمال | تا کہیں آئے نہ تیرے سر وبال
بند غیبت سے زباں کو کر صدا | تا نہ ہوویں بند تیرے دست و پا
بند غیبت سے نہ ہو جس کی زباں | وہ رہا ہووے عقوبت سے کہاں[2]

نساخ نے ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں پند نامہ کا ترجمہ مکمل کیا تھا۔ نساخ کے سامنے میر معین الدین فیض کا غیر مطبوعہ نسخہ ضرور ہوگا۔ لیکن نساخ نے اس نسخے سے استفادہ کرنے کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ نقش ثانی نقش اول سے بہتر

---

[1] دیکھئے چشمۂ فیض صفحہ ۵ [2] دیکھئے چشمۂ فیض نساخ مطبوعہ نول کشور پریس ص۲۷

۵

ہونا چاہیئے تھا لیکن نساخ کا کام بہت اچھا کام نہیں ہے۔ نساخ کے منظوم ترجمہ کی زبان بے شک میر فیض کی زبان سے زیادہ آسان، عام فہم اور رواں ہے۔ لیکن سادگی کے اعتبار سے میر فیض کا ترجمہ اصل سے زیادہ قریب اور جاندار نظر آتا ہے نساخ کے یہاں شعریت اور شیرینیت زیادہ ہے۔ بس اس سے زیادہ کچھ فرق نہیں ہے۔

میر فیض کے قائم کردہ عنوانات زیادہ برمحل اور مناسب ہیں اور آسان بھی۔ فیض نے چار چیزوں کی بدبختی کے بیان میں جو نظم لکھی ہے وہ آسان کے علاوہ عام فہم بھی ہے۔ ؎

بیان میں چار چیزوں کی بدبختی کے

چار چیز آثار بدبختی کے ہیں	جاہلی اور کاہلی سختی کے ہیں
بے کسی دنا کسی یہ چار ہیں[1]	بخت بد کے چار و یہ آثار ہیں
چھوڑ پہلے کامرانی کا مزا	دیکھ لے تب زندگانی کا مزا[2]

نساخ نے اس کا عنوان 'دلائل شقاوت' قائم کیا ہے جو میر فیض کے عنوان سے ثقیل اور مشکل ہے۔ حیرت ہے کہ نساخ نے پندنامہ عطار کے اس پہلے ترجمے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اور نہ ہی فیض کا حال لکھا۔ جبکہ نساخ نے اپنے تذکرے میں فیض تخلص کے بہت سے کم سواد اور غیر معروف شاعروں کا بھی حال لکھا ہے۔

مثنوی چشمۂ فیض، بیان میں عقل کے اور غافل ہونے یاد حق سے کے عنوان

---

[1] نساخ نے اپنی نظم میں یہی مصرعہ نقل کر دیا ہے [2] دیکھیے چشمۂ فیض قلمی نسخہ معین الدین فیض ص۲۲

پر ختم ہوتی ہے ؎

عقل کا رکھتا ہے گر کچھ دل میں نور	آنکھ رکھ چاران چیزوں سے دور
کام نالائق سے اپنا تو نہ چاہ	کام آ تو بھی نہ اس کے ایچ گاہ
تو بلا اور ڈر سے پاوے گا نجات	حرص دنیا کا جو دیگا چھوڑ سات
یادِ حق سے بھائی تو غافل نہ رہ	چھوڑ حق کو پئے باطل نہ رہ
جائے گریہ ہے جہاں اسیر نہ ہنس	چشم عبرت کھولدے اور ہو بیکس

کار بد کر عفو اس بد کار کے	واسطے حضرت فرید عطار کے
ہے یہ جو عاصی معین الدین فیض	اسکے نام پر ہو آمرزش کا فیض
بعد ازان از حرمت خیر الانام	ختم کر ایمان پر ختم کلام[1]

میر فیض کی یہ مثنوی ۱۸۰۳ء میں پایۂ تکمیل کو پہونچی تھی۔ انھوں نے خود لکھا ہے، "سنہ ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں جان گل کرسٹ کے حکم سے فرید الدین عطار کے پند نامہ کا ترجمہ کیا اور چشمۂ فیض نام رکھا ؎

بہ فیض خدا اور رسول انام	ہوا ہے یہ دیباچہ بھی اب ختم
الٰہی اسے پائیداری رہے	سدا چشمۂ فیض جاری رہے

میر فیض کے چشمۂ فیض کا خطی نسخہ ۵×۷ سائز اور صرف ۲۷ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ نسخہ خوبصورت نستعلیق میں ہے جو میر فیض کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں غلطیاں نہیں ہیں۔ انکی وفات کب ہوئی اور کہاں اسکی نقاب الٹ نہ سکی۔

---

[1] دیکھیے چشمۂ فیض قلمی نسخہ معین الدین فیض ص ۲۷۔

نہال چند لاہوری

نہال چند لاہوری نے فورٹ ولیم کالج کے دورانِ ملازمت میں صرف ایک کتاب تالیف کی اور یہی کتاب ان کی شہرت کا موجب بنی۔ ان کی یہ تالیف مذہبِ عشق اصل میں عزت اللہ بنگالی کی فارسی تصنیف قصہ گل بکاولی کا ترجمہ ہے۔ اس رومانی اور طلسمی داستان کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ متعدد شاعروں نے اسے منظوم کیا۔ لیکن سب سے زیادہ مشہور اور مقبول پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزارِ نسیم یعنی قصہ گل بکاؤلی ہوئی جو اس وقت بھی میر حسن کی غیر فانی مثنوی سحر البیان کے بعد اردو ادب میں عظیم ترین مثنوی شمار ہوتی ہے۔

نہال چند لاہوری کے نام سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ لاہور ان کا وطن تھا لیکن اصل میں ان کا مولد شاہ جہان آباد (دلی) تھا۔ نہال چند نے اس پر فخر بھی کیا ہے۔ اور بجا طور پر۔ مذہب عشق کے دیباچے میں اس عہد کے دیگر منشیوں کی طرح انھوں نے بھی عزت اللہ بنگالی کے فارسی قصہ گل بکاؤلی کے ترجمے کا سبب بیان کیا ہے۔

”اس کتاب کے ترجمہ کا سبب یہ ہے کہ مستمند نہال چند لاہوری کو کہ اس نحیف کا مولد شاہ جہان آباد ہے۔ آب وخور کھینچ کر بیچ شہر اشرف البلاد کلکتے کے جو اس وقت دار السلطنت ہندوستان کا ہے لا ڈالا۔ اور یہ خاکسار

ڈیوڈ روبرٹ سن (DAVID ROBERTSON) بہادر کی خدمت میں سابق سے بندگی رکھتا تھا۔ انھیں کی دست گیری سے صاحب خداوندِ نعمت حاتمِ زماں دست گیرِ درماندگاں، منبع جود و عطا، چشمۂ فیض و سخا، دریائے عنایت و کرامت بحرِ احسان و شجاعت، جناب گل کرسٹ صاحب بہادر مدظلہ العالی تعالیٰ کے دامن تک رسائی ہوئی۔ ابیات

ثنا میں اوس کے بجا ہے اگر صغیر و کبیر — ہزار صفحۂ کاغذ سیاہ کریں تحریر
وہی ہے باغِ فصاحت نخل عالم میں — گلِ سخن سے اوسی کے شگفتہ دل ہے زہیر
وہی ہے گوہرِ سخا و کانِ عطا — نہیں ہے اوس کا جہاں میں کوئی عدیل و نظیر
چراغِ عقل ہے شمعِ مراد روشن کی — وہ رات کو مہِ انور ہے دن کو مہرِ منیر
بجا ہے قامتِ موزوں پہ خلعتِ اخلاق — خدا نے اپنی عنایت سے اوس کو دی توقیر
ہر اک خدمتِ عالی سے فیض پاتا ہے — گواہ دل سے ہے اس بات پر امیر و فقیر

غرض صاحب بہادر کے تفضلات سے اس ضعیف کی اوقات بسر ہونے لگی اور آگے کو بھی امید بندھی کہ اگر یہ دامنِ دولت اپنے ہاتھ میں ہے تو انشاء اللہ تعالیٰ ایک نہ ایک دن بیڑا پار ہو جائے گا۔ پھر ایک روز خداوندِ نعمت نے ارشاد کیا کہ قصۂ تاج الملوک اور بکاؤلی کا فارسی سے ہندی ریختے کے محاورے میں تالیف کر کر باعث سرخروئی اور یادگاری تیری کا ہو۔ اور موجب خوشنودی ہماری کا۔ چنانچہ اس نحیف نے بموجب ارشاد فیض بنیاد کے اپنے حوصلے کے موافق صاحب فلاطون فطنت، والا شکوہ، عالی حشمت فلک اشتباہ، مارکوئس ولزلی، نواب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کے عہد میں،

ہندی میں تالیف کیا اور نام اس کا مذہب عشق رکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مذہب عشق میں محیر العقول واقعات، تاج الملوک اور شہزادی گل بکاؤلی کے معاشقے کی رنگین و سنگین داستان دلچسپ پیرائے میں بیان ہوئی ہے ہذا یہ مقبول انام ہوئی، اور یہ رومانی طلسمی کہانی بار بار نثر اور نظم میں دہرائی گئی۔ فرانسیسی، جرمن، انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی اس بے مثال قصے کے تراجم شائع ہوئے اور مقبول بھی۔ اور اردو میں اس کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس قصہ کی بنیاد پر ان گنت مثنویاں تصنیف ہوئیں۔ مگر ہمہ گیر مقبولیت کے باوجود سخت جستجو، تلاش اور تحقیق کے بعد بھی اس کی اصل پر اختلاف رائے باقی ہے۔

اردو کے ایک مشہور شاعر اصغر گونڈوی نے اسے ہندوستانی الاصل قرار دیا ہے مگر یہ خیال محل نظر معلوم ہوتا ہے کہ یہ خالص ہندوستانی قصہ ہے گل بکاؤلی کے تمام قصے کو پڑھئے۔ اس کے ہر کردار کا مافوق العادت کردار سمیت تجزیہ کیجئے تو یہ ہندوستانی نظر آئیں گے۔ واقعات بھی دوسری داستانوں سے ملتے جلتے ہیں۔ ان میں معمولی فرق ہے۔ اس عہد کی ہر داستان میں الف لیلوی کردار نمایاں ہے۔ ہر داستان میں پورب دیش کا بادشاہ ہوتا ہے۔ قصہ رضوان شاہ، آرائش محفل اور چار گلشن کے ہر قصے میں ایسا ہی حکمراں نظر آئے گا۔ اس کی شان و شوکت ایسی ہو گی جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملے گی۔ مگر تمام داستانوں میں ہندوستانی فضا، ایرانی تہذیب اور غیر ملکی اور مافوق الفطرت کردار، دیو، پری، جن، بھوت، پہلوان بدلے ہوئے پینترون

کے ساتھ متحرک نظر آئیں گے۔ مذہب عشق بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

مذہب عشق کا لب لباب یہ ہے کہ پورب دیش کا ایک بادشاہ زین الملوک تھا۔ اس کے چار حسین وجمیل اور شہ زور بیٹے تھے۔ خدا نے اسے پانچواں بیٹا دیا۔ جو حسن وجمال میں فرد تھا۔ مگر ستارہ شناسوں نے اس کی کنڈلی دیکھ کر بادشاہ کو یہ بتایا کہ جس دن بادشاہ کی نظر تاج الملوک پر پڑے گی اسی دن بادشاہ کی بصیرت جاتی رہے گی۔ تمام انسانی مساعی کے باوجود ہونی ہو کر رہی۔ زین الملوک کی بینائی چھن گئی۔ جو صرف بکاؤلی کے پھول سے ہی واپس مل سکتی تھی۔ اور گل بکاؤلی کو پانا جوئے شیر لانے سے کم مشکل نہیں تھا۔ مگر ہر افسانوی ہیرو کی طرح تاج الملوک دنیا بھر کی صعوبتوں کا مقابلہ کر کے بیسوا دبرکو چوسر میں مات دے کر اپنی منزل تک پہونچتا ہے اور بکاؤلی کا سیاہ پھول شہزادی کے باغ سے اڑا لیتا ہے۔ مگر راستے میں اس کے چار بھائی دھوکا اور فریب سے پھول چھین لیتے ہیں۔ پھول سے بادشاہ کی بینائی لوٹ آتی ہے۔

دوسری طرف شہزادی بکاؤلی اپنے محبوب پھول کے غائب ہونے سے ملول اور مضطرب ہو جاتی ہے۔ اس کو قیافہ سے پتہ چلتا ہے کہ پھول کا چور تاج الملوک ہے۔ اس کے حسن اور شجاعت پر وہ مرمٹتی ہے۔ اس کو پالیتی ہے۔ اور گلزار ارم میں عیش وعشرت سے دن گذارنے لگتے ہیں۔ شہزادی بکاؤلی کی ماں کو اس کی رنگ رلیوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ وہ گل کو قید کر دیتی ہے اور تاج الملوک کو طلسمی جنگل میں پھنکوا دیتی ہے۔ تاج الملوک ایک سچے عاشق جانباز اور نڈر سپاہی کی طرح تمام طلسمی کرداروں اور آفتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ آخر میں

فتح اس کو نصیب ہوتی ہے اور طلسمی جنگل سے رہائی ملتی ہے اور بکاؤلی سے اس کی شادی ہو جاتی ہے ۔ اور دونوں گلشن نگار میں دن رات خوشیوں کے سمندر میں غرق رہتے ہیں ۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہانی ختم ہو گئی ۔ ایک عجیب ٹھہراؤ کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے ۔ لیکن داستان گو ایک نئی داستان کی تخلیق کرتا ہے ۔ گل بکاؤلی اس میں راجہ اندر کے دربار کی پری ہوتی ہے ۔ ہر رات وہ تاج الملوک کو خواب گاہ میں تنہا چھوڑ کر اندر لوک جاتی ہے ۔ اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہے اور تاج الملوک کے بیدار ہونے سے پہلے ہی لوٹ آتی ہے ۔ تاج الملوک کو اس کا پتا چل جاتا ہے ۔ (گل وصنوبر میں یہی قصہ دوسرے انداز سے بیان ہوا ہے)

وہ گل بکاؤلی کے تخت سے لگ کر اندر لوک پہونچ جاتا ہے ۔ راجہ اندر بکاؤلی کے ہوشربا رقص سے خوش ہو جاتا ہے ۔ انعام کا وعدہ کرتا ہے ۔ انعام میں بکاؤلی تاج الملوک کو مانگتی ہے ۔ راجہ اندر غضبناک ہو جاتا ہے ۔ گل بکاؤلی کو نصف پتھر بنا کر مٹھ میں قید کر دیتا ہے ۔

کچھ عرصہ کے بعد تاج الملوک کا عشق راجہ چترسین کی بیٹی چتراوت سے شروع ہوتا ہے ۔ چتراوت تاج الملوک کو دل وجان سے چاہتی ہے ۔ اس کے لئے تاج وتخت سب کچھ تیاگ دینے کو تیار رہتی ہے ۔ لیکن مٹھ میں گل بکاؤلی کے سامنے تاج الملوک کا نالہ وگریہ اور بے باکانہ عشق چتراوت کے دل میں حسد اور نفرت کے شعلے بھڑکا دیتا ہے ۔ عورتوں کا جلاپا مشہور ہے ۔ چتراوت بھی اپنے سوکن کو مٹھ سے کھدوا کر چوپس کر دیتی ہے ۔ اسی جگہ سرسوں پیدا ہوتی

ہے۔ ایک کسان کی بیوی کو اس تیل سے حمل قرار پاتا ہے۔ کسان کے ہاں بکاؤلی کو نیا جنم ملتا ہے اور جوان ہو کر وہ تاج الملوک کو پھر مل جاتی ہے۔"

گل بکاؤلی کا ظاہر میں سیدھا سادھا اور سپاٹ معلوم ہوتا ہے لیکن ہر ہر قدم پر طلسمی ماحول، عجیب و غریب کردار، لرزہ خیز واقعات اور عشق و محبت کی رنگینی قاری کی آنکھوں میں سماں باندھ دیتی ہے۔ اور وہ اس میں کھو جاتا ہے۔ اس قصے کی بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے اس کے ماخذ کے متعلق کئی روایات گھڑلی گئی ہیں۔ اور اس کا تعلق ایک ایسے پھول سے بتایا جاتا ہے کہ جو کبھی ہندوستان میں آشوب چشم وغیرہ امراض کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

اکثر محققین نے اس کی اصلیت پر پڑے ہوئے نقاب کو الٹنے کی کوشش کی اور اکثر نقادوں کی تان اسی پر ٹوٹتی ہے کہ یہ ایک ہندوستانی الاصل قصہ ہے ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں یہ قصہ مختلف رنگ اور روپ میں رائج ہو۔ لیکن مذہب عشق کے مصنف عزت اللہ بنگالی نے اپنے محبوب اور عزیز دوست نذر محمد کے غم میں یہ قصہ تصنیف کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ اس کے ذہن کی اپج ہے اور مختلف داستانوں، جیسے داستان امیر حمزہ، ہتوپدیش، گل و صنوبر اور حاتم طائی وغیرہ سے اس نے اس کا پلاٹ تیار کیا ہو۔ اور اس عہد کے مروجہ کرداروں کی مدد سے اپنی یہ بے مثل داستان کی عمارت بنائی ہو۔ کیونکہ گل بکاؤلی میں کوئی نیا پن یا چونکا دینے والی بات نہیں ہے۔ اس کی ہمہ گیر مقبولیت کی بنا پر نہال چند لاہوری نے کالج کے لئے اس کا ترجمہ کیا تھا۔

نہال چند کی مذہب عشق دلچسپ یقینی ہے لیکن انداز بیان شگفتہ

نہیں ہے۔ عنوانات بھی فارسی کے طرز پر قائم کئے گئے ہیں۔ نہال چند کی اس کتاب میں یقیناً وہ زور اور جان نہیں ہے جو پنڈت دیا شنکر کی گلزار نسیم میں ہے۔ یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ ہندوستانی الاصل قصہ ہے تو بھی عزت اللہ بنگالی کی تصنیف اور نہال چند کے ترجمے میں غیر ملکی فضا او رکردار نمایاں ہیں۔ لہٰذا یہ سو فی صد ہندوستانی قصہ نہیں ہو سکتا ہے۔ نہال چند نے مذہب عشق میں ترجمے کی روح برقرار رکھی ہے۔ اور پنڈت دیا شنکر کی طرح لکھنوی ماحول سماجی زندگی اور تہذیب کی تصویر کھینچنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

مذہب عشق میں ۲۶ قصے ہیں۔ تاج الملوک بکاؤلی اور حمیرادت کو لیکر جب محل میں آتا ہے تو دلبر اور محمودہ استقبال کرتی ہیں۔ وزیر زادہ بہرام بھی ہوتا ہے جو روح افزا پری پر عاشق ہوجاتا ہے۔ دونوں کے عشق کی داستان ۲۵ ویں باب شروع ہوتی ہے۔ اس کا اصل قصہ سے گہرا تعلق نہیں ہے بلکہ ذیلی داستان ہے۔ جو بہرام اور روح افزا کی شادی پر ختم ہوتی ہے۔

مذہب عشق ۲۶ ویں داستان پر ہی ختم ہوتی ہے لیکن اس کتاب میں گلزار نسیم کی طرح دیو کو حلوہ سوہن سے رام نہیں کیا جاتا بلکہ پری کو سمجھانے کے لئے پری آتی ہے۔ اور جب بہرام کو جلتے ہوئے شعلوں میں ڈالنے کا حکم دیا جاتا ہے تو اس وقت بکاؤلی منظر عام پر آتی ہے اور اس کی سفارش پر اس کی چچی روح افزا کی شادی بہرام سے کرنے پر راضی ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح گل بکاؤلی کے قصے کا طربیہ انجام ہوتا ہے۔

مذہب عشق کی زبان شگفتہ اور سلیس نہیں ہے بلکہ نامانوس الفاظ

اور تراکیب کے استعمال سے قصہ کا زور بھی گھٹ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب عشق سے زیادہ مقبول گلزار نسیم ہے۔

قصہ گل بکاؤلی کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے بیسیوں ایڈیشن چھپے منظوم اور منثور۔ مگر گلزار نسیم اور مذہب عشق کو جو مقبولیت ہوئی وہ اور کسی کتاب کو نہیں ہوئی۔ ۱۲۶۹ھ میں محمد علی داؤد ناداں نے اس قصہ کو مثنوی کے سانچہ میں ڈھالا تھا۔ اس کا تاریخی نام گل باغ بہار ہے۔ اس کے متعلق گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے۔

"مصنف نے منظوم دیباچے میں عزت اللہ بنگالی کے فارسی قصے اور منشی نہال چند لاہوری کے اردو نثری ترجمے مذہب عشق کا ذکر کیا ہے لیکن وہ گلزار نسیم سے ناواقف معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے نزدیک مذہب عشق کو پہلے پہل نظم کرتا ہے اور اس کام سے بقائے نام کی امید رکھتا ہے لیکن اس کی یہ مثنوی زبان اور شاعری کے اعتبار سے ہر طرح کے عیوب سے پُر ہے۔ اس کی دو مثنویاں اور بھی ہیں۔ نظم بہار، اور طرز عاشق و معشوق اور چار طولانی قصوں کا ایک مجموعہ نثر میں ہے جس کا نام ظہور اسمائے الٰہی کتاب کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ مصنف حیدرآباد میں پیدا ہوا اور کچھ سرنگاپٹن، ریاست آصفیہ، مچھلی پٹن اور رنگون میں قیام کر کے کلکتے پہونچا۔ اور ٹیپو سلطان کے بھتیجے نواب غلام علی کے یہاں ملازم ہو گیا۔ اس نے اپنی کتاب ظہور اسمائے الٰہی ٹیپو سلطان کے فرزند شاہزادہ محمد سلطان عرف غلام محمد بطریق نذر پیش کی۔ مذکورہ بالا چار کتابیں مصنف نے قیام کلکتے کے زمانے میں لکھیں۔ آغاز داستان

کے اشعار یہ ہیں ؎

تھا پورب کے شہروں میں ایک بادشاہ ... کہ تھا شہنشاہ گیتی پناہ
یہ کہتے ہیں زین الملوک اس کا نام ... امر سے تھا بہ مقصد تمام
جمال اس کا جیسا تھا ماہِ منیر ... شجاعت و سخاوت میں تھا بے نظیر

آخری شعر

ہوئی مثنوی اس جگہ پر تمام ... بحق محمد علیہ السلام[1]

اس کے علاوہ اردو فارسی میں کئی نسخے اس کے ہیں۔ گل باغ بہار کے قبل خواجہ آتش لکھنوی کے شاگرد پنڈت دیا شنکر نسیم نے ۱۲۵۴ھ میں اسے لکھا تھا۔ نسیم کی یہ مثنوی سحر البیان کے مقابلے میں رکھی جاتی ہے۔ نسیم نے مذہب عشق سے اس قصہ کو لیا تھا۔ پشتو زبان میں بھی اس مثنوی کا ترجمہ ہوا تھا۔ اس کا نام گلشن[2] روح ہے اور مترجم احمد ترابی ہیں۔

مذہب عشق کا انگریزی میں ترجمہ ہوگلی کالج کے پروفیسر مسٹر تامس فلپ مینول نے کیا تھا۔ مینول نے خرد افروز اور اخوان الصفا کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اور ہندوستانی شاعروں کی شاعری کے عنوان سے ایک مفید کتاب انگریزی میں لکھی ہے۔ مینول نے ۱۸۵۰ء میں گل بکاؤلی کا ترجمہ مکمل کیا تھا جو دو سال بعد کلکتے سے شائع ہوا۔ مینول نے دیباچے میں اس عہد کی داستانوں کی یک رنگی اور یکسانیت پر کوفت کا اظہار کیا ہے

---

[1] ملاحظہ ہو قصہ گل بکاؤلی از گوپی چند نارنگ (آجکل اکتوبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۳)

[2] گلشن روح کا خطی نسخہ، ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

گل بکاولی اب بھی مقبولیت کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہے چہار درویش کو اولیت حاصل ہے لیکن ان کتابوں کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ہر میں اذیت ناک یک رنگی اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ شکار، شراب نوشی، سیر گلستاں، والہانہ عشق، مایوس عشق، سازش قتل، طلسمی دنیا اور آخر میں عاشق و معشوق کا ملاپ ہر داستان میں یہی واقعات ملتے ہیں۔

مینول نے اپنے دیباچے کے بعد مذہب عشق کے مولف نہال چند لاہوری کے دیباچے کا بھی ترجمہ کر دیا ہے۔ مینول اردو کا دلدادہ تھا۔ اور اردو میں اسے دستگاہ کامل حاصل تھی۔ پروفیسر مینول نے اپنے دیباچہ میں مرزا سودا کو اردو شاعری میں چاسر (chaucer) کا درجہ دیا ہے۔ خواجہ آتش، میر تقی میر اور درد کی بڑی تعریف کی ہے۔ اُردو سے واقفیت کی وجہ سے مینول نے گل بکاولی کا عمدہ اور پیارا ترجمہ کیا ہے جو نمونتاً درج ہے۔

"IT IS RELATED THAT 'ZEENUL MOOLOOK' WAS THE KING OF THE CERTAIN CITY OF THE EAST. HIS COMPLEXION WAS FAIR AND IN GENEROSITY, JUSTICE, AND BRAVERY, HE WAS UNEQUALLED. HE HAD FOUR SONS, WHO WERE WELL TRAINED IN ALL ARTS AND SCIENCES OF THE TIME IN BRAVERY EACH WAS THE RUSTAM. OF HIS AGE. IT HAPPEND BY THE

ملہ Introduction Qisa-i-Gul-i-Bakaoli by T.P. Manuel

BLESSING OF GOD THAT A CHILD, BRIGHT AS SUN AND GLORIOUS AS THE MOON IN HER 14th NIGHT WAS BORN TO HIM."[1]

مینول کا ترجمہ گل بکاؤلی اور تاج الملوک کے بیان پر ختم نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ دو ذیلی داستانوں کا بھی اس نے ترجمہ کیا۔ گل بکاؤلی کو دہقان کے گھر سے پانے اور چتراوت کو لیکر لوٹنے کی عبارت کا ترجمہ نمونتاً درج ہے۔

"TAJOOL MOOLOOK ASCENDED THE THRONE, CHATRAVAT AND BAKAWALEE SAT ON EITHER SIDE OF THE LINE, AND NIRMALA AND CHAPLA STOOD RESPECTFULLY BEFORE THEM. THE THRONE IN A MOMENT REACHED ITS DESTINATION. IT ALIGHTED ON THE THRESHHOLD OF TAJOOL MOOLOOK'S PALACE"[2]

مینول کے علاوہ بھی گل بکاؤلی کا انگریزی ترجمہ کسی اور نے بھی کیا ہے لیکن اس کے ترجمے کی بابت معلوم نہ ہو سکا۔ مختلف زبانوں میں مذہب عشق کے ترجمے کی وجہ سے نہال چند لاہوری کو صرف ایک کتاب تالیف کر کے وہ شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی جو بہت کم ادیبوں کے حصے میں آئی ہے۔ نہال چند لاہوری کی وفات کلکتے میں ہوئی غالباً ۱۸۲۶ء میں۔"

---

1. Gool-i-Bakawali 3 Chapter
2. Ibid 34.

باسط خاں

باسط خاں فورٹ ولیم کالج کے گمنام منشیوں میں سے تھے۔ باسط خاں شاہ عالم آفتاب کے عہد میں پیدا ہوئے۔ یہ مغلوں کے زوال کا زمانہ تھا۔ صدیوں پرانی مغل تہذیب، عظیم الشان سلطنت، دبدبہ اور جاہ وجلال سب کچھ انقلاب کے طوفان میں بہتے جا رہے تھے۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ بدلیشی سوداگروں، جاٹوں اور مراہٹوں کی طاقتیں غبارے کی طرح پھولتی جا رہی تھیں۔ اور سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ ایسے تاریک اور پرآشوب زمانے میں باسط خاں نے آفتاب کی روشنی دیکھی۔ لیکن پانچ برسوں کے اندر طاقت اتنی خستہ ہوئی کہ باسط خاں کے والد مراد خاں کو ہجرت کرنے والے کارواں کے ساتھ عظیم آباد آنا پڑا۔

باسط خاں پٹھان خاندان سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے اپنی تالیف گلشن ہند میں اپنا حال، لٹتی ہوئی ویران دلی، سلطنت مغلیہ کے انحطاط و زوال اور معاشی اور سماجی زبوں حالی کے واقعات خود بیان کئے ہیں۔

"التماس اہل قلم، صاحب فضل و ہنر اہل قدر عالی منشی کی خدمت میں عرض ہے کہ فدوی باسط خاں متوطن ہندوستان تخلص باسط قدیم غلامانِ غلام بندۂ بارگاہ سلطانی ہمیشہ سے روزگار بزرگوں نے سپہ گری کا بادشاہوں کے دربار میں کیا اور حجرہ گاہ آداب وتسلیمات کی بار پاتے رہے۔ محمد شاہ

بادشاہ غفراللہ کے جہان سے اُٹھ جانے کے سبب اور غفلت کی نیند لینے کے باعث ایک عالم نے تباہی دیکھی کہ بیان کروں اور چراغ لے اپنی کاوش کے ساتھ خدائیکو وہاں کی ایسی نیلی پیلی آنکھیں دکھائیں کہ کسی کے پنپنے کا تو کیا مذکور، اکسانے کی نوبت نہیں رہی۔ پھر تو ایسی عجیب گردی ہوئی جدھر جس کا سینگھ (سینگ) سمایا اودھر کی راہ لی، کوئی کدھرو (کدھر) گیا اور کوئی کسی طرف۔ عہد میں شاہ عالم بادشاہ کے کہ جن کا تخلص آفتاب ہے، جب اس فدوی کی پیدائش ہوئی اور پانچ برس کا سن ہوا تب ہمراہ لیکر اس خاکسار کے والد مراد خاں نے گردوں دون کی گردش کے ساتھ شاہ جہان آباد کی وہ سرزمین چھوڑی کہ جہاں مٹی چھوتے سونا ہوتا تھا اور سونا چھوتے جواہر۔[1]

باسط خاں نے اس کے بعد شاہ جہان آباد دلی، مغل شہنشاہوں کی تعریف کے پل باندھے ہیں۔ دلی کی خوبصورت، دلکش اور خوشنما تصویر کھینچی ہے کہ مغلوں کی پرشکوہ اور عظیم دلی کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ دلی کی تعریف کے ساتھ اردو کے سب سے بڑے قصیدہ گو مرزا رفیع الدین سودا کی شاعرانہ عظمت کے گیت گانے لگتے ہیں۔ وہ سودا کے تلمیذ تھے انہوں نے شاگردی کا حق ادا کر دیا ہے۔ سودا کی ان کی نظر میں وہی حیثیت تھی جو سعدی شیرازی، فردوسی اور انوری کی فارسی شاعری میں ہے۔

گلشن ہند باسط خاں کی تنہا تصنیف ہے جس میں چھوٹی چھوٹی حکایات، ذیلی داستانیں اور گل وصنوبر کی کہانی درج ہے۔ باسط خاں کی

---

[1] ملاحظہ ہو مخطوطہ گلشن ہند ورق ۱-۲

طرزِ تحریر صاف اور دلپذیر نہیں ہے۔ عبارت میں ادبی شان اور رنگینی و چاشنی کا فقدان ہے۔ مگر گلشنِ ہند کے دیباچے میں اس نے آمادہ زوال سلطنت مغلیہ اور دلی کی تاخت و تاراج کی جو جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا احساس اور باشعور شخص تھا۔ تباہ حال دلی کو خیرباد کہہ کر اس کے آباد اجداد عظیم آباد آئے تھے۔ یہاں کی پرامن فضا میں باسط خاں کو بھی طمانیت نصیب ہوئی تھی۔ درانیوں، ابدالیوں اور مرہٹوں کی یلغار اور لوٹ مار سے عظیم آباد متاثر نہیں ہوا تھا۔ عظیم آباد میں باسط خاں کی تقدیر نے بھی یاوری کی۔ اور مہاراج کلیان سنگھ بہادر خیر خواہ کمپنی بہادر کے صاحبزادے کے ساتھ ہم مکتب اور ہم نشیں ہونے کے باعث ہندوستان کے مانے ہوئے مشاہیر اور علماء کی صحبت انھیں نصیب رہی۔ وہ خود لکھتے ہیں۔

"جب ہوش سنبھالا تو چندے نواب مبارک الدولہ مرحوم فیروز جنگ صوبہ بنگ اور چند دنوں نواب دلاور جنگ کی حضور میں مصاحب رہا۔ کمترین نے ایک مدت صاحب فضل و ہنر کے بوستان کی سیر کی۔ ان کے گلستاں کی خوشبو سے دماغ کو اور گل سے دامن کو بھرا۔ تب گل چینوں کے شمار میں آکر زبدہ نوئنان مشیر خاص شاہ کیوان، بارگاہ انگلستان مارکوئیس ولزلی۔ لارڈ گورنر جنرل مارنگ تن (ولزلی) بہادر کے دام اقبالہ کے عہد میں۔۔۔۔۔"

یہاں عبارت اچانک ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد گورنر جنرل

مارکوئیس ولزلی، اور مسٹر جان گل کرسٹ کے قصیدے لکھ مارے ہیں یہ قصیدے تین چار صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں لیکن سودا کے شاگرد ہونے کے باوجود ان کے قصائد بے روح ہیں اور پھس پھسے قصیدوں کے خاتمہ پر ٹوٹی ہوئی عبارت کی کڑی پھر ملتی ہے۔

بموجب حکم مسٹر جان گل کرسٹ واسطے تربیت و تعلیم صاحبان عالیشان والا دودمان دستگیر بے کسان سخن آرائی کے ساتھ قصہ گل وصنوبر اور نقلیں چند قطعہ اشعار و قصہ کہانی اپنی تصنیف اچھی اچھی دلچسپ باتیں جمع کر کے اس مجموعۂ سخن کا نام گلشن ہند رکھا[۱]"

گلشن ہند باسط خاں کی حکایتوں سے جن کو وہ اپنے ذہن کی اپج بتاتے ہیں، شروع ہوتی ہے نقلیں جب ختم ہوتی ہیں تو باسط خاں کی طبعزاد کہانی حسن ملوک کی شروع ہوتی ہے۔ کہانی مختصر ہے اور دلچسپ بھی۔ داستان سے زیادہ ایک مختصر افسانہ ہے جس میں اس عہد کی دوسری داستانوں کی طرح بہت سی بے معنی باتیں ہیں۔ وہی طلسمی باغ ہے، مافوق العادت کردار، محیر العقول واقعات اور کارنامے ہیں، دیو جن سے انسان کی جنگ، دیویوں اور جنوں کی شکست، شراب دوآتشہ، خوبصورت دلربا اور انجام طربیہ ہے یعنی شہزادہ اپنی شجاعت اور اپنے دوست وزیرزادے کی ذکاوت و ذہانت کی مدد سے شہزادی حسن الملوک کو حاصل کر لیتا ہے۔

قصہ میں کوئی نئی بات نہیں ہے نہ ہی اس عہد کے سماجی حالات کی کوئی واضح تصویر

---

[۱] دیکھیے خطی نسخہ (ایشیاٹک سوسائٹی) ورق ۶ - ۸

ابھرتی ہے، باسط خاں نے بھی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو محسوس کیا نہ اجاگر کیا، بلکہ دوسرے داستان گویوں کی طرح ہوائی قلعے تعمیر کرتے رہے بس ایک خیالی جنت انھوں نے بنائی ہے۔ انیسویں صدی کی بہت کم داستانیں ہیں جو بدلتی ہوئی تہذیب محکومی اور غلامی کی سل تلے کراہتی ہوئی زندگی کی عکاسی کرتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بٹے پٹائے کردار کی وجہ سے اس عہد کی داستانوں میں اذیت ناک حد تک یکسانیت انسانی ذہن کو تھکا دیتی ہے۔

گلشن ہند ۱۸۰۳ء میں مکمل ہوئی تھی، لیکن اسکے شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ صرف گل وصنوبر کا قصہ متعدد بار شائع ہوا۔ لیکن ان میں باسط خاں کا کوئی ذکر نہیں۔ گل وصنوبر کی تالیف کے متعلق باسط خاں نے تتمہ پر لکھا ہے

عید کے مہینے میں قصہ گل وصنوبر کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔ ربیع الثانی کے مہینے میں پانچویں تاریخ روز دوشنبہ ۱۸۰۳ء میں تمام کیا۔ گلشن ہند اس ترجمہ کا نام رکھا تاریخ اس کتاب کی دو نکالی۔ ایک تو ہجری ہے

خلد بریں بروئے زمیں

۱۲۱۷ ہجری

گلشنِ ہند میں چھوٹی چھوٹی حکایتوں سے شروع ہوتی ہے۔ پہلی حکایت ہے۔

" دیارِ ہند میں راجہ جے سنگھ بہت بڑا شخص ہو گذرا۔ چھ برس کی عمر کا ایک لڑکا چھوڑ کر جب مر گیا تب بادشاہ نے ان کے مال واموال کی ضبطی کی اور حکم دیا کہ لڑکے کی تعلیم کرو۔ اچھا ہو گا تب اس کے نام پر بحال ہو گا۔ لڑکے کا نام بھی جے سنگھ تھا۔ اس لڑکے نے ضبطی کی خبر سنی تو بادشاہ کو عرض کی اور اس میں یہ مضمون درج کیا کہ

غلام نالائق نہیں جو گھر بار ضبط ہو اور تعلیم کا حکم ہو۔ عرض کو سنتے ہی بادشاہ نے اشتیاق سے اس کو طلب کیا۔ جس وقت سامنے آیا باوجود اس کے کہ لڑکا تھا مگر ہرگز رعب بادشاہی کو خیال میں نہ لایا۔ بادشاہ نے اس کے ڈھیٹ پن کو دیکھ کر کہا کہ (کہ) آ گے آ۔ جب پاس آیا تب دونوں ہاتھ پکڑ کر زمین سے دو ہاتھ بھر اونچا کیا۔ اور کہا کہ کیوں تجھکو زمین پر ٹپک نہ دوں۔ عرض کی جہاں پناہ جس کو خاک سے اٹھاتے ہیں اس کو پھر خاک میں نہیں ملاتے ہیں، اور کوئی انگلی پکڑ کر نباہ کرتا ہے، آپ نے ہاتھ پکڑا ہے۔ آپ ہی کے ہاتھ پناہ ہیں۔ یہ بات سنتے ہی بادشاہ نے فوراً ضبطی بحال کی، جے سنگھ رائے کا خطاب دیا اور مثل کہی کہ ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات[1]"

گلشنِ ہند کی دوسری نقل نصیحت آموز اور معلومات افزا ہے اور ہر نقل کے دامن میں پند و نصائح کے آبدار موتی چھپے ہوئے ہیں۔

"عالمگیر بادشاہ نے ایک عمدہ اور قابل شخص کو برطرف کیا۔ نوکری کے جانے سے اس کے جی پر از بسکہ دقت گذری، مایوسی کے ساتھ بادشاہ کو عرضی بھیجی۔ اس میں یہ شعر درج کیا ؎

زشرم آب شدم آب راشکستی نیست
بہ حیرت ام کہ مرا روزگار چوں بشکست

بادشاہ سے جب اس شعر کا جواب نہ ہو سکا تب اپنی بیٹی زیب النساء کے پاس جا کر کہا کہ اگر تم سے اس کا جواب ہو سکے تو لکھو۔ اس کے سوال پر زیب النساء نے

---

[1] دیکھئے گلشن ہند خطی نسخہ ورق ۱۲

یہ جواب لکھا، چہ مشکل است یخ بستہ شکست، یخ ہم بجائے آب می شود و بستہ بود شکستہ شد، جس وقت اس سوال والے نے اپنے سوال کا جواب پایا اس وقت اپنا منہ لیکر رہ گیا..... اور جی میں یوں تصور کیا کہ جب ایسا شخص نیش زن ہو پھر دفتر شاہی میں اپنے نام کے داخل ہونے کی کون سی صورت اور جب بادشاہی روزگار گیا تو حرمت گئی۔ جو حرمت گئی تو ایسے جینے سے مرنا بہتر۔ ان باتوں کو جی میں سوچ کر زندگی سے بیزار ہو ہی رہا تھا۔ اپنی جان سے ہاتھ دھو کر زیب النساء کو ایک عرضی لکھی اس میں یہ شعر لکھا ؎

در شکل و شمائل کس دگندم چو یکست
آن رہ زن آدم شد این رہ زنِ من

جس وقت بادشاہ زادی کے پاس اس کی عرضی گذری سب کو یقین تھا کہ اس کو قتل کریگی۔ پر ہرگز اس کو کچھ نہ کہا بلکہ اور بلا کر سرفراز کیا۔ قدرداں اور منصف کی بلا دور[1]"

گلشن ہند میں پندرہ سولہ نقلیں ہیں اور حسن ملوک کے افسانے کے بعد بیس صفحات پر خطی نسخہ میں یہ نقلیں پھیلی ہوئی ہیں اور ان کے بعد گل وصنوبر کی مشہور ومعروف داستان شروع ہوتی ہے۔ گل وصنوبر کے اس خطی نسخہ اور نول کشور پریس کے مطبوعہ نسخے میں فرق ہے۔ نول کشور کے مطبوعہ نسخے میں بہت سی باتیں نکال دی گئی ہیں۔ اور زیب داستان کیلئے افسانے بھی کہے گئے ہیں بیاسط خاں کی گل وصنوبر شروع ہوتی ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو گلشن ہند خطی نسخہ ص ۱۹ تا ۵۲ ایضاً ص ۲

"لعل و پوش ایک بادشاہ تھا کہ لشکر و خزانہ بے شمار رکھتا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ بڑے کا نام مئے نوش تھا۔ منجھلے کا نام مدہوش تھا اور چھوٹے کا نام باہوش تھا۔ ...... الخ"[1]

لعل پوش کے تینوں بیٹوں کے شہزادی مہرافروز کے معاشقے کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ قصہ حاتم طائی کی حسن بانو کی طرح شہزادی مہرافروز کی بھی شادی کی ایک شرط ہوتی ہے۔ شرط یہ تھی کہ جو شخص شہزادی کے اس سوال کا کہ "گل باصنوبر چہ کرد" کا جواب دے گا شہزادی مہرافروز اس سے ہی شادی رچائے گی۔ یہ ایک ایسا ٹیڑھا سوال تھا جس کا جواب محال تھا۔ اس لئے گل وصنوبر کی (کے) خالق نے شہزادوں کے نام بھی ماحول، کردار اور مقام کی مناسبت سے رکھا ہے۔ مے نوش مے نوشی میں ڈوب گیا۔ مدہوش، مدہوشی میں غرق، دونوں جواب نہیں دے پاتے ہیں۔ اور موت کی شراب ان کی زندگی کی تلخیوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتی ہے لیکن شہزادہ، باہوش، ہوشمندی، دانائی اور شعور کے لشکروں کے ساتھ ہولناک مصائب، لرزہ خیز آفات اور برائی کے زبردست لشکر کا مقابلہ کرتا ہے۔ انھیں زیر کرتا ہے۔ طلسمی دنیا، جادوگر، دیو پری اور مافوق الفطرت کرداروں کو شکست دے کر اور سنہرے بال کی مدد سے شاہ گل سے جواب معلوم کر کے کامران و کامگار لوٹتا ہے۔ مہرافروز کے سوال کا جواب دیتا ہے، گل کی ملکہ صنوبر، شہر سے دور حبشیوں کی بستی کے چند حبشیوں سے ناجائز تعلقات پیدا کر لیتی ہے۔ ان کے لئے گل کو فریب دیتی ہے۔ اور پھر شاہ گل اپنے وفادار کتے

---

[1] ملاحظہ ہو گلشن ہند خطی نسخہ صنہ۲

کی مدد سے حبشیوں کو ہلاک کرتا ہے۔ بستی چور بن کر دی جاتی ہے۔ صنوبر خواجہ سگ پرست کے بھائیوں کی طرح پنجڑے میں قید کر دی جاتی ہے۔ کتے کا جھوٹا کھاتی ہے۔ ان ہی حبشیوں میں سے ایک حبشی جان بچا کر فرار ہو کر، مہر افروز کا غلام ہوتا ہے۔ اور مہر افروز بھی اس کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کر لیتی ہے۔ شہزادہ باہوش مہر افروز کی بدکاریوں پر سے نقاب الٹتا ہے۔ مہر افروز شرط ہار جاتی ہے۔ اس کا آشنا حبشی قتل کیا جاتا ہے اور مہر افروز کو بھی عبرتناک سزا ملتی ہے۔ باسط خاں کی گل وصنوبر اسی انجام پر ختم ہوتی ہے۔

"اس حبشی کو قتل کیا۔ شہزادوں کے سر دفن کر کے مہر افروز سر کے بالوں کو گھوڑے باندھ کر لٹکائے ہوئے اپنے شہر کو چلا۔ اور اپنے شہر میں داخل ہوا جب اپنے باپ کی خدمت میں گیا تو مہر افروز کو سامنے کھڑا کر کے عرض کی، اے قبلہ وکعبہ اسی نے میرے دو بھائیوں کو قتل کیا۔ یہ تقصیروار ہے۔ اب جو مرضی حضور کی، وہ بجا لاؤں۔ غرض جو حالت گل نے صنوبر کی کی تھی سو وہی حالت باہوش نے مہر افروز کی کی[1]"

باسط خاں کی گل وصنوبر بھی کوئی نئی کہانی نہیں ہے۔ وہی لٹے پٹے کردار، طلسمی دنیا، حیرت انگیز خیالی کارنامے اور فتح و شکست ملتی ہے۔ اس میں زندگی کی حقیقی تصویر نہیں ملتی اور نہ ہی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے خاکے نظر آتے ہیں اسمیں بھی صرف تفریح اور دلبستگی کے سامان موجود ہیں اور محیر العقول واقعات کی بنا پر اپنے عہد میں یہ بھی دوسری داستانوں کی طرح مقبول انام ہوئی۔"

---

[1] گلشن ہند ق ن ص ۱۳۲

مولوی امانت اللہ شیدا

شعبۂ ہندوستانی کے پروفیسر جان گل کرسٹ کی خاص عنایت مولوی امانت اللہ پر تھی۔ ان کے تبحر علمی سے تمام منشی مرعوب تھے۔ اور گل کرسٹ کو انھوں نے اس قدر متاثر کیا تھا کہ قرآن پاک کا ترجمہ سب سے پہلے مولوی امانت اللہ کے سپرد ہوا اور پروفیسر جان گل کرسٹ کے ایما پر مولوی صاحب نے عربی اور اردو زبانوں میں ہدایت الاسلام جیسی مفید مذہبی کتاب تصنیف کی، جان گل کرسٹ نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا۔ مولوی امانت اللہ صرف ایک جید عالم اور ادیب ہی نہیں تھے بلکہ فارسی اور اُردو کے ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ بینی نرائن جہاں نے اپنے مشہور تذکرے دیوان جہاں میں ان کا مختصر حال لکھا ہے۔ اور ان کا تخلص شیدا بتایا ہے۔ حیرت ہے کہ نساخ نے سخن شعراء میں ان کا قطعی ذکر نہیں کیا ہے، البتہ راجہ جے مترا ارمان نے اپنے مشہور تذکرے "نسخۂ دلکشا" میں ایک سطر میں شیدا کا ذکر کیا ہے۔

مولوی صاحب کا کلام نایاب ہے، اور فارسی اور اردو تذکروں میں ان کی کوئی مکمل غزل نقل نہیں کی گئی ہے۔ لہٰذا شاعری میں انکی حیثیت کی تعیین ذرا دشوار ہے۔ بلاشبہ مولوی صاحب نے صرف اردو منظوم میں اپنی شاعرانہ کیفیت کی جولانی کا مظاہرہ کیا ہے لیکن درحقیقت شاعری کا میدان ان کے لئے نہیں انکی طبیعت اس کے لئے موزوں نظر نہیں آتی ہے۔ اس میدان میں وہ اپنے ہم عصر

افسوس، لطف، جوان اور ولا سے بھی پیچھے نظر آتے ہیں۔

مولوی امانت اللہ کا خاندان بھی لٹتی ہوئی دلی سے ہجرت کر کے نئے عظیم شہر کلکتے میں آبسا تھا۔ مولوی امانت اللہ نے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تعلیم پائی تھی اور کلکتے میں تعلیم مکمل کی تھی۔ اور کلکتے میں ان کے علم کا چرچا اور ادبی شہرت ان کے لئے فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کا زینہ بنی تھی۔ مولوی امانت اللہ ۱۸۱۶ء تک کالج سے وابستہ تھے۔ تقریباً ۱۸۲۶ء میں ان کا انتقال غالباً کلکتے میں ہوا۔ مولوی صاحب نے کالج کے لئے تین مفید اور علمی کتابیں ترجمہ اور تالیف کیں۔ ان کی سب سے پہلی تصنیف ہدایت الاسلام ہے۔ جو گل کرسٹ کی خاص ہدایت پر ۱۸۰۴ء میں مولوی قدرت اللہ اور منشی شہاب الدین کی نگرانی میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد مختلف شہروں سے اس کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہوئے۔ اور عوام میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی لیکن ۱۸۰۴ء کی پہلی مطبوعہ ہدایت الاسلام اور بعد کے مطبوعہ نسخوں میں نمایاں فرق ہے۔ بعد کے مطبوعہ نسخوں میں دیباچے کو بھی شامل نہیں کیا گیا ہے۔ ۱۸۰۴ء کے مطبوعہ نسخہ کی جلد اول کی عبارت یوں تحریر ہے۔

پہلی جلد

ہدایت الاسلام

تالیف کی ہوئی مولوی امانت اللہ کی ہند کے اہل اسلام کے لئے عہد میں شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ کے اور حکومت میں بندۂ نومتان عظیم الشان مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہِ انگلستان مارکوئیس ولزلی، گورنر جنرل

بہادر دام ظلہ کی ارشاد سے خداوند نعمت جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے۔

خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے پری اور آدمی کو پیدا نہیں کیا ہے مگر اس لئے کہ میری بندگی کریں۔

سنہ ۱۸۰۴ء مطابق سنہ ۱۲۱۹ھ ہندوستانی چھاپے خانے میں چھاپی منشی شہاب الدین و قدرت اللہ کی[1]"

ہدایت الاسلام کے اس اشتہار سے پتا چلتا ہے کہ سنہ ۱۸۰۴ء کے قبل یہ کتاب ترتیب پا چکی تھی اور سنہ ۱۸۰۴ء میں چھپ کر بازار میں آگئی۔ گل کرسٹ کو صرف اردو زبان اور ادب سے ہی شغف نہ تھا بلکہ اسلامی قوانین، شریعت اور فقہ سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ گل کرسٹ کی تحریک و تجویز پر قرآن شریف انجیل اور بھگوت گیتا کے ترجمہ کا کام شروع ہوا تھا۔ ہدایت الاسلام میں مولوی امانت اللہ نے لکھا ہے۔

"مسٹر جان گل کرسٹ صاحب نے اس نارسان حال کو حضور پرنور میں، زبان فصاحت بیان سے یوں ارشاد فرمایا کہ اکثر عوام دیار ہند کے جو اشغال دنیاوی کے سبب فقہ عربی سے باز رہے اور وے خداترسی اور ایمانداری میں استوار اور اس کی بندگی میں مصروف ہیں۔ لیل و نہار ان کے لئے کچھ ایک احکام شرعی مثلاً چار کلمے، وصف ایمان اور نمازوں کی نیت وغیرہ، ضروریات کا ترجمہ ریختے کی زبان میں کیا جاوے کہ اس سے ان کے سمجھنے میں آسانی اور

---

[1] مطبوعہ نسخہ سنہ ۱۸۰۴ء

خطا اور غلطی کا بچار ہووے، تب یہ عاصی امانت اللہ اس امر کو تنبیہ الغفلت سمجھ کر ان کا حکم بجا لانے کے لئے اس نقل کو شاہد لایا[۱]"

مولوی امانت اللہ نے اس کے بعد پوری نقل ایک طالب علم کی کوڑ مغزی کی لکھی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ "اس رسالے کو اکثر مسائل ضروری کے ساتھ مختصر وقایہ و کنز الدقائق و ضرور المکلف سے انتخاب کر کے ترتیب دیا اور عبارت عربی کے نیچے اس کا ترجمہ لکھا اور نام اس کا ہدایت الاسلام رکھا[۲]"

مطبوعہ نسخہ ہدایت الاسلام نول کشور پریس میں، آغاز میں ایک مثنوی دی گئی جو ۱۸۰۴ء کے نسخہ میں نہیں ہے۔ مولوی امانت اللہ کی ہدایت الاسلام شروع ہوتی ہے۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ نہیں کوئی معبود سوائے خدا کے جس حال میں وہ ایک ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کا بندہ اور بھیجا ہوا اس کا ہے[۳]"

مطبوعہ نسخہ ۱۸۰۴ء ۲۷۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ہدایت الاسلام کی پہلی جلد پیغمبر کی اولاد کے بیان پر ختم ہوتی ہے۔ دوسری جلد غالباً مکمل نہیں ہوئی۔ اس نسخہ میں چار صفحات پر اغلاط نامے درج ہیں اور سب سے آخر میں جان گل کرسٹ نے ہدایت الاسلام پر ایک مختصر سا تعارف بہ زبان انگریزی تحریر کیا ہے۔

۱؎ ہدایت الاسلام مطبوعہ ۱۸۰۴ء ص۲ ۲؎ ایضاً ص۲-۳ ۳؎ ایضاً ص۶

صرف اردو یہ مولوی امانت اللہ شیدا کا منظوم کارنامہ ہے۔ یہ کتاب ۱۸۱۰ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ پروفیسر گل کرسٹ کی لندن کو واپسی کے بعد گورنر جنرل لارڈ منٹو کے عہد میں منظوم اردو صرف و نحو کو مولوی صاحب نے مکمل کیا تھا۔ اردو قواعد جیسے خشک مضمون کو آسان زبان میں نظم کرنا جوئے شیر لانے سے کم مشکل نہ تھا مولوی صاحب نے اپنے سرپرستوں کی خواہش کی تکمیل کے لئے ہدایت الاسلام اور اخلاق جلالی کی ترتیب کے بعد اس کام کو شروع کیا۔ یہ کتاب ۱۸۰۶ء میں مرتب ہو چکی تھی۔ مگر بعض دشواریوں کی بنا پر ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں شائع ہو سکی۔ اس مطبوعہ نسخہ کے سرورق پر درج ہے

"صرف اردو"

تصنیف کی ہوئی مولوی امانت اللہ کی واسطے فوائد کثیر طالبانِ زبانِ اُردو کے، عہد حکومت میں ...... عظیم الشان مشیر خاص حضور فیض معمور، بادشاہ کیواں بارگاہ انگلستان اشرف الامرا نواب گورنر جنرل لارڈ منٹو دام اقبالہٗ کے نوازش و عنایت سے صاحبان کالج کونسل کی، چھاپی ہوئی ہندوستانی چھاپے خانے میں ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء[لے]"

صرف اردو کے خطی اور مطبوعہ نسخوں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ دو چار الفاظ ادل بدل ہیں اور بس۔ صرف اردو منظوم خدا کی حمد سے شروع ہوتی ہے ؎

حمد میں اس کی کھولتا ہوں زباں　　جسم بے جاں کو جس نے بخشی جاں
پر زباں ہووے اگر سراپا صرف　　نہ ادا اس کا ہو سکے ایک حرف

حمد خدا کے بعد نعت پیغمبر ہے جس میں ۲۰ اشعار ہیں۔ اور اس کے دور کے دستور کے مطابق صاحبوں کے قصیدے بھی لکھے گئے ہیں جس میں وہی خوشامدانہ باتیں جو دوسرے کے یہاں ملتی ہیں۔ مولوی صاحب نے مالک ہندوستانی پریس ڈاکٹر ولیم ہنٹر کا بھی قصیدہ لکھا تھا ؎

قدردان گروہ اہلِ ہنر — صاحب خلق ڈاکٹر ہنٹر

گروہ ناظم نہ ہوتا کالج کا — نہ کبھی ہوتا بندوبست ایسا

دردو پڑھتے ہی ہووے افزوں تر — جاہ و اقبال ڈاکٹر ہنٹر

تجکو بھی چاہئے اب اے شیدا — کہ اٹھا وے دعا میں دست اپنا

فضل حق سے بر آوے اس کی اُمید — گلشن عمر میں رہے جاوید

مولوی صاحب نے صرف اردو کی تصنیف کی وجہ بھی منظوم لکھی ہے[1] ؎

گر نہ انسان کی زبان گویا — ہوتی حیوان سے فرق کب ہوتا

پر نہ ہو قاعدے پر گر جاری — ہو مشابہ بصورت حیوانی

اس لئے ہر زبان کے دانشور — رکھتے اس کی بنا ہیں قانون پر

قاعدے ہر زبان کے ہیں دو دو — صرف اور نحو کہتے ہیں جس کو

ہیں دو نوں اصول قانون کے — اور فروع ان کے ماورا جتنے

صرف ان دونوں میں سے مقدم ہے — لفظ کا مبنی جس سے محکم ہے

اپنے رتبے میں گو ہر ایک زبان — حسن ترتیب سے رکھے ہے شان

ان میں سے پر زبان اُردو کی — ہے لطافت میں صدق خوبی

---

[1] منظوم صرف اردو ص ۵ طبع

کی نظر میں نے جو تامل سے — مشتمل قاعدہ میں پایا اسے
تب سے خاطر میں بڑی تھا خلجان — طالبوں کو بتاؤں اس کا نشان
دوستوں نے مجھے یہ دی تکلیف — صرف کو نظم کروں موزوں

الغرض اب خدا کے فضل اوپر — کہ توکل میں اس پہ باندھ کمر
یہ رسالہ ہوا فضلِ حق سے تمام — صرف اُردو رکھا اس کا نام
سن تھے بارہ سی بیسٹ ایک اے یار — کہ یہ کان گہر ہوئی طیار[1]

سبب تالیف بیان کرنے کے بعد مولوی صاحب اپنی منظوم گرامر "اسم" کی تعریف سے شروع کرتے ہیں ؎

اسم کہتے ہیں اس کو اہلِ کمال — جسکے معنی میں ہووے استقلال
یعنی جب اسیر دل ہوئے دو — اس میں محتاج دوسرکا نہ ہو
اور زمانے سے بھی معرا ہے — یہ مدلول جا نو اس کا ہے[2]

اسم مفعول کی تعریف یوں بیان کی ہے ؎

اسم مفعول دوسرا ان کا — فعلِ فاعل ہے جس پہ واقع ہوا
وزن اس کا ہے وزن ماضی کا — ہے برابر ہمیشہ میں نے کہا
جیسے کہئے وہ میرا مارا ہے — بارہا کام سے بچھاڑا ہے

۱۹۱۰ء کا مطبوعہ نسخہ انھی حروف میں چھپا ہے اور صاف ہے۔ یہ ۱۰۹ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کتاب حرف تاکید کے بیان پر ختم ہوتی ہے ؎

---

[1] دیکھئے صرف اردو منظوم ص۶ [2] ایضاً ص۱۱ [3] ایضاً ص۱۴۰

کبھی کرتا ہے حرف کی تکرار　　　یاد رکھیو اسے بھی تو دلدار
ایک ہی جنس یا کہ دو میں سے　　　حرف لاویں مکرر پیارے
شام سے لے کرتا سحر جیسے　　　محفل رقص میں تھے ہم بیٹھے
یا کہ گھر میں سے جب میں نکلا　　　دو قدم جاتے گھوڑے پر سے گرا
یا کہیں اسکے تئیں کو مارا کیوں　　　لا مکرر اگر تو چاہے یوں[۱]

صرف اردو منظوم اسی پر ختم ہوتی ہے۔ مبتدیوں کے لئے بڑی دلچسپ اور مفید کتاب ہے اور آخری صفحوں میں فہرست دی گئی ہے۔

اخلاق جلالی کالج کی ملازمت کے دوران میں سب سے بڑا کارنامہ اخلاق جلالی کا ترجمہ ہے۔ یہ عربی کے منفرد انشا پرداز اور جید عالم مولانا جلال الدین محقق دوانی کی معرکۃ الآرا تصنیف "لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق" کا ترجمہ اور تلخیص ہے۔ مولوی امانت اللہ نے کپتان جیمس مویٹ کی ہدایت پر اتنی دقیق اور مشکل کتاب کا ترجمہ کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اور چار و ناچار ملازمت کی خاطر اسے مکمل کیا۔ مولوی صاحب نے بڑی ایمانداری سے بے کم و کاست ترجمہ کے سلسلہ میں اپنی ذہنی پریشانی اور ہچکچاہٹ کا ذکر دیباچے میں کیا ہے

"—— شیخ امانت اللہ مترجم تفریق ہندی مدرسہ کا ہے۔ جب اس بندہ نے نسخہ ہدایت الاسلام سے فراغت کی اور صاحب ممدوح یعنی جیمس مویٹ صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ ارشاد ہوا کہ اخلاق جلالی کا ترجمہ زبان ریختہ میں کر۔ اگرچہ یہ کتاب بغایت مغلق اور دقیق المضمون اول سے آخر تک

---

[۱] ملاحظہ ہو صرف اردو منظوم صہ ۹۹

تمام مسائل حکمی اور تدقیقات علمی سے پُر ہے اور ترجمہ کرنا اس کا مستلزم تجرید مادہ جسمانی اور اسقاط قوای انسانی کا ہے لیکن بہ مقتضائے نمک خواری کے صورت انکار کی مناسب نہ دیکھی اور فضل حقیقی پر توکل کرکے اس میں اقدام کیا لیکن اسکے خطبے کے بدلے دوسرا خطبہ علاحدہ کہہ کے ضمیمہ اس کا ترجمہ کرکے حکمت عملی کی تقسیم سے شروع کیا اور حتی المقدور اس کی تسہیل کی۔"

مولوی صاحب نے سخت محنت اور عرق ریزی سے ترجمہ مکمل کیا تھا اور ایک سال میں ہی یہ کام پورا ہوا۔ انھوں نے ترجمے کے کام میں دقت اور دشواری کا ذکر بھی کیا ہے۔

"جولائی کی بیسویں دوشنبہ کے دن ۱۸۰۵ء مطابق ۱۲۲۰ھ کے بہت محنت وجانفشانی اور فضل یزدانی کی مدد اور صاحبان عالیشان کے اقبال کی برکت سے اس ہیچ مداں نے کتاب لوامع الاشراق مکارم الاخلاق کے ترجمے سے فراغت کی۔

تتمہ پر قطعہ تاریخ بھی نقل کیا ہے ؎

ترجمے سے ہوا جب فارغ فکر تاریخ پہ تھی مشتاق

دور کر تیغ علم سے سر جہل بولا ہاتف "تمامی اخلاق"

۱۲۲۰ھ

دیباچے کے بعد کتاب حکمت عملی کی تقسیم سے شروع ہوتی ہے۔

"اس علم کا نام ملک داری ہے اور سیاست مدنی ہے۔ پس بالضرور مقاصد اس کتاب کے تین قسموں کے درمیان منحصر ہوے۔ ہر گاہ کہ طریقے تدوین مقتضی اس کے ہیں کہ مقدمے کو جو کہ مشتمل ہے تھوڑی سی ایسی یقینی باتوں پر کہ فن مقصود سے علاقہ رکھیں، اور شروع کرنے والے کی آنکھیں ان سے کھل جائیں اور مقاصد کی تحقیق

کرنے کے لئے اس کی اعانت ہو۔ مطالب کے اوپر مقدم کیجئے، اس واسطے ترتیب اس کتاب کی ایک مطلع پر جو عبارت ہے مقدمہ سے یعنی بیان کرنے ان باتوں کے اور تین لومعے سے ان تین مقصدوں میں مقرر ہوئی۔ اور ابواب و فصول کی تعبیر لمعے اور مانند اس کی سے کی۔ لیکن توفیق اس کی اللہ سے ہی ہے اور ہم اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے اور کمک نہیں چاہتے مگر اس سے۔[۱]

مولوی صاحب نے ارباب کشف و مشاہدے کا حال بھی مفصل لکھا ہے وہ لکھتے ہیں۔

احوال ارباب کشف و مشاہدے جیسے جنید بغدادی، ابو یزید بسطامی اور سہیل بن عبداللہ تستری ہیں، مذکور ہوا، کہا اس نے کہ وے بلاشبہ حکیم ہیں لیکن اس ارادہ کے درمیان بہت سے خوف اور خطرے ہیں کیونکہ دوسرا اور فریب و خیال فاسد کے بیابان کے چلنے والے کو حیران اور سرگرداں رکھتے ہیں۔ اور بڑا اسفادیہ ہے کہ تھوڑی نمائش سے جس طرح میدان میں سراب نظر آتا ہے اور پیاسا اس کو پانی سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب اسکے نزدیک آیا تو کچھ نہ پایا، طلب کی راہ سے رہ جاتے ہیں۔ پھر جب ان کو اصل حقیقت پہ تنبیہ ہوتی ہے تو حسرت و ندامت کے سوا کوئی چیز ان کے ہاتھ نہیں لگتی ؎

اس دشت میں بس دور لب آب ہی طالب   ہشیار تجھے غول بیابان کا نہ بہکائے

میدان کے طے کرنے والے بہت ہیں، پر منزل پر پہنچنے ہارے تھوڑے ہیں۔[۲]"

اخلاق جلالی امانت اللہ کا خطی نسخہ ۳۸۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

---

[۱] دیکھئے خطی نسخہ اخلاق جلالی ص ۱۳-۱۴ [۲] ایضاً ص ۲۷-۲۸

مکمل نہیں ہے۔ آخر کے کچھ صفحات دستبرد ہو گئے ہیں کیونکہ تتمہ کی عبارت ادھوری رہ گئی ہے۔

اس کی مہربانی نے مراسمِ عدل کے زندہ کرنے میں خاصیت انفاس..... کو ظاہر کیا۔ اور عدل نے اس کے ظلم و مظالم کے دفع کرنے کے لئے آفتاب دکھایا، اس کی عدالت ـــــ کے عہد میں فتنہ بغیر چشم معشوق کے نہ دیکھ سکے۔ .... بیچ امید کہ ـــ"

یہاں ہی اچانک عبارت ختم ہو جاتی ہے اور صفحات بھی کم ـــ یقیناً دستبرد ہو گئے ہیں۔ اخلاق جلالی ایک عظیم کتاب ہے جس میں شریعت اور احکاماتِ الٰہی اور ان پر عمل کرنے کے طریقے دنیا کے بڑے بڑے فلسفیوں کے زریں مقولے افلاطون، ارسطاطالیس، ابو نصر فارابی اور بو علی سینا وغیرہ کے حوالے سے نصیحت کے موتی بکھیرے گئے ہیں۔ فلسفہ جیسے خشک موضوع کی وجہ سے عبارت شگفتہ اور سلیس نہیں رہ سکی۔ پھر بھی جس چابکدستی اور فن کاری سے انھوں نے ایسے دقیق اور خشک کتاب کا ترجمہ کیا ہے، وہ انھیں اردو ادب میں ایک منفرد مقام عطا کرنے کے لئے کافی ہے۔

مولوی صاحب نے مرزا کاظم علی جوان کے ساتھ قرآن پاک کا بھی ترجمہ کچھ پاروں تک کیا۔ جس کی تفصیل کاظم علی جوان کے احوال میں بیان کی جا چکی ہے

مرزا علی لطف

مرزا علی لطف کے آباو اجداد استرآباد (ایران) کے رہنے والے تھے لیکن مغلوں کے حملہ اور ایران کی تاخت وتاراج کے وقت استرآباد سے ہجرت کرکے ہندوستان چلے آئے تھے۔ لطف کے والد فارسی کے کامیاب شاعر تھے اور ہجری تخلص کرتے تھے۔ مرزا علی لطف کی پیدائش دارالسلطنت دلی میں غالباً ۱۷۵۰ء اور ۱۷۶۰ء کے درمیان ہوئی۔ کیونکہ جس وقت کلکتے آئے تھے انکی عمر لگ بھگ چالیس سال تھی۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے وقت انھیں ترک دلی کرکے عظیم آباد منتقل ہونا پڑا تھا۔ وہاں سے وہ مرشدآباد گئے تھے جہاں فورٹ ولیم کالج کا شہرہ سن کر کلکتے گئے۔ مرزا لطف اچھے اور کامیاب شاعر تھے اور ان کی ایک مثنوی اپنے عہد کی ایک کامیاب مثنوی سمجھی جاتی ہے۔ اس عہد کے اکثر فارسی تذکروں میں مرزا لطف کا حال مل جاتا ہے لیکن تمام تذکرے ان کے سنہ پیدائش سے خالی ہیں۔ ان کے معاصر نواب سرور نے ریختہ گویاں کا جو مفید تذکرہ فارسی میں ترتیب دیا ہے اس میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے

"لطف تخلص، مرزا علی، تذکرہ ریختہ گویاں در نثر زبانِ ہندی تالیف نمودہ۔ اصلش از بلدۂ استرآباد کہ شہر لیست از اقلیم ایران مولد ومنشا، مرزا علی موصوف دارالخلافہ۔ از چندے بہ نواح عظیم آباد استقامت گزیدہ است"

تذکرہ ہندی، مصحفی، گلشن بے خار شیفتہ، مجموعہ نغز اور سخن شعرا میں

مرزا علی لطف کا ذکر ملتا ہے جو اس کی نشاندہی کرتا ہے کہ لطف اپنے زمانے کے کامیاب اور مشہور شاعر تھے۔ لیکن یہ بات انکی بدقسمتی سے ہی عبارت ہو سکتی ہے کہ لطف نے ادبی دنیا میں شاعر کی حیثیت سے نام و نمود حاصل نہیں کیا۔ بلکہ ان کے نثری کارنامے گلشن ہند کو اردو ادب میں لازوال شہرت نصیب ہوئی اور یہی کتاب انھیں دوامی زندگی بخش گئی۔

مرزا لطف شاعری میں کس کے تلمیذ تھے۔ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے مصحفی اور سرور ان کی شاگردی کے بارے میں خاموش ہیں لیکن مجموعۂ نغز میں ان کو مرزا سودا کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ نساخ نے بھی سخن شعرا میں مجموعہ نغز کی پیروی اور تقلید کرتے ہوئے لطف کو سودا کا شاگرد قرار دیا ہے۔ گلشن بے خار میں شیفتہ نے انھیں میر تقی میر کا شاگرد بتلایا ہے لیکن اس میں صداقت نہیں ہے۔ سخن شعرا میں نساخ نے لکھا ہے۔

"لطف تخلص مرزا علی استرآبادی شاگرد مرزا رفیع سودا، دہلی میں تربیت پائی تھی۔ عظیم آباد کے اطراف میں سکونت کی تھی۔ حیدرآباد کی بھی سیر کی تھی ان سے ایک تذکرہ شعرائے اردو یادگار ہے۔ صاحب گلشن بیخار نے جوان کو شاگرد میر تقی میر لکھا ہے غلطی کی ہے[1]۔"

مرزا علی لطف عظیم آباد سے مرشد آباد گئے تھے۔ اس وقت مرشد آباد اردو کا تیسرا بڑا مرکز تھا۔ اور انشا اور مرزا جان طپش کا بڑا شہرہ تھا۔ ۱۸۰۱ء میں لطف کلکتے آئے۔ جان گل کرسٹ سے ملاقات ہوئی اور گل کرسٹ کی

---

[1] دیکھئے سخن شعرا ص ۴۰۵

فرمائش پر ہی تذکرہ گلشنِ ہند مرتب کیا تھا۔ تذکرہ گلشن ہند میں لطف نے اپنی حیات قلمبند کی ہے۔ وہ فارسی میں اپنے والد کاظم بیگ خاں استرآبادی سے اصلاح لیتے تھے لیکن ریختہ میں انھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ لطف لکھتے ہیں۔

لطف تخلص مرزا کاظم علی نام راقم ہے۔ اس چند اوراق پریشاں کا کہ مانند نامۂ اعمال اپنے کے سیاہ کئے ہیں۔ اور اسم گرامی والد بزرگوار کا اس خاکسار کے کاظم بیگ خاں ہے۔ متوطن استرآباد شجاعت نبیاد کے ہیں۔ گیارہ سوچون ہجری (۱۱۵۴ھ) میں نادرشاہ کے ساتھ شاہ جہاں آباد تشریف لائے اور ابوالمنصور خاں منصور جنگ کی وساطت سے کہ آپس میں معرفت ولایت کی تھی۔ مصدرِ عنایت بادشاہی ہوئے۔ اب آگے بیان امورات دنیوی باعث ہے طول کلام کا اور وہ معاملہ دیکھا ہوا ہے خاص و عام کا۔ بہرحال غزل فارسی کے کہنے میں حضرت کو ید طولیٰ تھا۔ اور ہجری تخلص آپ کا تھا۔ ..... اصلاح فارسی کی اس ہیچ مداں کو آپ ہی کی جانب سے اور مقررہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے ہے[۱]۔"

لطف کے اس بیان سے اُردو میں ان کے تلمذ کے متعلق غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ غالباً اسی بنا پر ان کے ہم وطن اور ہم عصر نواب سرور اپنے تذکرہ عمدہ المنتخبہ میں ان کو کسی کا شاگرد نہیں لکھا ہے۔ ناسخ نے سنی سنائی بات پر یقین کر کے ان کو مرزا رفیع الدین سودا کا شاگرد لکھدیا ہے۔

---

[۱] دیکھئے گلشن ہند صفحہ ۵، مطبوعہ

تذکرۂ گلشن ہند کے دیباچے میں لطف نے سبب تالیف بیان کیا ہے
"میرا ارادہ سیر حیدرآباد کا تھا۔ مگر چونکہ گل کرسٹ کے بڑے اخلاق و تپاک
کے ساتھ مجھ سے اس تذکرے کے لکھنے کی خواہش کی لہذا میں نے اسے بسرو چشم
قبول کیا..... اور آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء کے ہیں....
موافق حکم اس والا مناقب کہ نام نامی اور اسم گرامی اس کا اوپر مذکور ہوا ہے
اس ہیچ مداں نے یہ تذکرہ لکھا اور نام اس کا بموجب ارشاد اس صاحب ممدوح
کے گلشن ہند رکھا، تاریخ نظم اس طور پر لکھا جائے۔

ہر ایک گل ہمیشہ بہار اس حدیقہ کا   کہتا ہے یوں خزاں سے تو بلشت ہے
حیراں پھرے ہیں بے سرو پا بہمن و دے   تاریخ اس کی جب سے رشک بہشت ہے

تذکرہ گلشن ہند ایک مفید اور قیمتی تذکرہ ہے۔ اس میں اُردو کے تمام
مشہور شاعروں کا حال مل جاتا ہے۔ یہ دراصل مشہور فارسی تذکرہ گلزار
ابراہیم کا ترجمہ ہے۔ لیکن کاربن کاپی نہیں ہے۔ اصل میں مرزا علی لطف نے
جناب خلیل ابراہیم کے فارسی تذکرے کی بنیاد پر زیادہ وسیع اور کشادہ
عمارت تعمیر کی ہے۔ مرزا لطف نے صرف ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ شاعروں کے حال کو پھیلایا
ہے اور بہت سی نئی باتوں کا اضافہ کیا ہے اور اضافے اور ترمیم سے ندرت اور
نیا پن پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے کہیں یہ اضافہ باعث حسن ہوا ہے
اور کہیں پیچیدگیاں اور الجھن پیدا ہو گئی ہیں۔ کیونکہ مرزا لطف اکثر مصنوعی
عبارت۔ قافیہ پیمائی اور عبارت کو سجانے کی فکر میں وہ اصل مقصد سے
دور ہو گئے ہیں۔ اور الفاظ کی شعبدہ بازی نے مواد کو سمیٹ لیا ہے۔ ان تمام

خرابیوں کے باوجود مرزا لطف کا یہ تذکرہ مفید اور کارآمد ہے۔ لطف نے شاعروں کے حال میں مصنوعی رنگین اور مقفی عبارت میں لکھ کر اپنے تذکرے کو ہلکا ضرور کر دیا ہے، کام کی باتیں چند سطروں میں سما سکتی ہیں۔ وہ کئی صفحوں میں پھیلا دی گئی ہیں اور ابہام بھی پیدا ہو گیا ہے۔ تعقید لفظی وقافیہ پیمائی کی وجہ سے طبیعت الجھنے اور ابنے لگتی ہے۔

مرزا لطف نے اپنے تذکرے میں بہت سے غلط واقعات بھی شامل کر دیے ہیں جس کی وجہ سے گلشن ہند میں وہ جان اور زور نہیں ہے جو گلزار ابراہیم میں ہے۔ لطف مخلص علی مخلص کا حال لکھتے ہیں۔

"مخلص علی نام، تخلص مخلص، بھانجے نواب نوازش محمد خاں شہامت جنگ کے ساکن مرشد آباد میر باقر کر کے مشہور تھے۔ جوان، خندہ رو۔ کشادہ پیشانی، ہمیشہ خوش وقت اور خوش زندگانی بنگالے میں بہت کیفیت کے ساتھ انھوں نے گذر کی اوقات ہمیشہ عیش و کامرانی میں بسر کی۔ شب و روز عیش و عشرت سے کام تھا۔ اور رات دن احباب، گردن صراحی اور جام تھا۔ زبانِ ریختہ میں انھوں نے بہت کچھ کہا لیکن کثرت عیش سے ازبسکہ دھیان رہا۔ کہیں کا کہیں گا ہے، کلام ان کا خالی لغزش سے نہیں ہے۔ شاید ۱۲۰۰ھ بلدۂ مذکور کے اندر دام ہستی کی کشاکش سے رہائی پائی اور سیر چمنستانِ عدم کی عین تعیش فرمائی[1]"

گلزار ابراہیم میں مخلص کا بیان اس طرح ہے

---

[1] تذکرہ گلشن ہند۔ مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق

مخلص تخلص اسمش مخلص علی خاں معروف بہ میر باقر خواہر زادہ نواب نوازش محمد خاں، شہامت جنگ مرحوم، جوانے است زیبا و بزم آرا، ہموارہ سر ور و کشادہ سیما، در بنگالہ بسر میبرد، اشعار بسیار گفتہ و مدون ساختہ، اما بہ نظر دقیق و تحقیق ناظر کلام خود گشتہ۔ بغایت عیش دوست، دوست دار ایں خاکسار است۔ ایں اشعار[1]........"

گلزار ابراہیم کے مؤلف کا انداز بیان کس قدر شگفتہ، طنز کس قدر لطیف ہے۔ نواب مخلص کے کردار کی جانب اشارہ کس قدر عمدہ ہے لیکن مرزا علی لطف نے بغایت عیش دوست جیسے بامعنی خیال کو نظر انداز کر کے اپنی طرف سے مخلص علی خاں کو عیاش، رنگین مزاج، شرابی اور گمراہ انسان بتایا ہے۔ انھوں نے اپنی عبارت میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جو سادگی اور بے ساختگی گلزار ابراہیم میں ہے لطف کے یہاں وہ غایب ہے۔ لطف کے تذکرے میں ایسی ہی ترمیم و تنسیخ کے باعث عیوب پیدا ہو گئے ہیں۔

لطف نے کالج کے لئے صرف ایک ہی کتاب تالیف کی۔ اور یہ بھی پتا چلتا ہے کہ لطف کو کالج کی ملازمت باضابطہ نہیں مل سکی تھی۔ ۱۸۰۱ء میں تذکرہ گلشن ہند کی ترتیب کے بعد وہ حیدرآباد چلے گئے۔ حیدرآباد میں انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ مولف ارباب نثر اردو لکھتے ہیں۔

"مرزا علی لطف ۱۸۰۱ء میں گلشن ہند کی تالیف سے فارغ ہو کر حیدرآباد آئے، اور نواب آصف جاہ بہادر اور اعظم الامرا ارسطو جاہ کی مدح میں قصاید

---

[1] ملاحظہ ہو گلزار ابراہیم خطی نسخہ ورق ۲۲۱ (ایشیاٹک سوسائٹی کتب خانہ)

لکھ کر گذرانے۔ ان کی آمد کی شہرت ہوئی تو شعرائے دکن نے معاصرانہ فراخدلی سے کام لیکر استقبال کیا اور وہ حیدرآباد کے مشاعروں میں غزلیں پڑھنے لگے اس زمانے کے دکنی شعراء میں محمد خاں ایمان بہت ممتاز تھے۔ ان سے لطف کی اچھی راہ و رسم تھی۔ سرکار عالی سے ازراہ قدردانی چار سو روپیہ ماہوار اور ایک پالکی عطا ہوئی۔ لطف نے نواب ارسطو جاہ کی مدح میں کئی قصیدے لکھے ہیں[۱]"

ارباب نثر اردو میں ارسطو جاہ کی شان میں طویل قصیدہ بھی دیا گیا ہے جس کا مطلع ہے ؎

بخشش نے تیری رشک بیاباں کیا بہار — ہمت تے تیری غیرت دریا ہے کوہسار[۲]

حیدرآباد میں مرزا لطف کو آرام و سکون کی زندگی نصیب ہوئی۔ اور بیس سال تک وہاں رہے۔ اپنی بذلہ سنجی، خوش اخلاقی اور اپنی مرنجاں مرنج طبیعت کی وجہ سے حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقے میں مقبول ہوئے۔ اور وہیں ۱۸۲۲ء میں سپرد خاک ہوئے۔

مرزا لطف ایک کامیاب شاعر تھے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ان کے کسی دیوان کا پتا نہیں چلتا ہے۔ ان کی ایک مثنوی کا نسخہ دستیاب ہوا ہے۔ یہ مثنوی حیدرآباد سے شائع ہوگئی ہے[۳]

لطف کی شاعری کے متعلق ان کے معاصرین کی رائے اچھی ہے۔ ان کی غزلوں میں سوز و گداز اور مٹھاس کی بلاشبہ کمی ہے لیکن انھیں فن میں دستگاہ کامل تھی۔ بلکہ قصیدہ، مرثیہ، مثنوی اور رباعیات بھی لکھیں۔ مگر غزل گو کی حیثیت ہی

---

[۱] دیکھئے ارباب نثر اردو ص ۱۲۱ [۲] ایضاً ص ۱۳۲ [۳] مثنوی لطف کو ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے مرتب کیا ہے

ان کی نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے سب سے بڑے غزل گو میر کا اثر قبول کیا اور قصائد میں ان کے سودا کا رنگ جھلکتا ہے۔ لہٰذا اکثر تذکرہ نویسوں نے ان کو سودا یا میر کا شاگرد لکھا ہے مگر ان کی غزلوں میں نہ تو میر کی آہ ابھری اور نہ سودا کی واہ یہاں نمونتاً ان کے چیدہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں ؎

بس کہ بھلاتے ہو شیشے کا گلو ٹوٹ گیا	خم مرے منھ سے لگا دو جو سبو ٹوٹ گیا
نہ کر بلبل دلِ باختہ صیاد کا شکوہ	کہ جاں بازوں کے دین میں کفر ہے جلاد کا شکوہ
ہر یک کہے ہے مجھ سے کہو ماجرائے دل	رسوا کیا جہاں میں مجھے تو نے ہائے دل
سب کنارہ گیر اپنے اور بیگانے ہوئے	اب کے فصل گل میں ہم بے طرح دیوانہ ہوئے
سنا کرتے تھے شہرہ لطف کا مدت سے کل دیکھا	جو اِن کم سخن وارستہ خاطر سا نظر آیا[1]

خورشید کی بھی آنکھ فلک پر جھپک گئی	ٹک جو گرہ نقاب کی اس کے سرک گئی
وہ خود فراموش آگیا بارے چمن میں کل	بوئے خودی نکل گئی گل کے دماغ سے
بے چین بہت لطف کی ہے کل سے طبیعت	اللہ کرے آج وہ روٹھا ہوا من جائے

کیا سبب بتلائیں، ہنستے ہنستے باہم رک گئے

خود بخود کچھ وہ کھنچے اُدھر، ادھر ہم رک[2] گئے

مرزا علی لطف کے اس مختصر انتخاب کلام سے یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ لطف

---

[1] دیکھئے تذکرہ سرور مرتبہ خواجہ احمد فاروقی جو عام طور پر دستیاب ہے۔ ص ۵۰-۵۱

[2] دیکھئے تذکرہ سرور ص ۲۳۲

کے اندر ایک کامیاب اور اچھے شاعر ہونے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ انھوں نے اپنا دیوان بھی ضرور مرتب کیا ہوگا۔ ان کا دیوان دستیاب ہو جاتا تو ان کی شاعرانہ حیثیت کے تعین میں مدد مل سکتی تھی۔

مرزا جان طپشؔ

مرزا جان طپشؔ انیسویں صدی کے ان باکمال شاعروں میں ہیں جو دلی کی غیر یقینی سیاسی حالت اور آئے دن کی تاخت و تاراج سے تنگ آکر اپنے وطن سے نکل کر ہندوستان کے دوسرے شہروں میں جا بسے تھے۔ طپشؔ بھی بنارس، لکھنؤ، عظیم آباد، جہانگیر نگر اور مرشد آباد کی خاک چھاننے کے بعد ۱۸۰۰ء اور ۱۸۰۲ء کے درمیان کلکتے آئے۔ وہ کالج میں باضابطہ ملازمت حاصل نہ کر سکے تھے۔ مگر کالج کے مصاحبوں کی فرمائش اور ایما پر بہار دانش کا ترجمہ اردو میں کیا مگر منظوم۔ ان کی بہار دانش کو اپنے زمانے میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے توسط سے کلکتے میں انکی زندگی اطمینان سے گذری۔ مرزا طپش کو اس مثنوی پر انعام بھی ملا تھا۔ ہندوستانی پریس کے مالک اور منتظم ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے اسے چھاپنا بھی چاہا تھا لیکن اس اثناء میں ان کی بدلی جاوا ہو گئی اور بہار دانش ہندوستانی پریس سے شائع نہ ہو سکی۔

مثنوی بہارِ دانش کے دو خوبصورت خطی نسخے ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ ایک کا نام بہار دانش ہے لیکن دوسرے کا تاریخی نام باغ و بہار ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ بہار دانش ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء میں ترتیب پا چکی تھی۔ بہار دانش سب سے پہلے ۱۲۵۰ھ میں شائع ہوئی تھی لیکن مطبوعہ نسخہ کلکتے میں موجود نہیں ہے۔ اس کے قبل گلزار مضامین کے نام سے طپشؔ اپنا مجموعہ

کلام مرتب کر چکے تھے۔ اور شمس البیان بھی۔

مرزا طپش کا وطن بخارا تھا۔ لیکن امیر تیمور کی فوج کشی کے وقت انکا خاندان بخارا سے ہجرت کر کے ہندوستان میں آباد ہو گیا تھا۔ طپش ۱۷۶۰ء اور ۱۷۶۲ء کے درمیان دلی میں پیدا ہوئے۔ طپش عربی فارسی کے علاوہ سنسکرت میں دستگاہ رکھتے تھے۔

مرزا طپش کا اصل نام مرزا محمد اسمٰعیل تھا۔ لیکن وہ مرزا جان کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے والد کا نام مرزا محمد یوسف بیگ تھا۔ مرزا جان طپش ذہین، ہنس مکھ اور طرحدار جوان تھے اور اپنے عہد کے اچھے شاعر بھی۔ اردو کے کم و بیش تمام تذکروں میں ان کا حال ملتا ہے۔ تذکرہ سرور میں ان کے حال میں معلومات افزا باتیں ملتی ہیں جن سے طپش کی سیرت اور فن کے مختلف پہلو اور نقوش ابھاگر ہوتے ہیں۔

"طپش تخلص مرزا محمد اسمٰعیل عرف مرزا جان۔ خلف یوسف بیگ اصلش از بخارا شریف۔ خودش در دارالخلافہ تولد یافتہ۔ نسبش بہ حضرت سید جلال الدین بخاری قدس اللہ تعالیٰ سرہ می رسد۔ جوانی است وجیہہ و خوش خلق و خوش وضع و یار باش و بذلہ گو و سخن سنج و شاعر خوش فکر خط صرافی و سنسکرت خوب می نویسد۔ شاگرد حضرت خواجہ میر درد قدس اللہ سرہ، با راقم بہ سبب ہمسائگی تعارف و اخلاص تمام دارد۔ از چندے طرف بنگالہ برائے سعی معاش رفتہ است۔"[1]

---

[1] تذکرہ سرور ص [illegible]

نواب میر محمد خاں بہادر سرور نے اس مختصر حال میں مرزا جان طپش کی سیرت کی کتنی واضح تصویر اتاری ہے۔ مرزا جان طپش خوش فکر شاعر تھے۔ اور اردو کے تمام تذکرہ نویس ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ طپش خواجہ میر درد کے شاگرد تھے مگر غلام ہمدانی مصحفی نے تذکرہ شعرائے ہندی میں لکھا ہے کہ طپش نے پہلے یار محمد بیگ سائل سے اصلاح لی تھی پھر خواجہ میر درد کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوئے۔

"در سال شانزدہ سالگی طبع موزوں بہم رسانیدہ چندے بخدمت مرزا محمد یار بیگ سائل کہ ذکر ایشاں بہ صدر گذشت مشق سخن نمود و بعد ازاں رجوع خواجہ میر درد صاحب کردے[1]"

مصحفی کے علاوہ طبقات الشعرا کے مولف مولوی کریم الدین نے ان کو پہلے سائل کا شاگرد بتلایا ہے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا اور وہ خواجہ درد کے شاگرد ہوئے۔ جناب محمد خلیل ابراہیم نے گلزار ابراہیم میں ان کو خواجہ میر درد کا شاگرد قرار دیا ہے۔

طپش تخلص، دہلوی از شاگردان خواجہ میر درد[2]......

تمام تذکرہ نویس کو اس پر اتفاق ہے کہ طپش خواجہ میر درد کے عزیز اور مشہور شاگرد تھے۔ یہ بات اور ہے کہ انھوں نے ابتدا میں دو چار غزلیں سائل کو بھی دکھائی ہوں۔

مولوی کریم الدین کا کہنا ہے کہ ۱۱۹۰ھ میں طپش کو شعر گوئی کا شوق ہوا، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ ۱۱۹۰ھ میں طپش کی عمر لگ بھگ ۲۶ یا ۲۷ ہو گی مصحفی نے

---

[1] تذکرہ شعرائے ہندی خطی نسخہ ورق ۸۰ [2] قلمی نسخہ گلزار ابراہیم ورق ۱۶۸

نے لکھا ہے کہ وہ سترہ سال کی عمر سے ہی شعر کہنے لگے تھے اور یہی صحیح بھی ہے کیونکہ نساخ نے قطعہ منتخبہ میں طپش کے حال میں لکھا ہے کہ انھوں نے ۱۱۹۹ھ میں گلزار مضامین کے نام سے اپنا پہلا مجموعۂ کلام مرتب کر لیا تھا۔

"طپش تخلص، مرزا محمد اسمٰعیل عرف مرزا جان ولد مرزا یوسف بیگ سید جلال الدین بخاری کی اولادوں میں تھے۔ مولد و مسکن ان کا دہلی وہاں سے آ کر مرزا جہاندار شاہ بہادر کی رفاقت میں تھے اور ان کے حکم سے اپنا دیوان مرتب کر کے نام تاریخی اس کا گلزار مضامین رکھا تھا۔ (۱۱۹۹ھ) بعد ازاں بنگالہ میں آ کر مدت تک شہر ڈھاکہ میں نواب شمس الدولہ بہادر کی رفاقت میں رہتے تھے۔ سنسکرت میں اچھا دخل رکھتے تھے۔ کسب سخن حضرت خواجہ میر درد سے کیا تھا۔ کلیات ان کا نظر سے گذرا ہے۔"[1]

مرزا جان طپش کا کلیات کالج سے بھی شایع ہوا تھا۔ لیکن کلیات کا مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ طپش اچھے شاعر تھے۔ اور فن شاعری سے بخوبی واقف بھی۔ مثنوی بہار دانش اور ان کے منتخبہ کلام کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا جان طپش کی شاعری میں فکر تھی لیکن تنوع نہیں تھا۔ ان کے یہاں نادر تشبیہات اور ندرت خیال آفرینی بھی ملتی ہے۔ لیکن میر تقی میر کے کلام میں جو سوز و گداز ہے، درد کے یہاں جو فلسفہ اور تصوف ہے ان کے کلام میں خال خال ہی یہ خوبیاں ملتی ہیں۔ پھر بھی طپش نے میر درد کا تتبع کیا ہے۔ ان کے بعض اشعار نہایت پاکیزہ، لطیف اور عمدہ ہیں

---

[1] قطعہ منتخبہ نساخ ص۱۰۱

شمع رو وہ بھی ایک زمانہ تھا — تجھ سے روشن غریب خانہ تھا

نہ شہر بھائے نہ صحرا لگے بھلا مجھ کو — الٰہی بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہوا مجھ کو

خاک سے جام کیا جام سے پھر خاک کیا — تو نے کیا کیا نہ کچھ اے گردش افلاک کیا

ساقی ہے دور شیشہ ہے شب ماہ تاب ہے — لیکن یہ غضب ہے کہ تو مست خراب ہے

کیوں وصل کی دل سے جائے امید — آخر دنیا ہے جائے امید

نہ جانا تھا یہ کچھ شورش ہے جام عشق پینے میں — اترتے ہی گلے سے لگ گئی اک آگ سینے میں

خلش آہ سے ہے دکھ سحر و شام مجھے — پھانس نکلے یہ جگر سے تو ہو آرام مجھے

کشش میں آہ کی دم ایک بار ٹوٹ گیا — ہزار حیف کہ کھینچتے ہی تار ٹوٹ گیا

کہا چل دل سے میں اک تماشا تجھکو دکھلاؤں[1] — تہ کاکل عرق آلود وہ گردن چمکتی ہے

لگا کہنے طپش کیونکر بھلا ایسے میں نکلوں میں — اندھیری رات ہے برسات ہے بجلی چمکتی ہے

نہ پیروی قیس نہ فرہاد کریں گے — ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

کبھی تو پانو کی ٹھوکر سے تیرے آشنا ہوتے — اگر خوابیدہ کوچے میں ترے جوں نقش پا ہوتے

سدا وصل کا دن ہی کم ہوتے دیکھا — ولے ہجر کی شب نہ کوتاہ دیکھا

زندگانی کے بھلا اب کون سے آثار ہیں — زندگی جس سے عبارت ہے وہی بیزار ہیں

کچھ تیرے سلیقے سے پھنسے ہم نہیں صیاد — لائی ہے ہمیں دام میں تقدیر ہماری

---

[1] تذکرہ سرور مشتبہ ـ ناسخ نے سخن شعرا میں یہ ق اس طرح لکھا ہے

کہا جو دل سے چل تجھکو تماشا اک دکھلاؤں — تہ کاکل عرق آلود وہ گردن چمکتی ہے

لگا کہنے طپش میں گھر سے باہر کس طرح نکلوں — اندھیری کالی رات ہے برسات ہے بجلی چمکتی ہے

دیکھیے سخن شعرا ص ۳۰۳

مرزا جان طپش بھی فارسی اور اردو شاعری کی روایات سے چمٹے ہوئے ہیں۔ غزلوں میں ہجر و فراق کا ماتم ہے، وصل معشوق کی آرزو ہے۔ وہی سوزش اور حدت ہے اور وہی بے کسی کی فضا ہے جو دوسرے غزل گویوں کے یہاں ملتی ہے۔ لیکن کبھی ان کا عشق مجازی عشق حقیقی کی سرحد میں لاشعوری طور پر داخل ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے محبوب سے روایتی اور پامال طریقوں کو ترک کرکے ایک نیا طرز جنوں ایجاد کرنے کا عزم کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ طپش کا دیوان دستیاب نہ ہوسکا۔ یہ اشعار مختلف تذکروں سے یکجا کئے گئے ہیں۔ اور یہ مختصر انتخاب یقیناً اس کا غماز ہے کہ طپش اپنے زمانے کے ایک نغز گو شاعر تھے مگر انھیں وہ مقام حاصل نہ ہوسکا جو ان کے استاد خواجہ میر درد کو حاصل ہے۔

شمس البیان | مرزا جان طپش کی یہ گراں قدر اور مفید تصنیف ہے جو محاورات اور ضرب الامثال کے دُر بے بہا اپنے دامن میں سمیٹے ہے۔ مرزا جان طپش نے انشا کے قبل ۱۲۰۶ھ سے کچھ پہلے اس مفید اور قیمتی کتاب کو مکمل کیا تھا اور پہلی بار یہ مرشد آباد سے شائع ہوئی۔ طپش نے اس کتاب کا نام اپنے محسن اور سرپرست نواب امیر الله ملک شمس الدولہ سید احمد علی کے نام "شمس البیان" یا مصطلحات ہندی رکھا یہ فارسی میں لکھی گئی ہے۔ زبان آسان ہے۔ ہندوستانی محاورات اور ضرب الامثال کی تصریح و توضیح فارسی میں کی گئی ہے۔ لیکن تائید میں اردو کے اشعار نقل کئے گئے ہیں۔

اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہونے کی وجہ سے مرزا جان کی شمس البیان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ طپش نے اپنی اس کتاب میں دلّی کے محاورات اور

ضرب الامثال نقل کئے ہیں۔ لکھنؤ کے محاورات اور کہاوتوں کو چھوڑ دیا ہے۔

طپش نے اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں سخت محنت کی ہے اور بڑی عرق ریزی سے کام لیکر انھوں نے تقریباً ۱۸۰ محاوروں اور ضرب الامثال کو ردیف وار ترتیب دیا ہے۔ اور ہر ایک کی سند میں اردو کے مستند شاعروں کے اشعار بھی درج کئے ہیں۔ مرزا جان طپش کی اس نادر تالیف کا خوبصورت خطی نسخہ ۱۶×۱ سائز پر ۷۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ غالباً طپش نے یہ قلمی نسخہ خود ہی لکھا ہے۔ کیونکہ اس نسخے میں غلطیاں نہیں ہیں اور کتاب کے حاشیے سنہرے رنگ میں بڑا دیدہ زیب ہیں۔ کتاب پر سرور کا عالمانہ مقدمہ بھی ہے۔ جو اس طرح شروع ہوتا ہے۔

"بعد تحمید حضرت سخن آفریں کہ زبان الناس بہ انواع مقال قدرت گویائی بخشید۔ و پس از تمہید نعت ختم النبی کہ نکتہ سنجان دقیقہ رس، بہ فیضان نطق و بلاغت مشرف گردانیدہ، ذرہ بے مقدار ہیچمداں متخلص بہ طپش مرزا جان معروض رائے محاورہ، دانان فصیح زبان و لطیفہ شناسان صحیح بیان گرداند کہ خاطر عاطر امیر بے نظیر امیر الملک شمس الدولہ سید احمد علی خاں ذوالفقار جنگ دام اقبالہٗ ..... نمود کہ نسخہ مشتمل بر توضیح اصطلاحات دیار دلی و روزمرہ فصحائے اردو معلے انچہ در بعضے اشعار منظوم می گردد[1]"

دیباچے کے بعد محاورات اور ضرب الامثال کی توضیح و تصریح کی گئی ہے۔ انگاروں پر لوٹنا۔ کنایہ از بے قراری کہ در عالم رشک لاحق گردد۔ و لی

---

[1] دیکھئے خطی نسخہ دیباچہ

دکنی گو یدے

شعلہ خو جب سے نظر آتا ہے   تب سے انگاروں پہ لوٹے ہے دلی

بہارِ دانش صاحبانِ کونسل کی فرمائش پر کالج کے ہندوستانی شعبہ کے لئے مرزا جان طپش نے بہارِ دانش فارسی کو اردو نظم کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ یہ عنایت اللہ کنبو کی فارسی مثنوی بہارِ دانش کا ترجمہ ہے۔ طپش نے بڑا رواں دواں منظوم ترجمہ کیا ہے اور اس میں وہی زور، طرزِ تحریر، روانی اور سلاست پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ جو سحر البیان کی خصوصیات ہیں۔ مرزا نے میر (حسن) کی تقلید کی مگر انھیں اس میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہو سکی۔ گو انھوں نے بڑی چابکدستی سے بہارِ دانش میں وہی محیر العقول اور طلسمی دنیا کی تخلیق کی ہے جو سحر البیان میں پائی جاتی ہے مگر دونوں میں فرق ہے۔ ایک اپنی تمام سادگی، سلاست اور روانی کے باعث ذہن کو مسحور کرتی ہے دوسری میں اکثر کردار بھرتی کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں شہزادی نجم النسا جیسی کوئی متحرک شوخ اور سنگ شخصیت ابھر نہیں سکی۔

بہارِ دانش کا قصہ بھی فرسودہ اور سیدھا سادا ہے۔ اس میں کوئی نئی چونکا دینے والی بات نہیں ہے۔ اس قصہ کا پلاٹ بھی بادشاہ، جن پری اور طلسمی قوتوں کے خمیر سے تیار ہوا ہے۔ اور کہانی دراصل صرف دو کرداروں جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو پر گھومتی ہے۔

بہارِ دانش کے قصے کا خلاصہ یوں ہے کہ جہاندار شاہ پورب دیش کے بادشاہ کا وارث ہے۔ اس کے پاس ایک ایسا توتا ہوتا ہے جو ایسی ایسی باتیں

غیب کی جانتا ہے کہ جن کو سن کر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔ جہاندار کی ایک حسین کنیز مہر بانو ہوتی ہے جسے اپنے حسن پر بڑا ناز ہوتا ہے۔ ایک دن آئینے میں اپنے حسن کو دیکھ کر مہر بانو اترانے لگتی ہے تو تا کہہ اٹھتا ہے کہ تجھ سے بھی زیادہ دلفریب اور حسین و جمیل ایک شہزادی ہے جس کا نام بہرہ ور بانو ہے بہرہ ور بانو کے بے پناہ حسن کی کہانی سن کر جہاندار شاہ اس پر غائبانہ عاشق ہو جاتا ہے۔ وہ دنیا کی تمام خوشیاں اور عیش و آرام کو تیاگ دیتا ہے۔ ہزار تمناؤں کے بعد بادشاہ کو ایک بیٹا نصیب ہوا تھا اس کے غم کو دیکھ کے بادشاہ بے قرار ہو جاتا ہے۔ بہرہ ور بانو دور دیش کی شہزادی ہے۔ جہاندار بخت (شاہ) اپنے محبوب کے عشق میں سدھ بدھ کھو دیتا ہے اور شہزادی کے لئے جہنم کی آگ سے بھی گذرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ محبوب کی جستجو شروع ہوتی ہے۔ وہ ایک نامعلوم منزل کی تلاش میں طویل سفر پر روانہ ہو جاتا ہے راہ میں ہولناک مصائب پیدا ہوتے ہیں۔ غموں کے طوفان میں پھنس جاتا ہے زندگی موت کی سرحد میں کئی بار داخل ہو کر لوٹ آتی ہے۔ ہرنی اور توتے کے قالب میں اس کی روح قید کر دی جاتی ہے۔ ہرمز جادوگر اس کا طاقتور حریف ہے جو بہرہ ور کو اس سے چھین لینے کو اپنی تمام طلسمی قوتیں جھونک دیتا ہے لیکن دوسرا افسانوی کردار کی طرح بیدار بخت کی ہی فتح ہوتی ہے اور وہ بھی بہرہ ور بانو کی مدد سے جادوگر ہرمز کو اپنے کیے کی سزا ملتی ہے۔ وہ بہرہ ور بانو سے مات کھاتا ہے۔ ہرن کی شکل اسے ملتی ہے اور جہاندار اپنی شکل میں آ کر اپنے گوہر مطلوب یعنی بہرہ ور بانو کو ہمیشہ کے لئے پا لیتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ انیسویں صدی کی اکثر داستانوں میں ایسے ہی قصے ملتے ہیں۔ ان میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ وہی عشق، شراب، جادو ٹونا، جنگ وجدال اور وصال محبوب کا فرسودہ قصہ دہرایا گیا ہے اور دوسری داستانوں کی اذیت ناک یکسانیت ہی طپش کے شاعرانہ اسلوب اور بے ساختگی نے اس لٹے پٹے قصے کو نظم کے سانچے میں ڈھال کر اس کو نیا روپ اور رنگ عطا کیا ہے چونکہ طپش نے کالج کے نووارد طلبہ کے لئے یہ مثنوی تالیف کی تھی۔ لہذا انھوں نے زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور آسان بنانے کی کوشش کی ہے اور جزئیات اور واقعات بیان کرتے وقت بھی طپش نے ماحول، فضا اور کہانی کے کردار کی خصوصیات اور دوسرے پہلوؤں کا خاص خیال رکھا ہے۔ طپش واقعات اور جزئیات نگاری میں ضرور کامیاب ہوئے ہیں لیکن بیان میں سحر البیان کا سحر پیدا نہ کر سکے۔

بہارِ دانش کا خطی نسخہ حمد سے شروع ہوتا ہے۔ مناجات کے بعد صاحبوں کی شان میں قصیدے لکھے ہیں۔ ڈاکٹر ولیم ہنٹر اور ولیم ٹیلر کی دل کھول کر مدح سرائی کی ہے۔ اور ان کو اُردو کا پرستار اور محسن قرار دیا ہے۔ قصائد کے بعد مرزا صاحب نے اپنی مثنوی کی تالیف کا سبب نظم میں بیان کیا ہے ؎

طبیعت کو تھا ایک شب اضطراب	جگر تفتہ تھا اور آنکھیں پر آب
اسی بے کلی میں یہ گذرا خیال	کہ کب تک رہے یونہی آشفتہ حال
مناسب ہے بہلاؤں جی کے تئیں	بھلادوں اس آشفتگی کے تئیں
کروں طبع معروف شعر و سخن	کہ ہے نالہ ہی شغل مرغ چمن
کہ ہے قصہ یہ فارسی میں بیاں	بھلا ہے اگر ہو بہ ہندی زباں

سخن وہ کہ ہووے مفید انام | کریں جس کو ادراک سب خاص و عام
فوائد کے اس میں ہیں کتنے نکات | ہر ایک بات میں اک نکلتی ہے بات[1]
سلف میں کہیں کوئی تھا بادشاہ | برازندۂ تخت و تاج و کلاہ
شہِ عادل و خسرو داد گر | معینِ ستم دیدگانِ سحر
حریف و عدو کا نہ تھا اس کو فکر | نہ تشویش کا پاس تھا اس کے ذکر
میسر تھا عالم کا عیش و نشاط | سدا تھی خوشی خورمی انبساط
مگر وہ تھا اس غم سے غمگین سدا | کہ فرزند دلبند رکھتا نہ تھا[2]

یہاں بھی فرزند دلبند کی تمنا درویش کی دعا سے بر آتی ہے۔ جہاندار بخت نازو نعم میں پلتا ہے۔ دنیا بھر کا عیش اسے میسر ہے لیکن توتا کی زبان سے بہرہ ور بانو کے حسن بے پناہ کا حال سن کر بے تاب ہوجاتا ہے اور مختلف نشیب و فراز اور آلام و مصائب سے گذرنے کے بعد اسے اپنی منزل ملتی ہے۔ بہرہ ور بانو کی ہرمز کے محل میں قید رہنے اور جہاندار شاہ کے توتے کی شکل میں بہرہ ور بانو کے پاس آنے اور شہزادی کی مدد سے رہائی پانے اور محبوب سے ملنے کے واقعات کی جیتی جاگتی تصویر مرزا طپش نے کھینچی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طپش نے اپنا دل کاغذ کے صفحات پر رکھ دیا ہے اور زورِ قلم سے ایسی منظر کشی کی ہے جو ذہن پر مرتسم ہوجاتی ہے ؎

یہ سن کر مصیبت کا اس کے کلام | لگی بہرہ ور بانو رونے تمام
کہا تب جہاندار نے بس نہ رو | نہ رو رو کے اتنا گھلا آپ کو
خدا کے تئیں یاد کر بر محل | وہی مشکلیں ساری کرتا ہے حل

---

[1] دیکھئے مخطوطہ بہار دانش ورق ۱۶ [2] دیکھئے بہار دانش خطی نسخہ ورق ۱۷

مگر ایک تدبیر کہتا ہوں اب — کہ ہر مژدہ آوے ترے پاس جب
تو کہہ اس سے اے شاہ والا گہر — نہیں حال سے اپنے مجکو خبر
رہا کرتی اکثر ہوں بیمار میں — نہیں کوئی رکھتی ہوں غم خوار میں
ترا جس میں جی بیلئے وہی ہے خوب — وہی بازیوں بیچ بازی ہے خوب
یہ کہہ کر منگا ایک آہو کے تئیں — گیا مار کر اس کے گھٹ میں وہیں
جہاندار کو بس یہ فرصت ملی — ملا اس کو جب اپنا تئیں
گیا اپنے گھٹ میں شتابی سما — وہ آہو کا آہو ہی بس رہ گیا
سزا اس کو اپنے کئے کی ملی — کہ دنیا ہے جاگہ مکافات کی
جہاندار اور بہرہ ور بانو تب — بدستور رہنے لگے روز و شب
طپشؔ جیسے مقصد ان کو ملا — ہمارا تمہارا اسے ملے مدعا[1]

جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو کے ملاپ پر بہار دانش ختم ہوتی ہے
اس کا قلمی نسخہ ۲۸۸ صفحات پر ۶×۹ سائز پر پھیلا ہوا ہے۔ خوشخط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ غلطیوں کے عیب سے پاک ہے۔

ان تین کتابوں کے علاوہ طپشؔ کی کسی اور کتاب کا پتا چل نہیں سکا۔ گلزار مضامین ان کا پہلا مجموعۂ کلام تھا۔ مگر یہ بھی آجکل نایاب ہے۔

---

[1] دیکھئے ق ن بہار دانش ص ۳۸۶-۳۸۷

مولوی محمد اکرام علی

مولوی محمد اکرام علی عربی و فارسی شعبہ میں درس و تدریس کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ زیادہ وقت ان کا اسی میں صرف ہوتا تھا۔ اس لئے لکھنے کا کام انھوں نے کم کیا۔ مولوی صاحب نے کالج کے عہد ملازمت میں صرف ایک کتاب تالیف کی جو اخوان الصفا کا ترجمہ ہے مگر یہی کتاب انکی ادبی شہرت اور دوامی زندگی کا ذریعہ بنی۔ اور ان کی کتاب کا ترجمہ انگریزی اور بنگلہ زبان میں بھی ہوا۔

مولوی صاحب سیتاپور کے رہنے والے تھے۔ تلاش معاش انھیں کلکتہ کھینچ لائی تھی۔ انھوں نے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تعلیم حاصل کی اور فورٹ ولیم کالج میں روزگار سے لگ جانے کے بعد ان کی زندگی خوش و خرم گذری۔

مولوی صاحب نے نو وارد صاحبوں کے لئے ولیم ٹیلر کے ایما پر اخوان الصفا کے ایک دفتر کا ترجمہ کیا تھا۔ اخوان الصفا کے دیباچے میں انھوں نے ترجمہ کی وجہ خود بیان کی ہے۔

"بعد اس کے حامی سراپا معاصی اکرام علی یہ کہتا ہے کہ جب میں بموجب حُسنِ ایما جناب نامدار مسٹر ابراہیم لاکٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کی و موافق طلب اخی و استاذی جناب بھائی صاحب قبلہ مولوی تراب علی صاحب دام ظلہم کے شہر کلکتے میں آیا۔ اور رہنموئی طالع سے بعد حصول شرف ملازمت کی مورد

عنایت و رحمت کا ہوا۔ از بسکہ صاحب موصوف کو کمال پرورش منظور تھی۔
سرکار کمپنی بہادر میں نوکر رکھوا کر اپنے پاس متعین کیا۔ بعد چند روز کے بہ استصواب
جناب صاحب عالی شان زبدہ دانایان، روزگار۔۔۔۔ عالی مقدار مدرس
ہندی کپتان جان ولیم ٹیلر صاحب بہادر دام دولتہ کے فرمایا کہ رسالہ اخوان الصفا
کہ انسان و بہائم کے مناظرے میں ہے تو اس کا زبانِ اُردو میں ترجمہ کر لیکن نہایت
سلیس کہ الفاظ مغلق اس میں نہ ہوویں بلکہ اصطلاحات علمی اور خطبے بھی اس کے
کہ تکلف سے خالی نہیں ہیں قلم انداز کر۔ صرف خلاصہ مضمون مناظرے کا چاہیئے
راقم نے بموجب زمانے کے لفظ حاصل مطلب کو محاورہ اردو میں لکھا خطبوں
کو نکال ڈالا اور اکثر اصطلاحات علمی کہ مناظر سے ان کو علاقہ نہ تھا ترک کیں
مگر بعض خطبے اور اصطلاحات ہندسے وغیرہ کہ اس مطلب سے متعلق تھیں باقی رکھیں۔
فی الواقع اگر اس رسالے کی صنعت و رنگینی پہ نگاہ کیجیئے تو ہر ایک خطبہ اس
کا مضمون فصاحت ہے اور ہر ہر فقرہ مخزن بلاغت۔ ہرچند کہ عوام الناس ظاہر
عبارت سے اس کے صرف مضمون مناظرے کا پاتے ہیں مگر علماء دقیقہ شناس ادراک
معانی سے حقائق و معارف الٰہی کا حظ اٹھاتے ہیں۔ مصنفین اس کے ابو سلیمان،
ابوالحسن ابواحمد وغیرہ دس آدمی باتفاق یکدیگر بصرہ میں رہتے تھے۔ اور ہمیشہ
علم و دین کی تحقیق میں اوقات اپنے بسر کرتے تھے۔ چنانچہ اکاون (۵۱) رسالے تصنیف
کئے۔ بیشتر علوم عجیبہ و غریبہ ان میں لکھے۔ یہ ایک رسالہ ان میں سے انسانوں اور
حیوانوں کے مناظرے میں ہے۔ طرفین کی دلائل عقلی و نقلی اس میں بخوبی بیان کیں
آخر بہت قیل و قال کے بعد انسان کو غالب رکھا۔ اور غرض ان کو اس مناظرے

سے فقط کمالاتِ انسانی بیان کرنا ہے۔ چنانچہ اس رسالے کے آخر میں لکھا ہے کہ جن وصفوں میں انسان حیوان پر غالب آیا۔ وہ معلوم معارف الٰہی ہیں کہ ان کو ہم نے اکاون رسالوں میں بیان کیا ہے اور اس رسالے میں مقصود یہی تھا کہ حقائق ومعارف حیوانات کی زبانی بیان کیجئے تاغافلوں کو اس کے دیکھنے سے کمالات حاصل کرنے کے واسطے رغبت ہووے۔

ترجمہ اس رسالے کا خلاصہ، ایران ذوی الاقتدار و زبدۃ نوئینان عالی مقدار حاتم دوراں، افلاطون زمانہ، سرور سروراں، بہادر بہادراں نواب گورنر جنرل لارڈ منٹو، بہادر دام اقبالہ کے عہد حکومت میں کہ سن ہجری بارہ سی پچیس اور عیسوی اٹھارہ سی دس (۱۸۱۰ء) میں مرتب ہوا۔"[1]

اس دیباچے سے ظاہر ہے کہ مولوی صاحب نے صرف ایک دفتر کا ترجمہ کیا اور وہ بھی خلاصہ۔ بہت سی غیر ضروری باتیں بھی حذف کر دیں۔ اخوان الصفا اپنے دور میں بے حد مقبول ہوئی۔ اور ہوگلی کالج کے پروفیسر فلپ تامس ہینول نے انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ کیا تھا۔

مولوی صاحب ۱۸۳۰ء تک کالج سے وابستہ رہے لیکن بیس سال کی طویل مدت کے دوران میں صرف ایک کتاب کا ترجمہ کر سکے۔ ۱۸۰۶ء میں مولوی اکرام صاحب کالج کے کتب خانہ کے محافظ اور نگراں بنا دئے گئے تھے۔ اخوان الصفا پہلی بار ہندوستانی پریس سے ۱۸۱۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور پھر اسکے کئی ایڈیشن نکلے۔ ہمارے سامنے ایک قدیم مطبوعہ نسخہ ہے جسے اردو کے سرپرست ڈاکٹر فاربس

---

[1] دیکھئے اخوان الصفا مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۱ء صـ۳-۲

نے سنہ ۱۸۶۱ء مطابق سنہ ۱۲۷۸ھ میں ڈاکٹر ریو صاحب کی معاونت سے نئی ترتیب کے ساتھ شائع کیا۔ یہ مطبوعہ نسخہ ٹائپ میں ہے اور ٹائپ کی تمام برائیاں اس میں بھی موجود ہیں۔

مسٹر فاربس کا مرتبہ نسخہ حمد خدا سے شروع ہوتا ہے۔

سپاس بے قیاس اس واجب الوجود کو لائق ہے جس نے اجسام ممکنات میں باوجود وحدتِ ہیولیٰ کی مختلف صورتیں بخشیں اور ماہیت انسانی کو جنس وفصل سے ترتیب دیکر ہر ایک فرد کو علٰحدہ علٰحدہ قوتیں عطا کیں[1]۔"

اخوان الصفا اردو بنی آدم کی پیدائش اور حیوان سے بادشاہ جن کے دربار میں ان کے مناظرے سے شروع ہوتی ہے۔ حیوان اور انسان کے درمیان یہ نزاع پیدا ہوتی ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہونے کے ناتے سے دنیا کے تمام جانوروں کا آقا ہے لیکن حیوان اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے مقدمہ جن شاہ کی عدالت میں پیش ہوتا ہے۔ سخت رد وکد، تعدیل وجرح کے بعد انسان کامران ہوتا ہے اور حیوان انسان کی اطاعت قبول کر لیتے ہیں۔

مولوی صاحب کی اخوان الصفا یوں شروع ہوتی ہے۔

لکھنے والے نے ابتدائے ظہور بنی آدم کا یوں لکھا ہے کہ جب تک یے تھوڑے تھے، سدا حیوانوں کے ڈر سے بھاگ کر غاروں میں چھپتے اور درندوں کے خوف وخطر سے ٹیلوں اور پہاڑوں میں پناہ لیتے۔ اتنا بھی اطمینان نہ تھا کہ دو چار آدمی مل کر کھیتی کریں اور کھا دیں۔ اس کا کیا ذکر کہ کپڑا بنیں اور بدن

---

[1] دیکھئے صہم

کو چھپادیں۔ غرض پھل پھلاری، ساگ پات جنگل کا جو کچھ پاتے کھاتے اور درختوں کے پتے سے تن کو چھپاتے۔ جاڑوں میں گرم سیر جاگہ میں رہتے اور گرمیوں میں سردزمین کا رہنا اختیار کرتے

جب اس حالت میں تھوڑی مدت گذری اور اولاد کی بہتایت ہوئی، تب تو اندیشہ دام دور کا کہ ہر ایک کے جی میں سمایا تھا بالکل نکل گیا۔ پھر تو بہت سے قطعے شہر، قریہ، نگر بسا کر چین سے رہنے لگے۔ زراعت کا سامان مہیا کر اپنے اپنے کاروبار میں مشغول ہوئے اور حیوان کو دام میں گرفتار کر کے سواری باربرداری، زراعت کشت کاری کا کام لینے لگے[1] الخ"

اخوان الصفا میں بنی آدم کی آفرینش کے بعد قدیم سماجی، اقتصادی اور تمدنی زندگی کے خاکے جا بجا ملتے ہیں۔ انسانوں اور حیوانوں کے مناظرے دلچسپ اور سبق آموز انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔

اخوان الصفا بہت سی خوبیوں کی حامل ہے۔ اس عہد کی رومانی داستانوں سے بالکل جدا اس میں نیا قصہ بیان ہوا ہے۔ انسان اور حیوان کی جنگ کی عجیب و غریب کہانی بیان کی گئی ہے۔ زبان آسان، اسلوب جاندار اور طرز تحریر عمدہ ہے اسے فورٹ ولیم کالج کی ایک مفید تصنیف کہا جا سکتا ہے۔ آسان زبان اور انتہائی دلچسپ اور نصیحت آموز قصے کی وجہ سے اخوان الصفا بے حد مقبول ہوئی اور کئی کئی ایڈیشن اس کے شائع ہوئے۔

مولوی صاحب کی یہ مفید اور کارآمد کتاب انسانوں کے اثبات دعویٰ

---

[1] دیکھئے اخوان الصفا ص ۹

اور بادشاہ کے فتوی پر ختم ہوتی ہے۔

"بعد ایک آدم کے ایک فاضل زکی نے کہا جب کہ حضور میں انسان کے دعوی کا صدق ظاہر ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان میں ایک جماعت ایسی بھی ہے کہ وہ مقرب الٰہی ہیں (ہے) اور ان کے واسطے اوصاف حمیدہ، صفاتِ پسندیدہ، اخلاق جمیلہ بلکہ سیرتیں عادل قدسیہ، احوال عجیب وغریب ہے کہ زبان ان کے بیان سے قاصر ہے عقل ان کی کنہ صفات میں عاجز ہے۔ تمام واعظ اور خطیب ہمیشہ مدت العمر ان کے وصف کے بیان میں پیروی کرتے ہیں۔ پر فی الواقع ان کے کنہ معارف کو نہیں پہنچتے۔ اب بادشاہ عادل ن غریب انسانوں کے حق میں کہ حیوانات جن کے غلام ہیں، کیا حکم کرتا ہے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ سب انسانوں کے تابع اور زیرِ حکم رہیں۔ اور ان کی فرمانبرداری سے تجاوز نہ کریں، حیوانوں نے بھی قبول کیا اور راضی ہو کر سب نے بہ حفظ وامان وہاں سے مراجعت کی۔

تمام شد رسالہ اخوان الصفا[1]"

مولوی صاحب کی اخوان الصفا میں اردو نثر ابتدائی دور کے اکثر نقائص اور برائیوں سے پاک ہے۔

فارس کا مطبوعہ نسخہ ۱۷۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ دو صفحات میں تتمہ پر فہرست دی گئی ہے۔ پروفیسر (T. P. MANUAL) مینول نے اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

طبقات الشعرا میں مولوی اکرام علی کو شاعر بھی لکھا گیا ہے لیکن انکا کلام

---

[1] دیکھئے اخوان الصفا ص ۱۷۲

کہیں نظر سے نہیں گذرا۔ اور اس عہد یا بعد کے کسی تذکرے میں مولوی صاحب کا حال نہیں ملتا ہے اور ان کو شاعر کی حیثیت سے کوئی شہرت نہیں ملی۔

مولوی صاحب ۱۸۲۰ء تک کلکتے میں تھے اس کے بعد ان کی بابت کچھ معلوم نہیں ہوتا ہے۔ وہ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر وطن لوٹ گئے ہوں گے ناد م سیتاپوری نے لکھا ہے کہ مولوی اکرام علی ہندوستانی پریس کے مالک تھے جو صحیح نہیں ہے۔ ہندوستانی پریس کے مالک ڈاکٹر ہنٹر اور ولسن تھے اور انتظام کار دیوان رام کنول سین تھے۔ مولوی صاحب کا ہندوستانی پریس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

مرزا مغل نشاںؔ

مرزا مغل لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک راسخ العقیدہ شیعہ خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ انھوں نے عربی فارسی کے علاوہ مذہبی علوم کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کا سن پیدائش معلوم نہیں، چونکہ وہ فورٹ ولیم کالج کے باتنخواہ منشی نہیں تھے۔ لہٰذا ان کا ذکر شاذ شاذ ہی ملتا ہے جس وقت مرزا مغل کلکتے آئے تھے ان کی عمر ۳۲ کے لگ بھگ تھی۔ لہٰذا ان کی پیدائش ۱۷۶۶ء اور ۱۷۶۷ء کے درمیان ہوئی ہوگی۔ کاظم علی جواںؔ کے نشاںؔ شاگرد تھے اور جواںؔ کی سفارش پر گل کرسٹ نے ان سے بوستان سعدی کا ترجمہ کروایا تھا۔ انھیں کالج کی ملازمت کی تمنا نہیں تھی بلکہ ان کی دلی آرزو زیارت کعبہ تھی انھوں نے سفر کے اخراجات پورا کرنے کے لئے بوستانِ سعدی کا ترجمہ کیا۔ بوستان سعدی میں مرزا مغل نے اپنا حال بھی تفصیل سے لکھا ہے

"..... اصل اس خاکسار کی عرب اور مولد لکھنو۔ جب یہ خوشہ چینِ سخنوران شاگرد مرزا کاظم علی جواںؔ حاجی مرزا مغل متخلص بہ نشاںؔ کربلائے معلیٰ سے سعادتِ زیارت حاصل کرکے اور صحیفۂ ہدایت حدیقۂ کرامت، سر دفتر صلحا، سرگروہ اتقیا، حاتم دوراں، رستم زماں جناب مرزا حسین علی خاں دام مجدہ ابن امیر الامرا امیر الدولہ نواب حیدر بیگ خاں مغفور کی رفاقت میں مدت تک رہا۔ جب انکی حالت ابتر ہوئی اور اس عرصے میں ہر نوع واجب الحج ہو گیا۔ موافق حکم خدا و رسول ترک وطن واجب

جانا، داغ ہے ابتک اس صحبت کا، خدا پھر ملادے حسب تمنا، غرض اسی اندیشے میں تھا کہ زادراہ بہم پہنچایا چاہیئے اور ہر طریق حج و زیارت کو جایا چاہئے اس فکر و تدبیر میں تھا کہ شہرۂ صاحبان عالی شان کی قدردانی کا سنا۔

ان کی مرتبہ شناسی سوچ کر مرشدآباد سے کلکتے کا ارادہ کیا۔ اور اوصاف حمیدہ سن کے . . . . جناب مسٹر جان گل کرسٹ صاحب دام ظلہ‘ کے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ جوئندہ یا بندہ۔ پس موافق رائے اور اشتہار کے زادراہ کی امید پر عہدِ حکومت میں . . . . . مارکویس ولزلی گورنر جنرل . . . . کے ترجمہ بوستان سعدی کا زبان اردو میں کیا۔ ہر چند بارہ برس سے شعر و سخن ترک تھا اور تحصیل علوم دینی میں مصروف۔ لیکن اہم جان کے خواب و خور اپنے اوپر حرام کر کے جان لڑا کے ایک مہینے کے عرصے میں موافق اس شرح کے جو میر غلام حسین صاحب نے لکھی تھی اور سب شارحوں کے قول جمع کر کے جس کو ترجیح دی تھی اس کو لکھا۔ اور دو مہینے کے عرصے میں لفظ و معنی و محاورات درست کر کے آپی (آپ ہی) اس فقیر نے کتاب کو صاف کیا۔ جو محنت ترجمے میں ہوئی تھی اس سے دو چند اس میں ہوئی۔ لیکن نظر انصاف سے دیکھئے تو ہتھیلی پر سرسوں جمائی اور جو کوئی اس کتاب کی سیر کرے گا، اس پر کھلے گا کہ ترجمہ موافق اصل کے ہے، اور مفہوم بہت کم، مگر جہاں جہاں محاورہ نہ بنتا تھا وہاں کچھ کچھ گھٹایا بڑھایا گیا ہے[۱]۔“

مرزا مغل نے باغ سخن یعنی بوستان سعدی کا ترجمہ آسان زبان میں کیا تھا۔ نشانؔ نے ۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۸ھ جمادی الاول میں باغِ سخن کو مرتب

---

[۱] دیکھئے بوستان سعدی ترجمہ باغ سخن خطی نسخہ دیباچہ ص ۱-۲

کرلیا تھا۔ اور انھیں اس کا صلہ بھی ملا تھا۔ حاجی مرزا مغل کی باغ حمد سے شروع ہوتی ہے ؎

نام سے اس کے دل آگاہ | ابتدا کر تو اس کو بسم اللہ
رکھنے والا وہی جہاں کا ہے | وہی خلاق انس و جاں کا ہے
ہے وہ ایسا حکیم و دانا | جس کی حکمت سے ہے زبان گویا

شروع کرتا ہوں میں اس کے نام سے جو بادشاہ ہے، جان کا پیدا کرنے ہارا (والا) اور حکیم ہے بات زبان پر خلق کرنے والا، صاحب ہے بخشنے والا اور ہاتھ پکڑنے ہارا کریم ہے، گناہ بخشنے والا، اور عذر قبول کرنے والا ایسا عزیز ہے کہ جس نے اس کے در سے سر پھیرا کچھ عزت نہ پائی ...... گیا جس کے در پہ مرتبہ نہ پایا، سر بڑے بڑے بادشاہوں کا اس کی درگاہ میں زمین نیاز پر جھکا ہوا ہے، نہ گردن کشوں کو ان کے غرور کے سبب جلد سزا دیتا ہے اور نہ عذر کرنے والوں کو جور سے نکلوا دیتا[1]"

خدا کی حمد نظم اور نثر میں لکھنے کے بعد حضور سرور کائنات کی نعت تین چار صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ بوستان میں سعدی کے حمد و نعت، سعدی کی زندگی اور تعارف کا بھی ترجمہ کر دیا گیا ہے۔

بوستان سعدی ایک شہرۂ آفاق کتاب ہے جس کا ترجمہ دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ہوا ہے۔ مرزا مغل نشاں کا اُردو ترجمہ بھی مفید اور عمدہ ہے مرزا مغل کی زندگی کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گذرا اس لئے لکھنوی زبان کے ابتدائی

---

[1] دیکھئے باغ سخن ص۱۳

نمونے ان کے یہاں ملتے ہیں۔ ترجمہ میں زبان کی سلاست اور برجستگی برقرار ہے
باغ سخن کا پہلا باب عقل و دانائی اور سلطنت کی تدبیر میں ہے۔

"دین کے بزرگوں سے نقل کرتے ہیں جو عارف کامل تھے کہ ایک صاحبدل
شیر پہ سوار کوڑے کی جگہ سانپ ہاتھ میں لئے اس کو دوڑائے جاتا تھا ایک شخص
نے اس سے کہا کہ اے مرد خدا جس راہ کو تو جاتا ہے مجھے بھی دکھلا کیا عمل تو نے
کیا کہ درندہ تجھ سے ہل گیا۔ اور نگیں سعادت کا تیرے نام ہوا۔ اوس نے کہا کہ
اگر شیر سانپ میرا تابعدار ہو، اور اگر ہاتھی یا گینڈا تو اچنبھا نہ کر تو بھی خدا کی
نافرمانی نہ کر تیرے بھی حکم سے کوئی باہر نہ ہوگا جب حاکم خدا کے کہنے پر چلے تو
خدا اوس کا رکھوالا اور یاد رہے۔ جب خدا تجھے دوست رکھے محال ہے دشمن
کے ہاتھ تجھے......

حکایت :۔ ایک شخص کو شیر پہ سوار میں نے دیکھا کہ رودبار کے میدان سے
آتا ہے۔ ایسی دہشت مجھ پر غالب آئی کہ خوف سے میرے پاؤں پھول گئے۔
مسکرا کے بولا کہ اے سعدی جو تو نے دیکھا اس کا تعجب نہ کر یہ راہ ہے موںہہ
طریقت سے نہ پھیر، اس راہ میں قدم دھر جو مطلب پھر چاہے حاصل کر سے

نصیحت اسے ہوئے گی سودمند جو سعدی کی باتیں کرے گا پسند[1]

باغ سخن مرزا مغل نشاں کی ایک ہی ادبی پونجی ہے۔ اس کے علاوہ ان
کی کسی اور تالیف کا پتا نہیں چل سکا۔ باغ سخن کی آخری حکایت یہ ہے کہ
"سنا ہے میں نے کہ ایک شرابی مسجد کے حجرے میں گھس گیا اور رونے لگا

---

[1] دیکھئے باغ سخن خطی نسخہ صہ ۲۲

درگاہ قدس الٰہی میں کہ یارب بہشت بریں میں مجکو لے جائیو، مؤذن نے اس کا گریبان پکڑ کے ہاں نکل کہاں آیا ہے۔ کتا اور مسجد، اے بے عمل و بے دین کیا نیک کام کئے تو نے جو بہشت مانگتا ہے۔ بدصورتی پر ناز نہیں پھبتا۔ مؤذن نے جب یہ بات کہی اس شرابی نے رو دیا کہ میں مست ہوں خواجہ مجھ سے ہاتھ اٹھا تعجب رکھتا ہے تو حق تعالیٰ کی مہربانی سے جو امیدواروں کے گناہ بخش دے تجھ سے میں نہیں کہتا کہ مرا عذر قبول کر دروازہ توبہ کا کھلا ہے[1]۔"

باغِ سخن کا یہ خطی نسخہ چار سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے لیکن مقام افسوس ہے کہ باغ سخن شائع نہ ہو سکی۔ تتمہ پر یہ عبارت درج ہے۔

فضل الٰہی سے ترجمہ سعدی کی بوستاں کا عہد میں زبدۂ نوینان عظیم الشان مشیر خاص بارگاہ انگلستان، مارکویس ولزلی گورنر جنرل لارڈ مارنگٹن کے شہر کلکتے میں ۱۲۱۸ھ ساتویں جمادی الاول تمام ہوا۔"

باغ سخن کے علاوہ نشاں کی کسی اور تالیف کا پتا نہیں چلتا ہے۔

مرزا مغل کاظم علی جواں کے شاگرد تھے اور نشاں تخلص کرتے تھے لیکن ان کی شاعرانہ حیثیت اس لئے متعین نہیں کی جا سکتی ہے کہ ان کا مجموعۂ کلام ترتیب نہ پا سکا۔ اور نہ ہی شاعروں کے تذکروں میں ہی ان کا کوئی حال ملتا ہے۔

---

[1] دیکھیے باغ سخن خطی نسخہ صفحہ ۹

خوانِ نعمت

'خوانِ نعمت' کالج کے تنخواہ دار منشی مولوی سید حمید الدین بہاری کی واحد تالیف ہے۔ سید صاحب نے اس کے علاوہ کوئی اور کتاب نہیں لکھی۔ سید حمید الدین کی اس تالیف سے متعلق بھی اب تک غلط فہمیاں باقی ہیں اور فرضی باتیں لکھی گئی ہیں۔ خوانِ نعمت کا نام اب تک الوان لکھا گیا ہے اور اکثر محققوں نے خوانِ الوان کو سید صاحب کی اپنی تصنیف قرار دیا ہے۔ لیکن خوان نعمت کے خطی نسخہ میں سید صاحب نے سبب تالیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کالج کے شعبہ ہندوستانی کے پروفیسر جان گل کرسٹ صاحب کی فرمائش پر فارسی کی مشہور کتاب خوان الوان کا جو کھانا پکانے کے قیمتی نسخوں سے متعلق ہے، ترجمہ آسان ہندوستانی زبان میں کیا تھا اور اس کا نام خوانِ نعمت رکھا تھا۔

افسوس ہے کہ خوانِ نعمت، کے دیباچے میں مولوی سید حمید الدین نے اپنا حال اختصار سے بھی نہیں لکھا ہے۔ اور چونکہ انھیں شعر و شاعری سے کوئی شغف نہیں تھا اس لئے ان کے عہد کے تذکروں میں ان کا کہیں ذکر بھی نہیں ملتا ہے۔ بہار میں اردو زبان اور ادب کے ارتقا کے مؤلف ڈاکٹر اختر اورینوی نے سید صاحب کا سرسری ذکر کیا ہے لیکن ان کی حیات پر سے پڑی ہوئی نقاب اُلٹ نہ سکے، غالباً سید صاحب عظیم آباد اور گیا ضلع کی سرحدوں سے متصل ایک

بستی میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن صغر سنی میں ہی کسب تعلیم کی غرض سے کلکتے چلے آئے تھے اور کالج میں روزگار حاصل ہونے کے بعد انھوں نے کلکتے ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

خوانِ نعمت سید صاحب کا تنہا ادبی کارنامہ ہے۔ اس میں انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں کی تیاری کے نسخے تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب کی تالیف اور ترجمہ کا سبب سید صاحب نے خوانِ نعمت کے دیباچے میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"بعد حمد و نعت کے ادنیٰ بندہ سید حمید الدین بہاری صاحب عالی شان درماندوں کے دستگیر فیض و کرم کے دریا اور زمانے کے حاتم یعنی جناب گل کرسٹ صاحب کے حکم سے خوان الوان نام کتاب کا کہ کھانوں کے اقسام میں ہے ترجمہ کیا، اس ترتیب سے کہ باب کی جگہ خوان کے نام رکھ کر چوبیس خوان مقرر کیئے۔ اس تفصیل سے کہ لکھتا ہوں کہ پہلا خوان روٹیوں کی بحث میں.... ۲۳ واں خوان دال کی بحث میں اور ۲۴ واں خوان اصلاحوں کی بحث میں اور نام اس کا خوان نعمت رکھا۔[1]"

خوان نعمت کا ترجمہ ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوا تھا۔ گل کرسٹ کی ہدایت پر کالج کے ناظم ولیم ہنٹر نے اس کتاب کی اشاعت کا بھی انتظام کیا تھا لیکن ۲۴ رفروری ۱۸۰۴ء میں گل کرسٹ کی لندن مراجعت کے بعد خوان نعمت، دوسری مفید کتابوں کی طرح قلمی نسخہ کی شکل میں محفوظ رہ گئی ہے۔ خوانِ نعمت کا مخطوطہ بوسیدہ

---

[1] دیکھئے خوان نعمت، قلمی نسخہ ۲۱۰ (ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری)

حالت میں ہے۔ اور ۶×۱۰ سائز پر ۱۸۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

مولوی حمید الدین صاحب کی خوانِ نعمت خدا کی حمد سے شروع ہوتی ہے۔

"۔۔۔کردن شکر اور احسان اس خالق کے (کا) جس کے خوان احسان سے ہر ایک خاص و عام کو لاکھوں طرح کی نعمتیں بے کھٹکے پہنچتی ہیں اور اس زمین کے چوڑے دستر خوان پر اس کے صدائے عام سے کیا زور آور کیا نربل کیا لنگڑے کیا لولے کیا اپاہج سب آسودہ ہو جاتے ہیں[1]۔"

خدا کی حمد کے بعد سبب تالیف درج ہے۔ اور پھر روٹیوں کی بحث سے شروع ہوتی ہے۔ مختلف روٹیوں کے پکانے کا قیمتی نسخہ دیا گیا ہے۔ پہلی بحث روٹی سے متعلق ہے۔

"میدا پاؤ سیر، گھی چھ تولہ، دودھ پاؤ سیر، خمیر کا ماوا ایک تولہ، نمک چھ ماشہ ان تمام چیزوں کی آمیزش سے روٹی پکانے کی ترکیب بتائی گئی ہے۔ چنے کے بیسن کا حلوا بنانے کی ترکیب یہ ہے۔

"چنے کا بیسن ایک سیر، چینی ایک سیر، دودھ دو سیر، بیسن گھی میں بھونٹے اور دودھ خوب اونٹا کر چینی میں ملا دے اور جب تیار ہو چکے اتار لے۔"

بیسن کے حلوے کے بعد حلوائے روغن اور نشاستے کا فالودہ تیار کرنے کے مفید نسخے دئے گئے ہیں۔ سادہ قلیہ پکانے کا بھی نسخہ مفید اور روزمرہ کی ضرورت کے لئے بھی ہیں۔ اس طرح پوری کتاب انواع واقسام کے لذیذ کھانوں کی تیاری کے قیمتی نسخے پر مشتمل ہے۔

---

[1] دیکھئے خوان نعمت قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری۔

حلوا، قلیہ، روٹی، دال اور ماش کی دال پکانے کے جو نسخے دئے گئے ہیں ان سے اس زمانے کے سماجی اور معاشی زندگی کا مبہم ساخاکہ ملتا ہے۔ یزدی روٹی کے لئے پاؤ سیر میدا میں چھ تولہ گھی، پاؤ سیر دودھ اور خمیر کا ماوا اشارہ کرتا ہے کہ اس زمانے میں کھانے کی تیاری میں کس قدر اہتمام کیا جاتا تھا اور لوگ کس قدر آسودہ حال تھے۔

بلا شبہ سید صاحب کی اس تالیف کی کوئی خاص ادبی حیثیت نہیں ہے اور عصر حاضر میں اسے خاص اہمیت بھی نہیں ہے۔ پھر بھی یہ کارآمد اور مفید کتاب ہے۔ اس سے مغل عہد کے لذیذ کھانوں کی فہرست اور ان کے تیار کئے جانے کی ترکیب معلوم ہوتی ہے۔ سید صاحب کی خوان نعمت ماش کی دھوئی دال پکانے کے نسخے پر ختم ہوتی ہے۔

"ماش کی دھوئی دال ایک سیر گھی ڈیڑھ پاؤ دارچینی ایک ماشہ ادرک ایک تولہ گول مرچ تین ماشا، نمک ڈیڑھ تولہ گھی میں ڈالی اور ادھا مصالحہ جب نیم پخت ہو ادرک کا عرق اور کالی مرچیں ڈالے جب تیار ہو جاوے باقی دارچینی پیس کر ملادے اور دم دے کر آتار لیوے[1]"

سید صاحب کی یہ تالیف نثر کا عمدہ نمونہ نہیں بلکہ خشک اور غیر دلچسپ ہے۔ پھر بھی اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سید حمیدالدین بہاری کو بھی اردو کے قدیم نثر نگاروں میں اپنی ایک الگ جگہ حاصل ہے۔ سید صاحب نے خوان نعمت کے علاوہ کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اس کتاب کی ادبی حیثیت گو نہ ہونے

---

[1] دیکھئے خطی نسخہ خوان نعمت صفحہ ۱۷۹-۱۸۰

کے برابر ہے۔ پھر بھی اس کا اسلوب بے کیف اور بے جان نہیں ہے۔ خشک موضوع ہوتے ہوئے بھی سید حمید الدین بہاری نے بڑی کامیابی سے اپنا فرض نبا ہا ہے اور عمدہ اور رواں دواں ترجمہ کیا ہے۔ عبارت میں زیادہ جھول نہیں ہے۔ حمید الدین صاحب قصے کہانیوں کی کتابوں کا ترجمہ کرتے یا ہلکی پھلکی دلچسپ اور مزیدار کتابیں تصنیف و تالیف کرتے تو اردو نثر کی بڑی خوش بختی ہوتی۔ اور اردو کلاسیکی ادب کو ایک کامیاب اور منفرد نثر نگار مل جاتا۔

PHOTO OF "DEWAN WLA"

By

MAZHAR ALI KHAN

کربل کتھا
یا
دہ مجلس

کربل کتھا یا دہ مجلس کو اردو کی قدیم ترین نثری کتابوں میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ اس وقت تالیف ہوئی جب اردو نثر کی خال خال کتابیں پائی جاتی تھیں۔ کربل کتھا کے قبل دکن میں معراج العاشقین، رسالہ گنج العلم اور ملا وجہی کی سب رس جیسی گنی چنی کتابیں نثر کی کل ادبی متاع تھی۔ دکن کے اثر سے جب اردو شمالی ہند میں مقبول ہوئی اور ادبی زبان کے سانچے میں ڈھلی تو ساری ذہنی تخلیقی قوت شعروشاعری کے سنوارنے اور شاعری کی دلہن کے کاکل میں نئے خوبصورت خم پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ نثر عدم توجہی کا شکار رہی۔ کہیں جا کر بارہویں صدی ہجری یعنی ۱۱۴۵ھ میں اردو کی پہلی اور مشہور نثری کتاب کربل کتھا[1] یا دہ مجلس لکھی گئی۔ دہ مجلس اصل میں ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہے۔ فضل علی فضلی نے براہ راست دہلی میں اس وقت کی مروجہ زبان کھڑی بولی میں اس کا ترجمہ کیا تھا۔ دہ مجلس میں بارہ مجلسیں ہیں۔ پہلی مجلس حضرت رسول کی حیات طیبہ کے چند آخری لمحات

---

[1] فضلی کی کربل کتھا کو مفید معلومات، نوٹ اور حواشی کے ساتھ مختار الدین احمد آرزو اور مالک رام نے ترتیب دیا اور یہ شائع ہو کر ادبی و علمی حلقے میں مقبول بھی ہو گئی ہے۔

کے واقعات سے شروع ہوتی ہے۔ اور بارھویں مجلس سید الشہدا حضرت امام حسین کی شہادت پر ختم ہوتی ہے۔

دہ مجلس ایک نادر اور قدیم کتاب ہے اور مغربی ہندی اور کھڑی بولی کا ایک قدیم اور نادر نمونہ ہے۔ فضل علی فضلی راسخ العقیدہ شیعہ تھے اور روضۃ الشہدا کا ترجمہ ۲۲ سال کی عمر میں بڑی محبت اور لگن سے کھڑی بولی (ہندوستانی) میں کیا تھا۔ فضلی کی کربل کتھا ایک مذہبی اور معلومات افزا کتاب ہے۔ اس میں آلِ رسول اور اہلِ بیعت پر ڈھائے گئے مظالم اور کربلا کے تپتے ہوئے ریگ زار میں حضرت حسینؓ اور ان کے سرفروش ساتھیوں کی شہادت اور یزیدی فوج کی شقاوت اور بہیمیت کی دردناک داستان انتہائی اثر انگیز انداز میں بیان کی گئی ہے۔

ملک محمد جائسی کی پدماوت کی طرح دہ مجلس یا کربل کتھا کھڑی بولی یا قدیم ہندی میں فارسی رسم الخط میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی زبان سب رس یا معراج العاشقین کی بہ نسبت زیادہ صاف ہے۔

فضلی کی کربل کتھا یا دہ مجلس کا ترجمہ فورٹ ولیم کالج کے تنخواہ دار منشی محمد بخش نے گل کرسٹ کی فرمائش پر اردو زبان میں کالج کے لئے کیا تھا۔ منشی محمد بخش نے ۱۸۰۱ء کے آخر میں فضلی کی کربل کتھا کو آسان اور عام فہم زبان میں مکمل کیا اور ۱۸۰۲ء میں گل کرسٹ صاحب کی خدمت میں پیش کی تھی۔ غالباً گل کرسٹ منشی محمد بخش کے کام سے مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے گل کرسٹ کے ایما پر مظہر علی خاں ولا نے محمد بخش کی تالیف پر تجدید نظر کی اور مناسب اصلاح و ترمیم کے بعد اس کی اشاعت کے لئے مناسب قرار دیا۔ دیباچہ بھی ولا کا ہی نوشتہ ہے۔ لیکن منشی محمد بخش کا مختصر حال

لکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ منشی محمد بخش کے بارے میں اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ بہار کے رہنے والے تھے لیکن بچپن ہی سے کلکتہ میں سکونت پذیر تھے۔ اور مدرسہ عالیہ کلکتہ سے فارغ تحصیل ہونے کے بعد کالج کے اردو اور فارسی شعبہ میں ملازم ہو گئے تھے۔ اس سے زیادہ حال محمد بخش کا معلوم نہیں۔ پھر بھی ان کی محنت اور کام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مظہر علی خاں ولا نے دہ مجلس کی مناسب اصلاح و ترمیم کی اور دیباچے میں اس کی تالیف کا سبب بھی درج کیا ہے۔

"اب یہاں سے مظہر علی خاں ولا خدمت میں صاحبانِ سخن کی یہ التماس کرتا ہے کہ اس ہیچ مداں کو اگرچہ اتنا دعویٰ نہیں کہ کسی کے کلام کو اصلاح اور تصیح کرے مگر عہد میں عالی گوہر بادشاہ ظل اللہ اور حکومت میں اس عادل زماں کی کہ جس کی دعا کے ایک بیشہ میں شیر و آہو بستے تھے اور ایک آشیانے میں باز و کبوتر رہتے ہیں وہ امیر الامرا زبدہ نوئینان عالیشان مشیر خاص حضور شاہ کیواں بارگاہ انگلستان اشرف الاشراف مارکوئس ولزلی، گورنر جنرل بہادر ممالک محروسہ سرکار کمپنی انگریز متعلقہ کیشور ہند فدوی شاہ عالم بادشاہ خلد اللہ ملکہ کے سن بارہ سو اٹھارہ ہجری نوازش الطاف سے صاحب عالیشان جان گل کرسٹ صاحب بہادر حشمتہ کے یہ اتفاق ہوا کہ جب منشی محمد بخش نے ترجمہ دہ مجلس کا زبان اردو میں کر کے گذرانا، انھوں نے اصلاح کے لئے احقر کو فرمایا۔ چندے ان کے یہاں رہتے ان کا فرمانا بجا لایا۔ اور ان کے ولایت کو تشریف لے جانے کے بعد حسب الحکم جناب کپتان موبت صاحب دام دولتہ کے جو ان کے قائم مقام مدرس تفریق ہندی کے ہیں، چندے اصلاح کیا (کی) اور جہاں جہاں منشی مذکور نے شعروں کا ترجمہ نثر میں

کیا تھا، انھیں نظم کر دیا تھا۔ اور جہاں کہیں چھوڑ دیا تھا انھیں بھی منظوم کر کے تمام کیا۔"[1]

سبب تالیف بیان کرنے کے ساتھ اس زمانے کے قاعدے کے مطابق ایک بیت میں سن تالیف بھی بیان کیا ہے ؎

تاریخ کی تھی فکر کہ ہاتف نے یوں کہا
غم نالہ امام ۔ یہ تاریخ اس کی ہے

ولاؔ کے اس دیباچے سے کم سے کم اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ فضل علی فضلیؔ کی دہ مجلس یا کربل کتھا[2] کو سامنے رکھ کر کالج کے لئے آسان زبان میں دوبارہ لکھا محمد بخش کی دَہ مجلس شروع ہوتی ہے

"روایت کرنے والے اخبار پرالم کے اور نقل کرنے والے حکایت درد و غم کی اس طرح بیان کرتے کہ ابتدائے ماہ سفر کرتے ہیں، کہ ابتدائے ماہ صفر ضعف ذات مقدس، ومطہر میں جناب محمد کی ظاہر ہوا تھا اور دن بہ دن زیادتی کرتا تھا چنانچہ اپنی وفات کے احوال اکثر اصحاب واحباب سے فرماتے تھے جبکہ حضرت کی بیماری کا احوال مومنوں پر معلوم ہوا حیران وسراسیمہ سب مسجد نبوی میں جمع ہوئے یہ خبر جناب رسول اللہ کو ہوئی روئے مبارک اپنا جناب حضرت امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی طرف کر کے فرمایا یہ لوگ کیا کہتے ہیں۔[3]

---

[1] دیکھئے قلمی نسخہ دَہ مجلس ص ۳۰۲ [2] کربل کتھا، فضلی، شائع ہو چکی ہے۔ جناب مالک رام ایم اے اور مختار الدین آرزو نے مفید حواشی ترمیم اور اضافے کے ساتھ اسے شائع کیا ہے۔ ج۔ ن۔

[3] دیکھئے قلمی نسخہ دہ مجلس ص ۳-۴

دہ مجلس میں حضرت رسول کے وصال کے بعد ہی حضرت فاطمہ کے وصال کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت فاطمہ کے عالم نزع کی کیفیت حضرت علی کی بے بسی حضرت امام حسنؓ اور حسینؓ کی بے تابیاں اور گریہ وزاری کی بڑی دردناک تصویر کھینچی گئی ہے جسے پڑھ کر سنگ دل انسان بھی بلبلا اٹھے گا اور پلکیں بھیگ جائیں گی۔ حضرت حسنؓ و حسینؓ کو حضرت علی کس بہانے سے نانا جان کے مزار شریف پر بھیج دیتے ہیں تاکہ بچے پر ماں کی موت کا گہرا اثر نہ ہو، لیکن دونوں بچے رسول صلعم کے مرقد شریف سے فوراً لوٹ آتے ہیں انکو اپنی ماں کے وصال کا پتا نانا کے مرقد شریف میں مل جاتا ہے اور بے تابانہ ماں کے بالیں پر سر رکھ کے التجا کرنے اور زار وقطار رونے لگتے ہیں۔

"حضرت امام حسن نے رو کر کہا کہ اے مادر مہربان اس فرزند آرزومند سے اس وقت دمِ واپسیں کوئی بات کر لے اور ایک طرف حضرت امام حسین پکارے کہ اے مادر مہربان میں تیرا بیٹا ہوں، حسین مجھ سے اس وقت ہم کلام کیوں نہیں ہوتی۔ تمہاری مفارقت کے سبب میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔۔۔ الخ"[۱]

روضۃ الشہدا کے مصنف ملا حسین واعظ کاشفی اور دہ مجلس کے مترجم فضلی دونوں ہی راسخ العقیدہ شیعہ تھے۔ اس لئے ان کے یہاں آلِ رسول اور اہل بیت پر فاسق یزید بن معاویہ کے مظالم، اسکی شقاوت، بہیمیت اور درندگی کا بیان نہایت ہی اثر انگیز انداز میں ملتا ہے۔ اور

۱؎ دیکھئے ق. ن ص ۱۸۱

ہر حساس دل یزید کی شقاوت اور مظلوم امام پر روح فرسا مظالم کی داستان
پڑھ کر رو پڑتا ہے۔

کربل کتھا یا وہ مجلس سید الشہدا حضرت امام حسین کی شہادت پر ختم ہوتی
ہے۔ اس وقت جب حضرت امام کے تمام عزیز و اقارب اور وفادار جاں نثار
ساتھی ایک ایک کر کے لشکر یزید کے ہاتھوں شہید ہو جاتے ہیں تو فاسق و فاجر
یزید کے ہاتھوں بیعت کرنے کے بجائے حضرت امام حسین زرہ بکتر پہن کر اور ہتھیار
بند ہو کر ذوالجناح پر سوار ہونے لگتے ہیں اس وقت حضرت امام حسین کی ایرانی
بیوی شہر بانو ان کے قدموں پر گر جاتی ہیں اور حسرت و یاس کی تصویر بنی امام کو
وداع کرتے وقت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہیں اور اپنی بے کسی کا حال
بیان کرتی ہیں

"اے سرور دو جہاں والی فخر کون و مکاں میں یہاں غریب الوطن ہوں، تمہاری
بہن بیٹیاں اولادیں جناب رسالت مآب کی ہیں۔ انھیں کوئی ہاتھ نہیں لگائے
گا، لیکن میں سوائے تمہارے اور آسرا نہیں رکھتی، بعد تمہارے مجکو قوم اعدا کے
ہاتھ سے کون بچائے گا، فرمایا اے شہر بانو کچھ اندیشہ مت کرو کہ خدا تیری عصمت
کا محافظ ہے۔ تجھ پر کسی کا ہاتھ نہیں پہونچ سکے گا لیکن بعد میری شہادت کے
جس وقت کہ ذوالجناح میرے خون سے اپنے بال و چوٹی تر کر کے تجکو میری
شہادت کی خبر دینے آئے تو اسکی پشت پر سوار ہونا اور جہاں وہ لے جائے
چلی جانا۔ یہ کہہ کر گھوڑا افواج اعدا میں ڈالدیا۔ زیادہ اس سے روایت تو
نہیں ہو سکتی، اب آگے شرح شہادت تو ہو نہیں سکتی۔ انا للہ

وانا الیہ راجعون[1]۔"

فضلی کی کربل کتھا یا دہ مجلس[2] اردو نثر کا قدیم ترین نمونہ کہی جاسکتی ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں اردو زبان اور خاص کر نثر کا ایک نیا ہیولیٰ تیار ہو چکا تھا اور اٹھارہویں صدی کی بہ نسبت اردو نے زیادہ واضح اور منفرد شکل اختیار کر لی تھی۔ اس کے اشکال میں بہت تبدیلیاں ہو چکی تھیں غالباً اس وجہ سے محمد بخش نے گل کرسٹ کی ہدایت خاص پر انیسویں صدی کی آسان زبان میں کربل کتھا کو دوبارہ لکھا ہے۔ مقام افسوس ہے کہ محمد بخش کی کربل کتھا یا دہ مجلس زیور اشاعت سے آراستہ نہیں ہو سکی۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں اس کا نادر خطی نسخہ محفوظ ہے جو ۱۶۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔
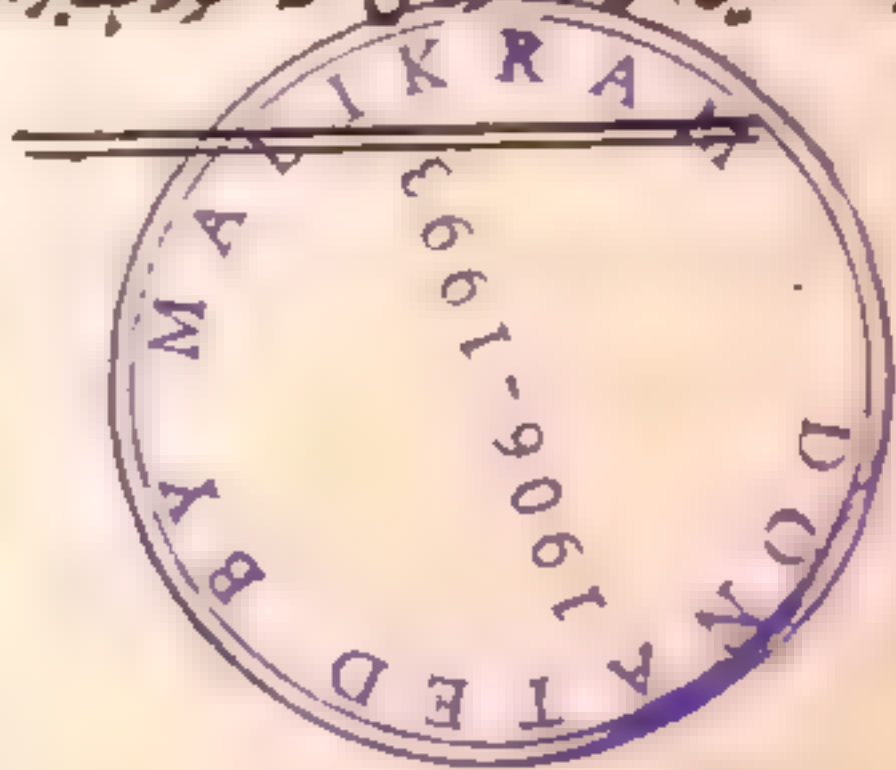
[1] دیکھئے قلمی نسخہ ورق ۸۴-۸۵ [2] فضلی سے پہلے ولی دکنی نے دہ مجلس کا ترجمہ (منظوم) دکھنی زبان میں کیا تھا۔ لیکن اسے مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری میں موجود ہے۔

اقبال نامہ

"اقبال نامہ" سید بخشش علی فیض آبادی کی تالیف ہے۔ سید بخشش علی فیض آبادی لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور صاحبان کالج کی اردو نوازی اور سرپرستی کا شہرہ سن کر کلکتہ آئے۔ گو بخشش علی کو کالج کی ملازمت نہ مل سکی لیکن انھوں نے سیر المتاخرین کے ایک حصے کا اردو میں کالج کے لئے ترجمہ کیا۔ سیر المتاخرین ایک مبسوط اور ضخیم فارسی تالیف منشی غلام حسین کی ہے۔ سید صاحب نے سیر المتاخرین کا انعام کے لئے ترجمہ کیا تھا۔ لہٰذا انھوں نے صرف اس حصے کا ترجمہ کیا جس میں نو وارد انگریزوں کی حکومت، تدبر اور عظمت کے گیت گائے گئے ہیں اور ان کی فتوحات کا حال تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

اقبال نامہ کی ترتیب کا سبب بخشش علی نے دیباچے میں خود بیان کیا ہے۔

"معلوم ہو کہ سید بخشش علی فیض آبادی نے ترجمہ سیر المتاخرین کا جس میں صاحبان عالیشان کی ابتدائے ریاست، شجاعت وعدالت کا بیان مفصل لکھا ہے۔ مدرسانِ ہندی جناب ٹیلر صاحب اور جناب مارٹن صاحب بہادر دام ظلہ ..... کی فرمائش کے بموجب جن کے سایہ دولت میں سب شرفا و نجبا، آرام وراحت سے استراحت کرتے ہیں متعلمان کالج کے واسطے لکھا بس کہ اس کتاب میں صاحبان عالیشان کی شہادت و تدبیر کا حال مفصل

بے کم و کاست لکھا ہے۔ اغلب کہ اکثر صاحب اِس کے مطالعہ سے مسرور ہوں۔[1]

اقبال نامہ کا ترجمہ ۱۸۰۵ء میں مکمل ہوا تھا لیکن یہ تاریخ بھی شائع نہ ہو سکی۔ اقبال نامہ میں انگریزوں کی دانائی، حکمت عملی، عدل گستری اور حکومت کا حال خوشامدانہ لب و لہجہ میں بیان ہوا ہے۔ اقبال نامہ میں متعدد ابواب ہیں اور ہر باب میں کا عنوان سیر المتاخرین کے ڈھنگ پر قائم کیا گیا ہے پہلا باب ہے۔

"سراج الدولہ علی وردی خاں کا نواسہ تھا۔ اسکے جلوس کا بیان تینوں صوبوں بنگالے، بہار، اڑیسے کی مسند حکومت پر بیٹھنے اور جو ماجرے اس کے عہد دولت میں واقع ہوئے۔"

جبکہ سراج الدولہ ماتم داری و تعزیت سے فارغ ہو کر حکومت کی مسند پر بیٹھا۔ فرمایا کہ تھوڑی فوج طیار رہو، اس کی خالہ بی بی گھسیٹی کو جو نواب علی وردی خاں کی بڑی بیٹی شہامت جنگ کی زوجہ تھی۔ اور اس نے اپنی سکونت و بود و باش موتی جھیل پر اختیار کی تھی۔ وہاں سے لا کر کسی مکان میں نظر بند رکھے اور سب مال و اسباب ضبط کر کے خاص خزانے میں داخل کرے۔ بی بی گھسیٹی کے سبب رفیقوں، ہوا خواہوں نے علی وردی خاں کے مرتے ہی کمال بے وفائی کی۔ باوجودیکہ بہت سا مال و زر اس کی رفاقت کرنے اور سراج الدولہ سے لڑنے کے وعدے پر اس احمق بی بی سے لیا کرتے تھے۔ تس پر بھی اپنا اپنا سیفتا کیا

---

[1] دیکھئے اقبال نامہ مخطوطہ ص ۱

اور جدھر مناسب جانا چلے گئے۔ اور عمدہ لوگ جو شہر کے باشندے تھے اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے رہے مگر جماعت قلیل جو باقی رہ گئی تھی فوج کے گھیر لینے سے مضطرب و بیقرار ہوئی[۱] "

دوسرا باب کلکتے پر نواب سراج الدولہ کی فوج کشی اور صاحبوں کی پسپائی سے عبارت ہے مگر پسپائی کے ساتھ صاحبوں کی ہمت اور شجاعت کے قصیدے لکھے گئے ہیں اور سراج الدولہ کی عارضی فتح کو 'فریب' اور 'دھوکا' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور بلیک ہال ٹریجڈی کا فرضی قصہ دہرایا گیا ہے۔

سید بخشش علی کا ترجمہ ستھرا ہے لیکن عبارت کہیں کہیں پیچیدہ ہو گئی ہے اور قلمی نسخہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں جا بجا غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں مگر اسکی افادیت سے اس لئے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں بنگالہ خصوصًا کلکتہ مرشدآباد اور ہوگلی کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالات کی ہلکی سی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اور بنگال میں مغل تہذیب و تمدن، آن بان اور شان و شوکت کے زوال کی عبرت انگیز کہانی بھی۔

---

[۱] ملاحظہ ہو اقبال نامہ قلمی نسخہ ص۲

شہنامہ ہندی

شہنامہ ہندی محمد علی ابن سید نثار علی ترمذی نانوتوی کا ایک یادگار کارنامہ ہے محمد علی ابن سید نثار فورٹ ولیم کالج کے لئے کالج کونسل کے مصاحبوں کے حکم سے ۱۲۲۶ھ مطابق ۱۸۱۱ء میں شمشیر خانی کا ترجمہ و تلخیص اردو میں کیا تھا۔ شمشیر خوانی کے مترجم سے ادبی دنیا واقف نہیں اردو ادب کی تاریخ یا تذکرے میں شہنامہ ہندی یا محمد علی کا کوئی ذکر نہیں ملتا لیکن یہ اردو ادب کی خوش نصیبی ہے کہ شہنامہ ہندی کے مولف نے اپنا حال اور ترجمہ کا سبب اپنی تالیف کے دیباچے میں لکھا ہے۔ شمشیر خانی فارسی نثر میں ۱۰۶۳ھ میں ترتیب و تالیف ہوئی۔ شمشیر خانی دنیا کی عظیم اور شاہکار رزمیہ نظم فردوسی کے شاہ نامے کا مخلص ہے۔ محمد علی لکھتے ہیں۔

" خاطی ہیچمداں محمد علی ابن نثار علی ترمذی نانوتوی کی یہ سرگذشت ہے۔ لہٰذا پہلے نواب وزیر الممالک آصف الدولہ مغفور ناظم لکھنؤ کے عہد میں نواب سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں مرحوم نائب صوبہ کی خدمت میں چودہ برس تک مصاحبت میں سرگرم رہا۔ چنانچہ جو اشخاص کہ اس مرحوم کی صحبت سے بہرہ مند ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ پھر ناسازی طالع شوم سے نواب مرحوم کی خدمت سے جدا ہوئے۔ بہت تصدیعیں اٹھائیں

یہاں تک فکر اندیشے کے دریا میں پڑا ہوا غم وغصہ کی لہروں کے تلاطم سے صدمے اٹھاتا ہوا بہتا بہتا دار الامین کلکتے میں کہ ساحل نجات ہے آنکلا۔ پہلے صاحب والامناقب، مخزن جود وسخا، معدنِ علم دین، الگذینڈر گالوی صاحب کی خدمت میں کئی مہینے سعادت اندوز رہا۔ بعد صاحب ممدوح کی سفارش سے کپتان ولیم اسٹرک صاحب کے لفٹنٹ جنرل جارج ہویت صاحب بہادر دام اقبالہ کے میر منشی تھے انکی بندگی میں حاضر رہا۔ جب صاحب والامناقب ۵ اگست ۱۷۹۱ء میں پینا پٹن (مندراج یعنی مدراس) میں وفات پائی۔ بندہ ہمرکاب ظفر انتساب جنرل صاحب کے مندراج سے چلا اور رڈیانہ نام جہاز میں کہ جہاز کا کپتان مارشل صاحب تھا بندہ نے جو کچھ طوفان کے صدمے اٹھائے بیان سے باہر ہیں۔ خدا دشمن کے دشمن کے بھی نصیب نہ کرے۔ جب کلکتے پہونچا دوبارہ تو گل سر سبد گلشن رفعت واقبال صاحب والا مناقب کپتان جیمس ہارن صاحب بہادر کہ کپتان اسٹرک صاحب متوفی کی جا پر جنرل بہادر صاحب کے میر منشی ہوئے ہیں۔ انکی خدمت میں بدستور سابق بحال ہوا۔ اب ان کی بندگی میں ہوں ممکن ہے کہ باقی عمر اس شجر فتوحات تلے بسر کروں۔ حاصل کلام اس عاصی نے دیکھا کہ بعض احباب ترجمہ کتب کے وسیلے سے کمپنی انگریز بہادر کی سرکار علامت آثار سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ ہیچ مدان نے بھی حوصلہ کیا۔ اور بموجب حکم جہاں مطلع صاحبان عالیشان کونسل کے کتاب شمشیر خانی کہ منتخب شاہ نامہ ہے باوجود مشاغل وہیجان تفکرات دنیوی اردوئے معلیٰ

کی زبان میں ترجمہ کی (کیا) اور شہنامہ ہندی اس کا نام رکھا[1]۔"

"شمشیر خانی غزنیں کے حاکم کی فرمائش پر حاکم کے ایک مقرب کے دوست توکل بیگ بن تولک (غالباً تغلق) شاہ نامہ فردوسی کا ترجمہ و تلخیص فارسی نثر میں کیا تھا اور اس نثر کہ نام جس کا شمشیر خانی ہے اب عاصی محمد علی بن نثار علی ترمذی نے اردو نثر میں ترجمہ کیا[2]۔"

محمد علی نے فارسی کتاب کا خلاصہ عام فہم اور آسان زبان میں کیا ہے لیکن اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ مولف نے دو تین سطروں کے بعد اشعار لکھ کر اپنی شاعرانہ طبیعت کا زور دکھایا ہے جس سے نثر کی سادگی اور سلاست پر اثر پڑتا ہے۔ شہنامہ ہندی کیومرث کی داستان سے شروع ہوتی ہے۔

"کہتے ہیں کہ پہلے جس شخص نے تاج اور تخت بادشاہی کا آئین جہاں میں نکالا، کیومرث تھا۔ پہاڑ میں رہتا تھا اور اپنی قوم سمیت حیوانوں کے چمڑوں کا لباس پہنتا تھا۔ اس کے بیٹا تھا سیامک نام، بیت ؎

پسر تھا نپٹ اس کا خوبرو — خردمند جوں باپ ہوبہو
سیامک تھا نام اس کا آزاد تھا — کیومرث اس سے بہت شاد تھا

کیومرث کا ایک دیو اور دیو بچہ دشمن تھا۔ دیو بچے (نے) اپنے باپ سے کہا میں کیومرث سے لڑنا چاہتا ہوں۔ دیو نے دیووں کا لشکر اس کے ساتھ کر کے رخصت کیا[3]۔"

---

[1] دیکھیے قلمی نسخہ شہنامہ ہندی ص۲ [2] ایضاً ص۳ [3] ایضاً ص۷

شہنامہ میں آگ پتھر سے نکالنے کے واقعہ اور افسانوی بادشاہ جمشید کا حال انتہائی دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ زرہ چار آئینہ، تلوار اور دوسرے ہتھیار اس نے ایجاد کئے۔ دیو اس کے غلام تھے۔ اسکے پاس ایک پیالا تھا جو جام جم کہلاتا تھا۔ جس سے ساری دنیا اس کی نظر میں رہتی تھی خدا کا اس کے غرور پر عتاب نازل ہوا۔ اور وہ تباہ ہو گیا۔ شہنامہ ہندی کا خطی نسخہ ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ افسوس ہے کہ شہنامہ ہندی شائع نہ ہو سکی۔

بحرِ عشق
یعنی
قصہ سیف الملوک کا

بحرِ عشق سید منصور علی حسینی کی تالیف ہے۔ سید منصور علی حسینی فورٹ ولیم کالج کے ملازم تھے۔ کالج کے میر منشی سید بہادر علی حسینی ترمذی کی وساطت اور سفارش پر انھیں ۱۸۰۲ء میں کالج کی ملازمت ملی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اردو کے منفرد قدیم نثر نگار میر افسوس اور میر امن دہلوی کالج سے وابستہ تھے اور صاحبان کونسل کے ایما پر داستان اور تاریخ کی دلچسپ اور مفید کتابیں ترجمہ اور تالیف ہو رہی تھیں منصور علی حسینی کو بھی گل کرسٹ کے حکم پر سیف الملوک اور بدیع الجمال کا رومانی قصہ ترجمہ کرنا پڑا تھا۔ سید صاحب کی یہی ایک تالیف ہے۔ اس کی زبان اور طرزِ نگارش سے پتا چلتا ہے کہ منصور علی حسینی بہار کے رہنے والے تھے اور ترکِ وطن کر کے کلکتے میں ہی رہ گئے تھے۔ بحرِ عشق میں 'وجہ سے' کی جگہ 'وجہ کر' 'رڑکوری' اور ایسی ہی بہت سی اصطلاحیں اور الفاظ ملتے ہیں جو صرف بہار میں مروج ہیں۔ بحرِ عشق کے دیباچے میں منصور علی نے اپنا مختصر حال ضرور لکھا ہے مگر انھوں نے اپنی جائے پیدائش تعلیم یا خاندان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں۔

"یہ قصہ سیف الملوک شہزادے کا کہ جس کو محمد عمر نے اپنے دوستوں کے کہنے سے عبارت فارسی میں بطور مثنوی (مثنوی) کے لکھا تھا۔ سو اب یہ کمترین خلایق

بعجز سرشت ازلی سید منصور علی ابن سید امام بخش حسینی موسوی سبزواری جو دیلے
سے برگزیدہ، خاندانی رسالت و پسندیدہ دودمان کے اور قیصر جہاں آرزومندوں
و درویش دردمندوں کے خلق و حسلم اجدادی میں مشہور، علم و مروت آبائی سے معمور
جناب میر صاحب قبلہ و کعبہ مخدومی و معظمی سید سندی میر بہادر علی حسینی ترمذی کہ
حق تعالیٰ ہمیشہ ان کو اپنے فضل و کرم سے اس جہاں بہ عزت و حرمت نگاہ رکھے
آخرت میں نجات بخشے اشرف البلاد کلکتے میں وارد ہو کر سینۂ منشی گری صاحب
عالیشان نوآموزوں کی تعلیم و درس کے واسطے مدرسے میں کمپنی انگریز بہادر دام اقبالہٗ
کے تفریق ہندوی میں سرفراز ہوا۔ اس نے عہد میں شاہ عالم بادشاہ کے اور حکومت
میں . . . . . مشیر خاص کیوان بارگاہ مارکویس ولزلی گورنر بہادر کی بموجب ارشاد
صاحب عالی ہمت حاجت روائے محتاجان مسٹر گل کرسٹ کے سنہ ۱۲۱۸ھ مطابق
سنہ ۱۸۰۳ء میں زبان ریختہ نثر میں ترجمہ کیا اور ان لفظوں کو جنہیں خواص و عوام ہندو
مسلمان سب بولتے ہیں صاحبان نوآموزوں کے استفادہ کے واسطے قصداً تحریر
میں لایا اور نام اس کتاب کا بحر عشق رکھا[1]،،

سید منصور علی کے اس تعارف سے بس اتنا پتا چلتا ہے کہ ان کے والد
کا نام سید امام بخش تھا۔ سبزوار ان کا آبائی وطن تھا لیکن عہد مغلیہ میں دوسرے
ایرانیوں کی طرح ان کے آبا و اجداد بھی ترک وطن کر کے ہندوستان میں سکونت
پذیر ہو گئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ جب دلی لٹ رہی تھی اور سلطنت مغلیہ زوال کی
سیاہ پرچھائیوں میں سمٹی جا رہی تھی تو اس نازک وقت میں سید امام بخش مراد آباد

---

[1] دیکھیے قلمی نسخہ ص ۲-۳

اور دلی سے عظیم آباد آگئے ہوں اور وہیں کے ہو کر رہ گئے ہوں۔ مولوی منصور علی کی پرورش و پرداخت بھی بہار ہیں ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان پر بہار کا اثر غالب ہے۔

سید صاحب کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا اور نہ ہی ان کی وفات کے سن کا کچھ پتا چلتا ہے۔ بحر عشق ان کی اکلوتی تالیف ہے۔ کالج میں درس و تدریس کی ذمہ داریاں انھیں سونپی گئی تھیں اس لئے تالیف اور ترجمہ کے کام پر وہ زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ ان کی یہ تالیف انھیں اردو کے قدیم نثرنگاروں کے زمرے میں شامل کرتی ہے۔

بحر عشق بھی فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے لیکن اس کا اسلوب اور انداز بیان شگفتہ نہیں ہے۔ قصے کا پلاٹ بھی فرسودہ اور پٹا پٹایا ہے۔ ایک بادشاہ ہوتا ہے اس کے کوئی اولاد نہیں ہوتی۔ حزن و ملال کا سایہ اس پر محیط رہتا ہے۔ دنیا اس کی نگاہ میں تیرہ و تاریک ہوجاتی ہے۔ وہ تاج و تخت سے دست بردار ہوکر عزلت نشیں ہوجانا چاہتا ہے۔ دوسرے قصوں کے عقلمند وزیروں کی طرح اس کا بھی ایک دانا وزیر ہوتا ہے۔ اس کی ترغیب سے شاہ یمن کی بیٹی دل آرام سے وہ شادی کرتا ہے دل آرام کے بطن سے چاند سا خوبصورت بیٹا سیف الملوک پیدا ہوتا ہے۔ سیف الملوک ہی قصہ کا اصل کردار ہے۔ دوسرا اہم کردار بدیع الجمال پری ہے۔ انھیں دو کرداروں پر تمام رنگین کہانی گردش کرتی ہے مگر یہ بھی بے حس اور سست ہیں۔ ان میں حرکت پیدا کرنے اور داستان کو دلچسپ بنانے کے لئے وزیرزادہ صاعد اور شہزادی گلنار کے علاوہ دیو، پری اور جن کے کردار کی بھی تخلیق کی گئی ہے جس عہد میں

یہ نثری داستانیں تخلیق ہوئی ہیں وہ عہد زندگی کے تلخ حقائق کو کہانی میں سمونے کے لئے موزوں نہیں تھا کسی نواب زادی کے کسی جاگیر دار کے لڑکے کے ساتھ معاشقے کا قصہ لکھا نہیں جا سکتا تھا۔ اسی بنا پر فوق الفطرت کرداروں کا سہارا لیا گیا۔ اور نواب زادوں اور زادیوں کے معاشقے کی کہانی فوق الفطرت کرداروں کے بھیس میں لکھی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کی ہر فرضی رنگین داستان میں سماجی اور معاشرتی زندگی کے خاکے ملتے ہیں۔ گو یہ دھندلے دھندلے ہیں۔

سیف الملوک کا قصہ بھی ایسا ہی ایک قصہ ہے جس میں سیف الملوک اور پری بدیع الجمال کے معاشقے کی داستان جو کبھی بے حد رنگین اور کبھی بے حد سنگین ہو جاتی ہے بیان کی گئی ہے۔ شہزادہ سیف الملوک ہر طرح کی آزمائش، لرزہ خیز مصائب اور خوفناک جنگ وجدال کے بعد اپنی محبوبہ کو پا لیتا ہے۔ دوسری داستانوں کی طرح اس میں بھی باغ ہے، شراب ہے رقص وسرود کی محفلیں جمتی ہیں۔ دیو پری اور جنگ کے بعد دو دلوں کے ملاپ کی بھرپور کہانی ہے اور اپنے عہد کی نثر کا عمدہ نمونہ ہے۔

سید صاحب کی بحر عشق حضرت سلیمان کے عہد حکومت کی داستان ہے اور رضوان شاہ کے وارث کے عہد حکومت سے شروع ہوتی ہے

"حضرت سلیمان پیغمبر علیہ السلام کے وقت میں شاہ عاصم نام رضوان شاہ کا بیٹا مصر کا بادشاہ تھا۔ بڑا عاقل وعادل سخی وشجاع، رعیتوں کا پالنے والا اور غریبوں کا داتا تھا[1]"

اسی عاصم شاہ نے شاہ یمن کی بیٹی دل آرام سے شادی کی۔ عاصم شاہ کی دیرینہ

---

[1] ملاحظہ ہو بحر عشق قلمی نسخہ ص۱

آرزو پوری ہوئی اور خدا نے اسے چاند سا بیٹا دیا۔

"...... اور شہزادے کا نام سیف الملوک رکھا۔ اتفاقاً اسی رات صالح وزیر کا بھی بیٹا پیدا ہوا۔ یہ خبر سنتے ہی حضورِ اعلیٰ سے حکم ہوا کہ وزیرزادے کو بھی شہزادے کے پاس لائیں کہ ایک ہی جگہ دونوں پرورش پاویں بلکہ شیرخواری میں ساتھ کریں کہ خدا کے فضل سے وہ بادشاہ ہوگا اور وہ اس کا وزیر۔ اور ہر حال میں اس کا حامی و مددگار ہوگا، وزیر نے بموجب حکم اپنے فرزند کو زچہ محل شاہی میں داخل کیا اور بادشاہ نے اس کا نام ساعد رکھا[1]"

اِس طرح شہزادہ کے ساتھ وزیرزادے کی پرورش بھی شاہی محل میں ہوتی ہے دونوں یارِ غار ہو جاتے ہیں۔ دن ہنسی خوشی گذرتے جاتے ہیں کہ اچانک نوشتہ تقدیر رنگ لاتا ہے۔ شہزادے کی خوشیاں ایک پری پیکر کے غائبانہ عشق کی آگ میں جلنے لگتی ہیں۔ پری بدیع الجمال کی موہنی اور دلفریب صورت شہزادے کو خواب میں نظر آنے لگتی ہے۔ شہزادہ ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ ہر دم مرغِ بسمل کی طرح تڑپتا ہے یہاں تک کہ بدیع الجمال کا بے پناہ حسن شہزادے کو وارفتہ بنا دیتا ہے اور اپنے تئیں دامِ ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔

سید منصور علی اپنی نثری صلاحیت سے مطمئن نہیں نظر آتے ہیں۔ اور قصے میں زور پیدا کرنے کے لئے دس بیس سطروں کے بعد ہی ابیات یا مثنوی کا پھول کھلانے لگتے ہیں جس سے قصہ کا ربط اور تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور ذہن پر مثنوی بوجھ بن جاتی ہے۔ منصور علی شاعر نہیں ہیں۔ ان کے تمام اشعار آورد معلوم ہوتے ہیں ؎

---

[1] دیکھئے بحرِ عشق قلمی نسخہ ص۳

کمان عشق کی، تیر جیسے جا لگائے ۔ نہ تدبیر کی وہاں سپر کام آئے
سچ ہے کہ جسکو عشق اپنے دام میں مبتلا کرتا ہے ۔ تمیز شاہ و گدا کی نہیں رکھتا ہے[۱]

بحر عشق میں ابیات اور مثنوی لکھنے کی خواہش منصور علی کی داستان کو بھی بھدی بناتی ہے ۔ اس کا یہ بہت بڑا عیب ہے اور یہ عیب فورٹ ولیم کالج کی دوسری داستانوں جیسے بہار عشق، شاہنامہ ہندی وغیرہ میں نمایاں ہے ۔

سید صاحب کی بحر عشق بھی دیو، جن اور پریوں پر انسان کی فتح اور مافوق الفطرت کرداروں کی شکست پر ختم ہوتی ہے ۔ شہزادہ سیف الملوک تمام دشوار امتحان میں پورا اترتا ہے ۔ وہ گلنار کے عاشق دیو خبیث کو ہلاک کرتا ہے ۔ خونیں جانوروں سے اسے بچاتا ہے ۔ بدیع الجمال تک رسائی کا زینہ گلنار بنتی ہے ۔ بدیع الجمال گلنار کی رضاعی بہن ہوتی ہے ۔ اس کے سہارے سیف الملوک کو اپنی محبوبہ مل جاتی ہے ۔ گلنار کی ماں کے سمجھانے پر شہپال کی بیوی بدیع الجمال کی شادی سیف الملوک سے کر دیتی ہے اور صاعد بھی گلنار کی تلاش کرتا ہوا اس کی سلطنت میں آتا ہے ۔ صاعد کی شادی گلنار سے ہو جاتی ہے، اس طرح بحر عشق کے چار اہم کردار ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں اور بحر عشق کے قصے کا انجام طربیہ ہوتا ہے ۔

سیف الملوک اپنی حسین و جمیل بیوی کو لیکر اپنی سلطنت میں واپس آتا ہے ۔ ماں باپ ملتے ہیں ویسے ہی جیسے ساون سے بھادوں، اور باپ کی جگہ شہزادہ سیف الملوک تخت پر جلوہ افروز ہوتا ہے ۔

"جب سیف الملوک نے بادشاہ کے تخت پر جلوس فرمایا عدل، انصاف اور

---

[۱] دیکھئے قلمی نسخہ صہ۳۳

داد و دہش میں باپ سے بھی زیادہ نام پیدا کیا۔ کمال خلق و مروت سے بادشاہت کرنے لگا[1]"

ظاہر ا بحر عشق کا یہ کلائمکس ہے لیکن کہانی یہیں پر ختم نہیں ہوتی ہے مولف اور مترجم نے ایک اور باب کا اضافہ کیا ہے وہ یہ کہ بدیع الجمال ڈیڑھ سو سال تک زندہ رہتی ہے۔ اس کے پانچ بیٹے ہوئے جو ایک سے ایک ہوئے۔ سیف الملوک بدیع الجمال کی موت پر پاگل ہو جاتا ہے۔

بحر عشق اس پر ختم ہوتی ہے۔ اس کا خطی نسخہ ۲۵۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اس خطی نسخہ میں جا بجا املے کی غلطیاں ملتی ہیں۔ ان تمام خامیوں کے باوجود قصہ دل چسپ ہے اور ابتدائی نثر کا عمدہ نمونہ ہے۔

---

[1] دیکھیے قلمی نسخہ بحر عشق ورق ۱۲۶

حسن و عشق

غلام حیدر عزت نے منشی محمد وارث کی فارسی تالیف گلشن عشق کا آسان اردو میں ترجمہ کیا۔ حسن و عشق اس کا نام رکھا۔ یہ دراصل شاہ خوزاں کی بیٹی اور روم کے بادشاہ کے بیٹے ہرمز کی رومانی کہانی ہے جو گل بکاؤلی اور دوسری عشقیہ داستانوں سے بہت ملتی جلتی ہے اِس میں بھی فوق العادت کردار ہیں۔ ناقابلِ یقین شجاعت کے حیرت انگیز کارنامے اور معجزہ نما واقعات سحر انگیز فضا پیدا کرتے ہیں

غلام حیدر عزت ہندوستان یعنی شمالی ہند کے کسی شہر سے ہجرت کر کے کلکتے آئے تھے۔ اور فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے۔ انھوں نے حسن و عشق کے دیباچے میں سبب تالیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کالج کے پروفیسر جان گل کرسٹ کی فرمائش پر سنہ ۱۸۰۴ء میں انھوں نے یہ داستان ترتیب دی تھی۔

"۔خردمندوں پر یہ پوشیدہ نہ ہے کہ اس قصہ دل آویز کو کسی استاد کامل نے فارسی نظم میں لکھ کر 'گلشن عشق' نام رکھا تھا۔ ازبسکہ اس کی تمہید طویل اور الفاظ دقیق اور عبارت رنگین اور صنعت اشعار اور فصاحت گفتار کے سبب سے مطلب فہمی میں توقف ہوتا تھا۔ اس واسطے منشی المناشی محمد وارث نے اسے مختصر نثر میں لکھا۔ اب غلام حیدر عزت نے سنہ ۱۲۱۹ ہجری مطابق سنہ ۱۸۰۴ء میں قدسی سلطنت میں شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ کی اور حکومت میں۔ . . . . مارکوئس ولزلی گورنر جنرل مارنگٹن بہادر کی، حسب حکم مسٹر جان گل کرسٹ بہادر دام حشمتہٗ کے

زبان میں ریختہ نثر کیا اور حُسن وعشق نام رکھا۔ اور اس لحاظ سے کہ یہ اصل اصل اول کے مضمون کا ترجمہ ہے نہ الفاظ وعبارت کا، عاصی نے جس کا تخلص عزت ہے اور جو ہندوستان سے ہجرت کر کے کلکتے آیا تھا۔ ترجمہ نویسی میں اقدام کر بعضے مقام میں الفاظ کا ترجمہ موقوف اور بعضے فقرے مبالغے کے کہ ہندی محاورے ..... جس جگہ محاورے میں غلطی ہو ازراہِ کرم اصلاح فرمادیں ۔۔۔[1]"

افسوس ہے کہ جناب عزت نے اپنا اور اپنے خاندان کا حال نہیں لکھا ہے لیکن تامس روبک کی مشہور کتاب دی انالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم کے ضمیمہ میں انکے بارے میں اتنی بات ضرور ملتی ہے کہ

"غلام حیدر عزت کالج کے تنخواہ دار منشی نے گلشن عشق کا ترجمہ ریختہ میں کیا ہے کتاب کا مسودہ چھپنے کے لئے تیار ہے۔"[2]

پروفیسر روبک کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عزت کالج کے تنخواہ دار منشی تھے۔ اور حسن وعشق کی اشاعت بھی ہوئی ہو گی لیکن مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہے ممکن ہے کہ ۱۸۱۴ء میں گل کرسٹ کی مراجعت کے بعد مسودہ چھپنے کے لئے پریس گیا ہی نہ ہو۔ عزت کی اس تالیف کے علاوہ کوئی اور تالیف نہیں ہے۔

حسن وعشق ترجمہ کم خلاصہ زیادہ ہے۔ عزت نے اصل قصے کو اپنے رنگ میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ قصہ اپنے زمانے میں بیحد مقبول ہوا تھا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ گوبند سنگھ عندلیب نے گل اور ہرمز کے اس قصے کو "نغمہ عندلیب" کے

---

[1] دیکھئے خطی نسخہ حسن وعشق ص۳

[2] دی انالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم ضمیمہ صفحہ ۱۲۶

نام سے دوبارہ لکھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عندلیب نے عزت کے ترجمے میں معمولی ترمیم و اضافہ کر کے اسے اپنی تالیف بنا لیا ہے نغمۂ عندلیب نقش ثانی ہے لیکن نقش اول سے کسی حال میں بہتر نہیں۔

حسن و عشق اور نغمۂ عندلیب میں ایک ہی داستان ہے۔ پہلے قصے کا انداز صاف ہے۔ اس تکلف، تصنع اور قافیہ پیمائی سے کام کم لیا گیا ہے لیکن نغمۂ عندلیب میں یہ عیب نمایاں ہے۔ حسن و عشق کی ستھری طرز قصے میں جو دلچسپی پیدا کرتی ہے وہ نغمۂ عندلیب میں مفقود ہے۔ نغمۂ عندلیب کے مرتب چودھری نبی احمد سندیلوی نے دیباچے میں اس کے پھیکے پن کا اظہار کیا ہے۔

"۔۔۔ قصہ بھی دلچسپ نہ تھا لیکن اس حیثیت سے کہ یہ سو برس پہلے کی لکھی ہوئی نثر ایک ہندو کی سحر طرازی کا نمونہ ہے اور کلکتے میں تصنیف[1] کی گئی ضرور قابل قدر ہے[2]"

حسن و عشق نغمۂ عندلیب سے بیس بائیس سال پہلے تالیف ہوئی لیکن اس کی زبان زیادہ سلیس ہے اور طرز تحریر دلکش جس کی وجہ سے داستان بڑی دلچسپ اور رنگین ہو گئی ہے۔

عزت کی اس تالیف کو نثری داستانوں میں وہ شہرت اور مقام نہ مل سکا جو مذہب عشق، باغ و بہار، توتا کہانی یا آرائش محفل کو نصیب ہوا۔ مگر اسکے باوجود انیسویں صدی کی نثر نگاری کا یہ ایک عمدہ مرقع ہے۔

---

[1] چودھری نبی احمد کو عزت کے حسن و عشق کا پتہ نہیں تھا اور نہ ہی انھیں اسکا علم تھا کہ یہ قصہ گلشن عشق کا ترجمہ ہے اسی بنا پر نغمۂ عندلیب کو انھوں نے گوبند سنگھ کی تصنیف قرار دیا ہے [2] دیکھئے نغمۂ عندلیب مطبوعہ

حسن و عشق حمد خدا اور سبب تالیف کے بیان کے بعد شاہ روم کے قصے سے شروع ہوتی ہے۔

"روم کے ملک میں ایک بادشاہ آسمان جاہ تھا۔ ہزاروں ملک اور جزیرے اس کے زیر نگیں تھے۔ اور ہر ایک ملک کے بادشاہ اس کے تابع تھے۔ اور خراج دیتے تھے۔ سب چھوٹے بڑے اس شہنشاہ کو قیصر روم کہتے تھے۔ جہاں تک اسباب عیش و خورمی (خرمی) تھے، اسے حاصل تھے لیکن اولاد نہیں تھی۔ اس واسطے میں ہمیشہ دلگیر رہتا تھا۔[۵]"

اس عہد کی دوسری داستانوں کے بادشاہوں کی طرح قیصر روم کے یہاں درویش کی دعا سے شاہ کی ایک بیگم کو حمل قرار پاتا ہے۔ یہ سن کر ہی شاہ کی دوسری بیگمات حسد کی آگ میں جلنے بھننے لگتی ہیں۔ وہ ہرمز کی ماں کے خلاف سازش کرتی ہیں۔ اسقاط حمل چاہتی ہیں۔ ایک دایہ کے یہ کام سپرد ہوتا ہے۔ مگر دایہ خوفِ خدا سے ڈر جاتی ہے اور سازش کا پردہ چاک کر دیتی ہے۔

"۔۔۔ اے بی بی بادشاہ بیگم نے مجھے بلوایا بہت سا انعام مقرر کر تمہارے حمل گرانے کو بھیجا ہے۔ تم بے کس و بے بس ہو، تم سے کیونکر اس طور کی بدی کروں اور بادشاہ کی نمک خوار ہو، اس کے زن و فرزند پر آفت لاؤں۔ اس سبب سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔[۶]"

دایہ کی بات سن کر بیگم کی روح کانپ جاتی ہے۔ دونوں کو بچے کو بچانے کی فکر ہوتی ہے۔ بیگم کے مشورے سے دایہ بچے کو لیکر روم فرار ہو جاتی ہے۔ راستے

---

[۵] دیکھئے حسن و عشق ق ن صہ۷ [۶] ایضاً صہ۹

میں کارواں ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹ جاتا ہے مگر دایہ خوش قسمتی سے بچ جاتی ہے۔ اور شاہ خوزاں کی راجدھانی میں پہنچ جاتی ہے۔ اور شاہی باغباں کے دروازے پر گر کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ہرمز باغباں کے ہاں پلتا اور بڑھتا ہے جوزاں میں اس کے حسن کا عام ہوتا ہے۔ شاہ خوزاں کی پری رو بیٹی گل باغباں کے بیٹے کو دل دے بیٹھتی ہے۔ جوانی اور عشق کے جوش میں شاہ ایران کے پیغام رشتے کو ٹھکرا دیتی ہے۔ عزت نے ہرمز پر گل کے عاشق ہونے کی داستان میں دلکش رنگ بھرے ہیں۔ عزت کا اشہب قلم یوں رواں ہوتا ہے۔

"نقل ہے کہ ایک دن گل ہزاروں ناز سے مانند طاؤس جلوہ گر کی کتنے صاحبوں کو ساتھ لیکے اپنے محل سرا کے بالاخانے کی چھت پر ہر طرف نظر کرتی تھی اور تماشا دیکھتی تھی۔ ناز و انداز سے جس طرف نظر کرتی تھی ذرہ سے آفتاب تک اس کی مژگاں کے خنجر سے زخمی ہوتے تھے۔ محل سرا کے متصل بہمن باغباں کا باغ تھا اس میں ہرمز گوشہ گیر ہوا کیلا رہتا تھا۔ . . . غرض ہرمز اس گھڑی باغ کے صحن میں نکل کر غسل کرتا تھا کہ اچانک گل کی نظر اس صورت پر پڑی جان و دل سے عاشق ہو گئی اور بے اختیار دل سے سرد آہ کھینچی [1]"

اس طرح ہرمز اور گل کے معاشقے کی دلچسپ کہانی شروع ہوتی ہے۔ گل ایک ضدی اور غصہ ور شہزادی ہوتی ہے۔ اور کسی کی پرواہ کئے بغیر شاہ ایران سے رشتہ جوڑنے سے انکار کر دیتی ہے۔ گل کی بغاوت شاہ خوزاں کے پتھر دل کو موم کر دیتی ہے۔ شاہ ایران کے رشتے کو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ شاہِ ایران

---

[1] دیکھئے حسن و عشق خطی نسخہ ص ۲۹

اپنی تحقیر اور تذلیل کی وجہ سے غصہ سے پاگل ہو جاتا ہے۔ طبل جنگ بج اٹھتا ہے۔ ایرانی فوجیں خوزاں پر چڑھ دوڑتی ہیں۔ ہزاروں لوگ مارے جاتے ہیں۔ شاہ خوزاں کی شکست یقینی ہو جاتی ہے اور جب وہ فرار کا پختہ ارادہ کر لیتا تو بہمن باغبان کا بیٹا رحمت کا فرشتہ بن کر آتا ہے۔ ہرمز اپنی افسانوی شجاعت سے شاہ ایران کی فوجوں کی صفیں الٹ دیتا ہے یقینی شکست فتح ونصرت میں بدل جاتی ہے۔ مگر اس کے باوجود گل ہرمز کو نہیں ملتی۔ وہ شاہِ ایران کے قبضے میں چلی جاتی ہے۔ پھر وہاں سے شاہ چین کے ہاتھ لگتی ہے شاہ چین اسے اپنی بیٹی بناتا ہے لیکن گل کا بے پناہ حسن وجمال اسکے ضبط وتحمل کی تمام حدیں توڑ دیتا ہے۔ اور پھر جنگ وجدال کی سنگین اور خوفناک داستان شروع ہو جاتی ہے۔ مافوق الفطرت کردار، خونخوار قوموں اور وحشیوں سے ہرمز کی نبرد آزمائی، پھر حسب دستور دیو، خونیوں اور وحشیوں کی شکست، ہرمز کی کامیابی، قیصر روم کی شاہ چین پر چڑھائی اور تاخت وتاراج اور آخر میں وصال عاشق ومعشوق پر حسن وعشق یعنی قصہ گل وہرمز کا ختم ہوتا ہے۔

اس قصے میں بھی کوئی جدت نہیں وہی پرانا پلاٹ اور پرانا انداز ہے بے شک کہیں کہیں عیاش عورتوں کی بے وفائی، دوست کی غداری اور ہوس پرست عیاش بادشاہوں کے کردار کے علاوہ سماجی اور ثقافتی تصویریں بھی ایران، روم اور خوزاں کی نمایاں ملتی ہیں۔

ہرمز مہرافروز سے بھی گل کی اجازت سے شادی کر لیتا ہے۔

"ہرمز نے اجازت گل سے مہر افروز سے شادی کی۔ تب قیصر نے سلطنت اپنی ہرمز کو سپرد کر کے آپ یادِ الٰہی میں مشغول ہوا۔ ہرمز نے نیک ساعت میں تخت پر جلوس فرمائی (فرمایا) اور عدل و انصاف سے بادشاہی کرنے اور خوش و خرمی سے گذران کرنے لگا۔ خداوند بچھڑوں کے ملانے والے نے اپنے نام پاک تصدق سے ان بچھڑوں کو ملا دیا۔ ویسا ہی ہر عاشق مہجور کو معشوق کا وصل میسر کرے اور ہر امیدوار کی امید برلاوے برکت سے نبی اور اولاد کی ان کی[۱]"

اس پر حسن و عشق کا افسانہ ختم ہوتا ہے۔ ۳۵۶ صفحات پر مشتمل یہ مخطوطہ ہے اور اس میں جابجا غلطیاں بھی ہیں، تذکیر و تانیث اور املے کی بھی۔

---

[۱] ملاحظہ ہو خطی نسخہ بحرِ عشق ص ۳۵۶

بہارِ عشق

بہارِ عشق[1] اصل میں فیضی بن مبارک کی مشہور نل دمن کا ترجمہ اور تلخیص ہے جو صاحبان کالج کونسل اور تفریق ہندی کے مدرس اول کپتان ولیم ہٹلر کے ایما پر ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں تالیف ہوئی۔ اس کے مترجم اور مولف مولوی نور علی بن نذر علی ہیں۔ مولوی نور علی کے دادا سید عبدالغفور ضلع ہوگلی کے ایک مردم خیز گاؤں چیتھلا کے رہنے والے تھے۔ اور ان کا شمار معزز لوگوں میں ہوتا تھا۔ سید نور علی کے والد نذر علی کا بھی کافی اثر و رسوخ تھا۔ اور ان کے گھر میں عربی اور فارسی کے علاوہ اُردو کی تعلیم بھی جزو ایمان سمجھی جاتی تھی۔ بنگالی نژاد ہوتے ہوئے بھی مولوی نور علی کو اردو سے شغف تھا۔ فارسی کی استعداد اور صلاحیت کافی تھی جس کی وجہ سے فیضی کی مشہور مثنوی نل دمن کے ترجمے میں انھیں کامیابی ہوئی اور اسے کالج کونسل میں انعام کے لئے پیش کیا گیا تھا۔

سید نور علی کے آبا و اجداد پیر مرشد تھے۔ اور بنگال میں ان کا حلقہ وسیع تھا اس لئے ان کے خاندان میں ان سے پہلے ملازمت کسی نے نہیں کی۔ خوش قسمتی سے بہارِ عشق کے دیباچے میں انھوں نے اپنا اور اپنے خاندان کے علاوہ کتاب کے ترجمے اور تالیف کی وجہ بھی بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ

---

[1] ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے کہ اس مثنوی کو سب سے پہلے نثر میں الٰہی بخش شوق نے ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۸۰۰ء میں لکھا تھا۔ شوق کا انتقال ۱۲۴۳ھ میں ہوا۔ دیکھئے اردو مثنویاں ص ۲۳

"بزرگوار اس فقیر کے نوکری چاکری سے مطلق سروکار نہیں رکھتے تھے بلکہ اس کو ننگ و عار سمجھتے تھے۔ اوقات اپنی پیر مریدی میں سے بسر کرتے تھے۔ اور اس سے اجرائے اوریکیر کرتے تھے مگر یہ خاکسار پڑھنے کے ارادے سے اشرف البلاد کلکتہ آیا۔ پھر چند روز بعد اتفاق حسنہ سے جان معانی جہان سخندانی شاعر بے بہا، چارہ ساز بے کساں جناب مرزا کاظم علی جوآں مدظلہ کی ملازمت سراسر افادت حاصل کی اور اس جناب کے فیض تعلیم سے زبان اردو کی محاورہ دانی جس قدر ہیچ مداں کو ہے تحصیل کی۔ انھی کی دست گیری و نوازش سے کالج میں نشان تفریق ہندوستان کے سررشتے نوکری سے سرفراز ہوا۔ ورنہ اس گمنام کو کون جانتا تھا۔ حق تعالیٰ ان کی ذات بابرکات کو سلامت رکھے اور دولت دینی و دنیوی سے مالا مال۔"[1]

اپنا مختصر حال لکھنے کے بعد مولوی صاحب نے تالیف کی وجہ بھی بڑی ایمانداری سے بیان کی ہے۔ پہلے وہ کالج کے ملازم نہ تھے۔ کونسل کی طرف سے کتابوں کے ترجمے اور تالیف کے اشتہارات دئے جاتے تھے۔ ایسے ہی ایک اشتہار نے مولوی صاحب کے دل میں نل دمن کا ترجمہ کرنے کی تحریص پیدا کی۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے اس ہیچ مداں کے دل میں یوں گزرا کہ اکثر اشخاص کونسل کے اشتہار کے بموجب کتب فارسی زبان ریختے میں ترجمہ کرتے ہیں اور حضور میں نذر گزران اپنے اپنے دامن امید کو صلہ و انعام کے در و گوہر سے بھر لیتے ہیں اور سرخروئی حاصل کرتے ہیں۔ اگر تم بھی کسی کتاب کا ترجمہ کر کے کونسل میں نذر گزرانو یقین ہے کہ اپنے شجر مدعا سے خاطر خواہ پھل پاوے اور آئندہ کو بھی تیری یادگاری رہ جائے اس لئے خاکسار

---

[1] ملاحظہ ہو قلمی نسخہ بہار عشق کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی ص۲

نے نل دمن فیضی کا خلاصہ مطلب لکھ کر واسطے پڑھنے صاحبان متعلم کے زبان ریختہ اردو میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ بارے فضل باری سے کتاب مذکور کا آغاز و انجام عہد حکومت میں لارڈ منٹو ۔۔۔۔۔۔ اور سر ولیم ہنٹر (W HUNTER) اور کپتان ولیم ٹیلر صاحب جو مدرس تفریق ہندی ہیں، بخیر و خوبی ہوا[1]۔"

دیباچے کے مطابق ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں ترجمہ مکمل ہوا اور اس کا نام نل دمن کے بجائے بہارِ عشق تجویز ہوا۔

سید صاحب کو مرزا کاظم علی جوآں سے دلی ارادت اور عقیدت تھی اور جوآں بھی ان کو چاہتے تھے۔ غالباً جوان کے مشورے سے ہی انھوں نے نل دمن کو اردو نثر میں منتقل کر کے صاحبان کونسل کو پیش کیا تھا۔ مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ جوآں نے ان کے ترجمے کو بے حد پسند کیا تھا۔ اور فی البدیہہ یہ قطعہ تاریخ بھی کہا تھا جو ذیل میں درج ہے ؎

بلبل طبع میر نور علی	ہے جو دل خستہ بہارِ عشق
زمزمہ سنج یوں ہوئے کہ سنے	حرف برجستہ بہارِ عشق
کہی ہے پا مارے رنج یوں تاریخ	یہ ہے گل دستہ بہارِ عشق

۱۲۲۵ھ

نل دمن کا افسانہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ دونوں افسانوی کردار ہیں۔ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور ہیر رانجھے کی طرح راجہ نل اور رانی دمنتی کو بھی قیام و دوام اور شہرت لازوال ملی۔ یہ ایک سنسکرت قصہ ہے اور خالص ہندوستانی ہے۔ اس قصے میں راجہ نل اور رانی دمنتی کے معاشقے اور معاشقے میں اذیت ناکیاں

---

[1] دیکھیے خطی نسخہ بہارِ عشق ص۲

تکالیف اور مصائب کی داستان جو کبھی رنگین اور کبھی سنگین ہے۔ گداز اور مؤثر انداز میں بیان کی گئی ہے۔ فیضی نے اس واقعہ کا منظوم ترجمہ کیا اور اس کی مثنوی نل دمن مقبول انام ہوئی۔ فیضی کی مثنوی بڑی جاندار ہے۔ اس میں بلا کا زور ہے اور بے پناہ شعریت بھی ہے۔ فیضی کی مثنوی کے مقابلہ میں مولوی نور علی کا نثری قصہ پھیکا پھیکا ہے۔ انداز بیان روکھا پھیکا ہے۔ جاندار رومانی قصے کے باوجود سید صاحب بہارِ عشق میں خوبصورت اور دلفریب پھول نہیں کھلا سکے۔ سید صاحب کی بہار عشق میں بھی ایک راجہ ہے جو ایک خیال پری وش پر عاشق ہو جاتا ہے۔ درباری حکیم کی مدد سے دمن کا پتا چلتا ہے دمن دکھن دیس کے ایک راجہ کی بیٹی ہوتی ہے۔ وہ نل پر غائبانہ عاشق ہو جاتی ہے اور نل کا بت بنا کر اس کی پوجا غائبانہ کرنے لگتی ہے اور آخر میں سوئمبر کے دن نل کے گلے میں پھول مالا ڈال کر اپنے محبوب کو پالیتی ہے اور ہجرت کی رات وصال کے دن میں ڈھل جاتی ہے۔ کچھ دن عیش و عشرت میں بسر ہوتے ہیں۔ پھر اذیت ناک مصیبتیں نازل ہوئی ہیں۔ راجہ نل کو اپنے دغا باز بھائی کے ہاتھوں جوئے میں شکست ہوتی ہے۔ سلطنت اور تاج و تخت پر دغا باز بھائی قابض ہو جاتا ہے راجہ نل اپنی محبوبہ دمن کے ساتھ جنگلوں، ریگستانوں اور پہاڑوں میں آوارہ بھٹکتا رہتا ہے اور پھر ایک رات اپنی پھول جیسی نازک اندام محبوبہ اور وفا شعار بیوی دمن کو تنہا چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔ یہاں سے مصائب کی داستان شروع ہوتی ہے دمن کو ناگ نگل جاتا ہے مگر حیرت انگیز طور پر ایک برہمن کی مدد سے وہ بچ جاتی ہے راجہ نل کو بھی ایک زہریلا ناگ ڈس لیتا ہے۔ اس کا گورا بدن سیاہ ہو جاتا ہے

نل کو گناہوں کی سزا ملتی ہے۔ آخر میں سانپ کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ راجے برن کی وساطت سے اس کی گم شدہ جنت دمنتی بھی مل جاتی ہے۔ وہ اپنی سلطنت واپس لیتا ہے۔ اور ہنسی خوشی راج کرنے لگتا ہے۔

نل دمن کی رنگین داستان کا یہ خلاصہ ہے۔ جو ابتدا سے انتہا تک عجیب و غریب واقعات، شکست و فتح کی ناقابل یقین باتوں سے بھری ہوئی ہے۔ سید صاحب کی بہار عشق شروع ہوتی ہے۔

"سبحان اللہ حسن ایسا شہنشاہ ہے، اگر اس کو آگ سے تشبیہ دو تو بجا ہے اور سیلاب کی مانند کہو تو روا ہے کیونکہ اس نے بڑے بڑے بادشاہوں کے خانۂ دل کو جلا کر خاک کیا۔ زلیخا کو اس نے بدنام کیا، مجنوں کو ناکام نل کو کمند زلف میں کیا اور دمن کو اس محبت میں خراب و خوار ... قصہ کوتاہ ہندوستان کی سرزمین بہشت آئین میں اجین کے اطراف و اکناف میں نل نامی ایک راجہ قوم کا برہمن عاشق تن تھا۔ سدا آتش عشق میں جلتا تھا اور شمع کی مانند پگھلتا تھا۔ باوجود عقل و دانش پنجۂ عشق میں گرفتار تھا۔"[۵]

راجہ نل، دمن کے تصوری پیکر کے عشق باؤلا اور دیوانہ ہو جاتا ہے۔ محبت کی چنگاریاں اس کے صبر و سکون کے خرمن کو پھونکنے لگتی ہیں۔ وہ اپنی سدھ بدھ سب کچھ سب کھو بیٹھتا ہے۔ راجہ کے عقلمند حکیم نے اس روگ کی تشخیص کی۔ نل کا مرض لا علاج قرار دیا جاتا ہے۔ حکیم نے کہا کہ ۔۔ اس کی کوئی دوا نہیں سوائے اس کے کہ نل کو اس کے خیالی محبوبہ کا وصال نصیب ہو۔

---

۵ ماخذ مو بہار عشق۔ مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری ورق ۲،

"حکیم نے کہا کہ میرے دل میں یہ بات گذرتی ہے اور تشخیص میں یہ دوا ٹھہرتی ہے کہ راجہ جس پری پیکر کے خیال میں مفتوں ہے اور جس لیلی وش کے تصور میں مجنوں اس کو کسی طرح یہاں بلوائیے اور اس کے عناب لب سے شربت وصال پلوائیے' یہ تپ جو چڑھی ہے (چڑھا) ہے اتر جائے ۔ اور مزاج جو برہم ہے حالت اصلی پر آجائے ۔ وزیر اس بات کے سنتے ہی بہت گھبرایا اور لشکر غم اس کے ملک دل پر چھایا۔[۱] "

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہانی اسی جگہ رک جائے گی لیکن اس مشہور قصہ کے خالق نے فنکارانہ چابکدستی سے کہانی آگے بڑھائی ہے ۔ راجہ نل کے دربار کا ایک خدمتگار دمن کے بے پناہ حسن کی تصویر کھینچ کر راجہ نل کو دمن کی پیدائش اور بے پناہ جمال کی مکمل داستان سناتا ہے ۔ راجہ نل کی خیالی مہ پیکر حقیقی دمن کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے ۔ راج ہنس' عاشق و معشوق کا پیامبر بنتا ہے ۔ اور اس طرح دمن نل کی شریک حیات بن جاتی ہے ۔ فیضی کی نل دمن منظوم میں جو زور ہے اور جذبات کی شدت کا جو احساس ہوتا ہے وہ سید نور علی کے قصے میں مفقود ہے ۔ انداز بیان میں اس قدر تصنع اور آورد ہے کہ یہ رنگین داستان بھی بے رنگ معلوم ہونے لگتی ہے ۔

برسوں کی جدائی اور ان گنت مصائب کے بعد راجہ نل دمن کے ماں باپ کے گھر میں اپنی باوفا بیوی سے دوبارہ ملتا ہے لیکن اس ملاپ کے بیان میں بھی زور قلم نمایاں نہیں ہے ۔ مثنوی نل دمن برادر دغل باز کے برادر راست باز کے ہاتھوں قمار بازی میں سب کچھ ہارنے' اپنے کیے پر پشیمان ہونے اور نل کی سخاوت اور دریا دلی کے سبب عفو تقصیر پر ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ نل دمن کے بیٹے اور وارث کی تخت نشینی در

---

[۱] دیکھیے قلمی نسخہ بہار عشق ص ۳۵

عاشق و معشوق کی موت پر ختم ہوتی ہے۔

نور علی کی بہار عشق کا خطی نسخہ ۳۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ سائز ۴×۶ ہے اور کسی کم سواد کاتب کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں قافیہ پیمائی کا زور ضرور ہے لیکن جا بجا غلطیاں کھلتی ہیں۔ اس کے علاوہ خود سید نور علی کی زبان خام ہے اور اکثر ناہموار زبان نے سلاست کا خون کیا ہے اور اسلوب کی آب و تاب پر سیاہ داغ کی طرح نظر آتی ہے۔

لالہ کاشی راج کھتری

لالہ کاشی راج کھتری لاہور میں پیدا ہوئے۔ اور تلاش معاش میں کلکتے آئے اور فورٹ ولیم کالج کے شعبہ پنجابی میں منشی مقرر ہوئے۔ اردو میں ان کی ایک ہی تصنیف ہے اور اسی تصنیف کی بدولت فورٹ ولیم کالج کی ملازمت انھیں حاصل ہوئی۔ ان کی داستان کا نام ہے "قصہ دل ربا اور دل آرام" جسے انھوں نے گل کرسٹ کو پیش کیا تھا۔ لالہ کھتری نے پنجابی زبان میں گلستان سعدی کا ترجمہ اور پنجابی صرف و نحو کی کتاب لکھی۔ ترجمہ گلستان کے دیباچے میں جو فارسی رسم الخط میں ہے لالہ جی نے اپنا حال لکھا ہے۔

"۔ یہ بندہ ہیچ مداں کاشی راج کھتری متوطن لاہور کا تھوڑا احوال اپنا عرض کرتا ہے کہ جب میں بموجب حکم صاحب فیض گستر غریب پرور دانائے علم و ہنر ڈاکٹر ولیم ہنٹر منتظم کالج کے قاعدہ صرف و نحو کا پنجابی زبان میں تصنیف ہو چکا تب صاحب موصوف نے حکم کیا کہ 'جلد نقلیات اور گلستان کو بھی زبان پنجابی میں تصنیف کر تاکہ وہاں کی بول چال کا احوال اور خاص و عام کی گفتگو کا سلیقہ معلوم ہو۔ میں نے ان کے حکم کو سعادت سمجھ کر اول دو جلد نقلیات کا ترجمہ کر کے حضور میں گذرانا۔ اتفاق ان دنوں میں بموجب حکم جناب گورنر جنرل بہادر کے جناب ممدوح کا جاوا کے طرف تشریف لیجانا پڑا۔ بندہ کو ارشاد فرمایا کہ اب میرا جانا جاوا کی طرف ہوتا ہے اور ڈاکٹر لیڈن صاحب بھی جو دانا اس زبان کے باعث ایجاد اس ترجمہ کے ہیں وہ بھی تشریف لے جاتے ہیں

بعد معاودت (واپسی) وہاں کے تجکو سرفراز کیا جائے گا۔ خاطر جمع رکھ اور تب تک تو گلستان کا ترجمہ کر۔ بندہ ان کے حکم (کے) موافق گلستان کا ترجمہ کرنے لگا۔ بعد چند روز کے دریافت ہوا کہ لڈن صاحب نے رحلت فرمائی۔ جناب ڈاکٹر ہنٹر صاحب کا وہیں تشریف رکھنا ہوا۔ اس خبر کے سنتے ہی دل میں نہایت مایوسی ہوئی اور ترجمہ کرنے سے طبیعت ہٹ گئی۔ لیکن صاحب عالی جاہ۔ علم و ہنر کا (کی) پناہ، تازگی بخشنے والا گلستانِ علم کا، زینت دینے والا ہنر کا۔ نکتہ داں۔ دقیقہ سنج بخشندہ گوہر گنج، چابک سوار، میدان شہسوار جولانگاہ ہر فن کا عاجزوں پر مہربان ہندوں کا قدردان، خداوند فیض رساں ستر تامس مدظلہ فلک سے زیادہ ہو جیو قدران کا (کی) اور سلامت رکھے خدا ان کو روز قیامت تک۔ بیت

جب تک آسماں پر سورج و قلم ہے اسکی بقا کا نیر جہاں میں علم ہے

مجھ سے فرمانے لگے کہ تو گلستاں کا ترجمہ تمام کر، تری محنت کا پھل تجھے ملے گا۔ اور یہ کتاب تری زیور قبول سے آراستہ ہو گی۔ اس ارشاد سے دل میں ہزار گ تقویت ہوئی اور یہ کتاب ۵ ۲ تاریخ ماہ اپریل ۱۸۱۲ء اٹھارہ مہینے میں تمام ہوئی[1]

لالہ کاشی راج کھتری نے قصہ دل ربا اور دل آرام اور قواعد زبان پنجابی کی تالیف کے آٹھ سال بعد گلستان کا ترجمہ ڈاکٹر ولیم ہنٹر کی فرمائش پر کیا تھا۔ قصہ دل ربا۔۔ ۔ گل کرسٹ کے عہد میں ۱۲۱۶ھ میں تمام ہوا۔ یہ اردو زبان میں ہے۔ کہانی دلچسپ ہے لیکن انداز بیان خشک ہے۔ طرز تحریر پھیکی اور بے جان ہے

---

[1] ماخذ ہو ترجمہ گلستان پنجابی خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ص ۲۷۱

یہی وجہ ہے کہ یہ ہندوستانی چینی کہانی ہونے کے باوجود عوام میں مقبول نہ ہوسکی

اس قصہ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہندوستان اور چین کے معاشرے اور تہذیب کی ہلکی سی جھلک ملتی ہے۔ اس میں مافوق العادت کرداروں کی بوالعجبیاں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہندوستانی راج کنیا کی ذہانت، ہوشیاری اور کامیابی کی دلچسپ داستان بیان ہوئی ہے۔ کاشی راج لاہور کے رہنے والے تھے اس لئے اس قصہ میں بھی پنجابی بولی کا پورا پورا اثر ہے۔ انداز بیان اور اسلوب میں پنجابیت نمایاں ہے۔ کاشی راج نے قصہ دل آرام میں لارڈ ولزلی کو راجہ یدھشٹر راجہ کرن اور ارجن بھیم کا اوتار قرار دیا ہے اور سخاوت اور فیاضی میں ان سے بڑا اگردانا ہے ؎

رحم اپنے میں جوں راجہ جدھشٹر	کرم اپنے میں لیکن اس سے برتر
سخاوت پہ اسے ایسا ہرن ہے	زمانے میں یہی راجہ کرن تھے ہے

لارڈ ولزلی کے بعد گل کرسٹ کا طویل قصیدہ ہے اور اس کے بعد ہی سبب تالیف بیان کیا ہے

"بندہ تراب الاقدام خاص و عام کہ قدم سے نمک پروردہ، اور دست گرفتہ بندگان صاحب موصوف کا ہے، چنداں لیاقت نہیں رکھتا کہ نظم و نثر اپنی کو خام خیالی سے اپنی سے پختہ و برجستہ سمجھ کر صاحب خداوند نعمت کے حضور میں فیضیاب میں پسند خاطر عطارد رائے اور ناظموں طبع رسائی کی ہو۔ مگر یہ قصہ دل ربا و دل آرام کا کہ بس از بس دل آویز اور دل چسپ ہے۔ اور دل درمند عامی کا

لہ دیکھیے خطی نسخہ قصہ دل ربا..... ص۳

حکایت درد روایت پر نہایت راغب اس لیے اس کو قلمبند کیا۔ اور یہ نکتہ مدنظر رکھ کر "برگ سبز ست تحفۂ درویش" حضور پرنور میں گذراناہ۔ امیدوار ہے کہ منشیان بلاغت اور ناظمان تصنیف ترجمہ اصلاح اس کی میں دریغ نہ فرمائیں۔[1]

انیسویں صدی کے شروع میں داستان طرازی اور داستان نویسی کی وبا کلکتے میں پھیلی ہوئی تھی کیونکہ داستان نویسی فورٹ ولیم کالج میں رسائی کی سیڑھی تصور کی جاتی تھی۔ ہر وہ شخص جسے کہانیاں لکھنے کا تھوڑا بہت سلیقہ تھا کوئی داستان اپنی بغل میں دبائے گل کرسٹ کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ اور اس کی گذراوقات کا کچھ وسیلہ پیدا ہو جاتا تھا۔ لالہ کاشی راج بھی کالج کا شہرہ سن کر کلکتہ آئے تھے اور قصہ دل آرام . . . . کی بدولت پنجابی زبان کے شعبہ میں ان کو جگہ ملی۔

قصہ دل آرام اور دل ربا میں ایک ہندوستانی شہزادی ایک حسین وجمیل برہمن بچہ پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔ لیکن راجہ باپ ان کے ملاپ میں دیوار بنتا ہے۔ راج لتا دلربا کی ایک راج کمار سے طے پاتی ہے مگر دل آرام کے ساتھ فرار ہونے کے دھوکہ میں راج کنیا عین برات کی رات چور کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے۔ دشت وبیابان سے گذرتی ہے مختلف قماش کے لوگوں کو اپنے دامن عصمت کو بچاتی ہوئی چین کے دیش میں پہنچ جاتی ہے۔ وہ دنیا کی ہوسناک نگاہوں سے بچنے کے لئے مردانہ روپ دھار لیتی ہے۔ چین کی شہزادی کو دھوکا ہوتا ہے اور اپنا دل اسے دے بیٹھتی ہے۔ اور وہ اپنی ذہانت اور دانائی

---

[1] دیکھیے خطی نسخہ قصہ دل ربا صہ۳

سے سب کو بے وقوف بتاتی ہے۔ آخر میں قصہ کا ہیرو دل آرام در در کی خاک چھانتا ہزاروں مصائب کا سامنا کرتا ہوا ملک چین پہونچ جاتا ہے اور بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں۔ دل ربا کے ساتھ ساتھ چینی شہزادی بھی برہمن دل آرام کو ملتی ہے۔ کچھ دنوں تک عیش و عشرت کی زندگی گذارنے کے بعد وہ سب قنوج لوٹتے ہیں۔ اپنے باپ کے دشمنوں کو دل ربا شکست دیتی ہے اور تاج و تخت کی وارث بنتی ہے اور رعایا خوشحال ہو جاتی ہے۔

قصہ دل آرام کا دوسرا نام فسانۂ عشق بھی ہے۔ یہ خطی نسخہ دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ خطی نسخہ کے کئی درمیانی صفحات غائب ہیں جس کی وجہ سے کہانی کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ داستان گو خاص ہندوستانی کرداروں پر مبنی ہے لیکن فارسی کی داستانوں کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ عنوان بھی اسی طرح قائم کئے گئے ہیں۔ قصہ دل آرام شروع ہوتا ہے۔

"آغاز داستان دلربا کے تولد میں، اور برہمن پسر دل آرام پر فریفتہ ہونے میں اور نکل جانے شہر قنوج سے ایک چور کے پھندے پڑ کے"

"کہنے والے قصہ کہانیوں کے یوں کہتے ہیں کہ ولایت ہندوستان جنت نشان میں شہر قنوج کا ایک راجہ تھا جے پال نام بڑا سخی، عادل اور رعیت پرور نہایت شجاع، تمام راجے ہند کے مالگذار اور فرمانبردار اس کے تھے۔ مگر خواہش بادشاہ حقیقی سے کچھ آل و اولاد نہ رکھتا تھا۔ اس واسطے بہت غمگین اور دردمند تھا اور عیش و نشاط دنیا کی ایک ذرہ بھی خوش نہ آتی...... اتفاقاً ایک دن فقیر کامل کہ دین اسلام رکھتا تھا، شہر میں آنکلا۔ راجہ خبر پا کر

اس کو حضور میں بلوایا۔"[1]

اس درویش کی دعا کی بدولت دلربا جنم لیتی ہے جو جوان ہوکر پری رو دوشیزہ ہوتی ہے اور دل آرام کے عشق میں سینکڑوں دکھ اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد دل آرام کو پاتی ہے۔

قصہ دل آرام و دلربا ختم ہوتا ہے

"۔۔۔ فرزند دلربا کا عہد دولت و اقبال میں پرورش پاکر جوان و لائق ہوا تب دل آرام نے اس کو تخت سلطنت پر بٹھایا اور آپ دلربا راج دلاری کو ساتھ لے کر بہ حشمت و شوکت تمام اپنے وطن مالوف کو چلا۔ منزل بہ منزل کوچ بہ کوچ روانہ ہوکر چند مدت میں نزدیک قنوج کے پہونچا۔ دل آرام نے پھر راجوں سے جنگ کرکے ملک محروسہ اپنے خسر کا چھڑا لیا اور تخت خلافت پر زینت افزا ہوکر جہانبانی کرنے لگا۔ اس کا نام فسانہ عشق ہوا انجام۔"[2]

قصہ دل آرام و دل ربا کی عبارت گنجلک، اسلوب بے جان اور طرز بھونڈی ہے۔ اکثر پنجابی لفظ جیسے کبھی کے بجائے کدھی وغیرہ استعمال ہوئے ہیں جس کی وجہ سے سلاست اور روانی جاتی رہی ہے۔

---

[1] دیکھیے خطی نسخہ ورق ۷ [2] ایضاً ورق ۱۰۰

کالج سے باہر

فورٹ ولیم کالج میں ان کتابوں کے علاوہ بھی کچھ کتابیں تالیف و ترجمہ ہوئی تھیں لیکن ان کے خطی نسخے سخت جستجو اور تلاش کے بعد بھی نہ مل سکے۔ اناّلس آف دی کالج آف فورٹ ولیم سے تواریخ بنگلہ اور تواریخ تیموری کا بھی پتا چلتا ہے۔ تواریخ بنگلہ غلام اکبر کی کتاب ہے جس پر صاحبان کونسل نے انعام بھی دیا تھا۔ اس کے متعلق گل کرسٹ اور اس کے عہد میں لکھا گیا ہے کہ

"یہ اور دوسری دو اور تاریخیں جن کا ایسی فہرست میں آگے ذکر کیا جائے گا ہندوستانی کلاس کے لئے بے حد فائدہ مند ثابت ہوئیں[1]"

اس تاریخی کتاب پر غلام اکبر صاحب کو تین سو روپیہ کا انعام بھی ملا تھا تواریخ بنگلہ کے علاوہ جو اور بھی دو تاریخوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ تاریخ تیموری تواریخ عالمگیری یا تاریخ بہمنی ہو سکتی ہیں۔ تاریخ بہمنی کا ذکر خلیل علی خاں اشک کے بیان میں ہو چکا ہے۔ تواریخ تیموری منشی تصدق حسین کی تالیف ہے جس پر مؤلف کو ۴۰۰ روپے بطور انعام دئے گئے تھے۔ تواریخ عالمگیری کے مؤلف محمد عمر ہیں۔ یہ تاریخ ۲۰۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور اس پر بھی ۴۰۰ روپیہ انعام دیا گیا۔ ان کتابوں کے علاوہ پروفیسر جان بارتھوک گل کرسٹ کے ایما پر در مجالس اخلاق النبی (غلام اشرف) غلام شاہ بھیک کی تواریخ السلاطین، قصہ فرعون

---

[1] دیکھئے گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۷۳

اور الف لیلی شاکر علی وغیرہ بھی تالیف و ترجمہ ہوئیں لیکن ان کی کتابوں کے مطبوعے اور خطی نسخے مل نہ سکے۔ شاید یہ زمانہ برد ہو گئیں۔

کالج کے باہر کلکتہ شہر میں فورٹ ولیم کالج کے زمانے اور اس کے بعد بھی اچھے اور کامیاب نثر نگار گذرے ہیں۔ انھوں نے انعام حاصل کرنے لیے کتابیں ترتیب دی ہیں۔ انھیں چند مصنفوں کا ذکر یہاں کیا جا رہا ہے۔

میر ابوالقاسم
(حسنِ اختلاط)

حسن اختلاط، میر ابوالقاسم کی تالیف ہے۔ اردو نثری ادب میں اس کو خاص اہمیت اس لئے بھی ہے کہ یہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے چار مہینے قبل تصنیف ہو چکی تھی۔ یہ کسی کتاب کا ترجمہ نہیں، بلکہ نواب قاسم کی اپنی تصنیف ہے اور اردو نثر کی ایک قدیم تصنیف ہونے کے ناتے اسے جو اہمیت حاصل ہونی چاہیئے تھی وہ نہیں ہو سکی۔ اردو ادب کی اکثر تاریخوں میں اس کا ذکر بھی نہیں ہوا ہے۔

نام حسنِ اختلاط نفس مضمون سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ہے۔ نام سے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ بھی انیسویں صدی کی عشقیہ رزمیہ داستانوں کی طرح کوئی داستان ہوگی اور کسی شہزادے اور پری کا گھٹا پٹا قصہ اس میں بھی بیان ہوا ہوگا مگر اصل میں حسن اختلاط چھوٹا سا تاریخی صحیفہ ہے جس میں ہندوستان کی مختلف سلطنتوں کا ـــ ہندو، افغان، مغل اور انگریز ـــ حال بے حد اختصار سے بیان ہوا ہے۔

اور غالباً اس کتاب نے کالج کے منشی خلیل علی خاں اشک کے دل میں انتخاب سلطانیہ اردو لکھنے کی تحریک پیدا کی ہو۔ انتخاب سلطانیہ اردو بھی ہندوستان کی مختصر تاریخ ہے۔

مقام افسوس ہے کہ حسن اختلاط کے مصنف سید ابوالقاسم سبزواری کا حال کہیں نہیں ملتا۔ انھوں نے اختلاط حسن کے دیباچے میں بھی اپنا حال نہیں لکھا ہے۔ حسن اختلاط کے منظوم دیباچے میں انھوں نے جان گل کرسٹ اور دوسرے انگریزوں کے قصیدے لکھے ہیں۔ ان قصیدوں میں انھوں نے جان گل کرسٹ کی اردو دوستی اور مغل تہذیب سے اسکی الفت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ان کی ملاقات نواب صاحب کے یہاں ہوئی۔ جان گل کرسٹ اور ان جیسے بامرتبہ انگریزوں سے دوستی اور بے تکلفانہ بات چیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ میر ابوالقاسم کو اپنے عہد کی سوسائٹی اور معاشرت میں ایک خاص جگہ حاصل تھی۔ گل کرسٹ اور ان کے ہم خیال انگریزوں کو مغل لباس، تہذیب اور ہندوستانی زبان سے گہرا لگاؤ تھا۔

سید ابوالقاسم سبزواری کے آباواجداد ایران کے مردم خیز شہر سبزوار کے رہنے والے تھے۔ اور ایران کی تاخت وتاراج کے وقت ان کا خاندان بھی ترک وطن کرکے ہندوستان میں سکونت پذیر ہوگیا تھا۔ اور پھر سلطنت مغلیہ کے زوال، درانیوں اور مرہٹوں کے ہاتھوں دلی کی تاخت وتاراج کے وقت سید صاحب کا خاندان ہجرت کرکے کلکتے میں آباد ہوگیا ہو۔

سید صاحب کا اس سے زیادہ حال معلوم نہیں ہوسکا کیونکہ اردو ادب کی تمام تاریخیں حسن اختلاط پر خاموش ہیں۔

حسن اختلاط کے شروع میں سید صاحب نے رنگین نثر میں خدا کی حمد لکھی ہے،

جو یہاں پوری نقل کی جارہی ہے کیونکہ یہ اس وقت لکھی گئی جب میر امن یا شیر علی افسوس کے نثری نمونے سید صاحب کے سامنے نہیں تھے۔ یہ حمد مکالمے کے انداز میں لکھی گئی ہے۔

"کیوں جی تم نے اوس کی حمد پر کمر باندھی ہے کہ جس کی کنہ ذات کی دریافت میں پیغمبر بھی عاجز ہیں۔ خدا کے واسطے ذرا ادھر تو دیکھ لو اور اک محمدی یہاں کس درجہ پر قاصر ہے کہ وہ یہ فرماتا ہے کہ "ما عرفناک حق معرفتک" یعنی میں نے سمجھا وہ کہ جو حق ہے سمجھنے کا جل جلالہٗ اور سارے محقق بھی یہی کہتے چلے گئے ہیں ؎

توان در بلاغت بہ سحبان رسید   نہ در کنہ بے چون سبحان رسید

غرض اب یہی سمجھو، تو مثل ہے کہ صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آوے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ اب تو آؤ جانے دو اس فضولی سے ہاتھ اٹھاؤ۔ بر محمد صلوات اور اس سے آگے اگر نعت کا ارادہ رکھتے ہو تو اپنے گریبان میں منھ ڈال اس شعر کو پڑھ لو بلکہ اس پر ختم کردو ؎

چہ نعت پسندیدہ گویم ترا   علیک الصلوٰۃ اے نبی الوریٰ

پھر آگے جا ہو سو کہو کوئی تمہارا منہ نہیں پکڑتا۔ مگر رسم یوں چلا (چلی) آیا (آئی) کہ ہے کہ بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیتے ہیں۔ پر اگر عقل سے بھرا (دماغ) رکھتے ہو تو چپکے سے اپنے مطلب کی راہ پکڑو اور سیدھے چلے جاؤ ادھر کو کہ جدھر کا مقصد ہے تمہیں اگر اب اٹکتے ہو تو راہ کھوٹی ہوتی ہے ویسے تو جانو میں نے اس بات کے سنتے ہی نظر بہر حقیقی کی طرف رکھ قدم تیز کیے اور مشکیں بھرتا چلا۔ ہر قدم پر دھیان ادھر ہی تھا کہ سب کی منزل مقصود کا پہچانے والا وہی ہے، پھر ہمارا پہچاننا بھی اوس سے کچھ دور نہیں، یہی خیال کرتا ہوا ایک دس بیس قدم آگے بڑھا تھا کہ پھر وہی دل ناسخ

ہمارا یوں بولا کہ کیوں بھائی تم نے سنا ہوگا کہ مسافر جو آپس میں باتیں کرتے ہوئے
جاتے ہیں تو راہ خوب کٹتی ہے۔ پھر اس سے کیا بہتر ہے کہ کوئی قصہ، حکایت
کہانی، ایسی بات کہتے چلو کہ جس سے راہ کٹے اور ماندگی سے[1]۔"

نثر میں حمد و نعت اور حسن اختلاط کے لکھنے کی وجہ بیان کرنے کے بعد مصنف
نے اردو کے قدیم محسن جان بارتھوک گل کرسٹ کا قصیدہ بھی لکھا ہے جس سے
ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب شاعر بھی تھے ؎

لباس مغل میں وہ انگریز تھا پر ایسا ہی وہ عقل میں تیز تھا
نہ تھا مجکو تو بھی یہ ان سے گماں کہ وہ ہونگے ہندی میں کامل زباں
زباں کھولی اونے جو ہندی میں آ مرا دل یہ کہتا تھا اے مرحبا
غرض ہے گا وہ ایک صاحب کمال بجا ہے جو کہیے عدیم المثال
خدا ایسے کامل کو رکھے مدام نکلتا ہے جس سے ہزاروں کام
یہ ہے نام نامی کا اوسکے سرشت لقب جان ہے، نام گل کرسٹ[2]

گل کرسٹ کے بعد مسٹر گارڈن نوج اور مسٹر کرسپ کی شان میں بھی قصیدے
ہیں۔ ان قصائد کے بعد حسن اختلاط' شروع ہوتی ہے۔ بادشاہوں اور راجاؤں
کی سلطنتوں کے حال سے پہلے ہندوستان کی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے۔

"۔ وجہ تسمیہ ہندوستان کا (کی) یہ ہے کہ یہ مملکت قدیم سے ہندوؤں کی تھی
اور وے اپنی اصطلاح میں صاحب تخت و تاج کو راجہ کہتے ہیں اور دلی دارالخلافت
بھی اونھیں کی مقرر کی ہوئی ہے مگر وہ اپنی زبان میں دلی کو ہستنا نگر کہتے تھے اور دارو مدار

---

[1] دیکھیے اختلاط حسن خطی نسخہ ص۸ [2] ایضاً ص۱

حاکم ومحکوم کا اوس وقت اس وضع پر تھا کہ محکوم حاکم کو اپنے اعتقاد درست سے واجب پرستش سمجھتے تھے بلکہ اسکی رضامندی کو اپنی نیک بختی اور اطاعت کو حسن طاعت جانتے تھے اور حاکم بھی بدل رعایت وشفقت، احسان کرم ان کے حال پر فرزندانہ کیے جاتا تھا۔ پھر جب تک طرفین کا یہ عالم رہا کہ راجہ راجے اور پرجا سکھی، یعنی وے تو اپنے راج پر براجتے تھے اور خلقت آرام سے اپنی اوقات کاٹتی تھی۔ چنانچہ راجہ بکرمادیت کی (کے) عمل تک ہند کی سلطنت کا اختیار انہیں لوگوں کے ہاتھ میں بخوبی رہا اور بہت دنوں تک رہا۔ پھر (پر) تو یہ کون وفساد ہے یہاں کون وفساد سے کون بچا ہے اور بچے گا کہ وہ بچتے۔ پھر جب کہ اون کے اقبال کا آفتاب سوانیزے پر آپہونچا وہ سرگرم تباہی ہوئے اور ایک کو دیکھ کے دوسرا جلنے لگا۔ رفتہ رفتہ پھر تو اونھی کے بیچ میں سے ایسی آگ اٹھی کہ سب کے سب اکٹھے جل اٹھے[۱]،،

حسن اختلاط میں ہندو سلطنت کا حال پہلے ملتا ہے۔ درحقیقت یہ کتاب ہندوستان کی سلطنتوں کے عروج وزوال کی مختصر سی تشنہ تاریخ ہے جو واقعاتی غلطیوں سے بھی پر ہے۔ اس تاریخ میں خونیں مہمات، قتل نظم ونسق سلاطین کی خونریز معرکہ آرائیوں اور شکست وفتح کی داستانیں اتنی نامکمل ہیں کہ یہ اشارے ہی کہے جا سکتے ہیں۔

سید صاحب کی یہ تاریخ اجین کے افسانوی کردار راجہ بکرماجیت کی عظیم الشان سلطنت کے حال سے شروع ہوتی ہے

---

[۱] ملاحظہ ہو حسن اختلاط قلمی نسخہ ص ۲۱

"بکرما دیت کے قتل کے بعد ہندوستان کی فضا پر ادبار کی گھٹا چھا جاتی ہے
قومی اتحاد پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی سلطنتیں معرض وجود میں آتی ہیں۔
نراج کا راج ہوتا ہے۔ رعایا مظلوم اور دکھی ہو جاتی ہے اور پھر ہندو راجاؤں کے
اندر حصولِ اقتدار کی کش مکش، جنگ اور خونریزیاں ان کے زوال کا سبب بنتی ہیں
ہندوؤں کی سلطنت مٹتی ہے اور پٹھانوں کی حکومت ہندوستان کے نقشہ پر
ابھرتی ہے۔ نئی تہذیب اور نئی زبان آتی ہے اور مقامی زبانوں کے اختلاط سے
ایک نئی زبان کا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے۔ پٹھانوں کی سلطنت پر بھی برسوں کے بعد
زوال کی پرچھائیں محیط ہونے لگتی ہے ان کے اندر بھی وہی برائیاں رینگ آتی
ہیں جو عظیم ہندو سلطنت کے زوال کا باعث ہوئی تھیں۔ اور تورانیوں یعنی مغل
کی یورش کے طوفان میں پٹھانوں کی وسیع سلطنت بھی خس و خاشاک کی طرح بہ جاتی
ہے۔ مغل سلطنت قائم ہوتی ہے۔ اکبر نے ہندوستان کی تاریخ میں نئے تابناک
باب کا اضافہ کیا اور ہندو مسلم کلچر کا روشن آفتاب ہندوستان کی سرزمین پر اپنا نور
برسانے لگتا ہے۔ بہت دنوں تک ہندوستان جنت نظیر بنا رہتا ہے مگر محی الدین
اورنگ زیب کی موت ناقابل شکست سلطنت مغلیہ کی تباہی کا پیش خیمہ بنتی ہے
ملک بھر میں خون و خرابہ اور طوائف الملوکی پھیل جاتی ہے۔ سلطنت مغلیہ دلی کی
چہار دیواریوں تک محبوس ہو کر رہ جاتی ہے۔ جاگیردار اور نواب آزاد ہو جاتے ہیں
انگریزوں، سکھوں، مرہٹوں اور مغلوں کی طاقتیں کھل جاتی ہیں اور غیر ملکی سوداگر
ہندوستان میں بدیشی حکومت قائم کر لیتے ہیں۔ غیر ملکی حکومت کے قیام اور ایسٹ
انڈیا کمپنی کے فروغ پر حسن اختلاط ختم ہوتی ہے۔ حسن اختلاط کا خطی نسخہ خوشخط

لکھا ہوا ہے لیکن تانیث وتذکیر کی غلطیوں سے خالی نہیں ہے خطی نسخہ صرف ۶۲ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے اس کی اہمیت اس لئے ہے کہ اردو نثر نگاری کا یہ ایک بہت ہی قدیم نمونہ ہے اور فورٹ ولیم کالج کی داستانوں اور تاریخوں کی تالیف سے پہلے جنوری ۱۸۰۵ء میں ترتیب پا چکی تھی۔ سید صاحب کی یہ تاریخ بھی شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکی اور صرف مخطوطہ کی شکل میں محفوظ ہے۔

گلشنِ اخلاق

گلشن اخلاق ۱۸۰۹ء مطابق ۱۲۲۴ھ میں مرتب ہوئی تھی۔ یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس میں نصیحت آموز باتیں افسانوی رنگ میں بیان کی گئی ہیں گلشنِ اخلاق کے مؤلف سید علی جعفری ہیں جو فورٹ ولیم کالج کے میر منشی شیر علی افسوس کے بیٹے تھے۔ دسمبر ۱۸۰۹ء میں افسوس کا انتقال ہوا۔ لیکن گلشن اخلاق انکی حیات میں ہی مکمل ہو چکی تھی۔ سید علی جعفری نے اپنے والد محترم کے مشورے سے ہی گلشنِ اخلاق ترتیب دی تھی۔ اور مدرس اول ولیم ٹیلر کو نذر کی تھی جنھوں نے کالج کونسل سے اسکی خریداری کی سفارش کی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید علی کو کالج کی باضابطہ ملازمت مل نہ سکی تھی۔ سید علی کا مشہور ادیبوں میں شمار نہیں ہوتا ہے۔ ان کا رجحان بھی شاعری اور ادب کی جانب ہوتا تو افسوس کی وساطت سے وہ بآسانی فورٹ ولیم کالج کے منشی بن سکتے تھے۔

شیر علی افسوس کا انتقال کلکتے میں ہی ہوا، کلکتے میں ہی وہ دفن ہوئے اور ان کا خاندان بھی کلکتے میں ہی آباد ہو گیا تھا۔ سید علی نے بھی کلکتے میں اپنی عمر گذاری اور یہیں دفن بھی ہوئے۔ اس سے زیادہ سید علی کا حال معلوم نہ ہو سکا گلشن اخلاق کے دیباچے میں انھوں نے اپنا حال نہ لکھنے کے برابر لکھا ہے۔

"عاصی ہیچ مداں سید علی ابن شیر علی افسوس جعفری، خدا بخشے گناہ ہم دونوں کے اور آبرو دو جہاں میں رکھے۔ یہ کہتا ہے کہ اس مجموعۂ کو (مجموعہ کو) بہ عبارت شگفتہ

اکبر شاہ ظل اللہ کی بادشاہت میں عہد حکومت میں گورنر جنرل منٹو بہادر دام اقبالہٗ دسویں رمضان المبارک ۱۲۲۴ھ شہر کلکتہ میں، بالفعل دار الحکومت ہے، فضل الٰہی اور اس کے لطف سرمدی سے حسن اتمام کو پہونچایا، اور چمنوں کو اس میں بنایا اور نام بھی گلشن اخلاق رکھا۔ اس وقت ۱۸۰۹ء مطابق ۱۲۲۴ھ یہ مکمل ہوا۔[1]"

اس دیباچے سے کم سے کم اتنی بات ضرور سامنے آتی ہے کہ سید علی نے جس وقت اپنی یہ کتاب ختم کی تھی اس وقت افسوس بقید حیات تھے ورنہ انکی موت کا ذکر ضرور کرتے، مگر اس کتاب کی تکمیل کے بعد ہی افسوس کا انتقال ہوگیا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سید صاحب کی اس تالیف کو ولیم ٹیلر صاحب کی سفارش کے باوجود کوئی انعام نہیں ملا۔

سید صاحب کی گلشن اخلاق شروع ہوتی ہے۔

"پہلا چمن گلشن اخلاق کا ادائے حق میں مشتمل ۵ اروش کے ادا کرنا حقوق کا رعیت پر عموماً اور ارباب دولت اور اصحاب قدرت پر خصوصاً لازم اور واجب ہے، کس واسطے کہ یہ امر طہارت ذات اور لطافت حسنات کے واسطے ایک دلیل ظاہر ہے۔[2]"

اس طویل پیچیدہ اور گنجلک عنوان کے بعد پہلی روش گلشن اخلاق کی شروع ہوتی ہے۔

"پہلی روش ادائے حق میں ہے کہ نعمت الٰہی کے ثمرہ سے اس کا یوں لکھتا ہے کہ ایک روز سلطان ظفر جنگ ابو منصور اوجی نے وزیر کو اپنے یاد فرمایا۔ وزیر اس وقت تلاوت قرآن میں مشغول تھا۔ سلطنت نہ موجب انتظار از حد گذرا اور یہ تلاوت قرآن سے

---

[1] ملاحظہ ہو گلشن اخلاق خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی ص۱ ۔ [2] ایضاً ص۱

فراغت پا چکا تب حضور میں جاہ (جا) حاضر ہوا۔ بادشاہ نے عتاب فرمایا وزیر نے جواب دیا کہ میں بندہ ہوں خدائے عالیشان کا اور نوکر بادشاہ زمان کا۔ یہ تقریر اس وزیر دانا تدویر (تدبیر) کی نہایت خوش آئی اور مرتبے کو اسکے بلند کیا[1]"

اس طرح پہلے گلشن میں پندرہ روشیں ہیں، ہر روش کے تحت مختصر عبرت آموز حکایتیں درج ہیں جو عربی فارسی سے ترجمہ معلوم ہوتی ہیں لیکن سید علی نے ترجمہ کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔

گلشن اخلاق ۴×۶ سائز میں ۴۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے کسی کم سواد کاتب نے لکھا ہے۔ ہر صفحہ میں متعدد غلطیاں رہ گئی ہیں۔ گلشن اخلاق پر شیر علی افسوس اپنی بیماری کی وجہ سے نظر ثانی بھی نہ کر سکے، طرز تحریر بھونڈی اور بے جان ہے اور زبان کی بھی خامیاں کھٹکتی ہیں۔ ناہمواری زبان کی وجہ سے سلاست کا بھی خون ہوا ہے۔

گلشن اخلاق چھٹے کے گلشن پر ختم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید علی نے گلستاں، بہارستان جامی اور ہتوپدیش کی نصیحت آموز حکایات کاٹ چھانٹ کر لکھدی ہیں لیکن بے جان اسلوب کی وجہ سے یہ ذہن پر دیرپا اثر نہیں چھوڑتیں ابتدائی دور کے نثری نمونہ ہونے کی وجہ سے اس کی تھوڑی بہت ادبی اہمیت ہے۔

اس کے علاوہ سید علی ابن افسوس کی کسی اور تالیف یا تصنیف کا پتا نہیں چلتا۔ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ سید صاحب کا انتقال کس سنہ میں ہوا۔

---

[1] ملاحظہ ہو گلشن اخلاق خ، ن ص۶

نور خاں بن قائم خاں

نور خاں نے فورٹ ولیم کالج کے حکام سے انعام حاصل کرنے کے لئے دو کتابیں ترتیب دیں۔ ایک قصہ بلند اختر اور دوسری مثنوی کلکتہ ہے۔ اور صاحبان کالج کونسل کو نذر کیا تھا۔ لیکن ان دو کتابوں پر کوئی انعام نہیں ملا۔ اور نہ ہی یہ چھپ سکیں۔

نور خاں کے آباؤ اجداد افغانستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے اس نے قصہ بلند اختر کے دیباچے میں اپنا حال اور سبب تالیف بھی بیان کیا ہے۔

"ابتدا اس کی یہ ہے کہ والد مرا قدیم سے بادشاہ کے توپ خانے میں پانصدی منصب پر سرفراز تھا۔ اور سلیم گڑھ کی داروغگی سے ممتاز، لاکھ درم شاہی سے ملتے تھے، نواب صفدر جنگ کی لڑائی میں وہ مغفور کام آیا اور بادشاہ نے یہ خبر سن کر لاش روبرو منگوائی اور مجھ سے (مجھے) بھی حضور میں یاد فرمایا غرض کہ اسی منصب پے میں نے سرفراز پائی۔ جب ابدالی آیا اور شاہ جہاں آباد درہم برہم ہوا تو لوگ مجھے لیکر لکھنؤ میں آئے۔ جب یہاں میں نے پرورش پائی اور ہوش سنبھالا افسانہ و قصہ خوانی کا فن اختیار کیا اور اوقات اس میں بسر کی۔ جن دنوں میں نسبت علی خان اٹاوا میں مارا گیا۔ خلوت و جلوت میں حاضر رہنے لگا۔ ہمیشہ خواب گاہ میں راتوں کو قصہ کہا کرتا تھا اور مورد الطاف ہوا کرتا تھا۔ اس اثنا میں ارادہ شہزادہ موصوف کا لکھنؤ کا ہوا اس فقیر کو شقی دیگر شہر ندکور کو دوبارہ بھیجا۔ وہاں کے ارکانوں کو شقی پہنچائے۔ ایک نقد واسطے پامر صاحب کے تھا وہ گذرانا۔ اسی جواب و سوال میں تھا کہ نواب

آصف الدولہ بہادر مرحوم نے مراسوردپی درماہا کیا۔ خلعت عنایت کرکے اپنے ملازموں میں سرفراز کیا۔ لیکن بندہ اس کام میں بدستور گرم رہا۔ غرض جب شہرہ کالج کا سنا اس شہر (کلکتہ) میں آیا اور دیکھا کہ کمپنی بہادر کی بدولت ایک عالم پرورش پاتی (پاتا) ہے اور کیا کیا زندگی کا لطف اٹھاتا ہے لیکن کمال شرط ہے جس سے قدر و منزلت حاصل ہو اور اہل علم و ہنر کے مجمع میں وہ شخص داخل ہو جب یہ بات دریافت ہوئی چھ ہزار بیت کہے اور مثنوی جو آگے کہی تھی در پیش کی۔ کتنی وجہوں صلہ محل توقف میں پڑا۔ بعد اب یہ قصہ نثر میں لکھا۔ امیدوار ہوں کہ عالیشان کی جناب میں قبول ہو۔ خاطر خواہ میرے دل کا مدعا حاصل ہو[1]"۔

مثنوی کلکتہ جو چالیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ صاحبان کونسل کو پسند نہیں آئی۔ غالباً اس لئے کہ کالج میں نثری داستانوں کی ترتیب، تالیف اور اشاعت کا کام ہو رہا تھا۔ نور خاں نے مایوس ہو کر صلہ و انعام پانے کے لئے قصہ بلند اختر لکھا جو ہندوستانی ایرانی قصہ کا امتزاج ہے۔ اور اس عہد کی دوسری خیالی داستانوں جیسی ہے۔ اس میں رومان، حسن و عشق کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ جنگ و جدال مافوق الفطرت کرداروں کی ناقابل یقین شکست اور شہزادہ بلخ کی فتح و کامرانی کی محیر العقول داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ داستان بھی حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ اس میں کوئی جدت بھی نہیں، ہوشربا واقعات اور طلسمی فضا ہر ورق میں نمایاں ہے۔

قصہ بلند اختر بھی حمد اور منقبت علیؑ اور امام سے شروع ہوتا ہے ؎

یہاں سے لکھ نثر اے دل آگاہ — ہے ہر ایک کا اسی کے ساتھ نباہ

---

[1] دیکھئے دیباچہ قصہ بلند اختر خطی نسخہ ص ۶، ۷

"حمد اس مالک الملک کی کرتا ہوں اور شام وسحر وصیان اسی پہ دھرتا ہوں، جو خاک سے اٹھا محتاج کو امیر، بلکہ پل مارے صاحب تاج وسریر کرتا ہے[1]"

نثری قصائد کے بعد اصل قصہ بلخ کے شہزادے کے معاشقہ کا شروع ہوتا ہے

"روایت کرتے ہیں کہ زمانہ ماضی میں ایک بادشاہ ملک بلخ کا تھا۔ سرزمین ترکستان میں نہایت معمور آباد تھا کیا شہر ہے کہ فردوس، جسکے رشک فضا سے شرمسار ہے۔[2] الخ

اور شاہ بلخ کی بخارے کی شہزادی سے محبت، عشق میں جنگ خونریزی اور تباہی کے ساتھ شہزادہ بلخ کی بے مثال شجاعت کی تصویر کشی میں نورخاں نے اپنے قلم کا سارا زور صرف کردیا ہے۔ لیکن زبان کی ناہمواری اور تذکیر وتانیث کی جابجا غلطیاں بیحد کھٹکتی ہیں۔ نورخاں داستان گو ضرور تھے لیکن داستان نویسی کے فن میں وہ خام نظر آتے ہیں ۲۴ صفحات پر قلمی نسخہ مشتمل ہے۔ اس کی ادبی اہمیت بس اتنی ہے کہ ابتدائی دور کی داستانوں پر ہی، جدید افسانہ نگاری کی بنیاد پڑی اور نثر کو قبول عام نصیب ہوا۔

مثنوی کلکتہ | یہ بقول نورخاں قصہ بلند اختر سے پہلے لکھی گئی۔ یہ چھوٹی سی مثنوی ہے جس میں کلکتہ سے زیادہ صاحبوں کی خوشامدانہ تعریف ہے۔ اس میں ہندوستان کے نقشہ پر ابھرے ہوئے صنعتی شہر کے ہلکے خاکے ضرور ملتے ہیں مگر نورخاں بنیادی شاعر نہیں انھوں نے یہ مثنوی صلہ وانعام کے لالچ میں لکھی۔ لیکن یہ اسقدر بے جان وبے کیف ہے کہ صاحبان کونسل کو بھی پسند نہ آئی اور نورخاں کو انعام نہیں مل سکا۔

مثنوی کلکتہ میں لارڈ ولزلی کی جاٹوں اور دوسرے راجاؤں کے ساتھ جنگ اور ولزلی کی فتح کا حال درج ہے اور اس میں خوشامدانہ مبالغہ آرائی اپنے شباب پر ہے صاحبوں

---

[1] دیکھئے قصہ بلند اختر خطی نسخہ ص ۲۲ [2] دیکھئے خطی نسخہ ص ۲۶

کے قصاید کے بعد، کلکتہ کی تعریف اس طرح بیان کی ہے ؎

لکھوں شہر کلکتہ کا میں بیاں — نہیں ایسی رونق کہیں در جہاں
ہر ایک کوچہ ہے یہاں کا جو شہر روم — ہے ہر ملک میں یہاں کی کثرت کی دھوم
محلا ہر ایک یہاں کا رشک ارم — ہیں آباد لاکھوں ہیں صاحب کرم
قرینے عمارت کی کیا خوب ہیں — ہر ایک دل کو جھکے یہ مرغوب ہیں
عمارت کا یہاں ایسا دستور ہے — جیدھر دیکھیے عالم نور ہے
نہ دیکھا کہیں ہند میں ایک جا — مکاں ایسا نقشے کا کوئی بنا
سلیکا (سلیقہ) کہاں ہے یہ لاوے کوئی — مکاں اس طرح جو بناوے کوئی[1]

شہر کلکتہ کی آن بان اور رونق کے آگے مینا بازار میں ہیچ ہے۔ چینا بازار کی تعریف میں مبالغہ کی انتہا کر دی ہے۔ ہر دکان شاعر کی نظر میں گلزار ہے۔

مثنوی کلکتہ ذیل کے شعر پر ختم ہوتی ہے ؎

یہ ہے شہر کلکتہ مثل بہشت — ہے ہر ایک عورت یہاں خوش سرشت[2]

---

[1] دیکھیے خطی نسخہ ص۲ [2] ایضاً ص۲

جیمس فرانسیس کارکرن

جیمس فرانسیس کارکرن، ایک غیر ملکی اردو ادیب ہے جس نے پروفیسر جان بارتھوک گل کرسٹ ٹوئیس ڈی کاشا ڈاکٹر ولیم ہنٹر اور تامس روبک کے نقش قدم پر چل کر اردو نثر کے الجھے گیسو میں شانگی کی۔ فرانسیس کارکرن، گل کرسٹ کے بعد سب سے اہم غیر ملکی مصنف ہے جسے اردو سے والہانہ شیفتگی تھی اور ہندوستان کے علما اور مشاہیر کی صحبت نے اس کے ذہن کو صیقل کیا۔ ہندوستان کے علما و مصنفین سے اسے بے پناہ ارادت و عقیدت تھی اس کا اظہار اس نے خود کیا ہے۔

"چونکہ بندے کو علمائے ہندوستان سے محبت قلبی ہے اور ان بزرگواروں کے فیضان صحبت سے اتنا ملکہ اس غیر زبان میں پیدا ہوا ہے کہ یہ عبارت بے ہندوستانی کی مدد سے لکھتا ہوں۔ لازم ہوا کہ ایسی عنایت و مرحمت کے عوض میں کوئی ایسا تحفہ ان کے نذر کروں کہ جس میں اگر دوسرا انگلستان نہ پایا جائے تو اتنا تو ہو کہ نادر و نایاب ہووے القصہ جس وقت کہ بازیچۂ گردوں نے مجھے اپنا تماشا دکھایا اور دست تقدیر نے کلکتہ میں دوبارہ پہونچایا اسی فکر میں تھا کہ ایک روز یہ ناچیز جوہر اخلاق، دانشمندوں کی مجلس میں بیٹھا بوستان دانش کے پھولوں کی بو سے دماغ عقل کو معطر کر رہا تھا کہ ناگاہ ادھر ادھر کی نقل و حکایت اور اخبار و روایت کے بیان میں کشورِ ختا کا ذکر آیا۔ اس وقت ایک بزرگ نے فرمایا کہ چونکہ اس مملکت بزرگ کی تاریخ عرب اور ایران اور ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں لکھی گئی اسی سبب سے ہندوستان کے علماء معتبر کو بھی وہاں کے حال سے

زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی میرے خیال میں آیا کہ اگر کوئی ایسی تاریخ تالیف کی جائے کہ بر سبیل اجمال اس ملک کے جزو کل حالات کو شامل ہووے تو نہایت مفید اور مقبول خاص و عام ہووئے[1]۔

جیمس کارکرن نے تاریخ چین کے اس دیباچے میں اپنا حال نہیں لکھا بس اتنا معلوم ہوا ہے کہ ایک انگریز افسر تھا جو کلکتہ اور دلی میں رہتا تھا اور فورٹ ولیم کالج میں وہ مترجم کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اور قیام کلکتہ کے دوران میں اس نے اپنی مشہور کتاب تاریخ ممالک چین تصنیف کی اور اس کی ترتیب میں اس نے تقریباً ۲۸ مستند تاریخوں سے مدد لی۔ تاریخ چین کی دو جلدیں ہیں۔ پہلی جلد ۱۸۴۸ء میں شائع ہوئی اور دوسری جلد ۱۸۵۲ء میں۔

نول کشور پریس نے پہلی جلد کا نسخہ آہنی حروف میں شائع کیا ہے۔ جیمس کارکرن کی اس تصنیف کو ادبی حلقہ میں بڑی شہرت نصیب ہوئی اور عوام نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا مصنف کو ہندوستان کے گوشے گوشے سے خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اخبارات اور رسائل میں تبصرے شائع ہوئے۔

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کو کارکرن کی یہ تصنیف بے حد پسند آئی تھی۔ شاہ ظفر نے اس پر جو رائے دی تھی وہ تاریخ چین کی جلد دوم میں دوسری آراء کے ساتھ انگریزی میں غالباً ترجمہ درج ہے۔ شاہ ظفر نے لکھا ہے۔

"... [illegible] ... سے یہ کتاب بڑے دلکش اسلوب کے باعث رشک ... [illegible] ... معانی مجموعہ لائق قدر ہے۔ ہمارے دربار کے مشاہیر نے ...

---

[1] دیکھئے تاریخ چین جیمس کارکرن صد

گرانمایہ تصنیف سے بے حد حظ اٹھایا۔ ہمارے ادیبوں نے آپکی کتاب سینہ سے لگایا ہے۔ اس کے پہلے اس سے زیادہ خوبصورت، بامعنی، مفید اور معیاری کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی۔ اس کتاب نے تاریخ اردو ادب میں آپ کا نام ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا ہے[1]۔

کلکتہ ریویو مارچ ۱۸۵۰ء کے شمارے میں تاریخ چین کی پہلی جلد پر تبصرہ کیا گیا:

"تاریخ چین میں مصنف نے بہترین زبان (اردو) اور دلکش اسلوب اور جاندار اسٹائل اختیار کیا ہے۔ کہیں کہیں تو میر امن کے باغ و بہار کے انداز نگارش سے لگا کھاتا ہے۔ اس میں وہی روانی اور شگفتگی پائی جاتی ہے جو باغ و بہار میں ہے"۔

انگلش مین، جو بعد میں اسٹیٹسمین ہوا، ۹ نومبر ۱۸۴۹ء کی اشاعت میں تاریخ ممالک چین کے متعلق لکھتا ہے۔

"مصنف کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلی تاریخ چین ہے جو ہندوستان کی کسی مقامی زبان میں لکھی گئی۔ اس لئے اس کی ادبی حیثیت اور قدر یں خواہ کچھ بھی ہوں اس سے ہندوستانی طبقہ کی ضروریات کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ ... چنانچہ اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا"۔

زبدۃ الاخبار مدیر امجد علی کی ۲۵ مئی ۱۸۵۰ء کی اشاعت میں تاریخ چین پر عمدہ اور مثبت تبصرہ کیا گیا ہے

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد مدت کلکتہ کے مترجم جیمس کارکرن نے ہندوستانی ایک کتاب تصنیف کی ہے جو مملکت چین کی تاریخی داستان ہے اس کتاب سے

---

[1] اقتباس از مکتوب بہادر شاہ ظفر بنام مصنف: دیکھئے تاریخ چین جلد دوم۔ دیباچہ انگریزی

قارئین کو چین کے متعلق بہت ساری معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس کا اسلوب جاندار اور عبارت شگفتہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قارئین خود چین کا سفر کر رہے ہیں اور تمام مناظر جو کتاب میں بیان کئے گئے ہیں اس کی نظروں کے سامنے ایک ایک کرکے آتے جاتے ہیں۔"

یہ چند رائیں جو یہاں نقل کی گئی ہیں ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ ممالک چین کو ادبی حلقہ میں قبول عام نصیب ہوا تھا مگر اسے المیہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان کے اس عظیم مصنف کے متعلق اردو ادب کی تاریخ میں کوئی تفصیلی ذکر نہیں ملتا۔

تاریخ چین بے حد معلومات افزا اور مفید تاریخ ہے۔ اسکی اشاعت کا اشتہار ۱۸۴۳ء میں دیا گیا تھا لیکن اس کی اشاعت میں ۲۰۱۵ مہینے کی تاخیر ہوگئی مصنف نے تاخیر کی وجہ خود بیان کی ہے۔

"چھپنے اشتہار اور نمونے کے عشرہ بھی نہیں گذرا تھا، بلکہ اکثر جگہ وہ پہنچا بھی نہ تھا کہ صدر دیوان عدالت کے حکام با احتشام نے راقم کو عہدہ مترجمی میں مقرر کیا، اس سبب سے فرصت کی قلت ایسی ہوئی کہ بجز صبح اور کئی گھنٹے شب کے دوسرے وقت مطلق موقع نہ ملا کہ توجہ اس کی طرف کی جاوے[1]۔"

تاریخ چین کی افادیت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ اس تاریخ میں جنگی مہمات، فتوحات اور سلطنتوں کے عروج و زوال کا ہی صرف حال بیان نہیں ہوا ہے بلکہ چین کی جغرافیائی تفصیل، ہر شہر، ہر پرگنہ اور ہر صوبے کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ تاریخ چین میں وہاں کی معاشرت، تہذیب اور تمدنی زندگی کی

---

[1] دیکھئے تاریخ چین صہ

واضح تصویریں بھی ملتی ہیں، اور جیمس کارکرن نے ختائیوں کی زبان پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے جس کا تاریخ نویسی سے کوئی تعلق نہیں۔

تاریخ چین شروع ہوتی ہے کہ

"چینی تاریخ دانی کے سفروں پر واضح ہے کہ ایام قدیم سے مملکت وسف آگیں جس کا نام اور وہاں کی صنعت و حکمت کا شہرہ تمام ہر اقلیم میں تھا لیکن بہ سبب نہ ہونے راہ و رسم اوس ملک کے کوئی عقدہ وہاں کے فقیر و قطیر کا کہیں کسی پر نہ کھلا۔"

اس عہد کے چین کے طبقاتی نظام کی بھی جیتی جاگتی تصویر سامنے آتی ہے شہر پے چن (پے کن) کے ذکر میں لکھا گیا ہے کہ "ایک طرف دولت کی ریل پیل ہے لیکن اکثر ایسے لوگ بھی ہیں جن کو دو وقت کی روٹی بھی نہیں ملتی۔"

ختائیوں کی زبان کے متعلق امرکی عالم پون سو کا قول نقل کیا ہے کہ "قاعدہ ختائی تحریر کا حقیقت میں نقش مقصد گداز نہیں ہے، جیسا کہ لوگوں نے تصور کیا ہے بلکہ اس کو نقش کلمہ گذار کہنا چاہیے اور نقش مقصد گذار ایک چیز خیالی ہے اس جہت سے اس کو نقش قرار دینا مناسب نہیں ..... کیونکہ انسان کو قوت ناطقہ ہے اور نقش اس کو کہہ سکتے ہیں جو کہ زبان استعمال پر دلالت کرے۔[۲] الخ

صوبہ کیانگ نان کے شہریوں، ان کی سماجی زندگی ان کے اخلاق و آداب سوچو کے مکانات اور نہروں کی بھی بڑی دلآویز تصویر کھینچی گئی ہے۔

"لوگ فارغ البال مرفہ الحال مزے سے کھا پی کر آرام سے سوتے ہیں۔ باشندے وہاں کے خلیق، خوش مذاق، صاحب جوہر، ادب و تہذیب میں طاق ہیں

---

[۱] دیکھیے تاریخ چین ص ۷ [۲] دیکھیے تاریخ چین ج ۱، کارکرن ص ۳۳

مکانات ستھرے اور عالی، سڑکیں صاف و پختہ، وضع کی نرالی اور صدہا نہریں شہر کے محلوں میں آب زلال سے لبریز ہے۔"

تاریخ چین، ایک تاریخی کتاب ہونے کے باوجود ادبی زبان اور جاندار طرز نگارش کی وجہ سے بیحد دلچسپ ہے اور پڑھتے وقت ختا کے ملک کے دلچسپ واقعات اور قصوں میں ذہن ڈوب جاتا ہے اور قاری کو بڑا لطف آتا ہے۔

کارکرن کی تاریخ چین جلد دوم شروع ہوتی ہے

ختا کے پہلے شہنشاہوں کا احوال اور اس مملکت کی بنا اور پہلی آبادی کا بیان،

"اخبار ایام ماضیہ اور قدیم تاریخ معتبر اور روایات متداولے جو سینہ بہ سینہ اور پشت بہ پشت سلف سے چلی آتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ مشرق میں قریب یا بیچ تبت بزرگ کے یا دشت گوبی کی گرد و نواح میں بیچ اوس سرزمین کے جو کوہستان ہمالہ کے شمال کی جانب واقع ہے خدائے تعالیٰ نے آدم کی بنیاد کو اوائل میں قائم کیا تھا[1]،،

اس تمہید کے بعد مصنف نے انسان کے آباد ہونے، پھیلنے اور دریا روا لگا) کے کنارے بستیاں بسنے اور حضرت نوح کی اولاد کے پھیلنے پھولنے کی تاریخ افسانوی رنگ میں لکھی ہے جو شگفتہ اور رواں دواں عبارت کی وجہ سے بہت دلچسپ ہو گئی ہے۔

جلد دوم نو ابواب پر مشتمل ہے اور سوچو کے جزائر کے احوال پر ختم ہوئی ہے

---

[1] تاریخ چین جلد دوم ص۱

اس تاریخ کے مطالعے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ سنہ ۱۷۵۷ء میں انگریز قوم رفتہ رفتہ چین پر اپنا تسلط جماتی جارہی تھی۔ کارکرن انگریز تھا اور قومی عصبیت اس میں بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ختائی قوم کی تذلیل و توہین بھی اس نے کی ہے۔ اور سراج الدولہ کو بدکردار اور وحشی قرار دیا ہے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اس غیر ملکی ادیب کا دل بھی تعصب سے خالی نہ تھا۔ اور اس نے ہندوستانی تہذیب اور سماجی زندگی کا بھی خاکہ اڑایا ہے

— ہندوستان کے حکمرانوں کی ریاکاری، بزدلی اور بربریت کے جو واقعات اس میں بیان ہوئے ہیں اس کی تاریخی اہمیت کو وہ گھٹا دیتے ہیں —

جیمس کارکرن صرف ایک اچھا نثر نگار ہی نہ تھا بلکہ اچھا شاعر بھی تھا۔ مقام افسوس ہے کہ اس غیر ملکی مصنف نے اپنی کسی تالیف میں اپنی زندگی کا حال نہیں لکھا ہے۔

جوہر اخلاق | جیمس کارکرن کی دوسری کتاب جوہر اخلاق ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی سبق آموز کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اصل میں یہ یونانی حکایات کا ترجمہ ہیں جس کا ذکر دیباچے میں خود جیمس کارکرن نے کیا ہے۔

"یونانی ایشپ کی نقلیات کا ترجمہ اردو زبان میں دلی اور لکھنؤ کے خاص لوگوں کے محاورے میں جس کو احقر العباد جیمس فرانسیس کارکرن نے ترجمہ کرکے اور شاہ الفت حسین مولوی کی نظر سے گذار کے جناب سخن پرور عدل گستر حاکم عدالت دیوانی صدر کلکتہ رابرٹ بالڈن رابری ۔۔۔۔ کی خدمت میں نذر دینے کو مدرسہ عالیہ میں سنہ ۱۸۲۵ء میں چھپوایا ہے۔"

جوہر اخلاق میں ہر حکایت کا ما حصل کارکرن نے نظم میں لکھا ہے جس سے اسکی شاعرانہ صلاحیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ بلاشبہ زبان اور بیان کے لحاظ سے اس کی ادبی حیثیت نہیں ہے لیکن اسکی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جوہر اخلاق کی پہلی نقل یوں شروع ہوتی ہے۔

ایک روز کسی مرغے نے کسی کوڑے کے ڈھیر پہ چگتے میں ایک جواہر بیش قیمت دیکھا افسوس سے ایک آہ سرد بھر کر کہنے لگا کہ جوہری کے یہاں اسکی بڑی قدر ہوتی لیکن میرے نزدیک ایک دانا اناج کا اس سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ حاصل، ؎

جسے گندم وجو سے ہوئے سرور — نہیں کچھ اوسے لعل و گوہر ضرور
جو روٹی کا ٹکڑا ملے بھوکھ (ک) میں — تو معلوم ہو زر سے بہتر ہیں

جوہر اخلاق میں پچاس حکایات اور ہر حکایت نصیحت آموز ہے اور ۹۶ صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب اس قطعہ پر ختم ہوتی ہے ؎

ہم نے دکھلایا آنکھ والوں کو — جلوۂ مہر انور اخلاق
ہو مفید جہانیاں یہ کتاب — رہے جب تک کہ دفتر اخلاق

مؤلف نے دیباچہ انگریزی میں تحریر کیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ اس نے جوہر اخلاق کو تین جلدوں میں مرتب کیا تھا، لیکن اس کی صرف پہلی جلد شائع ہو سکی۔ دو جلدوں کا کہیں پتا نہیں۔

تاریخ بنگلہ | دیباچے میں کارکرن نے یہ بھی لکھا ہے کہ جوہر اخلاق کے قبل اس نے مارشمین (MARSHMAN) کی تاریخ بنگالہ ترجمہ کر لیا تھا۔ لیکن مقام افسوس ہے کہ تاریخ بنگلہ زمانہ برد ہو گئی اور اس کا

کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں۔

میجر جے ڈبلو جے آدسلی نے لکھا تھا کہ

"میں نے آپ کا ترجمہ دیکھ لیا ہے۔ اس میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت رکھتا ہوں، یہ نہایت مفید اور کارآمد کتاب ہوگی[1]"

---

[1] دیکھئے دیباچہ جوہر اخلاق۔ انگریزی ص ۲۱۱

جذب عشق

جذب عشق کے مصنف حسین بخش شاہ ہیں۔ یہ ایک رومانی قصہ ہے جس میں ایک مرہٹی سپاہی کے جو حسن و جمال میں یوسف تھا، عشق کی رنگین داستان بیان کی گئی ہے۔ جذب عشق میں حسین بخش شاہ نے اپنی زندگی کا حال نہیں لکھا ہے اس نے بھی اتنا لکھا ہے کہ تھامس ہنری کولبرگ (غالباً کولبرج) کی فرمائش پر یہ کتاب لکھی جو ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوئی۔ حسین بخش شاہ نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ اسے اردو زبان پر عبور کامل نہیں ہے لیکن اپنے محسن ہنری کالرج کی فرمائش پر اس نے ایک مرہٹی سپاہی کی داستان عشق قلمبند کی ہے جو اس کے ذہن کی اپج ہے

جذب عشق کا قصہ ۹۶ صفحات میں سمٹا ہوا ہے۔ اس میں بھی وہی برائیاں پائی جاتی ہیں جو ۱۹ ویں صدی کے آغاز میں روایتی حسن بن گئی تھیں یعنی قصہ کے باب کا خلاصہ، مثنوی میں بیان ہوتا ہے جو قصے کی دلچسپی کو گھٹا دیتا ہے۔

جذب عشق شروع ہوتی ہے اس بیت سے ؎

شروع داستاں بس یہاں سے کیجئے   نہایت طول قصے کو نہ دیجئے

اس شعر کے بعد شروع ہوتا ہے

"کہتے ہیں مرہٹے کے لشکر میں ایک جوان رعنا تھا۔ انگریز کا رفیق کار او رسراپا در نایاب، بحر حسن میں غریق، نہایت ہی حسین اور صاحب جمال قیامت پے، لطیف طبع اور شیریں مقال ـــ"

نثر میں حسن و جمال کی تعریف بیان کر کے مصنف کو دلی تسکین نہیں ہوتی ہے
اس نے آٹھ دس اشعار میں خوبصورت سپاہی کے سراپا کی تصویر اتاری ہے۔ جذب عشق
کا انجام المیہ ہے۔ عاشق و معشوق موت کے بعد ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔

جذب عشق جذباتی اور رومانی قصہ ہونے کے باوجود اپنے اندر رنگینی اور دل
چسپی جذب نہ کر سکی۔ بس جانباز کی بے مثال شجاعت اور محیر العقول کارنامے، کتاب
کی دل چسپی کا سامان ہیں۔

حملات حیدری

حملات حیدری، احمد علی گوپا موئی کی تالیف ہے۔ احمد علی نے چار فارسی کتابوں یعنی کارنامہ حیدری، جارج نامہ اور تاریخ حمید خانی سے ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ شہید سلطان ٹیپو کے فرزند محمد سلطان عرف غلام محمد کی فرمائش پر کیا گیا اور ان کو نذر بھی کیا گیا اور سلطان موصوف کی ہدایت پر میر کونسل مسٹر ڈرنک واٹر بیتھون کے نام معنون کی گئی۔

اس کتاب کا تاریخی نام 'تواریخ گزیدہ' جس سے ہجری سنہ نکلتا ہے۔ یہ کتاب ۱۲۶۳ھ میں مکمل ہوئی۔ اور کلکتے میں مولوی عبداللہ کے چھاپہ خانہ ۱۸۴۸ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔

شیخ احمد علی گوپا موئی بھوپال کے رہنے والے تھے لیکن بہ سلسلۂ ملازمت ان کی زندگی کا بیشتر حصہ کلکتے میں گذرا۔ سبب تالیف انھوں نے دیباچے میں خود لکھا ہے "جب فضیلت انتساب کرامت مآب مظہر دقائق منطقی و حکمی مصدر فیوضات علمی، حبیں غوامض انگریزی، عربی و فارسی صاحب ذہن .... مولوی عبدالرحیم .... نے وقائع نواب حیدر علی خاں بہادر مغفور اور ٹیپو سلطان کو انگریزی اور فارسی تواریخوں سے جن کی تفصیل آتی ہے بہ سبب کمال دلجوئی و شفقت و حمایت درجات شاہزادہ عالیشان کے تین برس کے عرصے میں نہایت شفقت و رحمت سے معلوم کر کے زبان فارسی میں لکھا اور اس کا نام کارنامۂ حیدری رکھا اور واقعی کمال

کیا ہے ؂

ہر کہ سخن را بہ سخن فہم کند قطرۂ از خون جگر کم کند

عاصی شیخ احمد علی گوپاموئی نے اس کتاب کے مضمون کا فائدہ عام پا کے اور یہ سمجھ کر زبان فارسی سے اس کے جو لوگ فارسی میں کامل لیاقت رکھتے ہیں وہی اس چشمۂ فیض سے بہریاب ہو سکتے ہیں اور جو لوگ صرف حرف شناس اور کم مایہ ہیں اس کے فائدے سے محروم رہیں گے۔ تعمیم فائدہ کی نیت سے ساتھ صلاح و مشورہ ...... حکیم مولوی احمد حسین شاہ جہاں آبادی کے فارسی سے زبان اُردو میں جو بول چال لکھنؤ اور دلی والوں کی ہے دارالامارہ کلکتے میں سنہ ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں ترجمہ کیا۔ اور حملات حیدری اس کا نام رکھا۔ اور تاریخی نام تواریخ گزیدہ پایا۔[1]"

شیخ احمد علی گوپاموئی نے سخت محنت اور عرق ریزی سے حیدر علی خاں اور شہید سلطان ٹیپو کے عہد کے واقعات، مہمات، جنگ اور شکست کا حال دلچسپ اور آسان زبان میں لکھا ہے اور یہ اس عہد کا مفید ماخذ ہے۔

حملات حیدری، ہندوستان کی سرحدوں کے اجمالی بیان سے شروع ہوتی ہے۔

"یہ ولایت وسیع جنوبی حصے میں براعظم ایشیا یا بلاد سمران[2] کے واقع ہے۔ اتر دکھن میں یہ ولایت درمیان الہ آباد اور ۳۵ درجہ عرض شمالی کے واقع ہے یعنی آٹھ درجے کے فاصلہ سے شروع اور ۳۵ درجہ تک منتہی ہوتا ہے[3]۔

---

[1] دیکھیے حملات حیدری مطبوعہ ۱۸۴۸ء ص[illegible] [2] یورپ افریقہ بلاد سمران بڑا تیسرا حصہ ہے ربع مسکون قدیم کا جس کے اور دو حصے کو یورپ افریقہ یا بلاد سمران کہتے ہیں مؤلف۔ [3] دیکھیے حملات حیدری ص۱

ہندوستان کی جغرافیائی حدود اور تشکیل کی وضاحت کے بعد ہندوستان کی ندیوں اور پہاڑوں کی تفصیل درج ہے جو بے حد مفید اور معلومات افزا بھی ہے۔ ندیوں اور پہاڑوں کے ذکر کے بعد اصل تاریخ انگریزوں کے تسلط سے شروع ہوتی ہے۔ ایک طویل مثنوی بھی درج ہے جو اس کا عیب ہے۔ دکن میں سلطنت کے زوال اور حیدر علی کے عروج کی تاریخ انتہائی دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہے۔

حملات حیدری ۵۲ صفحات پر مشتمل ہے اور گورنر بنگال لارڈ ولزلی کے مکتوب بنام ولیم منٹنگ پر ختم ہوتی ہے۔ کتاب کے خاتمہ پر بارہ صفحات میں اغلاط نامہ درج ہے۔

راجہ جنم جے متر ارمان

راجہ جنم جے متر ہندوستان کی سابقہ راجدھانی کلکتہ کے حوالی شیوڑا میں پیدا ہوئے وہ راجہ پتمبر متر کے پوتے تھے۔ راجہ پتمبر متر کو خود بھی اردو شاعری کا اچھا مذاق تھا چنانچہ راجہ جنم جے متر نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی، پلے اور بڑھے جہاں شعر و شاعری کا عام چرچا تھا راجہ ارمان نے بھی فطری طور پر اس ماحول کا اثر قبول کیا اور صغر سنی سے ہی شاعری کرنے لگے تھے۔ ارمان اس عہد کے مشہور و معروف شاعر حافظ احمد منیم کے دائرۂ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ حافظ منیم کے علاوہ ارمان کو عبدالغفور خاں نساخ، عصمت اللہ انسخ اور نساخ کے دوسرے شاگردوں اور اچھے اور باذاق لوگوں کی صحبت رہی۔ یہی صحبت ان کی شاعری کو چمکانے اور اسے جلا بخشنے میں معاون ثابت ہوئی۔

نساخ نے اپنی کتاب "سخن شعرا" میں ارمان کا بھی ذکر اختصار سے کیا ہے اور ان کے دو شعر بھی نقل کئے ہیں۔ نساخ لکھتے ہیں۔

"نام راجہ جنم جے متر تھا تخلص ارمان، نبیرہ راجہ پتمبر متر، شاگرد حافظ اکرام احمد منیم حوالی کلکتہ شیوڑا میں رہتے ہیں۔ راقم سے انکی ملاقات ہے۔ ان کا ایک تذکرہ شعرائے اردو نظر سے گذرا۔"[1]

"سخن شعرا" چونکہ صرف شاعروں اور ان کے کلام کا تذکرہ ہے اس لئے غالباً نساخ نے ارمان کے تذکرہ شعرائے اردو کا سرسری ذکر تو کر دیا لیکن اسکی تفصیل

---

[1] دیکھیے سخن شعرا نساخ ص۔

تو کجا نام تک نہیں لکھا۔ نساخ نے ارمان کے جس تذکرۂ شعرا کا ذکر کیا ہے وہ اپنے زمانے کا ایک مفید ادبی تذکرہ ہے جو "نسخۂ دلکشا" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور جو ارمان کے نام کو زندۂ جاوید رکھنے کیلئے کافی ہے۔

"نسخہ دلکشا" کی صرف پہلی جلد اور وہ بھی نامکمل چھپ کر لوگوں تک پہنچ سکی۔ نسخۂ دلکشا کی دو جلدیں ارمان نے مرتب کر لی تھیں لیکن بدقسمتی سے اس کی مسلسل علالت اور پھر موت کے باعث دوسری جلد شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکی۔

"نسخۂ دلکشا" جیسا کہ لکھا گیا اردو کے شاعروں کا مختصر تذکرہ ہے اس نسخہ کی تالیف کا سبب خود ارمان نے اپنے دیباچہ میں بیان کیا ہے۔

"شائقین فن سخن و طالبان مضامین تازہ و کہن، ناظرین غزل و اشعار فرحت انگیز و سامعان رباعیات و مخمسات لطافت و ظرافت آمیز کی خدمت میں گذارش ہے کہ یہ عاصی پر معاصی اپنے غنچۂ دل پژمردہ کی تر و تازگی کی خاطر سیر چمنستان پر بہار دیوان ہائے اردو و فارسی میں کبھی کبھی مصروف رہا کرتا تھا جو ابیات و اشعار دلچسپ پاتا اس کو پارۂ کاغذ پر لکھ کر دل بہلاتا۔ رفتہ رفتہ چند عرصہ میں ایک دفتر ہو گیا۔ لیکن جب کبھی کسی شعر کا مضمون یاد آتا دل شوق منزل اس شعر کی طرف مائل ہوتا۔ بہ سبب عدم ترتیب اشعار کے جلد دستیاب ہونا مشکل تھا لہذا اس خوشہ چین خرمن مضامین کا دل نیاز آئیں، اس پر متوجہ بہ اشعار پُربہار مع نام و تخلص اور مختصر احوال مصنفوں نجستہ آثار کے، کہ یہ بھی اعلیٰ مطالب طالبان سخن سے ہے ترتیب حروف تہجی مرتب کئے جاویں تاکہ متلاشی جلد اسے پاویں اور ان کے مذاق سے لطف اٹھائیں۔ بریں خیال شعرا ماضی و حال کے اکثر نسخوں کو جمع کر کے تانیاً

مقابلہ کیا اور نام اس بیاضِ رشکِ ریاض کا "نسخۂ دلکشا" رکھا۔[1]

ارمان نے اپنی زندگی میں نسخۂ دلکشا کی دونوں جلدیں مرتب کر لی تھیں لیکن اس کی مسلسل اور جان لیوا بیماری کے سبب پہلی جلد بھی ادھوری ہی چھپ سکی دوسری خواتین شعرا پر مشتمل تھی لیکن اسے اُردو ادب اور شاعری کی بدنصیبی کہہ لیجئے کہ اس نسخہ کی دوسری جلد شائع نہ ہو سکی ورنہ ہندوستان کی شاعرات اور خاص کر بنگال کی شاعرات کے متعلق اہم مواد اکٹھا ہوتا اور کئی ہندو بنگالی شاعرات بھی گمنامی کے پردے سے باہر آجاتیں۔ ارمان نے خود لکھا ہے کہ نسخۂ دلکشا کی دو جلدیں ترتیب پا چکی تھیں ـــ "یہ تذکرہ دو ترتیب پر مرتب ہوا، ترتیب اول میں ذکر شعراءِ ہند کا احوال مختصر کے ساتھ اور تخلص ان کا بہ ترتیب حروف تہجی رقم کر کے قدرے ان کے کلام دلپذیر سے مندرج کیا۔ اور ترتیب دوم اشعار عورتوں کے اور وہ ابیات کہ دلچسپ تھیں ......[2] الخ"

نسخۂ دلکشا کی پہلی جلد ۱۸۵۴ء میں چھپنے کے لئے پریس میں جا چکی تھی۔ مؤلف کی مسلسل علالت کی بنا پر ۱۸۷۰ء تک چھپ نہ سکی اور انکی موت کے بعد ادھوری ہی چھاپ کر شائع کر دی گئی۔ نامکمل جلد کی اشاعت کے اسباب پر تعارف میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

"۱۸۵۴ء میں یہ کتاب (پہلی جلد) چھپنے کے لئے دیدی گئی تھی۔ مصنف کی مسلسل علالت کی وجہ سے کتاب کا اختتامی حصہ چھپ نہ سکا اور ان کی حالیہ موت کے باعث اس کے مکمل چھپنے کی اُمید بھی نہیں۔ چنانچہ پہلی جلد ادھوری

---

[1] نسخۂ دلکشا ص۲ چھاپ شدہ کلکتہ ۱۸۷۰ء [2] ملاحظہ ہو نسخۂ دل کشا ص۳

شائع کی جارہی ہے۔ پوری کتاب میں ۷۰۰ شعرا اور ۳۲ شاعرات کا اجمالی ذکر ہے لیکن صرف ۳۸۰ شاعروں پر ہی پہلی جلد ختم کر دی جاتی ہے۔"

تعارف کے نیچے ایک صاحب "آر۔ ایم" کے دستخط ہیں۔ مقام شیورا اور تاریخ اشاعت ۴ مارچ ۱۸۷۰ء دی گئی ہے۔ اس تعارف سے صاف ظاہر ہے کہ نسخۂ دلکشا مکمل چھپتی تو ایک ضخیم کتاب ہوتی، لیکن بدقسمتی سے صرف ۳۸۰ شاعروں کا حال اور کلام شائع ہو سکا اور ۲۹۷ شعراء اور ۳۲ شاعرات کے ترتیب وار حالات اور کلام کا مسودہ ہی رہ گیا۔[1]

نسخۂ دلکشا کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ کے دوسرے اردو فارسی تذکروں کو پیش نظر رکھ کر ترتیب دیا گیا۔ ارمان نے اس کے لئے اپنا کوئی انداز یا اسلوب نگارش اختراع نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن کے تذکرہ شعرا میر تقی میر کے نکات الشعرا اور گلزار ابراہیم اس کے سامنے تھے۔ انھی تذکروں کے انداز اور اسلوب کو آرمان نے اپنایا ہے۔ ارمان کی کتاب آفتاب شاہ عالم کے تذکرہ سے شروع ہوتی ہے

"آغاز کتاب ازراہ ادب کے جو ساتھ نام حضرت شاہ عالم بادشاہ غازی اور حضرت صاحبقران جناب ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ غازی تخت نشین دہلی کے ہوا۔ اس کو احقر نے فخر اپنا سمجھ کر ترتیب حروف تہجی کو دخل یہاں نہیں دیا

---

[1] ہندوستان کے مشہور محقق قاضی عبدالودود صاحب پٹنہ کی اطلاع ہے کہ دوسری جلد کا مسودہ ارمان کے لواحقین نے فرانسیسی ادیب گارسان دتاسی کو بھیجدیا تھا لیکن بدقسمتی سے دتاسی بھی اسے شائع نہ کر سکے۔ شاید پیرس کی نیشنل لائبریری میں یہ نسخہ مخطوطہ کی شکل میں محفوظ ہو۔

اور نام نواب آصف بہادر کا بھی ذکر محمد حسین کے ثبت کیا۔

آفتاب تخلص، نام شاہ عالم بادشاہ غازی، یہ کبھی علی گوہر تخلص فرماتے تھے ابتدائے ۱۱۷۳ھ سے زینت آرائے سلطنت ہو کر ۱۲۲۱ھ میں رحلت فرمائی"۔

شاہ عالم آفتاب کی مشہور رباعی کے علاوہ دو چار شعر بھی نقل کیے ہیں۔

رباعی

صبح اٹھ جام سے گذرتی ہے — شب دل آرام سے گذرتی ہے

عاقبت کی خبر خدا جانے — اب تو آرام سے گذرتی ہے

اشعار

ہوئی جب باغ سے رخصت کہار و رکے یاقسمت — لکھا تھا یوں کہ فصل گل میں چھوٹے خانماں اپنا

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کٹتی — اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

شاہ عالم آفتاب کی رباعی اور اشعار کے انتخاب سے ارمان کے ستھرے مذاق شاعری کا پتہ چلتا ہے "نسخۂ دلکشا" میں ایک بات کھٹکتی ہے۔ ارمان نے شاعروں کے حالات لکھتے وقت تحقیق اور تجسس سے کام نہیں لیا ہے۔ زیادہ تر سنی سنائی باتیں لکھدی ہیں صحت کا خیال نہیں رکھا ہے۔ مرزا جان طپش کا حال لکھا ہے۔

"طپش تخلص، نام محمد مرزا احمد اسمٰعیل عرف مرزا جان بیٹا یوسف بیگ بخاری کا۔ پیدائش ان کی ملک بخارا کی، سپاہی پیشہ تھے، پہلے شاگرد محمد یار بیگ کے بعد اسکے خواجہ دردکے، دلی میں رہتے ہیں۔ پیچھے کلکتہ میں آکے راجہ کشن بہادر کی مصاحبت میں رہتے تھے"۔

۱؎ ملاحظہ ہو نسخۂ دلکشا ص۱۶۲

مرزا جان طپش کی پیدائش بخارا میں نہیں دہلی میں ہوئی۔ اس پر اکثر محققوں کو اتفاق ہے کہ طپش کا مولد و مسکن دلّی تھا۔ ارمان نے یہ بھی لکھا ہے کہ دلّی سے کلکتہ آکر راجہ کشن کی مصاحبت کی لیکن طپش دلّی سے پہلے لکھنؤ اور بنارس رہے۔ پھر جہانگیر نگر ڈھاکا گئے اور مرشد آباد میں کچھ دنوں رہنے کے بعد ۱۸۰۱ء میں کلکتہ آئے تھے۔

نسخہ دلکشا کی واقعاتی غلطیوں کے علاوہ اسکی زبان میں بھی روانی اور سلاست نہیں ہے۔ ارمان کے سامنے میر امن دہلوی، شیر علی افسوس اور حیدر بخش حیدری اور بینی نرائن جہاں کی نثر کے نمونے تھے لیکن ان کا اسلوب نگارش اور انداز بیان باغ و بہار تو کجا دیوانِ جہاں سے بھی لگا نہیں کھاتا۔

لیکن ان خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود "نسخہ دلکشا" کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ارمان نے ڈھاکا، ہگلی، مرشد آباد اور کلکتہ کے اکثر غیر معروف اور گمنام شاعروں کا بھی حال لکھا ہے جس سے بنگال میں اُردو کے شاعروں کا نشان ملتا ہے اور تحقیقی کام کرنے والوں کے راستے سے بہت سی رکاوٹیں ہٹتی ہیں۔

اس زمانہ کے دستور کے مطابق ارمان نے اپنا حال بھی مختصر لکھا ہے۔ اپنا نمونۂ کلام بھی دیا ہے لیکن دوسرے تذکرہ نویسوں سے ہٹ کر اس نے اپنی دو تین غزلیں ہی نمونہ کے طور پر لکھی ہیں۔

نسخۂ دلکشا ۴۲۰ صفحات پر مشتمل ہے اور کفایت کے تذکرہ پہ ختم ہوتا ہے
"تخلص کفایت، نام نواب کفایت اللہ خاں۔ نواب زادہ رامپور کے اکثر غزلیں ان کی گائی جاتی ہیں۔"[۵]

---

[۵] ملاحظہ ہو نسخۂ دلکشا صفحہ ۲

کفایت کے حال سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مقبول شاعر تھے۔ ان کی
غزلیں اکثر محفلوں میں گائی جاتی تھیں لیکن ارمان نے ان کا صرف
ایک ہی شعر نقل کیا ہے اور بس۔ ارمان کے تذکرے میں ایسی تشنگی کا احساس
جا بجا ملتا ہے۔

مرشد آباد کا

اُردو ادب میں حصّہ

ہندوستان انیسویں صدی کے شروع اور اٹھارہویں صدی کے آخر میں ایک نازک اہم دور سے گذر رہا تھا اور سیاسی انقلاب کی دھیمی گونج سنائی دے رہی تھی۔ دلی سلطنت کی بنیادیں ۔ اس سیاسی انقلاب کے طوفان میں ہل رہی تھیں اور دلی سلطنت ہر لمحہ بدلتے ہوئے حکمرانوں کے باعث کمزور ہو کر فنا کی سرحد میں داخل ہو رہی تھی۔ اس سیاسی انقلاب نے دلی اور اسکے گرد و نواح کی شہری زندگی اتھل پتھل کر کے رکھدی تھی۔ جب رعایا کے محافظوں کی ہی جان و آبرو خطرے میں گھر گئی تھی اور وہ لوگ جو تاج و تخت کے مالک تھے خود کاسۂ گدائی لئے پھرتے نظر آرہے تھے تو لٹتی اور برباد ہوتی ہوئی دلی آباد کیسے رہتی۔ وہاں کے خوددار اور سکون پسند شہریوں کا کارواں رخت سفر باندھ کر سکون کی تلاش میں مختلف شہروں کی طرف چل نکلا کسی کو لکھنؤ، کسی کو عظیم آباد اور کسی کو ہندوستان کے دور دراز مشرقی حصے مرشد آباد اور ہوگلی میں پناہ ملی۔ اٹھارہویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے آغاز میں ہی مرشد آباد ہندوستان کے نوابوں، تاجروں اور فنکاروں کا مرکز بن چکا تھا۔

مرشد آباد کی زمین اُردو ادب کے پودے کیلئے مناسب اور سازگار ثابت

ہوئی تھی اور اردو کے بڑے اور منفرد شاعر اور ادیب یہاں پیدا ہوئے اور اسکی ادبی متاع کلکتہ، لکھنؤ اور عظیم آباد سے کچھ کم نہیں ہے۔ مرشد آباد میں اردو ادب کے ارتقا کا جائزہ لینے کے لئے اِس کے تاریخی پس منظر اور واقعات کا تجزیہ لازمی ہے۔

مرشد آباد کی تاریخی حیثیت

مرشد آباد بھی ایک قدیم تاریخی شہر ہے اسکی ابتدا کے ساتھ نیم تاریخی اور مذہبی واقعہ وابستہ ہے یہ بھاگیرتی کے کنارے بسا ہوا تھا لیکن اصل میں مرشد قلی خاں کے قبل پایہ تخت نہ بن سکا تھا۔ اس شہر کی بنیاد رکھے جانے کی تاریخ پر نقاب پڑی ہوئی ہے۔ اکثر مورخین نے لکھا ہے کہ مغل اعظم اکبر کے عہد میں اس شہر کی بنیاد پڑی اور آہستہ آہستہ ایک بارونق اور بڑا شہر بھاگیرتی کے کنارے آباد ہو گیا۔ ۱۶۹۶ء میں افغانوں نے بغاوت کی اور مخصوص آباد تک پیش قدمی کرتے ہوئے چلے آئے تھے۔ علامہ ابو الفضل نے آئینِ اکبری میں اس شہر کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے مگر واقعات اکبر (اکبر نامہ) میں مخصوص خاں کا ذکر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسی نے مرشد آباد کو بسایا تھا۔ اس لئے اس کا نام مخصوص آباد تھا۔ مرشد علی قلی خاں نے اسکی تعمیر از سرِ نو کرائی اور جہانگیر نگر کے بجائے اسکو اپنا صدر مقام بنایا۔ اور اس کا نام مرشد آباد رکھا۔ اور اس وقت سے یہ ایک اہم تجارتی شہر بننے لگا تھا۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے لوگ یہاں آکر آباد ہونے لگے تھے اور نواب مرشد قلی خاں کے نام پر ہی مرشد آباد نے

مرشد آباد کے نام سے شہرت پائی۔

مرشد آباد صوبہ بنگالہ کا "جنت البلاد" تھا اور اورنگ زیب کے عہد میں ہی یہاں مغل، ایرانی اور پٹھانوں کی کثیر تعداد آباد تھی یہ مختلف پیشہ کے لوگ تھے۔ ان میں بیوپاری تھے، کاریگر تھے، کسان تھے، طبیب تھے، شاعر اور ادیب تھے۔ اٹھارویں صدی سے ہی یہ مسلمانوں کا اہم اور بڑا مرکز بن چکا تھا۔ جہاں انکی نشانیاں اور یادگاریں کھنڈرات کی شکل میں موجود ہیں اور انکی سابقہ عظمت کے خاموش مؤرخ ہیں۔ مرشد آباد عالیشان قصر اور مساجد کا شہر تھا۔ سات سو مساجد یہاں تعمیر کی گئی تھیں۔

سات سو مسجدوں کے گنبد سے سات سو مؤذنوں کی اذانیں اس پر ہجوم شہر کی فضا میں گونجتی تھیں۔ اس وقت یہ سب برباد ہو چکی ہیں اور صرف ستر[1] مسجدیں باقی رہ گئی ہیں اور ستر مسجدوں میں سے صرف سات اچھی حالت میں ہیں[2]

مرشد آباد کا تابناک ماضی ختم ہو چکا ہے۔ رفتہ رفتہ اس شہر کی اہمیت ختم ہوتی جا رہی ہے یہ گذشتہ عظمت اور شہرت کا قبرستان بن چکا ہے اور اس کی زندگی میں جو عظیم انقلاب برپا ہوا تھا وہ صرف یاد کی گرد کی موٹی تہوں کے اندر دفن ہو چکا ہے۔ وہ مرشد آباد جو کبھی بنگال اڑیسہ اور بہار کی راجدھانی تھا اب بنگال کے ایک معمولی شہر میں بدل چکا ہے اب اسکی عظمت اور شوکت کی خالی یادیں باقی رہ گئی ہیں۔

اٹھارویں صدی کے پہلے نصف میں مرشد آباد کی تاریخ بنگال میں مسلم

---

[1] دیکھئے [2] دیکھئے مسند انمرشد آباد دیباچہ۔

حکومت کی ترقی اور وسعت کی تاریخ ہے عظمت اور خوشحالی کی تاریخ ہے جہاں ہندوستان کی مختلف قومیں آباد تھیں۔ لیکن اٹھارویں صدی کے اختتام میں یہ تاریخ بدل جاتی ہے۔ مسلم حکومت زوال آمادہ تھی۔ دلی سلطنت آنیوالے طوفان میں گھری ڈول رہی تھی۔ مرشد آباد کا پرانا کلچر بھی سسک رہا تھا اور سلطنت مغلیہ کا چراغ اس طوفان میں بجھنے والا تھا۔ اور غیر ملکی قوم چپکے چپکے اسکی زمین پر اپنے قدم مضبوطی سے جماتی جارہی تھی۔ پھر بھی ۱۸۲۵ء تک یہ بنگال کا پایہ تخت رہا تھا۔ اس وقت دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کو مل گئی تھی لیکن اسکے باوجود غیر ملکی طاقت نے تمام اختیارات نوابوں کے ہاتھ میں چھوڑ رکھے تھے ۱۷۹۳ء میں بنگال کے ناظم سے تمام اختیارات چھین لئے گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بیوپاری اور کلرک بادشاہ اور گورنر بن بیٹھے۔ اور بنگال کی آزادی ان کے پاؤں تلے کچل گئی۔ اور غلامی کی زنجیروں نے طویل ہوکر اور پھیل کر تمام بنگال کو اپنے حلقہ میں کس لیا۔ نئی قوم کے اقتدار کے ساتھ مرشد آباد کی عظمت اور اہمیت گھٹنے لگی۔ کلکتہ آہستہ آہستہ ایک وسیع اور عظیم شہر بن رہا تھا۔ رفتہ رفتہ تمام سرکاری دفاتر فورٹ ولیم میں منتقل ہوگئے اور کلکتہ سے بنگال اور ہندوستان کے ان علاقوں پر حکومت ہونے لگی جن پر بتدریج انگریزوں کا قبضہ ہوتا جارہا تھا۔

یہ صرف مرشد آباد کے لئے نہیں بلکہ پورے ہندوستان کیلئے نازک وقت تھا اور ہندوستان ایک بحرانی دور سے گذر رہا تھا۔ مرشد آباد بھی اس بحران کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکا۔ یورپ کے صنعتی انقلاب کی پرچھائیاں سات سمندر

سے ہوتی ہوئی بنگال پر پڑنے لگی تھیں۔ غیر ملکی تہذیب اور سیاسی انقلاب
نے بنگال والوں کو بے حد متاثر کیا تھا۔ مرشد آباد کے لوگوں نے اس انقلاب
کی پرچھائیوں کو دیکھ لیا تھا جن میں مسلم سلطنت اور مخلوط ثقافتی زندگی رفتہ
رفتہ چھپتی جا رہی تھی۔ ہر لمحہ بدلتے ہوئے حالات میں طمانینت قلب ختم ہو چکی
تھی۔ چنانچہ اکثر زمیندار نواب اور خود دار اور غیور ادیب اور شاعر مرشد آباد
سے شمالی ہند کو واپس چلے گئے۔ ان میں انشاء اللہ خاں انشا تھے جو مرشد آباد
میں پیدا ہوئے تھے بڑھے اور وہیں انکی شاعری کا حسن نکھرا اور کلام
میں پختگی آئی۔ وہ لکھنؤ چلے گئے اور مرشد آبادی ہونے کے باوجود لکھنوی یا
دہلوی ان کے نام کا جزو بن گیا۔

اٹھارہویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے آغاز میں ہی
مرشد آباد کا ادبی سرمایہ اتنا ہو چکا تھا کہ اس کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی
تاریخ پوری ہی نہیں ہو سکتی۔ اردو ادب کے ارتقا میں مرشد آباد کا نمایاں
حصہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں کے مدرسے کالج اور مکتب
میں اب بھی اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم کا معقول انتظام ہے جو اس کا ثبوت
ہے کہ یہ مسلم کلچر کا بڑا مرکز رہا تھا جسکے دھندلے نقوش ابتک باقی رہ گئے ہیں۔

اردو ادب اور شاعری جاگیردارانہ ماحول کی پروردہ ہے اور اس
ماحول کی سرپرستی میں اردو شاعروں اور فنکاروں کو پھلنے پھولنے کا موقع میسر
آیا۔ مرشد آباد راجدھانی رہا اور اسکے حکمراں نواب مرشد قلی خاں، شجاع الدولہ
اور سراج الدولہ وغیرہ علم دوست اور فیاض تھے اور خود بھی شاعر تھے اسی لئے

اس دربار میں علوم وفنون کی خاطر خواہ سرپرستی ہوتی رہی۔ شاعری پھولی پھلی اور اس کے گلستاں میں رنگ برنگ پھول کھلے۔

شاہی کتب خانہ

مرشدآباد میں اردو کے بڑے بڑے اور مفید ادارے تھے اور نواب محل میں ایک ایسا عظیم کتب خانہ تھا جس میں اردو فارسی اور عربی کی نادر کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ اس وقت کتب خانہ کی حالت لیقیناً خراب ہوگئی ہے اور بہت سی نادر اور گراں بہا کتابیں دست برد ہو چکی ہیں جو باقی ہیں وہ بالکل بوسیدہ حالت میں ہیں لیکن اب بھی اتنی کتابیں ہیں جنکی طویل فہرست ہو سکتی ہے۔ اردو کی تھوڑی بہت کتابیں رہ گئی ہیں مگر عربی اور فارسی کے کچھ نادر نسخے اب بھی اسکے تابناک ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔ اس کتب خانہ ہی کا ایک انتہائی دیدہ زیب اور خوبصورت قلمی نسخہ قرآن مجید کا ہے جسے حسین تبریزی نے خط نستعلیق میں لکھا تھا۔ اور نواب شاہ بیگ کو نذر کیا تھا۔ اس کے دوسرے صفحہ پر شیر خورشید کا دلکش اسکیچ ہے۔ اس خطی نسخہ پر مختلف مالکوں کی مہریں ثبت ہیں۔ دوسرا نسخہ قرآن عالمگیری کا ہے جو اورنگ زیب کی خاص ملکیت تھا۔ قرآن کے بیسؔ نسخے ہیں اور سب کے سب نادر اور قیمتی ہیں۔

قرآن مجید کے علاوہ مرقع جات ہیں۔ ایک مرقع عالمگیری ہے۔ اور اورنگ زیب کے عہد کے مشہور خوش نویسوں کے لکھے ہوئے ہیں اور مشہور ومعروف نقاشوں کے دل آویز نقوش اور خاکے بھی ہیں۔ یہ نسخہ اس وقت مرتب ہوا تھا جب اورنگ زیب نے سلطنت دلی پر جلوس فرمایا تھا۔ تحفۂ آصفیہ

تیمور نامہ، دیوان امیر خسرو، دیوان حسن، دیوان قاسم، دیوان طوسی، دیوان مغربی، رسالہ سوال و جواب اور رسالہ انیس العارفین کے خوبصورت قلمی نسخے بھی موجود ہیں۔ انوار سہیلی کا دلکش خطی نسخہ بھی موجود ہے جسے ۹۴۵ھ میں یوسف سمرقندی نے لکھا تھا۔ یہ شہنشاہ اکبر کی ملکیت تھا اور اس پر اسکی مہر بھی ثبت ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ مخزن الاسرار، سکندر نامہ بہری، خسرو شیریں، لیلیٰ مجنوں، بوستان سعدی، خمسۂ نظامی کے بھی دیدہ زیب اور حسین مخطوطات ہیں۔ ۹۹۸ھ اور ۹۵۱ھ کے درمیان مرتب ہوئے تھے۔

تزک تیموری حافظ ابراہیم اور تذکرہ شعرا فارسی بھی ہے جس پر شاہ عالم کی مہر ثبت ہے۔ دولت شاہ سمرقندی کے تذکرۃ الشعراء کا خطی نسخہ ہے جسے محمد امین بن سید محمود نے ۹۸۲ھ میں دولت شاہ کی فرمائش پر تحریر کیا تھا۔

اکبر نامہ دو جلدوں میں ہے۔ علامہ ابو الفضل کے ہاتھ کا تحریر کردہ خطی نسخے کے جواب نایاب ہیں۔ پہلے صفحہ پر کتبہ ہے "خط علامی صحیح دانند" ایک مہر ہے جو بہ مشکل پڑھی جاتی ہے" ہم دم و ہمراز جہانگیر بادشاہ"

یہ بیحد کارآمد اور مفید نسخے ہیں اور نایاب بھی۔ اس میں اکبر کے عہد اور دربار اور اس کے نورتن کے واقعات تفصیل سے درج ہیں۔ واقعات اکبر اشک اسکی جلد اول کا ترجمہ ہے۔ دوسری جلد کا ترجمہ ناپید ہے۔ ہفت پیکر اور شاہنامہ فردوسی کے بھی قلمی نسخے اس شاہی کتب خانہ میں موجود ہیں۔"

پند نامہ جہانگیری کی سات جلدوں کے خوبصورت قلمی نسخے بھی ہیں جہانگیر کے لئے ۱۶۰۶ء میں میر عماد نے انھیں لکھا تھا۔

سیر المتاخرین کا جو مرشد آباد میں ہی تصنیف ہوئی تھی ایک خوبصورت خطی نسخہ ہے یہ غلام حسین خاں کا ہی نوشتہ ہے۔ اور اس پر مفید حواشی بھی درج ہیں۔ اس میں مرشد آباد کی تاریخ کے علاوہ سلطنت مغلیہ کے زوال اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عروج کی بھی تاریخ ہے۔ ان فارسی اور عربی مخطوطات کے علاوہ اردو کی چھپی ہوئی کتابوں اور دو چار مخطوطات کا بھی قابل مطالعہ ذخیرہ ہے۔ اب بہت سی کتابیں غائب ہوتی جا رہی ہیں جو ہیں وہ بھی حفاظت نہ ہونے کی وجہ سے نا قابل مطالعہ ہوتی جا رہی ہیں۔

شاہی کتب خانہ کے علاوہ نواب ہائی اسکول اور مدرسہ کے کتب خانوں عمدہ مفید اور پرانی کتابوں کا خاصا ذخیرہ ہے۔ محل کے مختلف ہال میں جا بجا آیتیں اور اردو فارسی کے اشعار کندہ ہیں۔ اب بھی مکتبوں، مدرسوں اور اسکول کے علاوہ کالجوں میں اردو پڑھانے کا انتظام ہے جس سے ظاہر ہے کہ مرشد آباد جو کبھی اردو شاعروں اور ادیبوں کی پناہ گاہ تھا اب صرف ان کی دھندلی تصویر رہ گیا ہے۔

مرشد آباد میں ۱۸ ویں صدی کے آخر اور ۱۹ ویں صدی کے شروع میں عمدہ کتابیں تصنیف و تالیف اور ترجمہ ہوئیں۔ منفرد شاعروں نے اپنے دلکش نغمے سنائے۔ دیوان مرتب ہوئے۔ اردو قاعدہ، اصطلات اور محاوروں کی مفید کتابوں کے علاوہ رومانی داستانیں بھی تالیف ہوئیں۔ ان شاعروں اور ادیبوں

میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ خود مرشد قلی خاں فارسی کا ایک اچھا شاعر تھا اور سرشار تخلص کرتا تھا۔ افسوس ہے کہ اس کا کلام زمانہ برد ہونے سے محفوظ نہ رہ سکا۔ مرشد قلی خاں کے بعد جتنے بھی نواب مسند نشیں ہوئے ان میں اکثر کو شعر و شاعری سے والہانہ عشق تھا۔ اکثر خود بھی شاعر اور فنکار تھے اور فنکاروں کی قدردانی اور سرپرستی انھوں نے دل کھول کر کی تھی۔

مرشد آباد کے ادیبوں اور شاعروں کے کارواں میں مخلص، قدرت انشاء اللہ خاں انشا پیش پیش رہے ہیں۔ ان کے بعد ہردی رام جودت، فقیہہ محمد دردمند، فرحت اور شیر علی افسوس کو اردو ادب میں شہرت نصیب ہوئی اور انکے کلام کو اکثر تذکرہ نویسوں نے سراہا ہے۔ یوں تو مرشد آباد کی خاک میں ان گنت شاعر اور ادیب ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا حال لکھا جائے تو اس کے لئے ہزاروں صفحات کی ایک ایک الگ کتاب درکار ہوگی۔ یہاں اُن شاعروں اور ادیبوں کا حال لکھا جا رہا ہے جن کو پورے ملک میں مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔

انشاء اللہ خاں انشا

انشا مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ مرشد آباد میں ہی انکی شاعری نکھری اور ان کو ہندوستان گیر شہرت نصیب ہوئی انکے والد کا نام ماشاء اللہ خاں تھا وہ خود بھی شاعر تھے اور مصدر تخلص فرماتے تھے۔ انشا کو بھی ادبی ماحول میں پلنا اور پروان چڑھنا نصیب ہوا تھا۔ اس لئے بچپن سے ہی انکو ادب سے لگاؤ تھا۔ مرشد آباد کی شاعرانہ فضا ادبی ماحول اور عالم باپ کی راست تربیت سے جلا پائی۔ شروع میں اپنے والد

مصحفی کے آگے انشا نے زانوئے تلمذ تہ کیا ہوگا۔ نساخ نے سخن شعرا میں لکھا ہے کہ "انشا شروع میں مصحفی سے اصلاح لیکر منحرف ہوگئے تھے" جو صحیح نہیں ہے مصحفی نے اپنے تذکرہ میں انشا کا حال لکھا ہے۔ انشا انکے شاگرد ہوتے تو اس پردہ فخر کرتے۔ مصحفی لکھتے ہیں:-

انشا تخلص، سید انشاء اللہ خاں نام دارد خلف الرشید میر ماشاء اللہ خاں وطن بزرگانش نجف اشرف وخودش در مرشد آباد تولد یافتہ تحصیلِ کتب عربیہ وفارسیہ بقدر حال ہمہ دادہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شعر در ہر سہ زبان می گوید و زود طبیعت می نماید۔ اما میلان طبعش بہ طرف ریختہ بیشتر است مسنوی (مثنوی) شیرو برنج در جواب نان وحلوا مولانا بہاء الدین آملی بسیار اصفا گفتہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیوانش از نظر فقیر گذشت۔ ہمہ کلامش در عالم ظرافت خالی از کیفیتی نیست۔[1]

مصحفی کے بیان سے یہ واضح ہے کہ انشا ان کے شاگرد نہیں تھے در اصل انشا کبھی بھی حلقہ تلامذہ مصحفی میں شامل نہیں ہوئے مصحفی سے نوک جھونک انکی ہمیشہ ہوتی رہی اور مصحفی کی ہجو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انشا نے مصحفی سے ایک آدھ غزل پر بھی اصلاح لی ہوتی تو شاگردی کے ناتے ایسی گستاخی کرنے کی ہرگز جسارت نہ کرتے۔

انشا غالباً سنہ ۱۱۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔ کسی تذکرہ میں ان کا سنہ پیدائش نہیں دیا گیا ہے۔ عشقی کا تذکرہ ۱۱۹۹ھ کے قبل ترتیب پا چکا تھا۔ اس وقت انشا

---

[1] دیکھئے قلمی نسخہ تذکرہ ہندی صـ۱۲

جو خوبرو جوان تھے اور مرشد آباد سے لکھنؤ جا چکے تھے عشقی نے لکھا ہے۔

"انشا تخلص اسمش میر انشاء اللہ بن حکیم میر ماشاء اللہ خوش طبع و شیریں زباں و جوانے است ذہانت پیشہ، فصیح زباں اصل بزرگان از نجف اشرف و ولادت گاہ او در مرشد آباد است۔ می گویند کہ اکثر فنون عربیہ کہ عبارت از علم صرف و نحو معانی باشد تمام پیدا کردہ و السنہ مختلفہ اشعار منظوم ساختہ بالفعل در شہر لکھنؤ بہ رفاقت نواب سعادت علی خاں خلف مرحوم وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ بہادر سعادت اندوز گردید بفراغتی حال میگذارند۔"

مصحفی، عشقی، سرور اور ابراہیم خاں نے انشا کا حال لکھا ہے اور انکی شاعری پر ہلکی سی تنقید بھی کی ہے لیکن کسی تذکرہ میں انشا کی وفات یا پیدائش کی تاریخ نہیں ملتی عشقی کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ انشا ذہین اور خوش مزاج تھے۔ اور انکی ذہانت دانشمندی اور ظرافت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھنؤ میں انکی زندگی پر عسرت اور تکلیف کا سایہ آخری ایام میں محیط ہوا۔ بیشتر زندگی آسودہ اور عیش و عشرت کے ماحول میں گذر چکی تھی جسکی وجہ سے انکو غم دوراں کو اپنے دائرہ شاعری میں سمیٹنے کا موقع ہاتھ نہیں آیا لیکن غم جاناں کی کسک تڑپ اور بے چینی کے ساتھ شوخی اور رنگینیاں غزل کے سانچے میں یقیناً ڈھلتی رہی تھیں۔ مبتلا اپنے تذکرہ گلشن سخن میں انشا کے بیان میں لکھتے ہیں۔

"راقم الحروف وی را در صغر سن ہنگام دولت میر محمد جعفر خاں بہادر دیدہ بود با والد ایشاں آشنا بود۔"

میر جعفر خاں کے زمانہ حکومت میں انشا کم سن تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ

۱۷۵۰ء اور ۱۷۵۲ء کے درمیان پیدا ہو چکے ہونگے اور ان کا سنِ ولادت ۱۷۵۰ء قرینِ قیاس ہے۔

انشا کی ابتدائی زندگی کا بیشتر حصہ مرشد آباد میں گذرا۔ ان کے والد دربار سے وابستہ تھے۔ اپنے عہد کے مشہور و معروف حکیم بھی تھے۔ انشا ایسے ہی ایک خوشحال گھرانے میں ناز و نعم میں پلے۔ انکی تعلیم کا معقول انتظام کیا گیا ہوگا۔ بنگالی ہوتے ہوئے بھی اُردو فارسی زبان میں انکو دستگاہ حاصل تھی۔ ان کے ابتدائی کلام پر بھی مرشد آباد کا اثر نمایاں نہیں ہے۔ عسکری نے کلیات انشا کے مقدمے میں لکھا ہے۔

"یہ بھی عجیب بات ہے کہ انشا کی شاعری کی ابتدا ملک بنگالہ سے ہوئی جہاں بچپن میں سینکڑوں شعر کہے ہوں گے۔ یہ انکی صلاحیت مزاج کی بہت بڑی دلیل ہے کہ انکے کسی شعر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ دلی اور لکھنؤ کی بہترین اور بامحاورہ زبان نہیں ہے۔"[۱]

انشا کا انتقال ۱۸۱۷ء میں ہوا۔ ان کے ایک عزیز شاگرد دلپت سنگھ نشاط کے قطعہ تاریخ سے اسکی تصدیق ہوتی ہے۔

دیوان انشا

انشا کا کلیات مرتب ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ انشا کی صلاحیتوں اور ذہانت کا اعتراف تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے کیا ہے انشا اپنے عہد کے درجہ اول کے شاعروں میں شمار ہوتے تھے انکی غزلیں بڑی رنگین ہوتی تھیں لیکن روایتی حدود سے نکل کر سوچنے کی زحمت ان جیسے ذہین اور

---

۱ - کلیات انشا مرتبہ عسکری دیباچہ

باصلاحیت شاعر نے بھی گوارہ نہیں کی غالباً اسکی وجہ یہ تھی کہ جاگیردارانہ اور عیاشانہ ماحول میں مقید آسودہ زندگی نے انکے جذبات کو آتش سیال بننے نہیں دیا اور نہ ہی محبوب کی جدائی میں انکو خون کے گھونٹ پینا پڑے تھے۔ غم حقیقی کی دھیمی دھیمی صدا بھی انکے تار حیات سے ابھرتی تو انشاؔ جیسے ذہین عالم اور خوش طبع شاعر کے دل سے "کچھ اور چاہئے وسعت میرے بیاں کے لئے" کی چیخ پہلے اٹھتی۔ روایتی ماحول میں پلی ہوئی انکی غزلوں میں ہلکا ہلکا طنز، بے پناہ شوخی اور طبیعت کی رنگینی اور بدمستی کی جھلکیاں تو مل جاتی ہیں لیکن روزگار اور انسانیت کا غم انکی غزلوں میں مفقود ہے بلکہ عیاشانہ ماحول انکے اکثر اشعار میں منعکس ہے انکی اکثر غزلیں رنگین مزاج اور مریض روح کی غمازی کرتی ہیں اور بہتیرے اشعار مبتذل ہیں اور اخلاقی حدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔

انشاؔ کے دیوان کا ایک خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ قلمی دیوان انشا "حمدِ خدا" کی غزل سے شروع ہوتا ہے جس کا مطلع ہے اور مقطع

صنما برب کریم یوں تیرے ہیں ہر ایک مبتلا
کہ اگر اَلَستُ بِرَبِّکُمْ ابھی کہے تو تو کہیں بلا

تجھے انشاؔ اور تو کیا کہوں دو جہاں میں کوئی بھی طرف ہے
جو خدا کے نور سے پُر نہ ہو دہر میں ہے خلا

یہ نسخہ کچھ ناقص ہے اور نامکمل بھی، غزلیات کا حصہ ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور آخری غزل کے قبل انکی یہ مشہور غزل بھی درج ہے ؎

گالی سہی ادا سہی، چیں بہ جبیں سہی ۔۔۔ یہ سب سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی
مرنا مرا جو چاہے تو لگ جا گلے سے ٹک ۔۔۔ اٹکا ہے دم میرا یہ دم واپسیں سہی
منظور دوستی جو تمہیں ہے ہر ایک سے ۔۔۔ اچھا تو کیا مضائقہ انشاؔ سے کیں سہی

غزلوں کے بعد اس خطی نسخہ میں قصیدوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ کئی قصائد مختلف لوگوں کی شان میں ہیں۔ آخری قصیدہ محمد سلیمان شکوہ کی شان میں ہے جو چار صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس قصیدہ میں انشاؔ نے بڑا زور دماغ صرف کیا ہے۔

انشاؔ کے خطی دیوان میں جا بجا غلطیاں بھی ملتی ہیں۔ کسی کم سواد کاتب کا نوشتہ ہے۔ انشاؔ خوش نصیب شاعروں میں ہیں۔ ان کا ذکر تقریباً تمام تذکروں میں مل جاتا ہے۔ آب حیات میں ان سے متعلق کئی باتیں ایسی بھی بیان ہوئی ہیں جن سے انکی باغ و بہار لیکن متضاد شخصیت کا ہلکا سا خاکہ نظر کے سامنے ابھرتا ہے

"سید انشاؔ کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے ڈبویا۔"[1]

یہ ایک شخص کا قول ہے جسے آزاد نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے جو انشاؔ کے سوانح حیات کے پیش نظر درست معلوم ہوتا ہے۔ شاعری کا چسکا کبھی انسان کو سہل پسند بنا دیتا ہے اور جو اس میں ڈوب جاتا ہے وہ شاعر کی حیثیت سے ابھرتا ہے لیکن علوم و فنون اور فضل و کمال کے بہت سے نکات اس میں کھو جاتے ہیں۔ انشاؔ کی شخصیت بھی انھیں بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گئی

---

[1] دیکھئے آب حیات مولانا محمد حسین آزاد

تھی۔ نواب سعادت علی خاں کی مصاحبت میں انشاؔ کو ان کو رجھانے کے لئے سب کچھ کرنا پڑا تھا۔ یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ انکی طبعی ظرافت اور شوخی کو درباری مصاحبت اور رندانہ مذاق نے خراب کیا اور اس نے انکی شاعری کو بھی بگاڑے بغیر نہیں چھوڑا۔"

اس مصاحبت کا اثر انکے کلام پر بھرپور ہوا ہے اور جاگیردارانہ ماحول کی برائیاں آپ کلیات میں نمایاں ہیں۔ غیر معمولی قابلیت اور ذہانت کے باوجود امرا کی ہم جلیسی اور ہم نشینی نے ان کو کہیں کا نہیں رکھا اور انکی اکثر غزلیں اعجاز کی سرحد میں پہونچنے کے بجائے ابتذال کی غلیظ وادی میں داخل ہو جاتی ہیں جو ذوق سلیم اور سمع پر بہت گراں گذرتی ہیں۔

کلام انشاؔ

انشاؔ کے دیوان کے قلمی نسخہ میں صرف غزلیات اور چند قصائد ہیں لیکن انکے مطبوعہ کلیات میں اردو کا دیوان۔ دیوان ریختی قصائد، دیوان فارسی، مثنوی بے نقط، مثنوی شکار نامہ، مثنویات در ہجو زنبور کھٹمل، پشہ، مگس، مثنوی شکایت زمانہ، مثنوی فیل، مثنوی در ہجو گیان چند ساہوکار، مثنوی شیر دبرنج، اشعار متفرقہ، پہیلیاں اور مخمس وغیرہ مثنوی شکار نامہ، دیوان اُردو بے نقط، رباعیات ونثر بے نقط، شرح مائتہ عامل، نظم فارسی وغیرہ شامل ہیں۔

دریائے لطافت

سید انشاؔ کا سب سے بڑا کارنامہ اور یادگار تصنیف دریائے لطافت ہے۔ اس میں اردو صرف و نحو منطق عروض، قافیہ معانی و بیان کا ذکر ہے۔ انشاؔ نے مرزا محمد حسن قتیل کے اشتراک سے یہ کتاب

تصنیف کی تھی، انشا کے قبل یوروپین مصنفین نے اردو قواعد اور لغت کی کتابیں تالیف کرلی تھیں۔ دریائے لطافت کے قبل مرزا جان طپش نے ۱۲۰۷ھ میں شمس البیان جو اردو محاورات اور اصطلاحات پر مختصر اور جامع کتاب ہے تصنیف کیا تھا۔ پھر بھی دریائے لطافت پہلی کتاب ہے جسے ایک بنگالی نے تالیف کیا۔ یہ ایک بے مثال کتاب ہے جس کے بار احسان سے اردو ادب دبا ہوا ہے۔ انشا کی دریائے لطافت ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء میں تصنیف ہوئی تھی اور ۴۳ برس بعد انکے ہم وطن مولوی مسیح الدین خاں بہادر مرشد آبادی نے اس بیش بہا کتاب کو چھاپا اور اُردو ادب کے سرمایہ میں ایک بیش بہا موتی کا اضافہ کیا۔ مولوی صاحب خود بھی عالم اور فاضل تھے اور انکو اپنے وطن سے اس قدر پیار تھا کہ انھوں نے اس دریا میں پیدا ہونے والے ہر موتی کو بازار ادب میں لانے کی کوشش کی۔ دریائے لطافت کے مختلف مخطوطات کو اکٹھا کیا، مقابلے کے بعد کتاب کی تصحیح کی اور بڑے اہتمام سے مرشد آباد میں یہ یادگار زمانہ تصنیف اشاعت پذیر ہوئی۔ دریائے لطافت ایک بڑے پایہ کی مفید کتاب ہے۔ اس کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کا خیال ہے کہ

زمانہ حال میں بھی جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ انشا کی تحقیق کو نہیں پہنچی ہیں اور بعض چیزیں تو وہ ایسی لکھ گئے ہیں کہ اگر وہ نہ لکھتے تو ہمیں ان کا کبھی علم نہیں ہوتا۔ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انشا کو اردو زبان پر کس قدر عبور حاصل تھا۔ اور ان کی نظر کیسی دقیق اور گہری تھی۔ زبان کی

تحقیق میں ایسے ایسے نکتے بیان کر گئے ہیں جنھیں پڑھ کر سید انشا کی ذہانت باریک نظری، زبان دانی اور زبان فہمی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔"

مولوی صاحب نے مقدمہ ثانی میں یہ بھی لکھا ہے کہ اُردو زبان کے قواعد محاورات اور روزمرہ کے متعلق اس سے پہلے کوئی ایسی مستند اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی[1]

مولوی صاحب نے یہاں تھوڑا سا مبالغہ اور جانبداری سے کام لیا ہے کیونکہ اسکے قبل گل کرسٹ کی گرامر اور مرزا جان طپش کی شمس البیان تصنیف ہو چکی تھی۔ دونوں کتابیں بڑی تحقیق اور محنت سے لکھی گئی ہیں۔ انکے محققانہ اور مستند کتاب ہونے پر کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ انشا کا کام ان سے زیادہ جامع اور ٹھوس ہے۔ چونکہ اگلے سانچوں پر یہ عظیم عمارت کھڑی ہوئی ہے اس لئے زیادہ پختہ، زیادہ وسیع اور کشادہ ہے۔

دریائے لطافت کا مطبوعہ نسخہ فارسی ایشیاٹک سوسائٹی کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ نسخہ مرشد آباد میں شائع ہوا تھا۔ نستعلیق ٹائپ میں ہے انجمن ترقی اُردو ہند نے پہلے فارسی میں شائع کیا پھر علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہو کر مقبول ہوا۔

دریائے لطافت مطبوعہ ۱۹۳۵ء نو ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں فصلیں بھی ہیں مثلاً باب اول ضمنی عنوان پہلی فصل اردو زبان کی کیفیت ہے۔ دوسری فصل اردو کے حروف تہجی ہے۔ پوری کتاب مفید، دلچسپ اور بے مثل ہے۔

---

[1] دیکھئے مقدمہ عبدالحق دریائے لطافت ۱۲

اُردو کی ہیئت، ساخت اور قواعد کے مکمل علم کے لئے اسکا مطالعہ لازمی ہے۔ تذکیر و تانیث کی بحث صرف دلچسپ ہی نہیں بلکہ طالب علم کیلئے نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت اور انفرادیت یہ ہے کہ محاورات اور اصطلاحات کی مثالوں میں سماجی، تمدنی اور سیاسی زندگی کے خاکے ملتے ہیں۔

رانی کیتکی رانی کیتکی انشا کی انوکھی تصنیف ہے۔ کہانی لکھنے میں انشا نے معجزہ کی حد تک کمال کر دکھایا ہے۔ پوری کہانی میں فارسی اور عربی کا ایک لفظ بھی نہیں آیا ہے۔ انشا سبب تالیف لکھتے ہیں۔

"ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھی کہ کوئی کہانی ایسی کہئے کہ جس میں ہندوی چھٹ[1] (ن) کی بولی کی پٹ نہ ملے۔ تب جا کے میرا جی پھول کی کلی کے روپ سے کھلے۔ باہر کی بولی اور گنواری کچھ اسکے بیچ میں نہ ہو۔ اپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی بڑے پڑھے لکھے پرانے دھرانے ڈاگ، بوڑھے گھاگ یہ کھڑاگ لائے۔ سر ہلا کر منہ تھتھا کر ناک بھاؤں چڑھا کر آنکھیں پھرا کر کہنے لگے "یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکا پنا بھی ٹھونس جائے، جیسے بھلے لوگ اچھوں سے اچھے آپس میں بولتے چالتے ہیں۔ جیوں کا تیوں سب وہی ڈول رہے ہیں اور کسی کی نہ دے یہ نہیں ہونے گا۔" میں نے ان کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا کھا کر جھنجھلا کر کہا میں کچھ ایسا بڑھ بولا نہیں کہ رائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کر اونگلیاں نچاؤں۔

---

[1] دیکھئے گل کرسٹ اور اس کا عہد عتیق صدیقی صفحہ ۲۴

اور بیے سری بے ٹھکانے کی اولجھی تانیں لے جاؤں جو منہ سے نہ ہو سکتا تھا تو بھلا یہ بات منھ سے کیوں نکالتا جس ڈھب سے ہوتا اس بکھیڑے کو ٹالتا۔"

انشاؔ نے یہ بھی لکھا ہے کہ :۔

یہ وہ کہانی ہے جس میں ہندی چھٹ کسی اور بولی کا نہ میل ہے نہ پٹ

سر جھکا کر ناگ رگڑتا ہوں اوس اپنے بنانے والے کے سامنے جس نے ہم سب کو بنایا اور بات کی بات میں وہ کر دکھایا جس کا بھید کسی نے نہ نبایا

آتیاں جاتیاں جو سانسیں ہیں

اوس کے بن دھیان سب یہ پھانسیں ہیں

رانی کیتکی کے علاوہ انشا کی بے نقط کی مثنوی بھی کافی مقبول اور مشہور ہوئی تھی اور ان کی تمام تخلیقات و تصنیفات کلاسیکی ادب میں اپنی انفرادیت کے پیش نظر اہم اضافہ سمجھی جاتی ہیں۔

آشنا میر امیر علی

میر امیر علی مرشد آباد میں پیدا ہوئے اور اسکی ادبی فضا میں پرورش پائی اور شاعروں کی صحبت نے انکے اندر بھی شعر و شاعری کا شوق برپا کیا۔ مرشد آباد اس وقت سیاسی انتشار کے دور سے گذر رہا تھا اور نوابوں کی گھٹتی ہوئی طاقت اور اثر کی وجہ سے اچھے اچھے شاعر اور ادیب ہندوستان سے ہجرت کرنے لگے تھے۔ آشنا بھی اس پر آشوب دور میں پیدا ہوئے اور شعر و شاعری کو اپنا محبوب مشغلہ بنایا تھا۔ میر امیر علی کا تخلص آشنا تھا اور ان کا انتقال ۱۸۷۰ء میں ہوا۔ آشنا آتش کے شاگرد تھے اس لئے ان کی شاعری نے بھی آتش کا رنگ قبول کیا تھا۔ آشنا کا حال سخن شعرا میں بے حد اختصار سے ملتا ہے۔

"آشنا تخلص، میر امیر علی ولد میر سبزہ مرشد آبادی شاگرد مرزا غلام حسین آتش۔ بیس برس کا عرصہ ہوا کہ انتقال کیا۔"

ناسخ نے نمونتاً چند اشعار بھی نقل کئے ہیں ؎

وہ حسن جلوہ گر ہے وہ رخ بے نقاب ہے
لیکن کچھ اپنی آنکھوں کا پردہ حجاب ہے
مجھ کو تو بات کل کی نہیں یاد آشنا
کہتے ہیں روز حشر کو دینا حساب ہے

جودت ہردی رام

لالہ ہردے رام مرشد آباد کے تھے لیکن ان کی پیدائش نواب کے عہد میں کٹک میں ہوئی تھی۔ نساخ نے اس غلط فہمی کی بنا پر ہردے رام کا وطن کٹک لکھدیا ہے۔ نساخ نے ان کا نام بھی ہری رام لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

"جودت تخلص ہری رام مرشد آبادی شاہ عالم بادشاہ کے عہد نواب علاءالدولہ کی سرکار میں توصل رکھتے تھے۔ وطن ان کا کٹک ہے۔[1]"

نساخ نے عشقی کے تذکرے سے کچھ باتیں حذف کر کے جودت کا حال لکھدیا اور نمونہ کلام لکھتے وقت اتنی عجلت سے کام لیا ہے کہ رباعی کا ایک شعر نقل کر دیا ہے۔ عشقی، شورش نے بھی جودت کا حال لکھا ہے۔ شورش سے جودت کا براہِ راست تعلق تھا۔ اور جودت کو شورش سے عقیدت اور ارادت بھی تھی۔ اس لئے شورش نے زیادہ تفصیل سے ان کا حال لکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ محمد حیات حیرت اور انکی دوستی اور اصلاح کے سبب لالہ ہردے رام جودت ریختہ بھی کہتے تھے اور انکے کلام ریختہ کا خاطر خواہ ذخیرہ بھی ہو چکا تھا جو دست برد ہو گیا۔ شورش لکھتے ہیں۔

"جودت صاحب شوکت لالہ ہردی رام جودت ساکن مرشد آباد والد ایشان بوقت حکومت نواب شجاع الدولہ دیوان صوبہ اوڑیسہ بود وایشان ہم بہ ثروت بسر بردند

---

[1] دیکھئے تذکرہ سورش

شاعر فارسی فاضل جید گاہے بہ سبب دوستی میر محمد حیات حیرت دبہ صلاح ایں احقر شعر ریختہ ہم می فرمودند۔ چنانچہ اشعار ایشاں معہ قلمدان وش رفتہ۔ وقت تحریر تذکرہ یک شعر بدست آمدہ است ؎

برنگ شمع سوزاں دل سے میرے آہ نکلے ہے[1]
الٰہی شکر کرتا ہوں کہ خاطر خواہ نکلے ہے

عشقی نے بھی اپنے تذکرے میں جودت کا نام رائے ہردے رام لکھا ہے۔ عشقی رقمطراز ہیں۔

جودت تخلص مرشدآبادی موسوم بہ رائے ہردے رام اصلش از کک و سلسلہ او بہ نواب علاء الدولہ سرفراز خاں مرحوم می رسد۔ آخر ہما جا پیمانہ عمرش لبریز گردید بالجملہ جودت طبعش ازیں رباعی واضح گردد ؎

واعظ تری بات دل سے کہنے کا نہیں
پتھر کی چوٹ شیشۂ دل سہنے کا نہیں

جا زاہد خشک تو ہے جب تک مرے پاس
لو ہو مری چشم ترسے بہنے کا نہیں[2]

عشقی کے تذکرے سے پتا چلتا ہے کہ جودت کا انتقال مرشد آباد میں ہوا لیکن عشقی اور شورش دونوں ہی اسکی تاریخ وفات پر خاموش ہیں انکے متعلق نساخ کا بیان تو ناقص ہے شورش کا تذکرہ ۱۱۹۹ھ کے قبل مرتب ہو چکا ہوگا۔ گلزار ابراہیم میں بھی جودت کا حال دیا گیا ہے یہ ۱۱۹۹ھ میں مکمل ہوا تھا۔ ابراہیم علی خاں نے

---

[1] تذکرہ شورش [2] تذکرہ عشقی و شورش مرتبہ کلیم الدین احمد

لکھا ہے کہ جودت کا انتقال ہو چکا ہے۔

جودت کی زندگی عیش و عشرت میں گذری۔ جاگیردارانہ نظام کی تمام آسائش انکو میسر تھی۔ ان کی شاعری بھی تفریح طبع کے لئے تھی۔ شورش کا کہنا ہے کہ جودت فارسی کے جید عالم تھے۔ فارسی زبان انکو مرغوب تھی اور فارسی شاعری بھی۔ بنیادی طور پر وہ فارسی کے شاعر تھے۔ اُردو میں محض تفنن طبع اور شوق کی خاطر کہہ لیا کرتے تھے۔ چونکہ ان کا کلام ناپید ہے اور زمانہ برد ہو چکا ہے لہذا شاعری میں ان کے مقام کا تعین کرنا دشوار گذار رہا ہے۔ پھر بھی انکی رباعی اور محولا بالا شعر سے یہی جان پڑتا ہے کہ وہ دوسرے درجہ کے شاعر تھے ان کے کلام میں کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جو پڑھنے والوں کو چونکا دے۔

دردمند محمد فقیہہ

دردمند محمد شاہ کے عہد میں ہوئے ہیں۔ ان کا نام محمد فقیہہ تھا۔ وہ وجیہہ متین اور اسم بامسمیٰ انسان تھے۔ مرزا جان مظہر کے چہیتے شاگرد تھے۔ وہ کامیاب غزل گو تھے لیکن مثنوی میں ان کا رنگ چمکتا ہے۔ انکی مثنوی ساقی نامہ کو اردو ادب میں بیحد مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

دردمند حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ دلی میں انکی شاعری کا رنگ نکھرا۔ مرزا جان جاناں مظہر کی اصلاح نے انکی شاعری کو جلا بخشی۔ مظہر انکو دل وجان سے چاہتے تھے۔ انکو اپنے شاگرد سے حد سے زیادہ الفت تھی۔ انکی غیر حاضری انکو مضطرب اور پریشان کردیتی تھی۔ انکے بارے میں مرزا مظہر نے کہا تھا ؎

غافل مباش مظہر از احوالِ دردمند
لعل آنکہ در گرہ روزگار نیست

مرزا مظہر کو دردمند سے گویا عشق تھا۔ دردمند انکے لئے ایک ایسا لعل تھے جو دنیا میں ناپید ہے۔ شورش نے اپنے تذکرہ میں دردمند کا حال ذرا تفصیل سے لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دردمند کو بھی لٹتی اور تباہ حال دلی کو خیرباد کہہ کر عظیم آباد اور پھر مرشدآباد آنا پڑا تھا۔ محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ ہندوستان کے لئے ایک نازک اور بحرانی عہد تھا۔ مغل سلطنت کا چراغ گل ہو رہا تھا نادرشاہ

سے کے حملے نے دلی کے نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔ دلی میں ہزاروں معصوم لوگوں کے خون سے چھوٹی چھوٹی ندیاں پھوٹ پڑی تھیں۔ ایسی برباد دلی میں کون محفوظ رہ سکتا تھا۔ کون اپنی ہی تباہی کے لئے دلی رہنا پسند کرتا۔ دردمند دلی سے عظیم آباد اور اپنے کنبے کے ساتھ مرشد آباد چلے گئے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اور وہیں ان کا انتقال بھی ہوا۔ شورش لکھتے ہیں :-

دردمند ہمراہ غلام حسن خاں سلمہ اللہ تعالیٰ فرزند نواب اعظم خاں از شاہ جہاں آباد بہ عظیم آباد تشریف آوردہ بخدمت میر محمد وحید صاحب قدس سرہ بیعت خواندو چند مدت اوقات بسر بردہ بعد خدمت دیوانی نواب موصوف در مرشد آباد آمدہ مسکن اختیار نمودہ و رفیق نواب شہامت جنگ مغفور گردیدہ ساقی نامہ ایشاں قبل تشریف آوردن ایشاں دریں شہر رواج یافتہ بود و دیوان فارسی ہنوز رواج نہ یافتہ بود کہ ازیں عالم فانی رخت بہ عالم جاودانی بست [1]

شورش کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دلی سے عظیم آباد آئے تھے لیکن پھر دلی لوٹ گئے تھے اور وہاں شادی کرنے کے بعد نواب غلام حسن خاں کے ساتھ مرشد آباد چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ دردمند فارسی اور اردو کے کامیاب شاعر تھے۔ ان کا دیوان فارسی بھی انکی موت کے بعد شائع ہو گیا تھا لیکن اردو دیوان کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ مثنوی ساقی نامہ کا قلمی نسخہ کلکتے میں موجود ہے۔ سنہ ۱۱۶۷ء میں مرشد آباد میں انکا انتقال ہوا۔ سخن شعراء سے اسکی تصدیق ہو جاتی ہے۔

"دردمند محمد فقیہہ شاگرد مرزا جان جاناں قدس سرہ بنگالہ میں بھی آئے تھے۔ سنہ ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۴ء) میں مرشد آباد میں وفات پائی۔ ساقی نامہ انکا کارنامہ ہے

[1] دیکھئے تذکرہ شورش مرتبہ کلیم الدین احمد

دردمند کا رنگ انشاء اللہ خاں انشا اور قدرت سے آگے مرشد آباد کی ادبی دنیا میں جم چکا تھا اور انکی شاعرانہ صلاحیتوں کا لوہا مان لیا گیا تھا۔ ان کی تصنیفات مقبول بھی ہوئیں۔ ساقی نامہ کے علاوہ انکی کسی اور تالیف کا کوئی پتہ نشان نہیں ملتا۔ ؎

ارے ساقی جان فصل بہار
یہی تھا ہمارا تمہارا اقرار

ہمارے سبزے کی یہ فصل تھی
فراموش کرنے کی فصل تھی

تری جان کی غنیمت ہوں میں
سلیقوں میں ظالم غنیمت ہوں میں

نیقہہ دردمند خوش نصیب شاعر ہیں۔ میر تقی میر جیسے نازک مزاج شاعر نے بھی نکات شعرا میں ان کا حال لکھا ہے۔ میر سے انکی ملاقات ہوئی تھی۔ ہرچند کہ یک ملاقات بااو کردہ ام لیکن خوب از کلام نیستم

سلہ دیکھئے نکات شعراء میر

مخلص

مخلص مرشد آباد کے مشہور شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مخلص اس لحاظ سے خوش نصیب بھی ہیں کہ تمام تذکروں میں ان کا حال کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے نواب سرور، ناسخ اور شیفتہ نے انکا حال لکھا ہے لیکن زیادہ تفصیل گلزار ابراہیم اور گلشن ہند سے ملتی ہے۔ گلشن ہند گلزار ابراہیم کا ترجمہ ہے لیکن مرزا علی لطف نے حسب ضرورت اس میں کچھ کمی و بیشی کی ہے۔ مخلص کے حال میں لطف نے معمولی اضافہ کیا ہے اور انکی شاعری پر ہلکا تبصرہ بھی۔ لطف لکھتے ہیں:۔

"مخلص علی خاں نام تخلص مخلص، بھانجے نواب نوازش محمد خاں شہامت جنگ کے ساکن مرشد آباد میر باقر کے مشہور تھے۔ جوان خندہ رو اور کشادہ پیشانی ہمیشہ خوش وقت اور خوش زندگانی بنگالے میں بہت کیفیت کے ساتھ انھوں نے زندگی گذر کی۔ اوقات بیشتر عیش و کامرانی میں بسر کی۔ شب و روز عیش و عشرت سے کام تھا اور رات دن وقت احباب گردن صراحی اور لب جام تھا۔ زبان ریختہ میں انھوں نے بہت کچھ کہا ہے چونکہ دیوان بطور اساتذہ ترتیب بھی دیا ہے لیکن کثرت سے ازبسکہ درمیان رہا کہیں کا کہیں ہے کلام ان کا خالی لغزش سے نہیں ہے۔ شاید ۱۲۰۸ھ میں بلدہ مذکور کے اندر دام ہستی کی کشاکش سے رہائی پائی ہے اور سیر چمنستان ارم کی عین تعیش فرمائی ہے۔"

مرزا علی لطف نے انکے چند اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ لطف کے بیان سے مخلص کی زندگانی گمنامی کے نقاب سے نکل کر ہمارے سامنے آتی ہے وہ اسکی نشاندہی کرتی ہے کہ مخلص نے روبہ زوال جاگیردارانہ نظام، عیاشانہ ماحول کی خلوص کے ساتھ پیروی اور نمائندگی کی ہے اور جاگیردارانہ ماحول کی تمام خصوصیات ان کے کلام میں بھی سمٹ آئی ہیں۔ مخلص ذہین، خوش طبع اور خوش فکر شاعر ہونے کے باوجود ساری عمر اپنے ماحول کی عیاشانہ رنگین زندگی سے کھیلتے رہے۔ جام وصراحی رقص وسرود کم بزم نشاط میں گم رہے صرف ذہنی تعیش اور طبع کی خاطر کچھ دماغ سوزی بھی کی اور اپنے جذبات، کیفیات اور احساسات کو نظم کیا۔ ایسے انحطاط پذیر اور پرفریب جاگیردارانہ ماحول میں جہاں ہر روز عید اور ہر رات شب برات ہوتی ہو، کسی فنکار کو تلخ حقیقت اور سچائی کو دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ہی نصیب نہیں ہوتا۔ مخلص نے بھی کبھی پرفریب وادی سے نکلنے کی فکر کی ہوگی۔ وقت گذارنے اور بزم نشاط میں گرمی پیدا کرنے کے لئے انھوں نے شاعری کی تھی۔ لہٰذا انکی شاعری بھی ایک بوجھل دماغ نیم پختہ شعور اور مریض دل کی شاعری ہے۔ انھوں نے بھی خیالی جنت اور بت سیمیں کے پیکر صفحہ قرطاس پر تخلیق کئے لیکن کوئی حیات بخش اور توانا مسئلہ شاعری میں پیش نہیں کیا ہے۔ علی ابراہیم کا کہنا ہے کہ ریختہ کے لئے انھوں نے بہت کچھ کیا۔ دیوان بطور اساتذہ ترتیب دیا۔ مگر کثرت عیش سے ازبسکہ دھیان نہ رہا کہیں کا کہیں ہے:

اس بیان سے مخلص کی بے پروا اور لاابالی طبیعت ظاہر ہوتی ہے وہ اچھے شاعر تھے۔ انکے پاس دولت کی بھی کمی نہیں تھی۔ رات دن عیش وعشرت میں ڈوبے

رہتے تھے ۔ وہ چاہتے تو خوبصورت اور قابل رشک دیوان چھپاتے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ پھر بھی زمانہ نے انکے حال پر ترس کھایا ہے اور انکا ایک مختصر خطی نسخہ کلکتے میں موجود ہے ۔

قلمی دیوان خواب مخلص کی کل کائنات ہے اسکے علاوہ انکے کسی اور ادبی سرمایہ کا کچھ پتہ نہیں چل سکا ۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ کا خطی نسخہ جو ہمارے سامنے ہے اس میں ۱۳۱ غزلیں اور چھ مخمس ہیں۔

قلمی دیوان کی پہلی غزل عارفانہ ہے جس میں پینتالیس اشعار ہیں۔ غزل کے بعد ردیف دار غزلیں شروع ہوتی ہیں۔ ان غزلوں میں ایک شکستہ کھویا کھویا سا شاعر ہمیں ملتا ہے جو کبھی عیش و عشرت کے پرفریب ماحول سے نکلنے کے لئے پیچ و تاب کھاتا رہتا ہے ۔ اور اس جاگیردارانہ نظام کی گھٹن میں ساری کائنات تباہی کے طوفان میں گھری اسے نظر آتی ہے وہ کانپ اٹھتا ہے اس وقت اسے دولت چلتی پھرتی چھاؤں اور جاگیر ایک بے معنی شے نظر آتی ہے

انقلاب کے طوفان کا احساس جب اس پر محیط ہوتا ہے تو اپنی بے لبسی اور بربادی کے تصور سے گھبرا کر مذہبی تصورات میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ مخلص کو بھی ایسے پر آشوب لمحات میں مذہب میں پناہ ملتی ہے انکی ہر غزل میں ایک دو شعر ایسے مل جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی عیاشانہ زندگی سے وہ نجات چاہتے ہیں اور حضرت علی امام حسن و حسینؑ کے آگے ہاتھ پھیلائے نجات کی دعا مانگتے ہیں ؎

ہو جو غلام دل سے علی کے جناب کا　　　اسکو نہیں ہے ڈر روزِ حساب کا

امید تجھ سے ہی مخلص کو بھی یہی مولا　　کرے تو دو جہاں میں میری مددگاری

اہل بیت پاک کے اعدا پر کرتا ہوں　　جی سے مخلص فدا ہوں انکے فرزندان کا

بس　اسی بات پہ رکھتا ہوں گا شاہد میں خدا کو

مخلص نہ دل وجان سے ہے غلام آل عبا کا

بجز خدا کے کوئی نہیں ہے بے کسوں کا یار

غرض تمام جہاں میں ایک آشنا دیکھا

مخلص کے اشعار میں زندگی کا منفی پہلو نمایاں ملتا ہے وہ جاگیر دارانہ نظام کی گھٹن شدت سے محسوس کرتے ہیں اور انکی انجانی سی خواہش انکے اشعار میں اجاگر ہوتی رہتی ہے۔ کبھی انکو بارگاہ ایزدی میں، کبھی مولا کے دربار میں اور کبھی اہل بیت کے ساتھ والہانہ دوستی ومحبت کے تصور میں راہ نجات نظر آتی ہے۔

مخلص راسخ الاعتقاد شیعہ تھے اور جاگیر دارانہ نظام کی تمام برائیوں اور روایتوں سے پیار کرنے کے باوجود عاقبت کے انجام اور خدا کے خوف سے کانپتے ہیں حضرت علی اور آل علی کے لئے عقیدت، ارادت اور ان سے والہانہ وارفتگی میں سکون قلب نصیب ہوتا ہے۔

مخلص کے دیوان میں خالص عشقیہ غزلیں بھی مل جاتی ہیں۔ وہ خلوص سے اپنے عہد کے دیگر غزل گو شاعروں کی پیروی اور تقلید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انکے ہاں بھی محبوب کی جدائی اور ستم رانیوں کا گلہ ملتا ہے۔ بیوفائی اور جفاکشی سے جھنجھلاہٹ اور غصہ کا اظہار ہوتا ہے۔ مخلص کے قلمی دیوان سے چند غزلیں اور ترجیع بند نمونے کے طور پر نقل کئے جا رہے ہیں جن سے غزل گوئی میں انکے مقام

کی تعیین میں یقیناً مدد مل سکے گی

بہ جز خدا کے کوئی نہیں ہے بے کسوں کا یار
غرض تمام جہاں میں اِک آشنا دیکھا

سنا ہے تو نے کہ فرہاد کو خسرو نے
فریب دے کے جو مارا تو کیا بھلا دیکھا

نہ چاہا جن نے کسی کو کبھی دنیا میں
پھر ان نے زندگی اپنی کا کیا مزا دیکھا

بہت سے اپنے تو عاشق بتاتے ہونگے میاں
بھلا کسی کو بھی مخلص سا بے ریا دیکھا

تجھے ہے درد سنانا مجھے بہت لازم
کہ ہے رفیق تو لے دل د تجھ سے ہے یاری
سدا گزرتے ہیں دن یاد میں رفیقوں کے
تمام شب مجھے کٹتی ہے ہائے وزاری
نہ چین دیتی ہیں آنکھیں ذرا بھی رونے سے
بغیر درد نہ آتا ہے کوئی غم بہ خواری
نہ لیوے نام کبھی عشق گل کا پھر بلبل
جو دیکھیں وہ مری آکر اس قدر خواری
امید تجھ سے ہے مخلص کو بھی یہی مولا
کہ کر تو ہر دو جہاں میں میری مددگاری

مخلص شاہ قدرت اللہ قدرت کے ہم عصر تھے۔ نساخ نے مخلص اور قدرت کا حال لکھنے میں بخل سے کام لیا ہے اور محنت نہیں کی ہے۔ نساخ لکھتے ہیں کہ "مخلص تخلص علی خاں مرشد آبادی خواہرزادہ نواب نوازش خاں شہامت جنگ معاصر شاہ قدرت اللہ قدرت"۔

نساخ نے اس صاحب دیوان شاعر کے بھی صرف دو چار اشعار نقل کئے ہیں جبکہ ان سے کم مشہور اور کم سواد شاعروں کا حال تفصیل سے لکھا ہے اور انکے کلام کا خاصہ انتخاب بھی دیا ہے۔ مخلص اپنے زمانے میں بہت زیادہ مشہور نہیں ہوئے ہندوستان میں انکی شہرت نہیں پہنچی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ نکات الشعرا میں ان کا حال نہیں ملتا۔ جب میر کے آگے قدرت قاسم اور درد منہ کچھ نہیں تو مخلص کو کیا قابل توجہ سمجھتے۔

مخلص کا یہ خطی دیوان ۱۸۰۱ء مطابق ۱۲۱۶ھ میں تحریر ہوا تھا یعنی انکی موت کے پورے دس سال بعد ترتیب پایا۔ اس میں وہی غزلیات شامل کی گئی ہیں جو ضائع ہونے سے بچی ہونگی۔ غالباً انکے کلام کا کچھ حصہ دست برد ہو گیا۔ مخلص کے نایاب کلام کے تقابل کے بعد مخلص بلاشبہ قدرت سے فروتر شاعر نظر آتے ہیں۔ پھر بھی ان کا شعری سرمایہ اُردو کے کلاسیکی ادب کے ذخیرہ میں ایک اہم اضافہ کر سکتا ہے۔

سرور نے اپنے تذکرہ "عمدہ منتخبہ" میں مخلص کا حال تشنہ لکھا ہے "تخلص مخلص علی خاں نام از عمدہ زادہائے مرشد آباد۔ مدتے شد کہ ازیں جہان فانی رحلت کردہ خدا بیامرزاد۔"

مخلص کی شاعری پر سرور نے ہلکی سی بھی تنقید نہیں کی اور نہ ہی اس بیان سے مخلص کا کوئی کردار یا اسکی شخصیت واضح ہوتی ہے لیکن یہ یقیناً پتہ چلتا ہے کہ تذکرہ سرور کی ترتیب کے بہت قبل مخلص دار فانی کو کوچ کر چکے تھے۔ ان کا قلمی دیوان بھی نواب صاحب کی نظر سے نہ گذرا تھا۔

گارساں دتاسی اور مولوی کریم الدین نے مخلص کا حال ذرا تفصیل سے لکھا ہے لیکن ان کا بیان ناقص ہے۔ مخلص کو انھوں نے نواب نوازش شہامت جنگ کا بھائی لکھا ہے دتاسی سے تسامح ہوا ہے اور مولوی کریم الدین نے بھی اس کی تصحیح نہیں کی۔

ہر تذکرہ نگار نے مخلص کو مرشدآبادی لکھا ہے جس سے ظاہر ہے کہ انکا تعلق شروع میں دلی یا دوسرے شہروں سے کبھی نہیں رہا۔ وہ مرشدآباد میں پیدا ہوئے وہیں پلے بڑھے اور جوان ہوئے اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ اسی لئے مخلص خالص بنگالی شاعر ہیں جن کی زبان اُردو تھی۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ سترہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے شروع کے اکثر تذکرہ نگاروں نے مخلص کو جاذب توجہ نہ سمجھا اور ان کا حال نہیں ملتا۔

شاہ قدرت اللہ قدرت

شاہ قدرت اللہ قدرت دلی میں پیدا ہوئے وہیں جوان ہوئے اور انکی شاعری کا رنگ نکھرا۔ قدرت کا زمانہ اردو شاعری کا عہد زریں تھا شمالی ہند میں میرؔ، سوداؔ اور دردؔ جیسے منفرد اور عظیم شاعروں کا طوطی بول رہا تھا۔ انکی شاعری بھی ایسی ہی فضا اور ماحول میں پلی اور پروان چڑھی تھی۔ دلی میں قدرت اپنی زندگی ختم کرتے تو انکی شاعری پر اور بھی خوبصورت رنگ چڑھتا لیکن دلی پر غیر ملکیوں کی یورش اور تاخت و تاراج نے دلی والوں کا سکھ چین چھین لیا تھا۔ شہری زندگی خطرے میں گھری ہوئی تھی۔ ذریعہ معاش مفقود تھا۔ آئے دن کی لوٹ مار چوری اور نقب زنی سے شرفائے دلی کی جان ضیق میں آگئی تھی۔ ایسی غیر محفوظ دلی سے قدرت کا دل بھی اچاٹ ہو گیا۔ مغلیہ سلطنت بتدریج زوال کی عمیق خندق میں گرتی جا رہی تھی۔ دلی سلطنت پر بادشاہ سائے کی طرح بیٹھتے اور اٹھتے جا رہے تھے۔ قدرت بھی فکر معاش میں مرشد آباد چلے گئے جہاں انکو سکونِ دل نصیب ہوا اور فکر معاش سے نجات بھی ملی۔ اور انکی شاعری کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع نصیب ہوا ۱۱۹۱ھ ہجری میں قدرت دلی سے مرشد آباد جا چکے تھے۔ قدرت کا حال اس عہد کے اکثر تذکروں میں ملتا ہے۔ گلشن ہند اور گلزار ابراہیم کے مؤلفوں کو ان سے لگاؤ تھا۔ دونوں نے ان کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ مرزا علی لطف لکھتے ہیں:۔

قدرتؔ تخلص، شاہ قدرت اللہ نام ساکن شاہ جہان آباد مشہور سخنوردوں میں تھے۔ رشتہ دار تھے میر شمس الدین فقیرؔ کے، صاحب مذاق تھے چاشنی درد و تاثر کے، نظم ریختہ میں ذہن رسا رکھتے تھے۔ خاطر سخن گستر اور طبع معنی آشنا رکھتے تھے۔ طرز مضمون آفرینی سے ماہر ادراک شکستگی کلام سے انکے ظاہر۔ اکثر فکر اشعار فارسی کے بھی کرتے تھے۔ لیکن نظم ریختہ پڑھتے تھے۔ تازہ کرنے میں مضمون کے اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور صفائی میں مضمون کے نازک خیالیوں سے ہر کے دمساز تھے۔ وارستہ مزاجی کے یار اور حالی سے سروکار۔ ایک مدت سے دلی کو چھوڑا تھا۔ اور وارد مرشد آباد تھے۔ اکابر و اعزہ اس شہر کے سب ان سے برسر اعانت و امداد تھے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ مجھ سے انکو اخلاص اور اتحاد تھا۔ واقعی عزیز اپنے طور کا استاد تھا۔ شاید ۱۲۰۵ھ میں اسی بلدے کے اندر انتقال کیا۔ اور طبع کو شاعروں کے حد سے زیادہ پر ملال کیا۔ دیوان میں اسی صاحب قدرت کے ہر قسم کے اشعار ہیں۔"

علی ابراہیم خاں مرزا علی لطفؔ میر حسنؔ اور نواب سرورؔ نے انکو ایک صاحب قدرت اور نغز گو شاعر لکھا ہے لیکن نکات الشعرا میں میر تقی میرؔ نے انکو عاجز سخن لکھا ہے۔ میرؔ نے قدرتؔ کے ساتھ انصاف نہیں کیا غالبًا اسکی وجہ یہ بھی ہوگی کہ قدرتؔ کو میرؔ کی صحبت یارانہ میسر نہ ہوئی اور میرؔ کی نظر میں دو چار ہی شاعر ایسے تھے جنکی شاعری قابل احترام تھی اور نہ اکثر شاعر ان اسکی تنقید کی ترازو پر ہلکے ہی نظر آتے ہیں۔

میر حسنؔ نے اپنے تذکرے میں قدرتؔ کا حال بھی لکھا ہے اور ان کی

شاعری پر بھی تبصرہ کیا ہے میر حسن کی نظر میں قدرت ایک کامل فن اور کامیاب غزل گو ہیں جنکے اشعار میں تصوف اور وحدت کی بجلیاں بھی کوندتی نظر کو چکا چوند کر جاتی ہیں۔ میر حسن لکھتے ہیں :-

"سمند نطقش در میدان فارسی و ہندی چالاک و چست و تصویر بے نظیر معانیش در استخوان ہندی الفاظ درست"

میر حسن نے یہ بھی لکھا ہے کہ قدرت اللہ صوفی منش اور خدا ترس آدمی تھے۔ اور میر شمس الدین فقیر سے اصلاح لیتے تھے چنانچہ انکی شاعری میں معرفت کا رنگ نمایاں ہے۔

نواب سرور نے "عمدہ منتخبہ" میں قدرت کی شاعری پر جچی تلی تنقید کی ہے اور

"شاعرِ بر دست پر قوت اشعارش یک دست با مضامین برجستہ و معانی دل پسند و عبارت رنگین و الفاظ مربوط فریب صفحہ ایام است و دل پسند خاطر معنی شناسان سخن رس طرز شعر گوئیش با ہیچ شاعرے نمی ماند بدورش خود بہ وضع داری علٰحدہ چاشنی معنی دارد رنگینی مضمونش ذائقہ بخش کام و زبان سخن سنجان غرض کہ استاد وقت خویش بود"

قدرت کی شاعرانہ صلاحیت کو تمام تذکرہ نگاروں نے تسلیم کیا ہے۔ قدرت حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ کی اولاد میں سے تھے۔ ان کی پرورش مذہبی ماحول میں ہوئی۔ صوفیائے کرام کی صحبت میسر تھی اس لئے انکے اشعار میں میں ہجر و وصال اور گل و بلبل کی دلگداز داستان بھی عارفانہ رنگ میں ملتی ہے

اکثر شعر میں تصوف اور فلسفہ کا امتزاج ملتا ہے انھوں نے صوفیانہ مضامین کو شعر کے ڈھانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ انکی عاشقانہ غزلوں میں عشق حقیقی اور وحدت کا فلسفہ بیان ہوا ہے۔

قدرت ۱۲۲۵ھ میں مرشد آباد میں فوت ہوئے اور وہیں دفن ہوئے قدرت قادر الکلام شاعر تھے۔ انکی غزلوں میں برجستگی اور شستگی ہے عشق حقیقی کی بجلیاں بھی ملتی ہیں۔ تصوف کے مسائل بھی نظم ہوئے ہیں۔ خواجہ میر درد کا رنگ ان کے ہاں بھی ہے۔ قدرت مرشد آباد نہ آئے ہوتے تو انکو صوفی شاعروں میں ایک منفرد مقام حاصل ہوتا۔ مرشد آباد میں انکی زندگی مصروف ہو گئی تھی۔ غور و فکر کی فرصت نہیں ملتی تھی۔

قدرت اللہ قدرت کا دیوان شائع نہ ہو سکا۔ ان کا قلمی دیوان جس کا حجم مختصر ہے ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ایک عکسی نسخہ نیشنل لائبریری (کلکتہ) میں ہے جو قاضی عبدالودود صاحب کا عطیہ ہے۔

ہوگلی

مرشد آباد اور کلکتہ کے علاوہ ہوگلی بھی بنگال میں اردو کا ایک بڑا اور اہم مرکز تھا۔ سات گاؤں جب گمنامی میں چلا گیا اور اس کی تجارتی اہمیت اور افادیت ختم ہو گئی تو ہوگلی نوابین کی تخت گاہ بنی اور اس شہر کو بڑی رونق حاصل ہوئی، اور یہاں ادیبوں اور شاعروں کا اجتماع ہوا۔

ہوگلی اور چنچوڑا متصل شہر ہیں۔ ہوگلی کو پرتگالیوں نے بسایا تھا اور چنچوڑا کی تعمیر ولندیزیوں نے کی تھی۔ ہوگلی میں اسلامی تہذیب و تمدن کے نقوش اب بھی باقی ہیں۔ اسلامی تہذیب کی جیتی جاگتی تصویریں ہوگلی امام باڑہ حاجی محسن کالج، ہوگلی مدرسہ اور کئی خوبصورت مساجد اب بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ دلی میں طوائف الملوکی پھیلنے کے بعد اکثر رؤسا دلی چھوڑ کر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ نوابین کی تخت گاہ ہونے کی وجہ سے ہوگلی میں شمالی ہندوستان کے امیر، ادیب اور شاعروں کا قافلہ بھی سمٹ آیا تھا اور وہ بڑی تعداد میں بس گئے تھے۔ انھوں نے ہوگلی میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔ ہوگلی، اور چنچوڑا ٹاؤن کے علاوہ پنڈوا بھی علم و ادب کا اسلامی تہذیب کا گہوارہ رہا۔ اس سرزمین سے

میں اردو کے مشہور شاعر اور نقاد عصمت اللہ آتش ابھرے اور ان کی شاعری اور انتقادی صلاحیت کی ہندوستان بھر میں دھوم مچی۔

ضلع ہوگلی کی خاک سے بہت سے شاعر اور ادیبوں کا جنم ہوا لیکن شہرت اور مقبولیت چند شاعروں کو ملی۔ اور بہت سے کامیاب شاعر گمنام رہ گئے۔ ان شاعروں اور ادیبوں کا جستہ جستہ حال مختلف تذکروں میں ملتا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ کتنی دلنواز شخصیتیں اور لغزگو شاعر اس کی آغوش میں خوابیدہ اور دفن ہیں۔

ضلع ہوگلی میں بے شمار شاعروں اور ادیبوں میں قاضی محمد صادق اختر، حافظ ضیغم، رشید النبی وحشت، عصمت اللہ آتش، زند، مخمور امید علی خاں آمید خاص طور پر مشہور ہیں۔

قاضی اختر

قاضی محمد اختر ہوگلی کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد قاضی لعل محمد کا ہوگلی کے ممتاز لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ صادق اختر نے اپنی خودنوشت حیات فارسی میں لکھی ہے جس کا نام صبح صادق ہے لیکن اب اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہے۔ قاضی صاحب کا حال اردو کے مختلف تذکروں میں اختصار کے ساتھ مل جاتا ہے۔ قاضی صاحب اچھے عالم کامیاب ادیب اور شاعر تھے۔ اردو سے زیادہ فارسی میں انھیں دستگاہ حاصل تھی۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گذرا۔ اس لئے عام طور سے انھیں شمالی ہند کا شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ قاضی صاحب بنگالی تھے۔ بنگال میں ہی ان کا جنم ہوا، یہیں پرورش و پرداخت ہوئی اور کسب تعلیم کیا۔ ملازمت کے سلسلے میں انھیں ہندوستان کے مختلف شہروں کی خاک چھاننی پڑی اور نواب حیدر بادشاہ کی دریادلی اور سرپرستی میں ان کا جوہر کھلا اور ان کی شاعری کا حسن نکھرا۔ لکھنؤ میں مستقل قیام کی وجہ سے ان کی شاعری پر دبستان لکھنؤ کا رنگ گہرا اور نمایاں ہے۔

کسی تذکرے میں قاضی صاحب کا سنِ ولادت درج نہیں ہے ان کا انتقال اٹھاون ۱۸۵۸ء میں ہوا۔ اس وقت انکی عمر لگ بھگ

۶۵ سال تھی۔ لہذا ۱۷۹۳ء ان کا سنہ ولادت قرار دیا جاسکتا ہے
نسّاخ نے ان کے متعلق لکھا ہے۔

"اختر تخلص قاضی محمد صادق خاں بہادر مرحوم ولد قاضی لعل محمد مرحوم باشندہ ہوگلی شاگرد مرزا قتیل۔ لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں ہمیشہ عمدہ عہدہ پر مامور رہے۔ تذکرہ آفتاب عالم تاب و محامد حیدری دیوان فارسی وریختہ و گنج تسرنخ وغیرہ بہت سی تالیفات اونکی مشہور ہیں۔ زبان فارسی خوب جانتے تھے فن شعبدہ میں کمال تھا۔ کیمیاگر مشہور تھے اور بہت سے فنون میں دخل رکھتے تھے۔ بہت سی تالیفات ان کی نظر سے گذری تھوڑا عرصہ گذرا کہ انتقال کیا[1]۔۔۔۔"

نسّاخ نے سخن شعرا میں ان کی مشہور مثنوی سراپا سوز کا ذکر نہیں کیا ہے، لیکن قطعہ منتخبہ مطبوعہ ۱۲۸۶ھ میں اختر کا ذکر زیادہ تفصیل سے کیا ہے بعض باتیں مشترک ہیں۔

"محامد حیدری و دیوان فارسی وریختہ و گنج نیرنج، تذکرہ آفتاب عالمتاب و مثنوی سراپا سوز وغیرہ بہت سی تصنیفات و تالیفات ان کے مشہور ہیں[2]۔"

صادق اختر ایک کامیاب شاعر اور منفرد نثر نگار تھے۔ فارسی میں انھوں نے اپنا مشہور اور مفید تذکرہ آفتاب عالمتاب تالیف کیا ہے جس میں بہت سے فارسی شاعروں کا ذکر ہے اور انکے کلام پر ہلکی تنقید بھی کی ہے۔ اردو میں اختر نے دیوان کے علاوہ اپنے عہد کی مقبول مثنوی سراپا سوز

لہ دیکھئے سخن شعرا نساخ صہ ۳ - ۲ہ دیکھئے قطعہ منتخبہ نساخ صہ ۳

چھوٹی ہے۔ ان کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ رباعیات، قطعات اور قصائد بھی ہیں۔ مگر ان کا اصل رنگ غزلوں میں ابھرتا ہے۔ قتیل کے شاگرد ہونے کے ناتے سے ان کی ریختہ گوئی ثقیل اور فارسی تراکیب سے بوجھل ہونی چاہیے تھی لیکن انھوں نے کمال ہوشیاری سے اپنے دامن کو فارسی میں الجھنے سے بچایا ہے۔ ان کی اردو شاعری لکھنوی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے پھر بھی سبک اور لطیف ہے۔ ان کا یہ شعر تو زبان زد خاص و عام ہے ؎

کہنے لگا زراہ تبختر مجھے بہ طنز معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا

ان کے دیوان میں ایسے تیکھے اور سلگتے اشعار کی کمی نہیں۔ اگر انھوں نے لکھنؤ کے شاعروں کا اثر قبول نہ کیا ہوتا اور داغ کے بجائے دل کی شاعری کی ہوتی تو اردو کے عظیم غزل گویوں کی صف میں انھیں جگہ ملتی۔

سراپا سوز قاضی محمد صادق اختر کا ایک بڑا کارنامہ ان کی مشہور مثنوی سراپا سوز ہے۔ صادق کی یہ مقبول مثنوی ۱۲۲۴ھ میں تصنیف ہو چکی تھی[1]۔

مولانا حسرت موہانی نے سراپا سوز کو مشہور مثنوی اسرار محبت یعنی قصہ سسی پنوں کے ساتھ شائع کیا۔ مثنوی سراپا سوز میں بھی ایک رنگین رومانی داستان نظم کی گئی ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ ایک مسلم نوجوان بنارس کے ایک سنار کی ماہ پیکر بیٹی کی ایک جھلک دیکھ کر دامنِ تواز ن کھو بیٹھتا ہے۔ اسکے عشق کے شعلے میں جلنے لگتا ہے۔ ایک ہی نظر میں عاشق ہوا اور بے ہوش ہو گیا۔ پڑنا

---

[1] سراپا سوز مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب، دیباچہ

ایک ناقابل یقین ڈرا ما معلوم ہوتا ہے ۔ المختصر عاشق دلگیر کے احباب اس کے والہانہ عشق کی خبر سنار کی لڑکی کو دیتے ہیں۔ سنار کی مہ رو بیٹی کا دل پسیج جاتا ہے اور عاشق کے لئے ایک انجانی سی الفت اسکے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر انکے وصال کے آگے مذہبی دیوار کھڑی ہوتی ہے ۔ وہ اپنے جذبات کو دباتی ہے اور اپنے عاشق کو پیغام بھیجتی ہے کہ تم مسلمان اور میں ہندو۔ ہمارا تمہارا ملن اس دنیا میں ناممکن ہے ۔

اپنی محبوبہ کا جواب سن کر آشفتہ سر عاشق دل برداشتہ نہیں ہوتا بلکہ ترک مذہب کر دیتا ہے ۔ قشقہ کھینچ کر سادھو کا لباس پہنتا ہے اور اپنی محبوبہ کے گھر کے سامنے دھونی رماتا ہے ۔ جیسا کہ قاعدہ ہے عشق عاشق و معشوق دونوں کو رسوا کرتا ہے ۔ سنار کے رشتہ داروں کی رگ حمیت پھڑک اٹھتی ہے ۔ ذلت اور رسوائی ناقابل برداشت ہوتی ہے اور عاشق نامراد اپنی جان سے جاتا ہے ۔

جب محبوبہ کو اپنے عاشق کے خوفناک انجام کی خبر ملتی ہے تو شرم و حیا کی تمام دیواریں پھلانگ کر وہ باہر نکل آتی ہے ۔ عاشق کی نعش سے لپٹ کر ماتم و شیون کرنے لگتی ہے اور رفتہ رفتہ عشق کی آگ میں جل کر راکھ ہو جاتی ہے اور اپنے محبوب سے جا ملتی ہے ۔

یہ چھوٹی سی عشقیہ کہانی ہے جو مثنوی کے سانچہ میں ڈھل گئی ہے ۔ اختر کا انداز شگفتہ ہے ۔ بیان میں سوز و گداز ہے ۔ جذبات نگاری میں اختر کو کمال تھا ۔

ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں کے مؤلف ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں :۔

"مثنوی مختصر ہے کہیں کہیں تصنع سے کام لیا ہے مجموعی طور پر اشعار رواں اور بندشیں چست ہیں ۔شاعر کے کلام سے اسکے زور طبیعت اور پختگی کا پتہ چلتا ہے[1] ۔"

سراپا سوز کے دو کلیدی کردار الگ الگ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ اس عہد کی تصنیف ہے جب برٹشی حکومت اپنی بنیادیں مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کو فروغ دیکر فرقہ وارانہ جذبات کو ابھار رہی تھی اور ہندو اور مسلمان کے درمیان نفرت کی خلیج پیدا کر رہی تھی اختر حساس شاعر تھا۔ ذہن اور شعور میں پختگی تھی۔اس نے اپنی اس کہانی میں نفرت کی اسی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی ہے ۔اس نے اپنی مثنوی میں محبت، اخوت اور امن و آشتی اور وحدت پر زور دیا ہے۔

اس مثنوی کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی مذہب کی فوقیت اور برتری ثابت کرنے کے بجائے باہمی رواداری اور قومی یکجہتی کی خوبی بیان کی گئی ہے ۔ستار کی لڑکی نے جب یہ کہلوا بھیجا کہ ہندو اور مسلمان کی خانہ برانداز تفریق ہماری راہ میں حائل ہے تو نوجوان اسکا جواب یوں دیتا ہے ؎

جس جگہ عشق کی ہے جلوہ گری	ہے وہ منزل دوئی سے پاک بری
انکے آگے جنھیں ہے عشق سے کام	دین کیا چیز کفر کس کا نام

[1] دیکھئے اردو مثنویاں ۔ ڈاکٹر گوپال چند نارنگ

نہیں اسلام ہے رخ جاناں　　کفر ہے اس پہ خال مشک افشاں
غور کیجے تو ہیں یہ دونوں ایک　　اس میں کب ہے تفاوت بد نیک
ہے حرم کی اگر اذاں ناقوس　　دیر کا پردہ دار ہے ناقوس
خانہ کعبہ ہو کہ کعبۂ دھر　　ماسوا ایک کے نہیں شے ہے غیر

مثنوی سراپا سوز اپنی انہی خصوصیتوں، خوبیوں اور شاعرانہ حسن و لطافت کے باعث اپنے زمانے میں بے حد مقبول ہوئی۔ تیسری بار ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ میں شائع ہوئی اور اب پھر چھپ کر منظر عام پر آ گئی ہے۔ اردو کی مختصر مثنویوں میں اسکی اپنی ایک الگ جگہ ہے۔ مثنوی سراپا سوز کا ایک نادر قلمی نسخہ آزاد لائبریری کے ذخیرہ حبیب گنج نمبر ۵۵/۱ میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ ۱۲۸۷ھ ہجری میں لکھا گیا ہے[۲]۔

[۱] دیکھئے مثنوی سراپا سوز مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب [۲] دیکھئے تاریخ ادب اُردو سکسینہ۔
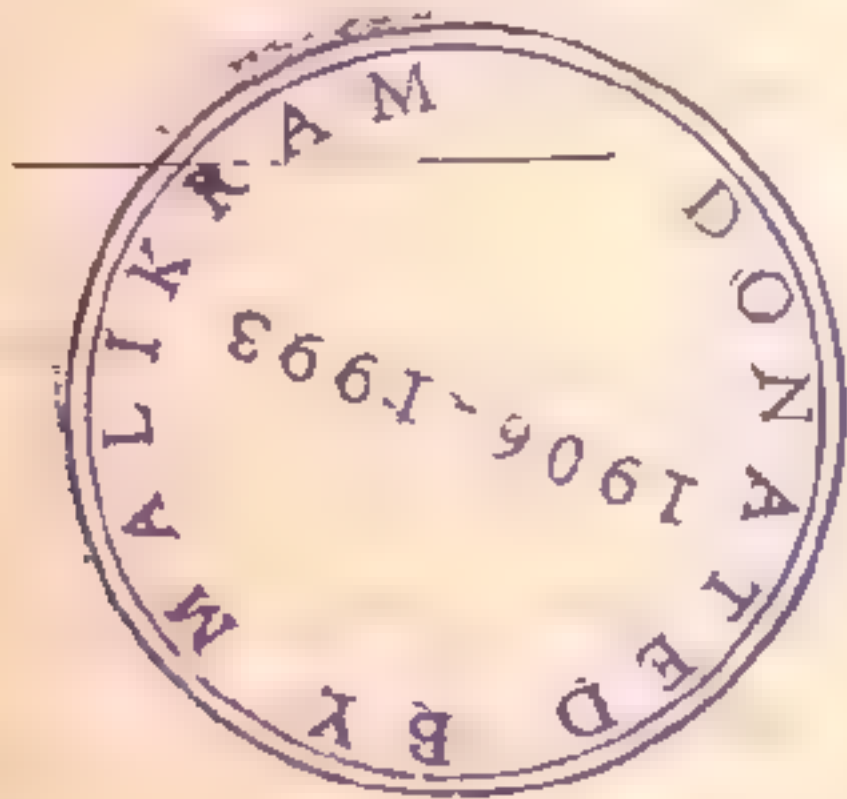
عصمت اللہ خاں انسخ

عصمت اللہ خاں انسخ ہوگلی ضلع کے مشہور و معروف شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ نساخ کے تلمیذ تھے۔ اور اپنے استاد کی تقلید اور پیروی کو اپنا فرض تصور کرتے تھے۔ مولوی صاحب کو اپنے استاد سے گہری عقیدت تھی والہانہ محبت تھی۔ وہ استاد کے خلاف معمولی اعتراض بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ غالبًا اسی دلی ارادت اور اندھی عقیدت کے نتیجے میں انھوں نے خرزن جیسی غیر ادبی کتاب لکھ ماری جو اخلاق و آداب اور تہذیب سے گری ہوئی ہے۔

مولوی صاحب ضلع ہوگلی کے مشہور قصبہ پنڈوا کے رہنے والے تھے۔ برسوں یہ قصبہ صوفیہ کرام کا تبلیغی مرکز اور اسلامی تہذیب اور علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے، صوفیائے کرام کی تبلیغی جدوجہد اور کام کی وجہ سے اسلامی تہذیب پنڈوا کی سماجی و ثقافتی زندگی میں رچ بس گئی تھی۔ اور فارسی زبان کے ساتھ اردو زبان کو بھی یہاں فروغ نصیب ہوا۔ اسی مردم خیز قصبہ میں ایک زمیندار گھرانے میں مولوی صاحب ۱۲۵۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد رحمت اللہ خاں چودھری کٹر مذہبی آدمی تھے۔ اسی مذہبی ماحول میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کلکتے چلے آئے اور اردو فارسی میں دستگاہ کامل حاصل کی۔

پنڈوا میں انسخ کے علاوہ بھی کئی نامور شاعر ہوئے ہیں۔ پنڈوا کے علمی

اور تہذیبی زندگی کے بارے میں کرافورڈ نے اپنی کتاب ہوگلی ضلع کی مختصر تاریخ میں لکھا ہے کہ

"پنڈوا مسلمانوں کا خاص مرکز ہے۔ یہاں کے مسلمان اشراف طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ ان مسلمان فوجیوں اور حکام کی اولاد ہیں جنھوں نے چودہویں صدی عیسوی میں صوفی شاہ کی کمان میں بنگال فتح کی تھی[1]"

عصمت اللہ آتسخ اسی پنڈوا کے اشراف طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ نساخ نے سخن شعرا میں اپنے عزیز شاگرد کا حال یوں بیان کیا ہے

"آتسخ تخلص مولوی عصمت اللہ ولد چودھری رحمت اللہ مرحوم باشندہ پنڈوا متعلق ضلع ہوگلی۔ سال تولد ان کا ۱۲۵۳ھ ہے۔ شعر اچھا کہتے ہیں۔ ایام صبا سے کلکتہ میں رہتے ہیں۔ کلام اپنا راقم الحروف کو دکھلاتے ہیں۔ صاحب دیوان ہیں۔ پیشتر مجبور تخلص کرتے تھے[2]"

نساخ کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ آتسخ کو شروع سے ہی شاعری کا ستھرا مذاق تھا۔ انھوں نے اپنے عہد کے بنگال کے سب سے بڑے شاعر غفور خاں نساخ کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ان پر نساخ کا گہرا اثر ہوا تھا۔ نساخ سے الگ ہو کر وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اپنے استاد کی پیروی کو ہی وہ اپنا فخر سمجھتے تھے۔ نساخ پہلے مہجور تخلص کرتے تھے اور آتسخ مجبور۔ جب مہجور نساخ ہوئے تو مجبور آتسخ بن گئے۔ ایسی کوری تقلید کی بہت سی مثالیں

---

[1] A BRIEF HISTORY OF HOOGLY DIST. BY CRAWFORD P. 163.

[2] ملاحظہ ہو سخن شعرا نساخ ص۴۳

ان کی زندگی میں مل جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آتشخ اصل میں ناسخ کی کاربن کاپی تھے۔

آتشخ کی اس کوری تقلید نے ان سے انکی انفرادیت چھین لی۔ ان کے اندر شاعرانہ صلاحیت کے علاوہ انتقادی صلاحیتیں بھی تھیں مگر ناسخ کی اندھی تقلید کی وجہ سے یہ آواز اٹھنے لگی تھی کہ طومار اغلاط آتشخ کی تصنیف نہیں بلکہ ناسخ کی ہے جو صحیح نہیں ہے کیونکہ طومار اغلاط میں جو جوش، ولولہ، بے خوفی و بے باکی کے ساتھ ناسخ کے معترضین کو تلخ و دوٹوک جواب دیا گیا ہے وہ آتشخ کی استاد پرستی کی کوکھ سے ہی جنم لے سکتا تھا۔

آتشخ ناسخ کی زندگی میں ہی کامل فن استاد ہو گئے تھے۔ ان کا حلقہ تلامذہ بھی وسیع تھا۔ تذکرہ غنچہ ارم کے مولف محمد علی نجف رامپوری نے انکو کلکتے کا ملک الشعرا لکھا ہے۔ تذکرہ غنچہ ارم سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آتشخ کا دیوان ان کی حیات میں چھپ کر مقبول انام ہو چکا تھا۔

محمد علی نجف رامپوری نے گہری دوستی کی بنا پر آتشخ کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ پھر بھی آتشخ ملک الشعرا ہوں نہ ہوں ناسخ کے جانشین ضرور تھے۔ انیسویں صدی کے بنگال کے نغز گو شاعروں میں ان کا شمار ہوتا تھا لیکن مقام افسوس ہے کہ بنگال کے اس کامیاب اردو شاعر اور ادیب کی تمام تخلیقات زمانہ برد ہو گئیں۔

شاعری | شاعری میں آتشخ کا مرتبہ متعین کرنا محال ہے۔ ان کا دیوان ناپید ہے۔ صاحب تذکرہ غنچہ ارم نے انکی دو چار غزلیں نقل کی ہیں

کی ہیں۔ جو آتشؔ نے محافل مشاعرہ میں سنائی تھیں۔ ناسخؔ نے بھی اپنے تذکرہ میں اشعار اور قطعات نقل کئے ہیں۔ یہی غزلیں انکی متاع شاعری رہ گئی ہیں جو ان کو دوسرے درجہ کے شاعروں میں جگہ دلاتی ہیں۔ ان کی شاعری میں میکدہ شراب، ساقی، محبت میں دیوانگی جنون اور غم عشق بیان ہوئے ہیں ؎

ہے دم مرگ بھی اس دیدۂ نیلگوں کا خیال
ساتھ جاتا ہے وقت سفر جام شراب

نیک و بد کی یہ کسوٹی ہے جہاں میں آتشؔ
کھول دیتا ہے ہر ایک عیب ہنر جام شراب

سخن شعرا میں ناسخؔ نے اپنے عزیز شاگرد کے اشعار کا انتخاب دیا ہے کل ۲۳۳ اشعار دیوان سے نقل کیے گئے ہیں۔ ناسخ استاد فن اور صاحب فکر شاعر تھے۔ انھوں نے انتخاب میں یقیناً سختی برتی ہوگی لیکن آتشؔ کے ان اشعار میں بھی وہی فرسودہ خیال اور روایتی عشق ہے جو اس عہد کے ہر غزل گو کا سرمایہ فن تھا۔ آتشؔ بھی پرانی روش پر ہی سبک خرام نظر آتے ہیں ؎

کہتا ہوں کچھ تو کچھ ہے نکلتا زباں سے
جوشش جنوں میں بھی اپنے طبیعت بہک گئی

مخاطب جس سے ہو قاتل شہید بے اجل وہ ہے
زباں تیز کیا چلتی ہے گویا تیغ چلتی ہے

بھڑکی ہوئی عشق کی آتش بدن میں ہے
مانند شمع جسم مرا پیراہن میں ہے

ناسخ کے انتخاب سے لگتا ہے کہ آتش کے دیوان میں بھرتی کے اشعار زیادہ ہونگے۔ ناسخ کے منتخبہ اشعار میں اکثر بے کیف دبے رنگ ہیں۔ ان میں کوئی نئی بات نہیں۔ سوز و گداز کا بھی فقدان ہے۔ ایسا احساس ہوتا ہے۔ جیسے شاعر نے غم عشق کی آنچ میں تپ کر اپنے جذبات و محسوسات کو شعر کے سانچے میں ڈھالنا سیکھا ہی نہیں۔

انتقادی حیثیت آتش کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں خداداد انتقادی صلاحیت عطا ہوئی تھی۔ وہ شاعر بھی تھے اور بالغ نظر ادیب و نقاد بھی۔ "جوہر اغلاط" ان کا زبردست تنقیدی کارنامہ ہے جو انھوں نے امام بخش ناسخ اور ان کے تلامذہ کے اعتراضات کے جواب میں لکھا۔ اور ناسخ اور ان کے شاگردوں کے کلام میں غلطیوں کو اجاگر کیا تھا۔ او رکلام میں عیوب ظاہر کئے تھے۔ آتش سنجیدگی کے ساتھ قلم اٹھاتے اور جذبات کے دھاروں کے ساتھ بہہ نہ جاتے تو "جوہر اغلاط" کی افادیت مستند ہو جاتی۔ ادبی بحث گالی گلوچ میں نہ بدل جاتی۔

خرزن آتش کا ایک تنقیدی رسالہ ہے جسمیں مولوی صاحب بنگال کے ایک کم سواد شاعر جناب عالی کے ناسخ کے فارسی کلام پر پوچ اور مہمل اعتراضات کا مدلل جواب دیا ہے۔ تنقیدی بحث میں آتش کا پلہ بھاری ہے لیکن جہاں بھی تہذیب اور اخلاق کا دامن ہاتھ سے چھوٹا ہے وہاں آتش ایک جذباتی اور سطحی آدمی نظر آتے ہیں۔ اور تنقید کا تنزل ہو جاتا ہے۔ محاسن عیوب میں بدل جاتے ہیں۔ خرزن کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

مولوی کرامت علی جونپوری

رسالہ ماخذ علوم

مولوی کرامت علی جونپوری ۱۲۳۶ء میں جونپور سے متصل ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ۔ اس مناسبت سے مولوی صاحب اپنے نام کے ساتھ جونپوری لکھتے تھے۔ گاؤں میں ہی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہوگلی چلے آئے اور امام باڑہ محسنیہ کے متولی مقرر ہوئے اور اپنی زندگی کا بقیہ حصہ ہوگلی میں گذارا اور وہیں ۱۸۷۶ء میں انتقال کیا ۔ اور دفن ہوئے ۔ ان کے لوح مزار پر ان کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں درج ہیں ۔ مولوی صاحب اہل تشیع کے جید عالم اور کامیاب مجتہد تھے ۔ ان کی ایک بڑی سی تصویر امام باڑہ کے منقش ہال میں آویزاں ہے ۔

مولوی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ امام باڑہ محسنیہ کی تعمیر ہے ۔ ان کے متولی ہونے کے قبل ہوگلی امام باڑہ "چھوٹا سا" تھا ۔ انھوں نے اس چھوٹے سے "خانہ نما" امام باڑہ کو اصفہان کے عالیشان امام باڑہ کے طرز اور نقش پر ایک عالیشان اور یادگار امام باڑہ میں بدل دیا ۔ امام باڑہ کا صحن کشادہ ہے اسکے کلس طلائی تھے ۔

وسیع اور کشادہ صحن میں ایک لمبوترا سا تالاب ہے جس میں زعفرانی رنگ کی عجیب و غریب مچھلیاں خاص اہتمام سے پالی جاتی تھیں "ہال" کشادہ خوبصورت

اور جاذب نظر ہے۔ فرش سنگ مرمر کا ہے۔ اور دیواروں پر قرآن پاک کی آیات "طغرائی خط" میں منقش ہیں جو انیسویں صدی عیسوی کی خوش نویسی اور فن کاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ امام باڑہ کے "گھنٹہ گھر" کو تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

اس جادانی عظیم کارنامہ کے علاوہ مولوی صاحب نے ایک ناقابل فراموش علمی و ادبی یادگار بھی چھوڑی ہے جو ادبی دنیا میں انکے نام کو زندہ جاوید رکھے گی۔ انکی اس علمی و ادبی یادگار کا نام "رسالہ بیان ماخذ علوم" ہے۔ اس کتاب میں مولوی صاحب نے قرآن مجید کی آیات اور احادیث کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ ارضی و سماوی رازہائے سربستہ رفتہ رفتہ منکشف ہوتے جا رہے ہیں اور بہت سی ایسی گرہیں عقل انسانی نے اپنے ناخن سے کھول لی ہیں جو ابتک غیر فتوح تصور کی جاتی تھیں۔ اس میں مولوی صاحب نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جس طرح عربوں نے یونانیوں سے اور عربوں سے فرنگستانیوں نے علم سیکھا ویسے ہی آج کے ہندوستانی خصوصاً مسلمان مذہبی تعصب اور تنگ نظری کے خول کو اپنے بدن سے اتار پھینکیں تو یورپین قوموں سے علمی فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

مولوی صاحب نے ماخذ علوم کے ضمیمہ میں آیتوں اور حدیثوں کے حوالے سے علم ہیئت جدیدہ اور دیگر فلکی مسائل و رموز کو بھی حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اصل میں ان مختصر رسالوں میں مولوی صاحب نے علوم و فنون اور تاریخی اور مذہبی معلومات کا خزانہ سمیٹ لیا ہے۔ گویا ایک کوزہ میں علوم و فنون کا دریا سمو دیا ہے۔

مولوی صاحب کی یہ گراں بہا کتاب ۱۹۶۴ء میں پہلی بار کلکتے

میں شائع ہوئی اور اس قدر مقبول ہوئی کہ ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔

مولوی صاحب ماخذ علوم کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں:۔

"اما بعد کہتا ہے کرامت علی بن رحمت علی جونپوری کہ یہ چھوٹا رسالہ ہے بیان میں ماخذ علموں کے یعنی آدمیوں نے کہاں سے علم پایا اور بیان میں اسکے کہ کتنا فائدہ علمی حاصل کیا اور اب مسلمان کتنے فائدے حاصل کرسکیں گے اختلاط سے اہل فرنگستان کے۔"

اُنھوں نے کتاب کے خاتمہ پر اپنی کم مائگی اور کم دانی کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ان کی تصنیف ہے اور انھوں نے کہیں سے کچھ نہیں لیا ہے۔

"اہل دانش کی خدمت میں اپنی نادانی کا اقرار و عذر کرتا ہوں اور صاف لکھتا ہوں کہ میں انگریزی کچھ نہیں جانتا اور پیدائش میری گانو کی ہے وہیں بزرگ ہوا اور عنفوان شباب سے سفر میں رہا۔ اسی سبب سے ہندی زبان (اُردو) بھی میری بہت کچی ہے اور کبھی ہندی میں لکھنے کا اتفاق بھی نہیں پڑا۔ جو اہل دانش اس رسالہ کو دیکھیں گے سمجھیں گے کہ جو مضامین نئے نئے اس رسالہ میں ہیں میری طبع غیر مطبوع نے نکالے ہیں۔ کسی سے مجھ سے پہلے سبقت نہیں فرمائی (ص ۱۰۹)"[1]

مولوی صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی زندگی شروع میں سفر میں گذری۔ جونپور میں وہ جوان ہوئے، اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے انھوں نے ایران اور دیگر ممالک کا بھی سفر کیا ہوگا۔ انگریزی زبان سے عدم واقفیت کے باوجود انھوں نے رسالے میں جس ادراک و استدلال سے علوم و فنون اور ہیئت

[1] دیکھئے رسالہ ماخذ علوم صفحہ ۱۰۹

جدیدہ پر اظہار خیال فرمایا ہے، اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ فارسی اور عربی زبان اور ادب کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس سمندر کے وہ ایسے غواص تھے جن کی نگاہ دوربین سے کوئی بھی موتی دریا کی تہ میں بچ نہ رہا ہو۔

رسالہ بیان ماخذ علوم پہلے مقدمہ سے شروع ہوتا ہے۔

"مشاہدہ ہے لڑکوں میں کہ، ادراک کے آلات کے واسطے جن کو ملا ہے کم کم آہستہ آہستہ علموں کو حاصل کرتے ہیں اور جتنا اصلی جہالت سے دور ہوتے ہیں، اتنا ہی علم اور صنعتوں سے نزدیک ہوتے ہیں لیکن اس کسب کے واسطے معلم یعنی سکھلانے والا ضروری ہے۔ سب سے پہلا سکھلانا زبان کا ہے۔ دیکھو بڑوں کے ساتھ کتنا پڑتا ہے جب وہ بات کرنے (کو رفی) سیکھتے ہیں اور بڑی محنتوں سے حرفوں کو ان کے خاص مخرجوں سے اور خاص وضعوں کے ساتھ نکلتے (نکالتے) ہیں یہ بات اور امتحانوں سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اکبر شاہ تیموری نے ایک مکان بنوایا اور اس میں دو دو سے رنڈی (عورت) اور مرد سب گونگے بہرے انکے رکھے اور بڑکے نوزادوں کو پرورش کے واسطے سونپے لیکن وہ لڑکے بعد رشد کے قادر کلام پر نہ ہوئے" (ص ۲)

مولوی صاحب نے دوسرے مقدمے میں حضرت نوح سے نسل انسانی کی دوبارہ افزائش کا حال لکھا ہے۔ طوفان نوح میں ساری خلقت غرق ہو گئی حضرت نوح، انکی بیوی اور تین بیٹوں اور عوج بن عوق[1] کے سوا کوئی نہ بچا۔

---

[1] عوج بن عوق دنیا کا سب سے لمبا انسان گذرا ہے۔ مورخین کا کہنا ہے کہ ۔۔۔ مرتبہ

ان سے انسانی نسل پھر چلی۔ اس مناسبت سے حضرت نوح کو آدم ثانی کہا جاتا ہے۔

'ماخذ علوم' کا چوتھا مقدمہ نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ مفید اور معلومات افزا بھی ہے۔ اس مقدمے میں مختلف السنہ پر بحث دلچسپ انداز میں ملتی ہے، دنیا میں بے شمار زبانیں رائج ہیں لیکن سب سے پرانی زبان سریانی ہے اور دوسری قدیم ترین زبان عربی ہے۔ ان سے دوسری زبانیں نکلی ہیں۔

مسلمانوں کی تواریخ میں اور حدیثوں میں ہے کہ حضرت آدم اور انکی ذریت کی زبان طوفان کے قبل تک سریانی تھی شیعوں کی حدیث میں ہے کہ حضرت نوح و حضرت صالح و حضرت ہود و حضرت لوط و حضرت شعیب (پدرزن موسیٰ) و حضرت خاتم پیغمبران کی عربی زبان تھی۔ لیکن لغتوں میں لکھتے ہیں کہ حضرت نوح و حضرت ہود و حضرت لوط علیہم السلام کے نام عجمہ ہیں یعنی عربی نہیں ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا، ان ناموں کے وزن اور مشتقات سب عربی ہیں تو عجمہ کیوں ہونے لگے۔ اور یہ کہ شہر بابل کے بنانے میں فلج بن عبیر کے وقت میں خلل پڑا اور زبانیں انکی بدل گئیں۔ (ص۹)

مولوی صاحب نے زبانوں کی ابتدا و آفرینش پر سیر حاصل بحث کی ہے اور آخر میں دلائل و براہین کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قدیم ترین زبانیں

(گذشتہ صفحہ کا نوٹ) عوج بن عوق اتنا لمبا تھا کہ طوفان نوح میں پانی اس کی چھاتی تک نہ پہنچا اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہلاک کیا تھا۔ (م۔ ن)

سریانی اور عربی تھیں، پھر فارسی لاطینی اور سنسکرت وغیرہ وجود میں آئیں۔
اس طرح چراغ سے چراغ جلے، زبان سے زبانیں پیدا ہوئیں۔

ساتویں مقدمہ میں مولوی صاحب نے یونان کی زبان، تاریخ اور ثقافت زندگی کی دلکش تصویر کھینچی ہے۔ مولوی صاحب کا کہنا ہے کہ

"یونانی اولاد سے یونان بن یافث بن نوح کے ہیں۔ ابتدا میں وہ لوگ وحشی تھے، اسباب تمدن سے کچھ واقفیت نہیں رکھتے تھے یہاں تک کہ شادی بیاہ بھی نہ جانتے تھے۔ اڑھائی ہزار برس تخمیناً قبل ہجرت کے کچھ مسافر وہاں جاکے بسے، وہ بت پرست تھے ان کا رویہ اور انتظام اچھا نہ تھا۔" (ص ۱۰)

بقول مولوی صاحب حضرت موسیٰ کی پرورش کے وقت ایشیائے کوچک سے ایک قوم بھاگ کر یونان کے جزیرے میں آباد ہوئی اس قوم سے یونانیوں نے رہنے سہنے کا طریقہ سیکھا۔ علم، ہنر و فن، کاشتکاری اور کان کنی سیکھی اور بتدریج مختلف علوم میں دستگاہ اور مہارت حاصل کرکے ایک قابل رشک عظیم مہذب قوم بن گئی۔ پھر ان سے رومیوں نے تہذیب کا چراغ روشن کیا جن کی وساطت سے تمدن کا نور ساری دنیا میں پھیل گیا اور جہالت کا گھپ اندھیرا گھٹنے گھٹنے لگا۔

"ماخذ علوم" میں عیسائی مذہب کی تبلیغ و اشاعت، حضرت عیسیٰ پر رومیوں کی سختیاں، ان کے لرزہ خیز مظالم اور پھر سخت ایذائیں دے کر حضرت

یسوع مسیح کو شہید کرنے کی روایت بے حد موثر انداز میں بیان کی گئی ہے
یہ وہ زمانہ تھا جب رومن طاقتور ہونے کے باوجود بے رحم، خونی اور ظالم
تھے اور ان کے پاؤں تلے تہذیب اور انسانیت کچل کر سسک رہی تھی کراہ
رہی تھی۔

"غرض خاتم پیغمبراں، پیغمبر آخر الزماں کے مبعوث ہونے سے قبل
سب ملکوں میں کیا فارس، کیا روم میں جہالت کی تاریکی پھر چھا گئی
تھی۔ ایسا ہی برخلاف اس کے جب وہ حضرت مبعوث ہوئے
سارا جہان علم کے نور سے روشن ہو گیا، یہود ——— نے راہبوں
نے بعض عیسائی بادشاہوں نے، صابیوں نے، بعض فارسیوں نے
بت پرستوں نے بطیب خاطر حضرت کے دین کو قبول فرمایا۔ علوم
سیکھے، جو کوئی ایک دفعہ بھی حضرت کی خدمت میں مشرف ہوا
اپنے حوصلے سے بڑھ کے علم حاصل کیا۔" ص۳۰

ایسی پر از معلومات، مفید اور دلچسپ روایتیں ہر مقدمہ اور ہر فصل میں
ملتی ہیں لیکن بعض بعض باب میں مولوی صاحب نے جذباتی انداز اختیار
کر لیا ہے اور سنجیدگی معقولیت اور رواداری کی حدود سے وہ متجاوز
ہو گئے ہیں۔ جانبدارانہ عقیدے کی تبلیغ واشاعت بے دھڑک کی ہے،
اسکندریہ کے کتب خانہ کے نذر آتش کیے جانے کے متعلق انھوں نے
بغیر کسی شک وشبہ کے یہ لکھدیا کہ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے حکم سے عمرو
بن عاص نے نادر اور قیمتی کتابیں جلادی تھیں۔

مولوی صاحب راسخ العقیدہ شیعہ تھے اور اثنا عشری امام پر ایمان رکھتے تھے۔ انھوں نے جا بجا ان اماموں کی برکت، فضیلت اور کرامت کے ذکر کے دوران ان سے اپنی والہانہ شیفتگی اور الفت کا اظہار شدت سے کیا ہے اور فرطِ محبت میں دوسرے فرقوں کی رسوم، طریقوں اور عقیدوں کی کبھی کھل کر، کبھی دبے الفاظ میں مخالفت کی ہے۔

مذہبی فلسفہ اور عقیدوں کے بیان میں مولوی صاحب کا قلم لغزش کھا گیا ہے۔ انھوں نے استدلال و استدراک کے بجائے اپنی بحث میں جذبات کو سہارا بنایا ہے۔ لہذا "جذباتی انداز" کی پرچھائیاں کتاب کی بعض خوبیوں پر پڑتی ہیں۔ بعض مسائل کے سمجھنے میں انسانی ذہن کو مدد نہیں ملتی ہے بلکہ یہ اُلجھنے لگتا ہے اور جذباتی مباحثہ کی بھول بھلیوں میں وہ گم ہو کر رہ جاتا ہے۔

ان خامیوں کے علاوہ مولوی صاحب کی زبان میں ناہمواری اور طرزِ بیان روکھا پھیکا ہے مگر چونکہ ان کی یہ کتاب ایک سو سال قبل لکھی گئی ہے اس لئے یہ کمزوریاں گوارا کی جا سکتی ہیں۔ ویسے ان کی یہ تصنیف پایہ کی ہے جس میں رموز و نکات کے موتی ہر صفحہ میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔

"رسالہ ماخذ علوم" ۱۰۹ صفحات پر مشتمل ہے اور خوبصورت ٹائپ میں چھاپا گیا ہے۔ آخر میں چار صفحات میں اغلاط نامہ درج ہے۔ ماخذ علوم اپریل ۱۸۶۳ء میں مظہر عجائب پریس میں چھپی اور وہیں سے شائع ہوئی۔

"رسالہ ماخذ علوم" کی اشاعت کے پورے ایک سال بعد اس کا ضمیمہ بھی مولوی صاحب نے تصنیف کیا۔ یہ ضمیمہ بھی مظہر العجائب پریس کلکتہ سے چھپ کر شائع ہوا۔ ضمیمہ ۸۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں جدید سائنس ہیئت جدید اور دیگر فلکی و ارضی مسائل پر دلچسپ بحثیں ملتی ہیں۔ جدید علم سائنس کی تحقیقات کی احادیث اور قرآن پاک کی آیات کے حوالہ سے تائید اور تردید کی گئی ہے۔ ہر فصل میں حدیث اور قرآن کے حوالہ سے زمین آسمان، سیاروں اور ستاروں کے فاصلے بھی بتائے گئے ہیں۔

"رسالہ ماخذ بیان علوم" سر چارلس تریویلین کے نام معنون کیا گیا ہے مولوی صاحب نے ان کی فرمائش اور ترغیب پر یہ کتاب تصنیف کی تھی۔ ماخذ علوم کے مطبوعہ نسخے ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں موجود ہیں ان دو نسخوں کے علاوہ اور کسی نسخہ کا پتا نہیں چلتا۔ اب ایک حد تک نایاب ہے۔ دوبارہ شائع ہو جاتی تو ایک مفید علمی و ادبی اور دلچسپ کتاب سے عوام مستفیض ہو سکتے۔

رشید النبی وحشت

رشید النبی وحشت ان شاعروں میں ہیں جن کو اردو ادب میں خوش نصیبی سے ایک اہم جگہ مل گئی۔ ہوگلی کے ایسے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے جو شمالی ہند سے ہجرت کر کے کلکتہ تلاش معاش میں چلے آئے تھے اور روزی کے ناتے بنگال کے ہو کر رہ گئے تھے۔ مولوی وحشت صاحب مولوی حافظ النبی رقت کے صاحبزادے تھے۔ مولوی رقت رامپور کے رہنے والے تھے۔ وحشت بھی رامپور ہی میں پیدا ہوئے لیکن کم عمری میں ہی اپنے والد کے ساتھ کلکتہ چلے آئے تھے ان کو ہوگلی میں مفتی صدرات کا عہدہ مل گیا اور وہیں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ مولوی صاحب نے ادبی ماحول میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی تھی اس لئے بچپن ہی سے انکے دل میں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ انکے والد مولوی حافظ حافظ النبی رقت مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ملازم تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں تھے۔ فارسی اور عربی کے جید عالم ہونے کے علاوہ فارسی اور عربی کے پاکیزہ اشعار کہتے تھے۔ ناسخ نے لکھا ہے کہ

"رقت تخلص مولوی حافظ النبی مرحوم معاون مدرسہ عالیہ کلکتہ ولد مولوی ضیاء النبی مغفور باشندہ رامپور حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں سے تھے اشعار عربی اور فارسی میں خوب کہتے تھے۔"

نساخ کے بیان سے ظاہر ہے کہ رقت عربی اور فارسی کے علاوہ اردو کے اچھے شاعر تھے۔ نساخ نے انکے چند اشعار نقل کئے ہیں جو انکی نشاندہی کرتے ہیں کہ رقت اپنے عہد کے کامیاب شاعر تھے اور انکی شاعری عشق اور عارفانہ تجلیوں کا امتزاج تھی۔

دوسری کا سوگ کیجئے ایک کا غم ہو چکا
اب جگر کو روئیے دل کا تو ماتم ہو چکا

اپنی تربت پہ نہیں مارتا پتھر کوئی
چڑھتے ہونگے کسی اللہ کے قبر پہ پھول

زندگی گر عذاب ہے تجھ بن
موت بھی تو خراب ہے تجھ بن

مولوی وحشت کو شاعری ورثہ میں ملی تھی اور یہ بھی غلط نہیں کہ وحشت اپنے والد سے زیادہ کامیاب اور نغز گو شاعر ہوئے ان کے تلامذہ کا حلقہ بھی وسیع تھا۔ بنگال کے مشہور شاعر نساخ خود وحشت کے تلمیذ تھے انھوں نے اس پر فخر بھی کیا ہے۔ وحشت کی بدقسمتی تھی کہ مشرقی ہندوستان کے دور دراز شہر ہوگلی میں انکی زندگی کا بیشتر حصہ گذر گیا اور جب شعور ہوا اور انکے کلام میں پختگی آئی تو عیش شباب میں ان کا انتقال ہوگیا۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ مولوی صاحب کو اکثر اردو تذکرہ نویسوں نے موجب التفات نہ سمجھا اور ان کا حال لکھنے کی زحمت نہیں اٹھائی۔

عفور خاں نساخ نے حق شاگردی ادا کیا ہے اور اپنے استاد کا

حال لکھا ہے ۔ اس سے زیادہ مفصل حال کسی اور تذکرے میں نہیں ملتا ۔

"وحشت تخلص استاد راقم الحروف مولوی حافظ رشید النبی مرحوم خلف الرشید مولوی حفیظ حبیب النبی مرحوم رقت تخلص اولاد میں حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ کے وطن ان کا رامپور مسکن کلکتہ ہوگلی میں بہ عہدۂ جلیلہ افتاء پر مامور تھے ۔ کچھ روز حافظ اکرام ضیغم سے اصلاح لی تھی عربی و فارسی اور اردو اشعار نہایت خوب و بغائت مرغوب کہتے تھے عین شباب میں ۱۲۷۳ھ میں انتقال کیا ۔ راقم نے یہ تاریخیں انکے وفات کی کہیں ؎

کیا کہوں کیا غم ہوا پائی یہ جس دم خبر
شاعر شیریں زباں مر گئے افسوس آہ

فکر تھی تاریخ کی کلک نے مصرع ؎
وحشت جادو بیاں مر گئے افسوس آہ
۱۲۷۳ھ

مولوی وحشت کا انتقال ۱۲۷۳ھ میں ہوا اور بقول ناسخ موت کے وقت وہ جوان تھے اس لئے انکی عمر ۵۰ کے لگ بھگ ہوگی اس لئے انکا سنہ پیدائش ۱۲۲۳ھ قرار دیا جا سکتا ہے اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کم عمری میں ہی وحشت درجہ استادی کو پہونچ چکے تھے ۔ اور انکے شاگردوں کی خاصی تعداد تھی ۔

ہوگلی میں ان کے مستقل قیام کی بدولت شاعرانہ فضا پیدا ہوئی اور ہوگلی میں بھی کئی کامیاب شاعر ہوئے وہ ہوگلی کو اردو ادب میں زندہ جاوید کر گئے ۔

وحشت کی غزل گوئی ، ان کا دلکش طرز بیان ، اور نئے اسلوب نے

بنگال کے اکثر شاعروں کو متاثر کیا تھا۔ ناسخ نے بھی اپنی شاعری کے ابتدائی
دور میں انکے رنگ کو اپنانے کی کوشش کی تھی۔ ناسخ بلاشبہ وحشت کے
خلیفہ ہوئے اور انکو ادبی دنیا میں وحشت سے بھی زیادہ شہرت نصیب ہوئی
ناسخ نے اپنے استاد کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے۔ انکی قبل از وقت
موت سے ناسخ کو گہرا صدمہ ہوا تھا۔ وحشت عنفوانِ شباب میں انتقال
نہ کرتے اور موت انکی شاعری کو نکھرنے کے لئے کچھ اور وقت عطا کرتی تو وہ اپنے
عہد کے استادفن شعراء غالب، ذوق اور مومن کے حریف ہوتے۔ وحشت کا
شعور جب پختہ اور کلام میں جب برجستگی پیدا ہونے لگی تھی تو ظالم موت نے
ہمیشہ کے لئے انھیں اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ اور انکا اصل رنگ دنیا کے
سامنے نہ آسکا۔ انکو اتنی بھی فرصت نہ ملی کہ وہ اپنے کلام کو اکٹھا کرکے اپنے
دیوان کی تدوین و ترتیب کے کلام کو سرانجام دیتے۔ انکی موت کے بعد بھی ان
کا کلیات ترتیب نہ پاسکا۔ اور ایک پرگو اور کامیاب غزل گو اپنی جوانی میں
چھین گیا۔ اور اردو کا شعری ادب بہت سے نشتر سے خالی رہ گیا۔ وحشت کا
کلام نایید ہے۔ ناسخ نے سخن شعراء میں انکے کلام کا طویل انتخاب دیا ہے
ان تیکھے اشعار کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ایک منفرد شاعر
آسمان ادب پر جلوہ گر ہوتے ہی موت کے سیاہ آنچل میں روپوش ہوگیا۔

لالہ کھیم نرائن رندؔ

لالہ کھیم نرائن رندؔ دلی کے رہنے والے تھے اور دیوان جہاں کے مولف بینی نرائن جہاںؔ کے بھائی تھے۔ دیوان جہاں اور چار گلشن میں بینی نرائن نے لالہ کھیم نرائن کا ذکر کیا ہے۔ راجہ لچھمی نرائن انکے دادا تھے اور مہاراجہ ٹکیٹ رائے انکے دوستوں میں، جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے رفتہ رفتہ ریاستوں کو اپنے دائرہ عملداری میں سمیٹ لیا اور راجہ نواب اور جاگیردار لٹ کر قلاش ہو گئے تو ان کے متوسلان بھی فکر معاش میں ادھر ادھر نکل گئے۔ بینی نرائن اور لالہ کھیم نرائن دونوں ہی روزی کی تلاش میں شاہ جہاں آباد کو چھوڑ کر بنگال کے نئے عظیم الشان شہر کلکتہ آئے۔ لالہ کھیم نرائن کو کلکتہ میں سر چھپانے اور زندگی گذارنے کی جگہ مل گئی تھی۔ لیکن آخری ایام میں وہ کلکتہ سے ہوگلی چلے گئے تھے۔ وہیں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کی تھی۔ اور ہوگلی ہی میں انکا انتقال ہوا تھا ان کا سنہ وفات معلوم نہ ہو سکا لیکن ۱۲۴۷ھ کے قبل انکا انتقال ہو چکا تھا کیونکہ قطعہ منتخبہ مرتبہ ۱۲۴۷ھ کے وقت وہ زندہ نہ تھے۔ اس بنا پر سخن شعراء اور قطعہ منتخبہ میں نساخؔ نے ان کا صرف ایک ہی قطعہ درج کیا ہے۔ سخن شعراء میں نساخؔ نے رندؔ کا مختصر حال لکھا ہے۔

" رند تخلص لالہ کھیم نرائن کھتری دہلوی نبیرۂ راجہ لچھمن نرائن مہاراجہ

ٹکیٹ بہادر کے رفیق تھے۔ طب میں اچھا دخل رکھتے تھے۔ بیشتر فارسی سے کہتے تھے۔ کلکتہ آئے تھے آخر ایام میں ہوگلی میں سکونت کی تھی۔

رندؔ جب تک کلکتے میں رہے فورٹ ولیم کالج کے منشیوں سے ان کا ارتباط رہا۔ حیدر بخش حیدریؔ کاظم علی جوانؔ اور مظہر علی خاں ولاؔ ان کے عزیز دوستوں میں تھے۔ اور رندؔ کے یہاں ان کی نشستیں ہوتی تھیں بینی نرائن جہاںؔ کی پہلی ملاقات حیدریؔ سے لالہ کھیم نرائن رندؔ کے مکان پر ہوئی تھی اور رندؔ کے ساتھ دیرینہ تعلقات ہونے کے ناتے حیدریؔ نے جہاںؔ کو کالج میں ملازم رکھوایا تھا۔ جہاںؔ نے دیوان جہاںؔ کے دیباچے میں اس کا ذکر کیا ہے۔ رندؔ نے حیدریؔ کاظم علی جوانؔ اور ولاؔ کی اکثر تالیفات کی تعریف کی ہے لالہ کھیم نرائن کے تاریخی قطعے ان تالیفات میں ہیں۔

لالہ جی چونکہ کامیاب طبیب تھے اس لئے انھوں نے کالج کی منشی گیری کا پیشہ اختیار نہیں کیا لیکن انکی ادبی صلاحیتوں کا علم صاحبان کونسل کو تھا اور انکی فرمائش پر صلہ اور انعام کی امید میں انھوں نے فارسی میں "فتوحات حیدری" لکھی۔ وہ شاعر اور نثر نگار تھے، شاعر کی حیثیت سے انھوں نے اپنی کوئی یادگار نہیں چھوڑی۔ غالبًا انھوں نے اپنا دیوان مرتب نہیں کیا۔ ورنہ صاحب تذکرہ سخن شعرا اس کا ذکر یقینًا کرتے۔ پھر بھی وہ اگر اپنی مشق سخن پر زیادہ توجہ دیتے تو اچھے اور کامیاب شاعر ہوتے۔ انکے اندر اچھے شاعر بننے کی تمام صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ خوش قسمتی سے انکے بھائی بینی نرائن جہاںؔ نے اپنے تذکرے میں بھائی کا حال لکھا ہے اور انکی غزلیں بھی نقل کی ہیں۔ جہاںؔ لکھتے ہیں:۔

"رندؔ نام رائے کھیم نرائن بہادر راجہ لچھمی نرائن کے پوتے ہمیشہ عمدہ روزگار رہے۔ دلی کے رہنے والے اور اب ہوگلی میں تشریف رکھتے ہیں اور یہ خاکسار بھی چھوٹا بھائی انھیں کا ہے۔ یہ کلام ان کا ہے"[1]

دیوان جہاں میں لالہ کھیم نرائن رندؔ کی سات غزلیں اور ایک قطعہ درج ہے، انکی غزلوں میں بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ رندؔ زاہد شراب، عشق اور جفاکشی محبوب کا رونا روتے ہیں۔ وہی فرسودہ خیال ہے، وہی ذہنی عشق ہے لیکن شعریت اور تغزل کا فقدان نہیں ہے

کل ہم جو یار کی شمشیر تلے بیٹھ گئے
وہ بہت ٹال رہے ہم نہ ٹلے بیٹھ گئے

ہم اٹھے یار کے در پر سے دے سو سو بار
مجروح کی مانند چلے بیٹھ گئے

گلشن دہر میں دو روز عبث آن کے ہم
سرو کی طرح نہ پھولے نہ پھلے بیٹھ گئے

قیس و فرہاد سے اے رندؔ ملے ہم کل رات
روئے یہاں تک گلے مل مل کر گلے بیٹھ گئے

رشتۂ تسبیح اور زنار دونوں ایک ہیں
رندؔ اور زاہد کو بے رشتہ ناحق جنگ ہے

---

[1] دیکھئے دیوان جہاں قلمی نسخہ

فتوحات حیدری یہ لالہ کھیم نرائن کی فارسی تالیف ہے جس میں حیدر علی فرمانروائے میسور کی مہمات فتوحات اور فرمانروائی کی تاریخ دلچسپ انداز میں بیان ہوئی ہے۔ اس کا ترجمہ شیخ احمد علی گوپاموئی نے ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۵۰ء میں اردو میں کیا۔ اور تواریخ گزیدہ کے نام سے شائع کیا۔ شیخ احمد علی نے مولوی عبدالرحیم کے کارنامہ حیدری کی فارسی تاریخ کا بھی ترجمہ کیا تھا۔ اور بہت سی فارسی اور انگریزی تاریخوں کے اقتباس بھی لئے تھے۔

کارنامہ حیدری اور فتوحات حیدری کے تراجم کے مجموعہ کو حالات حیدری کے نام سے شائع کیا اور شہید سلطان کے صاحبزادے محمد سلطان عرف غلام محمد کو نذر کیا تھا۔

لالہ کھیم نرائن کی فتوحات حیدری کا اردو ترجمہ اس کتاب میں شامل ہے ۱۸۴۸ء میں لالہ کھیم نرائن غالباً بقید حیات تھے۔ اور ہوگلی میں رہتے تھے اور اردو تاریخ یعنی تواریخ گزیدہ مطبع علمی کلکتہ میں چھاپی گئی تھی اس لئے لالہ صاحب کی کتاب کے ترجمے میں ان سے صلاح و مشورہ یقیناً کیا ہوگا۔

فتوحات حیدری میں حیدر علی کی غنیموں پر فوج کشی اور جنگوں میں فتح کا حال دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے۔ فارسی فتوحات حیدری کا طرز بیان شگفتہ اور لطیف ہے لیکن اردو ترجمے میں وہ زور نہیں اور تعقید لفظی اور فرسودہ طرز بیان کی وجہ سے تاریخی دلچسپی کم ہو گئی ہے اور زور بھی گھٹ گیا ہے۔

کیم نرائن ترنمد نے ہیر رانجھا کا رومانی قصہ بھی نثر میں لکھا تھا[1] لیکن ان کی یہ کتاب میری نظر سے نہیں گذری۔ کلکتہ میں کم سے کم اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہے۔

---

[1] دیکھئے ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں۔ (مولفہ ڈاکٹر گیان چند، گوپی چند نارنگ)

حیدر علی حیدر

حیدر علی حیدر کے آبا و اجداد دلی کے رہنے والے تھے جنھوں نے مغل سلطنت کے آخری ایام میں ہجرت کر کے ہوگلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کے دادا مسند خاں مرحوم ولندیزیوں کے زمانہ میں لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر چچوڑا چلے آئے تھے۔ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا صدر مقام صوبہ بنگال میں چچوڑا (چنسورہ) تھا۔ ہوگلی اور چچوڑا متصل شہر ہیں۔ غالباً اسی بنا پر نساخ نے لکھا ہے کہ مسند خاں ہوگلی آ گئے تھے۔

حیدر علی حیدر کے والد کا نام منشی غلام نبی تھا۔ جو چچوڑا میں سرکاری ملازم تھے۔ اور حیدر بھی وہیں پیدا ہوئے۔ حیدر کے زمانے میں اردو شاعری کا عام چرچا تھا اور ان کے آبا و اجداد کو ادب اور شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ اس لیے حیدر نے بھی اپنے ماحول کا اثر قبول کیا۔ ان کا چچوڑا کے مشہور شاعروں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ اچھے اور پاکیزہ اشعار کہتے تھے۔ ان کے صاحبزادے منحوؔر اور بھتیجے نوؔر بھی مشہور شاعر ہوئے منحور کو نساخ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حیدر علی حیدر کے متعلق نساخ لکھتے ہیں۔

"حیدر تخلص، منشی حیدر علی مرحوم باشندہ ہوگلی (چچوڑا) خلف منشی

غلام نبی مرحوم بن مسند خاں مرحوم دہلوی جو ولندیزیوں کے عہد میں دہلی سے ہوگلی آئے تھے۔ وہیں سکونت اختیار کی تھی۔ بڑے ظریف تھے[1]۔

ناسخ نے حیدر کو دیکھا تھا لیکن سنہ ۱۲۸۱ ہجری کے قبل ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ ناسخ نے ان کا ذکر احترام سے کیا ہے اور انھیں ظریف ہنس مکھ اور خوش اخلاق بتایا ہے۔ حیدر کا دیوان بھی ناقدری کے سبب زمانہ برد ہو گیا۔ ناسخ نے ان کے جو چار شعر سخن شعرا میں دئے ہیں ان سے انکی شاعری کے متعلق کوئی رائے متعین نہیں کی جا سکتی ہے۔ پھر بھی ظریف اور شوخ طبع حیدر کی غزلوں میں انکی طبیعت کا رنگ صاف جھلکتا ہے ؎

کھڑا ہو کر مرے بالیں پہ وہ رخصت جو ہوتا ہے
نظر آتا ہے حیدر نزع میں جلوہ قیامت کا

حال دل گر کہوں تو کہتا ہے
شوق مجھ کو نہیں کہانی کا

سست پیری میں کیوں ہوا ہے حیدر
کیا ہوا وہ ولولہ جوانی کا

سنگ ہاتھوں میں لئے ہیں ساتھ طفلان حسین
میں وہ دیوانہ ہوں پریوں کا اکھاڑا ساتھ ہے

---

[1] سخن شعرا، ص۱۴۱

اسداللہ منخور

منخور بھی غفور خاں ناسخ کے شاگرد تھے اور ہوگلی ضلع کے صف اول کے ادیب اور شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ منخور کے والد حیدر فارسی اور عربی خوب جانتے تھے اور اچھے شاعر بھی تھے۔ منخور کی پرورش ادبی ماحول میں ہوئی اور شاعری انکو اپنے والد سے ترکے میں ملی تھی۔ منخور کا نام اسداللہ خاں تھا لیکن چچوڑا میں وہ میاں علی جان کے نام سے ہی مشہور تھے۔ ۱۲۵۵ھ میں چچوڑا میں پیدا ہوئے۔ کم سنی میں ہی کلکتہ چلے آئے تھے جہاں کی مشہور درس گاہ مدرسہ عالیہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ انکو نثر نگاری کا بھی شوق تھا اور نثر میں "دفع الہذیان" نامی ایک کتاب تصنیف کی تھی جو اصل میں ناسخ کے معترضین کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اس میں ناسخ کے معترض جناب عالی کے پوچ اعتراضات کا عمدہ اور مدلل جواب دیا گیا ہے "دفع الہذیان" کے علاوہ نثر میں انکی اور کوئی کتاب دستیاب نہ ہو سکی اور نہ ہی ان کا دیوان محفوظ رہ سکا۔ ۱۲۹۱ھ تک وہ زندہ رہے۔ منخور کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ قصائد اور قطعات بھی تھے۔ ان کے کلام میں نہ صرف پختگی تھی بلکہ بعض اشعار میں ناسخ اور اس عہد کے کامیاب غزل گویوں کا رنگ جھلکتا ہے۔ پھر بھی ان کی غزلیں گل و

بلبل اور ہجر و وصال کی سرحد سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ انکی عاشقانہ طبیعت بھی ان کے اشعار میں نمایاں ہے

اسداللہ منخور بھی بنگال کے ان بد نصیب شاعروں اور ادیبوں میں سے ہیں جن کو تذکرہ نگاروں نے قابل توجہ نہیں سمجھا۔ منخور کا حال انکے استاد ناسخ نے اپنے تذکرے میں اختصار سے لکھا ہے۔

" منخور تخلص منشی اسداللہ معروف بہ علی جان ولد منشی حیدر علی مرحوم حیدر تخلص باشندہ چنچوڑہ جائے تربیت دارالامارت کلکتہ فکر بلند و طبع ارجمند رکھتے ہیں۔ کلام اپنا راقم الحروف کو دکھلاتے ہیں صاحب دیوان ہیں۔"

ناسخ کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ سخن شعرا کی تالیف کے قبل منخور نے اپنا دیوان مرتب کر لیا تھا لیکن اسکی قدر نہیں ہوئی۔

منخور کی شاعری بھی اساتذہ کے کھینچے ہوئے خطوط سے باہر نہیں گئی ہے۔ انھوں نے اساتذہ کی ہر ممکن پیروی کی ہے انکی غزلوں میں محبوب کی شوخی اس کے بل کھاتے ہوئے گیسو، اسکی نشیلی آنکھیں اور قاتلانہ مسکراہٹ اور پھر محبوب کی جدائی میں اشکباری اور غم جاناں کا سوز و گداز ضرور ملتا ہے۔ ان کی شاعری بھی فکری شاعری نہیں کہی جاسکتی ہے ہر غزل میں محبوب کی جفاکشی، عشق کی ناکامی، بے اعتنائی او ستم گری کی تصویر اتاری گئی ہے ۵

---

۵ دیکھئے سخن شعرا ص۴۵۹

ہیں اپنی ہی زلف و رخ پر مائل خیال ان کو ہو کیا کسی کا
بس اندنوں سر چڑھا ہے شانہ نصیب جاگا ہے آرسی کا
میں بدگماں چرخ کینہ پرور و بے وفا تند خو ستم گر
نبھے گی منحورؔ ان سے کیونکر وصال میں بھی ہے ڈر اکسی کا

غیر ممکن ہے مداوا عشق کے آزار کا
منہ تکے حیرت سے عیسیٰ بھی ترے بیمار کا
لائے گا کہاں سے کوئی پتھر کا کلیجہ
صدمہ اوٹھے گا شب ہجران تپاں کا

ساقیا رعد کی آواز کہاں آتی ہے | میکشی کیلئے کرتی ہے تقاضہ بدلی
باندھو عبث نہ قتل پہ منحورؔ کے کمر | کیا ہاتھ آئے گا کہو عاشق کو مار کے
ذکر کرتا ہے اگر میری وفا کا کوئی | شرم سے سر کو جھکا لیتا ہے کوئی

چشم بیمار تری جب سے کہ آتی ہے نظر
بے خورد خواب ہیں اور مضطرب و زار ہیں ہم
اک نظر لطف کی لازم ہے ادھر بھی پیارے
اے عیسیٰ ترے بیمار کے بیمار ہیں ہم

منحورؔ کو بھی اپنے استاد کی طرح رامش و رنگ رقص و سرود اور عیش و عشرت کی زندگی پسند تھی۔ اور ذہنی عیش کوشی میں وہ اپنے عہد کے رنگین مزاج شاعروں سے کم نہیں ہیں۔ ان کے بعض اشعار میں جنسی تلذذ کا اظہار کھل کر ہوتا ہے۔ یہ اشعار ابتذال کی حدود میں داخل

ہوتے ہیں۔ نساخ نے ان کے ایسے اشعار بھی اپنے تذکرے میں نقل کر دئے ہیں اور یہ صفحہ ۵۹۴ پر مل سکتے ہیں۔

ذہنی عیش کوشی اور جنسی تلذذ کے اشعار ان کے دیوان میں موجود ہیں انھوں نے اپنے استاد اور داغ دہلوی کا اثر قبول کیا تھا۔ جذباتی عشق کے اظہار میں انکو کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی ہے۔

صمصام حیدر نورؔ

صمصام حیدر نورؔ منحورؔ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ ان کے والد منشی حسن علی نے ٹالی گنج میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ لہٰذا نورؔ کی زندگی کا بیشتر حصہ ٹالی گنج کلکتہ میں گذرا پھر بھی ہوگلی سے ان کا رشتہ ٹوٹا نہیں تھا۔ زندگی کے آخر ایام تک آمد و رفت کا سلسلہ قائم رہا۔

حیدر نورؔ بھی اپنے بھائی منحورؔ کے مشورے سے ناسخؔ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے تھے۔ ناسخؔ نے ان کا حال بھی اختصار سے لکھا ہے اور انکو اپنا شاگرد بتایا ہے۔ نورؔ بھی قاضی خاندان سے تعلق رکھتے تھے انکی زندگی بھی آرام اور آسودگی میں گذری۔ صمصام حیدر نورؔ حیدر علی حیدرؔ، امیدؔ اور منحورؔ سے فروتر شاعر تھے۔ طبیعت کو شعر گوئی سے مناسبت ضرور تھی لیکن انکے کلام میں پختگی بھی نہیں آئی تھی کہ عیش شباب میں ان کا انتقال کلکتہ[1] میں ہوا۔ موت نے ان کو اتنی فرصت نہیں دی کہ وہ اپنا دیوان مرتب کرتے۔ ان کا کلام دستیاب نہیں ہے۔ ناسخ نے ان کے تین چار شعر اور ایک دو قطعات دئیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نورؔ بھی انھی شاعروں کی طرح تھے جنھوں نے فن شاعری کو محض تفنن طبع کے لئے اختیار کیا تھا۔

---

[1] دیکھئے سخن شعراء ص ۵۶۵

ان کے اشعار میں بھی پری وش کا ذکر، رقیب کی شکست اور فرقت محبوب میں بے چینی اور اضطراب کا نقشہ ملتا ہے۔ ؎

جو اعدا دیکھتے ہیں اس پری وش کو میرے پہلو میں
تو کیا کیا رنگ حربا کی طرح ہر دم بدلتے ہیں
رواں ہیں اشک میگوں فرقت ساقی میں ہمدم
جگر اور دل لہو ہو کر ان آنکھوں سے نکلتے ہیں
نہ پہونچے ہاتھ اپنے وصل میں بھی پائے نازک تک
اسی حسرت میں مدت سے کف افسوس ملتے ہیں

قطعات

قاتل عاشق جو ہے تیغ نگاہ
آنکو ہے چشم فتاں پر گھمنڈ

کیوں نہ ہو زیبا ہے شمشیر زن
تیغ انکو تیغ بران پر گھمنڈ

قطعہ منتخبہ اور سخن شعرا کے علاوہ ہوگا [illegible] شاعر کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں ملتا ہے حتیٰ کہ آزاد [illegible] کے بعد لکھے ہوئے تذکروں میں بھی ہو گی کے اس شاعر کا کوئی ذکر نہیں
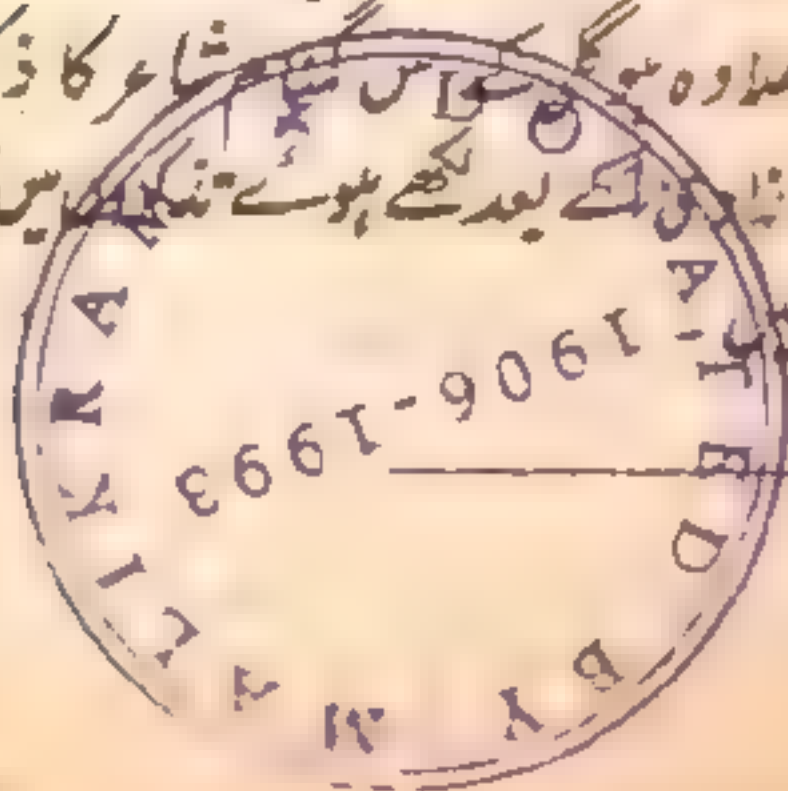
عبدالکریم آشنا

مولوی صاحب ندیا ضلع متصل ہوگلی کے مشہور قصبہ کرشنا نگر کے رہنے والے تھے۔ اس قصبہ میں مسلمانوں کی بڑی آبادی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے آخری ایام میں وہ کالج سے وابستہ ہوگئے تھے لیکن کالج میں مولوی صاحب کا تقرر صرف درس وتدریس کے لئے ہوا تھا۔ انھوں نے کالج کے لئے کوئی کتاب تالیف نہیں کی۔ نساخ نے انکی کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا۔ مولوی صاحب اچھے شاعر تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی زندگی میں کوئی دیوان مرتب نہیں کیا۔ ان کا انتقال ۱۲۸۲ھ میں ہوا تھا۔ ان کا حال سخن شعرا میں ملتا ہے:۔

نساخ لکھتے ہیں:۔

آشنا تخلص مولوی عبدالکریم خاں منشی فورٹ ولیم کالج باشندہ کشن نگر کلکتے میں رہتے تھے۔ شعر بہت کم کہتے تھے لیکن جو کہتے تھے نہایت پاکیزہ کہتے تھے۔ سات آٹھ برس ہوئے کہ انتقال کیا۔ راقم کے دوستوں میں تھے[1]

نساخ نے انکو ایک بہت کامیاب شاعر لکھا ہے۔ ان کے ساتھ

---

[1] دیکھیے سخن شعرا نساخ

اپنی دوستی کا بھی اعتراف کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی صاحب کو کلکتے کے ادبی حلقے میں ایک خاص مرتبہ حاصل تھا۔ اور ان کے احباب ان کی قدر کرتے تھے۔ ناسخ نے لیکن ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ نمونہ کے طور پر ان کے صرف تین شعر دئیے ہیں جن سے مولوی صاحب کی شاعرانہ صلاحیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ؎

جو قطرہ خوں کا مرے دل سے ٹپکا
تو گویا شعلہ تراک چراغ سے ٹپکا

چھاتی اٹھی دل خلق کا خورشید ہوا
شکر اللہ شجر حسن برومند ہوا

ضبط نالہ باعث چاک گریباں ہوگیا
کام یوں دست جنوں کا اپنے آساں ہوگیا

امید علی خاں امیدؔ

امید علی خاں کا تعلق نواب خاندان سے تھا اور انکی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں عیش وعشرت کی ایک حسین دنیا ہوتی ہے رقص وسرود اور راگ اور رنگ جس کا ایک دلچسپ مشغلہ ہوتا ہے ایسے جاگیردارانہ ماحول میں اردو شاعری کو پھلنے پھولنے کا موقع میسر ہوا تھا شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی اس ماحول کا ایک فطری عمل بن گیا تھا۔ ایسے ہی ماحول میں امیدؔ پلے بڑھے اور جوان ہوئے تھے اور فطری طور پر انھوں نے اپنے اس ماحول کا اثر قبول کیا۔ اور شعر وشاعری کو اپنا محبوب مشغلہ بنایا۔ امیدؔ نے بھی اپنی شاعری کی بنیاد روایتی شاعری پر رکھی غزل کی کہنہ روایت سے انھوں نے بھی بغاوت نہیں کی اور کرنا بھی نہیں چاہیے تھا کیونکہ انکی شاعری تفریحی تھی، جی کو خوش کرنے کے لئے تھی۔ ایسی شاعری زندگی کے مسائل یا مفکرانہ انداز اور فکر سے عموماً خالی ہوتی ہے۔ امیدؔ نے بھی اپنی شاعری کو روایتی غزل گوئی کے حصار میں مقید رکھا اور اپنی غزلوں میں گل وبلبل و ہجر ووصال کی خیالی تڑپ اور کسک کو سمونے کی کوشش کی ہے ۱۲۲۹ھ میں وہ مشہور شاعر ہو چکے تھے۔ ان کا زمانہ ناسخؔ سے قبل کا زمانہ

تھا۔ اس وقت بنگال میں مرزا جان طپش اور حافظ محمد اکرام ضیغم کا طوطی بولتا تھا۔ میر، سودا اور درد کا زمانہ انھوں نے دیکھا تھا۔ امید نے میر کے رنگ کو قبول کیا۔ انکی غزلوں میں ایک عاشق مزاج شاعر کھل کر اظہار عشق کرتا ہوا ملتا ہے۔ بینی نرائن جہاں نے امید کا حال اپنے تذکرے میں لکھا ہے۔

امید نام اور علی خاں جہاں کے بیٹے اب ہوگلی میں تشریف رکھتے ہیں یہ ان سے شعر ہے۔

نواب امید ۱۲۲۹ھ تک بقید حیات تھے انکے انتقال کی تاریخ کہیں نہیں ملتی۔ ناسخ نے ان کا حال دیوان جہاں سے ہی سے نقل کر دیا ہے۔ صرف ایک شعر دیا ہے۔ ناسخ نے بھی انکی تاریخ وفات نہیں لکھی مگر ۱۲۷۶ھ کے قبل انکا انتقال ہو چکا تھا اور ہوگلی میں ہی سپرد خاک ہوئے۔ وہ راسخ الاعتقاد شیعہ تھے اور اس کا اظہار انھوں نے اپنی غزلوں میں بھی کیا ہے۔

امید کی غزلوں میں وہی پٹے پٹائے خیالات ہیں مگر ان کے یہاں تغزل کی کمی نہیں۔ کلام میں سوز و گداز بھی ہے اور میر کے طرز پر بھی انھوں نے غزلیں کہنے کی کوشش کی ہے۔

دل اپنے سے گذر گئے ہیں ۔۔۔ با نالہ و چشم تر گئے ہم
کوچے میں ترے نہ گھر میں اپنے ۔۔۔ بتلا تو بھلا کدھر گئے ہم

امید پہ رکھ نظر کرم کی
غصے سے تو تیرے ڈر گئے ہم

لہ دیوان جہاں ایشیاٹک سوسائٹی

ہر قدم میں دل آمید بلا　　　کون سی چال ہے یہ کیا رفتار ہے

خوبرویوں کو بے وفا دیکھا　　　عشق بازی میں یہ مزا دیکھا

جز خدا دو جہاں میں یار د　　　سچ کہو کوئی آشنا دیکھا

سارے کرتے ہیں عشق کی تعریف　　　کیوں رے امید تو نے کیا دیکھا

معلوم نہیں شیخ کا ایمان کہاں ہے

زاہد کی تو تسبیح میں زنار نہاں ہے

جس کے فراق دل رنج و بلا کو پہونچا　　　یارب کرم سے اپنے اس دلربا کو پہونچا

سا یہ عرض دی تجھکو صبا قسم ہے　　　یہ خشک خاک لے میری کربلا کو پہونچا

امداد سے علی کی امیدوار ہے

جس کا کرم کہ ہر ایک شاہ و گدا کو پہونچا

دیوان جہاں میں آمید کی کئی غزلیں نقل کی گئی ہیں۔ امید نے یقیناً اپنا دیوان مرتب کیا ہوگا مگر ان کا دیوان بھی زمانہ برد ہو گیا۔ پھر بھی انکی چند غزلوں کے مطالعہ سے یہ رائے قائم یقیناً کی جا سکتی ہے کہ آمید اپنے دور کے کامیاب غزل گو تھے۔

قادر بخش مفتوںؔ

منشی قادر بخش کا اردو اور فارسی کے عالموں میں شمار ہوتا تھا۔ ہوگلی کے ادبی حلقوں میں بیحد مقبول تھے وہ حافظ محمد اکرام ضیغمؔ کے شاگرد تھے۔ ان کا انتقال سنہ ۱۲۴۰ھ میں ہوا۔ اور ہوگلی میں دفن ہوئے۔ معلمی ان کا پیشہ تھا منشی قادر بخش ایک اچھے اور کامیاب شاعر تھے لیکن انھوں نے بھی اپنا کوئی دیوان نہیں چھوڑا۔ وہ مزدور پیشہ تھے اور ان کو اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے رات دن سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ ایسی حالت میں ادب کی تخلیق کا موقع کم ہی میسر آتا ہوگا۔ انکے اشعار بے رنگ اور پھیکے ہیں۔ روایتی شاعری سے ہٹ کر مفتوںؔ نے بھی کبھی دماغ سوزی نہیں کی۔

ان کا دیوان ناپید ہے اور ناسخ نے سخن شعرا میں ان کا مختصر حال لکھا ہے۔

"مفتوںؔ تخلص، منشی قادر بخش باشندہ ہوگلی آخر ایام میں بصارت ان کی جاتی رہی تھی۔ چار سال کا عرصہ گذرا کہ انتقال کیا۔ بیشتر فارسی کہتے تھے۔ راقم کے ملاقاتیوں میں[1] تھے:

---

[1] دیکھئے سخن شعراء ناسخ

ناسخ کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ منشی قادر بخش نے طویل عمر پائی تھی، اور زندگی کے آخری دنوں میں انکی بصیرت جاتی رہی تھی۔ ناسخ نے انکا ایک شعر اور ایک قطعہ نقل کیا ہے دیوانِ جہاں میں بھی ان کا ذکر نہیں ملتا:[1]

جب تلک طالع کی تائید نہ ہو
ہو نہ شاہ ظلِ ہما سے پیدا

ق

یاد میں اس گل کے رویا صبح جو گلشن میں
بلبلان باغ میں ایک سخت ماتم ہوگیا
غنچہ نے پھاڑا گریباں گل کا دامن چاک تھا
چشم نرگس سے بھی جاری اشک شبنم ہوگیا

---

[1] دیکھیے سخن شعرا ناسخ

شیخ باقر فنا

یہ ہوگلی ضلع کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ انکے زمانے میں بنگال کی فضا میں شاعری کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ اردو شاعری شہروں، قصبوں سے نکل کر گاؤں گاؤں میں بھی مقبول ہو رہی تھی۔ فنا نے بھی موزوں طبیعت پائی تھی، شعر کہنے لگے لیکن انکی ایک خرابی یہ تھی کہ ہر سال اپنا استاد بدل دیتے تھے۔ فنا تاجر تھے اور خوشحال خاندان کے چشم و چراغ اس لئے وہ تفریح کے لئے اس میدان میں آگئے تھے۔ فنا نے طبیعت بھی تاجرانہ پائی تھی، پیشہ کا اثر انکی طبیعت اور انکی شاعری پر بھرپور رہا تھا۔ ورنہ حافظ اکرام ضیغم کو چھوڑ کر مولوی کریم آشنا، و پھر ان سے بڑھ کر مولوی وصل سے اصلاح لینے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ انھوں نے [illegible] پر قناعت نہیں کی بلکہ اور بھی کئی استاد بنائے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر شعر کہنے کی صلاحیت کم تھی اور انکے پاس جو کچھ شعری سرمایہ ہوگا وہ بھی انکے استادوں کے طفیل جمع ہوا ہوگا۔ فنا کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں ملتا۔ نساخ نے ان کا مختصر حال لکھدیا ہے۔

"فنا تخلص، شیخ باقر باشندہ ہوگلی حافظ ضیغم، مولوی عبدالکریم آشنا مولوی محمد مظہر وصل وغیرہ بہت سے شاعروں سے اصلاح لی تھی کہتے ہیں تجارت کرتے تھے۔ ریختی بھی کہتے ہیں۔" ان کا انتقال غالباً ۱۲۹۶ھ میں ہوا۔

مظہر وصل

محمد مظہر وصل عصمت اللہ آنسخ کے ہموطن ہیں۔ پنڈوا کے مشہور قاضی خاندان
سے انکا تعلق ہے۔ سنہ ۱۲۳۶ھ میں وہ کلکتہ میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم بھی
وہیں پائی۔ انکے والد قاضی غلام سبحان کا پنڈوا کے اکابرین میں شمار ہوتا تھا۔
وہ با اثر اور ذی اختیار لوگوں میں تھے۔ حکومت کی طرف سے انکو خان بہادر کا
خطاب ملا تھا۔ خان بہادر قاضی صاحب عدالت میں صدر دیوانی کے قاضی القضاۃ
تھے۔ اس لئے محمد مظہر وصل کی زندگی کا بیشتر حصہ کلکتے میں گذرا۔ فارسی اور اردو
زبانوں پر انکو قدرت تھی اس لئے فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شاعری کرتے تھے
اور اپنے وقت کے اچھے اور کامیاب شاعروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ناسخ
نے بھی ان کے کلام کی تعریف کی ہے۔ ناسخ نے ان کے کلام کا جو مختصر انتخاب
دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وصل دوسرے درجہ کے شاعر تھے اور اپنے
ہموطن مولوی آنسخ سے اس میدان میں بہت پیچھے ہیں۔ ناسخ لکھتے ہیں:۔

وصل تخلص، مولوی مظہر خلف قاضی غلام سبحان خاں بہادر سابق قاضی
القضاۃ عدالت صدر دیوانی کلکتہ شاگرد حافظ اکرام ضیغم۔ انکا وطن پنڈوا مولد و
مسکن کلکتہ۔ پہلے آوباش تخلص کرتے تھے ہر دو زبان میں شعر کہا کہتے ہیں انکا

دیکھئے سخن شعرا ناسخ صفحہ ۵۵

نام تاریخی ہے۔"

قاسم نے انکے اشعار نقل کئے ہیں۔ اور ناسخ کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وہ اوباش تخلص کرتے تھے لیکن اپنے استاد ضیغم کے مشورہ سے انھوں نے تخلص بدل کر وصل کیا۔ جو اوباش سے یقیناً بہتر ہے پھر بھی اس سے انکی طبیعت کی رنگینی اور حدت عشق نمایاں ہے ؎

مرض عشق بدن میں حرز جاں جانوں گا
ملک الموت بھی یہاں آ کے پشیماں ہوگا
غم نہیں گر نہ ہوئی دولت دنیا حاصل
مرتبہ شاہ و گدا خاک میں یکساں ہوگا

پارہ دل ہوا دل سیماب — دیکھا جس وقت بیقرار ہیں
سر سے پا تک کاکل جاناں — آجکل رات دن برابر ہے

وصل راسخ العقیدہ سنی تھے جیسا کہ ان کی غزلوں کے بعض اشعار میں اس کا اظہار کھل کر ہوا ہے۔ انھوں نے اپنا کوئی دیوان مرتب نہیں کیا۔ سنہ ۱۲۹۱ھ تک بقید حیات تھے۔

سخن شعرا ص ۵۵۴

وآلی

وآلی کا نام منشی محمدؐ تھا۔ وہ پنڈوا کے رہنے والے تھے۔ پنڈوا ہوگلی میں ہے۔ والی کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ سخن شعرا میں انکا یہ شعر درج ہے۔

کیا پوچھتے ہو یارو حالِ تباہ میرا
بے مہر ہو گیا ہے وہ رشکِ ماہ میرا

شعر اچھا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ان کے اندر شعر گوئی کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ پتہ نہیں نسّاخ نے ان کا صرف ایک ہی شعر کیوں نقل کیا۔

بیدل ہوگلوی

منشی حسن علی حسن کا ہوگلی کے معزز اشخاص میں شمار ہوتا تھا۔ انکو بنگلہ زبان کے علاوہ فارسی، عربی اور اردو زبان سے بھی شغف تھا۔ انکے بڑے صاحبزادے منشی عنایت اللہ متخلص بیدل نساخ کے ہمعصر تھے اور مولوی رشید النبی وحشت کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے۔ وہ کلکتے میں ملازم تھے اس بنا پر ٹالی گنج میں سکونت اختیار کرلی تھی، جہاں انکی اولاد آج بھی مقیم ہے۔ ان کا انتقال غالبًا ۱۹۴۲ء میں ہوا۔ نساخ کے دوستوں میں تھے۔ سخن شعرا میں نساخ نے ان کا حال بھی لکھا ہے اور ان کا صرف ایک ہی شعر بطور نمونہ نقل کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ پرگو اور مشہور شاعر نہیں ہوئے۔

"بیدل تخلص منشی عنایت اللہ ولد منشی حسن علی حسن باشندہ ہوگلی مقیم ٹالیگنج متعلق کلکتہ راقم کے ملاقاتی ہیں[1]۔

سر میں سودا زلف کا تیرے بت بے پیر ہے
طوق الفت ہے گلے میں پاؤں میں زنجیر ہے

بیدل کا کوئی دیوان یا کلیات سخت تگ و دو کے باوجود دستیاب نہ ہوسکا۔ انکے عزیز و اقارب کی عدم توجہی کے باعث زمانہ برد ہوگیا۔

---

[1] سخن شعرا ص

نواب جان قمر

مولوی نواب جان قمر ہوگلی کے خاص باشندے تھے۔ ہوگلی میں انکی زندگی درس وتدریس میں گذری۔ شعروادب سے بھی انکو لگاؤ تھا۔ قمر مولوی رشید النبی وحشت کے شاگرد تھے۔ انکا انتقال وحشت کے بعد ہوا۔ اور ہوگلی میں دفن ہوئے لیکن اب تو انکی قبر کا بھی نشان نہیں ملتا۔

قمر کی بدنصیبی تھی کہ ایک صاحب دیوان شاعر ہونے کے باوجود ان کو ادبی دنیا میں شہرت نصیب ہوئی اور نہ مقام۔ ان کے مختصر قلمی دیوان کا خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں تھا مگر سخت جستجو کے باوجود دستیاب نہیں ہے۔ فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ کتب خانہ کے تیسرے ذخیرے میں دیوان قمر کا قلمی نسخہ تھا۔ اس کا نشانی نمبر ۱۵۲ ہے۔ ناسخ نے بھی انھیں کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔

"قمر تخلص مولوی نواب جان ہوگلوی شاگرد مولوی رشید النبی وحشت مرحوم۔"

چہرہ یار نہیں زلف رسا سے پیدا
آج خورشید ہوا دام بلا سے پیدا

تاب نظارہ نہیں دیدہ خورشید کو بھی
پردہ روئے منور ہے ضیا سے پیدا

سیرام پور

کلکتہ اور مرشد آباد کے بعد مسلم تہذیب وتمدن کا بڑا مرکز ہوگلی تھا بنگال کے نواب اور طاقتور زمینداروں کا مسکن ہونے کی وجہ سے ہوگلی ضلع میں مسلمانوں کی بڑی تعداد بستی تھی۔ بنگالی مسلمانوں کے علاوہ شمالی ہندوستان سے ہجرت کر کے بہت سے عالم اور مشاہیر ہوگلی آئے تھے اور انھوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ طوطیٔ بنگال حضرت رضا علی وحشت کے آبا و اجداد بھی دلی سے ہوگلی منتقل ہوئے۔ اور پھر کلکتہ کو اپنا گھر بنایا۔ ہوگلی کی مٹی ادبا، اور شعرا کے لئے بڑی زرخیز ثابت ہوئی۔ رشید النبی وحشت قاضی محمد اختر، عصمت اللہ آتش اور بنگال کے بہت سے نامور شاعروں نے اس ضلع میں آفتاب کی روشنی دیکھی اور ان کی شاعری اور ادبی کارنامے کی دھوم سارے ملک میں مچ گئی۔

ہوگلی ضلع کے سیرام پور، چنچوڑا، ہوگلی اور پنڈوا میں مسلم ثقافت کی علامتوں اور نشانیوں کے دھندلے نقوش اب بھی نظر آتے ہیں۔ کھنڈرات بتاتے ہیں کہ ان علاقوں میں ایسی تہذیبی زندگی جلوہ گر رہی تھی، جس میں سلطنت مغلیہ کے عروج و زوال کی مکمل داستان پڑھی جا سکتی ہے۔

ہوگلی ضلع میں سیرام پور سب سے پہلے بسا اور چونکہ یہ ڈین قوم کے زیر نگین تھا اسے بڑا فروغ ہوا اور عیسائی پادریوں کو تبلیغی کام کو فروغ دینے کی زیادہ سہولتیں اس فریڈرک نگر یا سیرام پور میں ملیں۔ سیرام پور مشنری کے روح رواں فادر ولیم کیری، ان کے ساتھی جوشوا مارشمین اور ولیم وارڈ نے عیسائی مذہب کو بنگالہ کے پس ماندہ طبقہ میں مروج اور مقبول کرنے کے لئے یہاں کی مقامی بولیوں خصوصاً بنگلہ اور ہندوستانی کے نشو و نما اور ارتقا کے لئے نمایاں کام کیا۔ جوشوا مارشمین نے اپنی مشہور کتاب ہسٹری آف سیرام پور مشنری میں لکھا ہے کہ اپریل ۱۸۱۸ء میں ہندوستانی زبان میں پہلا جریدہ 'دگ درشن' شائع ہوا۔ اور تبلیغی کام میں آسانی اور سہولت کے لئے دوسرا مشہور اخبار سماچار درپن جاری کیا گیا۔ مارشمین لکھتے ہیں کہ

"سیرام پور مشنری کچھ دنوں کے لئے عوام میں معلومات اور تحقیق کے جذبے کو فروغ دینے کے لئے بنگلہ زبان میں اخبار نکالنے کی فکر میں ہے حکومت ہند اخبارات اور رسالوں کو حاسدانہ نگاہ سے دیکھتی ہے۔ پریس پر سخت پابندی اور سنسر شپ ہے اس وجہ سے ابتک کوئی اخبار نکل نہیں سکی تھی سماچار درپن کے قبل اشاعت تبلیغ کی غرض کے تحت بنگلہ زبان میں ایک جریدہ (دگ درشن) نکالا تھا[1]"

وارن ہسٹنگز کے عہد میں پریس پر سخت پابندیاں کچھ نرم کی گئیں۔ بقول مارشمین پابندیاں جب نرم ہوئیں تو انھیں اور ولیم کیری کو بنگلہ زبان میں ایک

---

[1] بنگلہ ادب انیسویں صدی میں ایس کے ڈے ص ۲۸۹

ہفتہ وار اخبار سماچار درپن نکالنے کی جرأت ہوئی۔ مارشمین نے لکھا ہے کہ

"۲۱ مئی ۱۸۱۸ء میں ہندوستان میں کسی دیسی زبان میں پہلا اخبار سیرام پور پریس سے شائع ہوا اس کا نام سماچار درپن (مرآۃ الاخبار) تھا[1]"

سماچار درپن کے مدیروں کو شروع میں بڑے ذہنی کرب میں گذرنا پڑا تھا اور اس کی پہلی دو تین اشاعتوں پر سخت نکتہ چینیاں اور تنقیدیں کی گئی تھیں مگر رفتہ رفتہ حکومت نے گرفت ڈھیلی کی اور عوام میں اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہونے لگی اور بنگال کے اندرونی علاقوں میں عیسائی مذہب بھی پھیلنے لگا۔ اس کا زور توڑنے کے لئے برج موہن نے اپنا مشہور اخبار "چندریکا" نومبر ۱۸۲۱ء میں جاری کیا۔ ان دو اخبارات کی مقبولیت نے کلکتہ والوں کے ذہن میں انقلاب پیدا کیا اور ۱۸۲۲ء میں اردو کا پہلا اخبار 'جام جہاں نما' شائع ہوا۔ جام جہاں نما کی مقبولیت کی کاٹ کے لئے مشنری نے اردو میں رسالہ نکالا لیکن اب اس کا وجود بھی نہیں۔ مارشمین کی ہسٹری آف سیرام پورمشن سے پتا چلتا ہے کہ ولیم کیری نے بنگلہ کے علاوہ عربی اور فارسی کے آہنی حروف ایجاد کئے اور مشنری کے چھاپے خانے کی چھاپی ہوئی اردو اور فارسی کی کئی کتابیں بھی موجود ہیں جو ہندوستانی پریس سے بھی شائع ہو چکی ہیں۔ سیرام پور، ہوگلی، سات گاؤں اور چنچوڑا میں اردو کی ترویج و اشاعت انھی غیر ملکی پادریوں کی مرہون منت ہے۔ ولیم کیری بنگلہ کے عالم تھے اور بنگلہ کی پہلی گرامر انھوں نے لکھی۔ نہ تو کیری اور نہ ہی

---

[1] دیکھئے ہسٹری آف سیرام پورمشن مارشمین ص ۶۳

ان کے دست راست جوشوا مارشمین نے ہندوستانی زبان میں کوئی کتاب تالیف کی۔ پھر بھی ان پادریوں نے مذہبی تبلیغ کے لیے سیرام پور اور ہوگلی میں اردو کو پھیلانے میں بالواسطہ مدد دی ہے۔ اور ان کی ابتدائی کوششوں کی وجہ سے ضلع ہوگلی بھی اُنیسویں صدی میں اردو کا ایک اہم مرکز بن پایا۔

سیرام پور مشنری کے عہد میں صرف ایک اردو کتاب کی تالیف اور ترجمہ کا حال ملتا ہے۔ جوشوا مارشمین کی مساعی اور ولیم کیری کی سرپرستی میں انجیل مقدس کا ترجمہ ہندوستان کی چالیس زبانوں میں ہوا۔ مرزا فطرت نے جو عیسائی ہو گئے تھے اردو کا ترجمہ مکمل کیا۔ ان کا ترجمہ سیرام مشنری کالج کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔
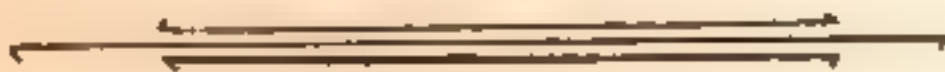
کلکتہ اور مٹیا برج

فورٹ ولیم کالج اور کالج کی سرپرستی یا صلے کی امید میں جتنی مفید اور اہم کتابیں مرتب ہوئیں ان کا ذکر ہو چکا ہے۔ کالج کے بعد اور اس کے حلقۂ اثر سے کلکتے اور مٹیا برج میں جاندار نثری اور شعری ادب کی تخلیق ہوئی اور کئی کامیاب اور منفرد ادیب و شاعر ہوئے جن میں سے اکثریت ہندوستان کی ادبی دنیا سے روشناس نہ ہو سکی اور ان کی زندگی گمنامی کا نقاب اوڑھے ہے اس باب میں ایسے ہی شاعروں اور ادیبوں کا حال احاطۂ تحریر میں لایا جا رہا ہے انیسویں صدی کے ادبا و شعرا میں سب سے زیادہ شہرت غفور خاں نسّاخ، اشمتی قاضی عبدالحمید، علامہ عصمت اللہ التسنیخ کو ہوئی۔ مٹیا برج بھی واجد علی شاہ اختر کی مستقل قیام گاہ بننے کے بعد اردو کا بڑا مرکز بن گیا تھا۔ اور وہاں کی مٹی نے عبدالحلیم شرر لکھنوی جیسے عظیم ادیب اور ناول نگار کو جنم دیا۔ شرر لکھنوی کی ادبی زندگی مٹیا برج میں ہی شروع ہوئی اور اس کی تکمیل لکھنؤ میں ہوئی۔ لہذا شرر مٹیا برج کے بجائے لکھنوی کے نام سے مشہور ہوئے۔

نجف رامپوری نے کلکتہ اور مٹیا برج کے شاعروں کا حال اختصار سے اپنے فارسی تذکرہ "غنچۂ ارم" مطبوعہ ۱۲۹۹ھ میں ترتیب دیا ہے۔ غنچۂ ارم مفید تذکرہ ہے۔ نجف رامپوری خود بھی شاعر تھے۔ ان کے تذکرے میں انھیں شاعروں

کا حال ملتا ہے جن کو کلکتے کی ادبی دنیا میں شہرت اور مقبولیت حاصل تھی ان شاعروں اور ادیبوں کے قافلہ کے سالار نواب عبدالغفور خاں نساخ تھے اور ان کے فیض صحبت سے اس زمانے کے شاعروں اور ادیبوں کے ذہن کو جلا ملی۔

عبدالغفور خاں نسّاخ

نسّاخ بلاشبہ بنگال کے سب سے بڑے اور منفرد ادیب اور شاعر ہیں یہ ان کی ذات ہی تھی جو شمالی ہندوستان میں اس خیال کو جھٹلا سکی ہے کہ بنگالیوں کو اردو سے کوئی شغف نہیں اور ان کی زبان بھی غلطیوں سے مملو ہوتی ہے۔ یہ ہی نسّاخ ہیں جنھوں نے آتش اور ناسخ کے کلام پر نسخ کا قلم پھیرا اور کلکتہ اردو کا مرکز بن سکا۔

نسّاخ کا نام عبدالغفور تھا۔ تخلص پہلے مہجور کرتے تھے بعد میں نسّاخ کیا ،ور انھیں اسی نام سے ہندوستان گیر شہرت نصیب ہوئی۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت خالد بن ولید سے جا ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی خود نوشت حیات میں اس پر فخر بھی کیا ہے اور اسی تعلق کی بنا پر وہ اپنے نام کے ساتھ خالدی بھی لکھا کرتے تھے۔

مشرقی بنگال کے ضلع فرید پور میں راجہ پور نامی بستی نسّاخ کا آبائی وطن ہے۔ مگر ان کے والد قاضی محمد فقیر کلکتے میں ہی زیادہ رہتے تھے۔ چنانچہ ۱۲۴۹ھ میں کلکتے میں نسّاخ نے آنکھ کھولی۔ نسّاخ کے چار بھائی تھے ان میں صرف نواب عبداللطیف مشہور ہوئے۔ انکی باغ وبہار شخصیت نے اردو

---

۵ نقوشِ سلیمانی۔ سلیمان ندوی

کے سب سے بڑے شاعر غالب کو بھی متاثر کیا تھا۔

یہ نساخ کی بدنصیبی تھی کہ ادیب اور عالم باپ کی محبت انھیں نہیں ملی اور وہ دس برس کے ہی تھے تو موت کی آندھی نے قاضی فقیر محمد کے چراغ زندگی کو بجھا دیا۔ اور نساخ کا گھر گھپ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ ماں بھی والد کے قبل ہی چل بسی تھیں۔ نساخ بے یار و مددگار رہ گئے تھے۔ ان کے بھائی نواب لطیف حضرت یوسف کے بھائیوں جیسے ہوتے تو اردو ادب کو ایک باکمال شاعر اور منفرد ادیب نہ ملتا۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد نواب عبداللطیف نے نساخ کو باپ کی محبت دی اور ان کی تعلیم و تربیت کی تمام ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔

نساخ کی خود نوشت زندگی کا خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس خود نوشت حیات میں نساخ نے اپنی ابتدائی زندگی کے دلچسپ واقعات و سانحات تحریر کئے ہیں۔ نساخ ذہین اور شریر طالب علم تھے۔ اور انکی شرارت سے ان کے استاد مولوی رضوان علی بھی نہ بچ سکے۔

نساخ نے مدرسہ عالیہ سے میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور ہوگلی کالج میں داخل ہوئے۔ کالج میں شاعر استادوں اور انکی صحبت میں نساخ کے دل میں شاعری کا شوق جرایا۔ نساخ بنگالی تھے اور ان کی مادری زبان بنگلہ تھی۔ چونکہ انیسویں صدی میں بنگال میں اردو مقبول ترین زبان تھی لہٰذا نساخ نے بنگلہ کے بجائے اردو کو ہی اپنی ادبی زبان بنایا اور اپنی بساط بھر تاحیات اسکی خدمت کرتے رہے۔

نساخ نے تعلیمی زندگی ختم کرکے کچھ دن بیکاری میں گذارے، پھر انھیں

مختلف ملازمتیں ملیں اور آخر میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ اس ملازمت کے ناتے انھیں بنگال اور بہار کے مختلف اضلاع میں رہنا پڑا۔ اور انکے صاحبزادے حضرت شمس بانکے بھاگلپور میں پیدا ہوئے۔

دورانِ ملازمت میں ناسخ نے دلی، لکھنؤ، عظیم آباد اور دوسرے شہروں کی بھی سیر کی جو ان کی ادبی صلاحیت کو بڑھانے کے لئے مفید ثابت ہوئی۔ دلی میں غالب سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ان کی رنگا رنگ شخصیت اور ذہانت نے غالب پر عمدہ اور گہرا اثر مرتب کیا۔

ناسخ کی ازدواجی زندگی بھی کامیاب تھی۔ تیس سال کی عمر میں انھوں نے مرزا ہمایوں بخت کی صاحبزادی سے شادی کی۔ ان سے دو اولاد ہوئی۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا ابوالقاسم محمد، یہی ابوالقاسم محمد شمس کے نام سے مشہور شاعر ہوئے اور طوطیٔ بنگال علامہ رضا علی وحشت ان کے مشہور تلمیذ ہیں۔

کامیاب زندگی گذارنے کے بعد ۴ جون ۱۸۸۹ء لغایت ۱۳۰۶ھ کلکتے میں ہی ناسخ کا انتقال ہوا۔ ان کی قبر ان کے موروثی قبرستان تال بگان میں خستہ حالت میں موجود ہے۔ ان کی بغل میں ان کے بڑے بھائی نواب عبداللطیف خاں کی قبر ہے۔ ناسخ کی قبر کی تختی پر ہی ان کی تاریخ وفات درج ہے۔

ناسخ کی باغ وبہار شخصیت انکی شاعری میں بھی جھلکتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اپنی مصروف زندگی میں انھوں نے اتنی کتابیں کس طرح لکھیں

ناسخ نے کم و بیش دس کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ ان میں کلیات ریختہ دفتر بے مثال، مرغوب دل، چشمہ فیض، ترجمہ پند نامہ عطار، دیوان دوم، اشعار ناسخ، قند پارس، زبان ریختہ، قطعہ منتخبہ، سخن شعرا اور گنج تواریخ کئی بار چھپیں اور مقبول ہوئیں۔

سخن شعرا

ناسخ کی نہایت مفید اور مقبول ترین تصنیف سخن شعرا یعنی تذکرہ شعرائے اردو ہے جو ۱۲۹۱ھ میں شائع ہوکر مقبول انام ہوئی۔ ناسخ کے اس تذکرے میں ۲۴۴۶ شعرا اور چالیس شاعرات کا ذکر ہے اور بنگال کے بہت سے ایسے شاعروں اور شاعرات سے ادبی دنیا روشناس ہوئی ہے جو اس کے قبل گمنام تھے۔

بلاشبہ ناسخ کا یہ تذکرہ تشنہ ہے۔ ناسخ نے شاعروں کا مختصر حال اور چند اشعار نمونتاً درج کئے ہیں۔ سخن شعرا الفبائی ترتیب سے لکھا گیا ہے۔ بنگال کے ایک غیر معروف شاعر آباد کے ذکر سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ ناسخ لکھتے ہیں۔
"آباد تخلص، نام محمد یعقوب علی خاں خلف محمد اسحاق، باشندہ ہوگلی کے، ان کا یہ شعر ہے ؎

ان خراباتیوں کی صحبت نے ؎ تجھکو آباد کیا خراب کیا

سخن شعرا میں ہندوستان بھر کے مشہور شاعروں کا ذکر ہے۔ اور یہ ختم بھی ایک گمنام شاعر یوسف کے تذکرے پر ہوتا ہے۔
"یوسف تخلص، میر یوسف علی شاہ، خلف حاجی احمد علی شاہ فرخ آبادی شاگرد

احمد حسین صفیر نمونتاً ایک شعر نقل کیا ہے ؎

شراب پینے نے کر دیا یہاں تلک الیس بت کو بے تکلف
نقاب اٹھا کر یہ کہہ رہا ہے حجاب ہم لیکے کیا کریں گے[1]

قطعہ منتخبہ سخن شعرا کے قبل ناسخ نے ۱۲۷۶ھ میں قطعہ منتخبہ ترتیب دیا تھا۔ یہ بھی شاعروں کے مختصر حال پر مشتمل ہے۔ نول کشور پریس لکھنؤ نے ۱۲۹۱ھ میں اسے شائع کیا ہے۔ یہ تذکرہ بھی حروف تہجی کی ترتیب سے لکھا گیا ہے اور ۱۰۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور واقف شاہ واقف غازی پوری کے تذکرے پر ختم ہوتا ہے

زبان ریختہ اردو زبان کی ابتدا اور اس کے نشو و نما پر ایک مختصر رسالہ ہے ناسخ کا یہ ہلکا پھلکا تحقیقی کام ہے۔ یہ رسالہ ۱۲۷۵ھ میں شائع ہوا۔ اس سے اردو زبان کے تدریجی ارتقا کی ہلکی سی تصویر ابھرتی ہے۔ اور لفظ ریختہ کی وضاحت اور تعریف بھی کی گئی ہے۔ تمباکو، گودام، لیچی، چینی اور پرتگیزی زبان کے الفاظ ہیں، جو انگریزی کے بہت سے الفاظ کی طرح اردو میں داخل ہو گئے۔ اسی بنا پر اردو ابتدا میں ریختہ کے نام سے مشہور ہوئی۔

دفتر بے مثال ناسخ کا پہلا دیوان ہے۔ جو ۱۲۷۶ھ میں شائع ہوا چونکہ ناسخ اور لکھنوی شعرا کے درمیان ہمیشہ نوک جھونک ہوتی رہی اور کئی ادبی معرکے بھی ہوئے۔ اس لئے ناسخ لکھنوی کے دیوان دفتر پریشاں کے جواب میں ناسخ نے دفتر بے مثال ترتیب دیا ہے۔ دفتر بے مثال کی غزلوں میں لکھنوی رنگ و آہنگ ہے۔ ان کی غزلیں اتنی کامیاب ہیں کہ غالب جیسا

---

[1] دیکھئے سخن شعرا ص ۵۵

شاعر بھی اس کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اور اپنے مکتوب میں اس کی بڑی تعریف کی، جس میں حقیقت کم اور تصنع زیادہ ہے۔

"شیخ امام بخش ناسخ طرز تجدید کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے آپ ان سے بڑھ کر بہ صیغہ مبالغہ بے مبالغہ نساخ ہیں۔ تم دانائے رموز اردو زبان ہو، سرمایہ نازش قلمرو ہندوستان ہو۔"

غالب کی دفتر بے مثال سے متعلق اسی تعریف کی وجہ سے نساخ کو یہ شعر کہنے کا حوصلہ ہوا ہے ؎

مر گئے غالبؔ آزردہ رہا ہے اک تو ۔۔۔ ذات نساخ بہت اب ہے غنیمت تیری

اشعار نساخ

یہ نساخ کا دوسرا شعری کارنامہ ہے۔ نساخ کا یہ دیوان ۱۲۸۳ھ میں منظر عام پر آیا۔ اس پر لکھنؤ کا گہرا اثر نمایاں ہے۔ چند رباعیاں بھی اس دیوان میں شامل کر دی گئی ہیں۔ اس دیوان میں نساخ کی کوئی چونکا دینے والی غزل نہیں ملتی۔ اساتذہ کے رنگ میں پرانی زمین میں بھی بعض اچھے اور کامیاب اشعار مل جاتے ہیں۔

ارمغان

دلی میں قیام اور غالب سے ملاقات نے نساخ کے ذہن کو موڑ دیا۔ اور لکھنوی طرز شاعری انھیں مصنوعی معلوم ہوئی۔ نساخ نے غالب کے اثر سے دلی کے شاعروں کا رنگ قبول کیا۔ اور دلی کے شاعروں میں جو خارجیت اور عمومیت ہے۔ ان کے ان دو دیوان میں نمایاں ہونے لگی۔ نساخ کا تیسرا دیوان ارمغان ۱۲۹۲ھ میں چھپا یہ دیوان ان کی مشہور غزل جس کا مطلع ہے ؎

نہ دیا دل اسے جو ظلم پہ مائل نہ ہوا
اس کو چاہا نہ کبھی مجھ سے جو غافل نہ ہوا

سے شروع ہوتا ہے اور سو یا سوا سو غزلوں پر مشتمل ہے۔ ناسخ کا چوتھا دیوان ارمغانی ہے۔ سنہ ۱۳۰۲ھ میں اس کی اشاعت ہوئی۔ اس میں اکثر غزلیں ایسی ہیں جن میں میر تقی میر، مومن اور غالب کا رنگ جھلکتا ہے۔ ان کا یہ دیوان شروع ہوتا ہے ؂

جلوۂ طور نے مارا
دلِ خاکی کو نور نے مارا

چشمۂ فیض چشمۂ فیض فارسی کے مشہور شاعر مولانا فرید الدین عطار کے پندنامہ کا ترجمہ ہے۔ اس مثنوی کا ذکر میر معین الدین فیض کے ضمن میں مفصل کیا جا چکا ہے۔ ناسخ کی یہ مثنوی اصل میں فیض کی مثنوی چشمۂ فیض کی کاربن کاپی ہے۔ اور یہ اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔ ؂

حمد بے حد کے ہے قابل وہ خدا — جس نے مشتِ خاک کو ایمان دیا

ناسخ کی چشمۂ فیض ۸۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ناسخ نے تتمہ پر تاریخی قطعہ خود لکھا ہے ؂

پندنامہ شیخ عطار کا — ترجمہ ناسخ جو میں نے کیا
دھیان آیا یک بیک تاریخ کا — خوب زیبا ترجمہ دل نے کیا

قندِ پارسی دراصل یہ انتخاب ہے ان فارسی زبان کے شاعروں کے کلام کا جو زیادہ مشہور نہیں ہوئے۔ مولوی احمد علی دہلوی

کے فارسی شعر سے قند فارسی کی ابتدا ہوتی ہے ؎

ساقی بیار جامِ مے این لطف در جنت کجا
آنجا بہار دیگر و این جا بہار دیگر است

قند پارسی کے انتخاب سے پتا چلتا ہے کہ نسّاخ صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ سخن فہم بھی تھے۔ اور یہ کہ اردو کے مشہور شعرا سراج الدین علی خاں آرزو، آزردہ، آزاد بلگرامی، میر تقی میر، انشا، منشی تفتہ، حالی، جہانگیر بادشاہ، اشکی کشمیری، اشرف الہ آبادی کی طرح فارسی کے بھی قادر الکلام شاعر تھے

شاہدِ عشرت نسّاخ کی یہ مثنوی اپنے زمانے میں بے حد مقبول ہوئی ۱۸۶۴ء میں ترتیب پائی، اور اس سنہ میں یہ شائع ہوئی۔ اس مثنوی میں نسّاخ نے اپنے فن شاعری کا دلکش مظاہرہ کیا ہے۔ اور محبوبہ کے سراپا کی جیتی جاگتی اور دل آویز تصویر کھینچی ہے۔ نسّاخ کی شاہدِ عشرت ذیل کی نظم سے شروع ہوتی ہے جس کا مطلع ہے ؎

اے ساقیٔ بے قہر کہاں ہے — اے ساقیٔ فتنہ گر کہاں ہے

شروع میں قامت کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ پھر زلف، چوٹی، آنکھ اور موباف کی تصویریں ملتی ہیں ؎

ہے منتخب اس کی زلف پر فن — یہ مانگ کی یہ الف روشن
یوں پیٹھ پر چوٹی ہے لٹکتی — ناگن بھی ہے جس پہ سر پٹکتی
چوٹی میں نہیں زری کا موباف — لپٹی ہے سحر یہ شام سے صاف

آنکھ کی تعریف یوں بیان کی ہے ؎

بے مثل و مثال ہیں وہ آنکھیں — آیات و قتال ہیں وہ آنکھیں

شاہد عشرت ۳ صفحات پر مشتمل ہے اور محبوب کی جفا اور ستم رانی کے شکوہ پر ختم ہوتی ہے ؎

دلکش ہے حسن اس صنم کا — ناسخ بھی جان سے ہے شیدا

ان مشہور کتابوں کے علاوہ ناسخ کی گنج تواریخ مطبوعہ ۱۲۹۰ھ ہے۔ جو تاریخی قطعات پر مشتمل ہے۔ اس میں مشاہیر اسلام کی تاریخ وفات کہی گئی ہے یہ فارسی میں ہے۔ اس کی کوئی خاص ادبی افادیت واہمیت نہیں۔

خودنوشت حیات ناسخ نے خودنوشت حیات بھی لکھی ہے۔ بدقسمتی سے ان کی یہ سوانح عمری شائع نہ ہوسکی۔ البتہ ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں اس کا خطی نسخہ موجود ہے۔ اس سے ناسخ کی زندگی کے دلچسپ واقعات اور سانحات کی واضح تصویر سامنے آتی ہے اور ان کی انانیت اور خودنمائی بھی جھلکتی ہے۔ بعض ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جو ذہنی اپج سے معلوم ہوتے ہیں۔ ناسخ نے اپنی سوانح حیات کو دلچسپ اور مزیدار بنانے کے لئے داستانیں گھڑلی ہیں۔"

انتخاب نقص ناسخ کی لکھنوی شاعروں سے ہمیشہ چشمک رہی۔ ناسخ شکن کہلانے کے لئے انھوں نے ناسخ تخلص کیا اور مرزا انیس اور دبیر کو بھی ان کی تنقیدی نگاہوں نے نہیں بخشا۔ ۱۲۹۴ھ میں انتخاب نقص کے نام سے مختصر سا رسالہ شائع ہوا جس کے سبب سے لکھنؤ کی ادبی دنیا میں بھونچال آگئی۔ ناسخ نے انیس و دبیر کی خوبیوں کو یک لخت نظرانداز کر دیا اور

ان کے کلام کے فنی اور معنوی عیوب و نقائص چن چن کر گنا دئے ہیں اور انکی یہ تنقید بعض اوقات تنقیص کی حد میں داخل ہوجاتی ہے اور ان کی انتقادی صلاحیت پر داغ بن گئی ہے۔

انتخاب نقص کی اشاعت سے لکھنوی شعرا بہت جز بز ہوئے اور اس کی کوکھ سے اس ادبی معرکہ و مجادلے کا جنم ہوا جس نے دو گروہوں میں شعرا اور ادبا کو بانٹ دیا۔ اور دلچسپ تنقیدی بحثیں ہوئیں جو اردو شاعروں کے لئے اور خصوصاً تنقید کے لئے مفید ثابت ہوئیں۔

ناسخ پر گو شاعر تھے۔ ان کے چار دواوین شائع ہوئے لیکن ان چار دواوین میں بھرتی کے اشعار کثرت سے ہیں۔ اچھے اشعار شاذ شاذ ہی ملتے ہیں۔ ناسخ اچھے نقاد، محقق اور عالم ضرور تھے اور فنی نکات اور باریکیوں پر ان کی گہری نظر بھی تھی لیکن بحیثیت شاعر وہ کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہے۔ استاد فن ہونے کے باوجود انھیں دوسرے درجہ کے شاعروں کی صف میں ہی جگہ مل سکتی ہے۔ غالب مومن اور میر کی ہمسری کا جو انھوں نے دعویٰ کیا ہے وہ بصیغہ مبالغہ ہی درست ہوسکتا ہے پھر بھی ناسخ کی زنگارنگ شخصیت اور ان کی ذات بنگال کے لئے مغتنم تھی کیونکہ ناسخ نہ ہوتے تو بنگال میں اردو شاعری اور نثر کو اتنی مقبولیت حاصل نہ ہوتی جو ہوئی اور شمس، الشیخ جیسے شاعر بھی اردو ادب کو نہ ملتے۔

ابوالقاسم محمد شمس

۱۲۴۴ھ میں غفور خاں نساخ کے یہاں ایک بچے کی پیدائش ہوئی جس کا تاریخی نام منظہرالحق تجویز ہوا مگر لوگوں نے اس ہونہار بچے کو منظہرالحق کے نام سے نہیں پہچانا۔ بلکہ ادبی دنیا میں شمس کلکتوی کے نام سے شہرت پائی۔

شمس کا نام ابوالقاسم محمد تھا تخلص شمس۔ ان کی پیدائش بھاگلپور کے بلکے میں ہوئی جہاں ان کے مشہور باپ نساخ ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ شمس نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ بلکہ ان کے گھر کے ادبی ماحول میں خود بخود ان کی ذہنی تربیت ہوئی۔ شمس گو فرید پور کے تھے اور پیدائش بھاگل پور میں ہوئی۔ لیکن تمام عمر کلکتے میں گذاری۔ کلکتہ سے اسی دیرینہ تعلق کی وجہ سے وہ کلکتوی مشہور ہوئے۔

شمس بے حد ذہین انسان تھے۔ اسکول اور کالجوں میں باضابطہ تعلیم حاصل نہ کرنے کے باوجود انھیں اردو اور فارسی زبانوں میں دستگاہ حاصل تھی اور انگریزوں کی صحبت کے باعث انگریزی کی بھی اچھی صلاحیت تھی۔

نساخ ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔ لیکن جدید رنگ کو انھوں نے کبھی نہیں اپنایا شمس ان کے بالکل مختلف تھے۔ انھوں نے مغربی تہذیب کی اچھائیاں اپنائی تھیں، جدید طرز کی زندگی گذاری۔ مزاج رندانہ ہونے کے باوجود شمس نے

مشرقی تہذیب کو بالائے طاق نہیں رکھا۔ مذہبی اصولوں سے کبھی منہ نہیں موڑا بلکہ صوم وصلوٰۃ کے پابند رہے۔

شمسؔ کی زندگی نے وفا نہیں کی۔ وہ چالیس سال کی عمر میں ہی انتقال کر گئے۔ اور جب ان کے فکر میں گہرائی وگیرائی اور شعور میں پختگی آنے لگی تو موت نے انھیں اپنی سرد آغوش میں ہمیشہ کے لئے چھپا لیا۔ اور جو چنگاریاں تھیں، وہ دبی رہ گئیں۔

کلکتہ والوں نے کبھی اپنے ادیبوں اور شاعروں کی خاطر خواہ قدر نہیں کی اور کلکتہ والوں سے ہمیشہ انھیں شکایت رہی۔ غالباً کلکتہ کی بے قدری نے انھیں اسقدر ملول ورنجیدہ کیا تھا کہ وہ کلکتہ سے بھاگ کر حیدرآباد جانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک مقطع میں اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا ہے ؎

ٹھنی ہے اب وہیں کی شمسؔ دل میں　　دکن میں قدر اس فن کی بڑی ہے

اس وقت دکن میں داغؔ تھے اور ہندوستان کے نامور شاعروں کی کہکشاں وہاں کے افق ادب پر جلوہ فگن تھی۔ کلکتہ میں ناقدروں کا اجتماع تھا، شمس جیسے استاد فن شاعر کی قدر یہاں کیا ہوتی۔ شمسؔ کی قدر نہ ان کی زندگی میں ہوئی اور نہ ہی موت کے بعد،

کلکتہ کے سب سے بڑے شاعر کا مختصر دیوان بھی کتر بیونت کے بعد شائع ہوا اور یہ کام بھی ان کے عزیز اور نامور شاگرد حضرت رضا علی وحشتؔ کے ہاتھوں انجام پذیر ہوا۔

خمخانۂ جاوید کے مؤلف لالہ سری رام شمس کے دوستوں میں تھے۔ شمس کی رنگا رنگ شخصیت نے انھیں بے حد متاثر بھی کیا تھا۔ انھوں نے شمس کا حال بھی اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔

"ان کی طبیعت فطری طور پر شاعری کے لئے مناسب واقع ہوئی تھی۔ زبان پر ایسی دستگاہ رکھتے تھے۔ مضمون میں شوخی اور متانت کی گھلاوٹ ہے۔ جرأت کا مذاق شاعری انھیں بہت پسند تھا۔ پرگو اور زودگو شاعر تھے۔"

شمس نے چالیس سال کی مختصر زندگی میں دلی اور لکھنو کا سفر بھی کیا تھا۔ دلی کے دبستان شاعری کا اثر انھوں نے قبول کیا۔ لکھنوی شعرا کا رنگ انھیں بھایا نہیں کیونکہ لکھنوی شاعروں نے دل کی شاعری بہت کم کی اور داغ کی شاعری زیادہ کی۔ اور ان کی اکثریت گل و بلبل، ہجر و فراق اور کنگھی چوٹی کے گورکھ دھندوں میں کھو کر رہ گئی تھی۔

شمس نے تجرد کی زندگی بسر کی۔ ان کی غزلوں میں ان کے چوٹ کھائے ہوئے دل کی آواز ہی ہوتی ہے۔ تغزل کے اعتبار سے وہ اپنے نامور باپ سے آگے ہیں ان کی غزلوں میں حلاوت کے ساتھ سوز و گداز بھی ہے۔ بعض غزلیں تو میر کے رنگ میں بے پناہ ہیں۔

شمس نے اپنے باپ کے مشہور شاگرد عصمت اللہ انسخ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ انھوں نے دو چار غزلیں حضرت داغ کے پاس بھی اصلاح کے لئے بھیجی تھیں۔ ویسے وہ انسخ کے ہی باضابطہ شاگرد تھے۔ اور شاعری کے میدان میں

---

۵ خمخانۂ جاوید، سری رام

وہ اپنے استاد سے بازی لے گئے۔

شمس کی غزلوں کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ داغ کا اثر ان پر نمایاں اور گہرا مرتب ہوا ہے۔ داغ کی غزلوں میں جو سوز، شوخی اور مستی کھل کر سامنے آتی ہے وہ شمس کے یہاں بھی ہے۔ اور بعض غزلیں ابتذال کی سرحدیں داخل ہوتی ہیں۔ اور ان کے بیا رذہن کی غمازی کرتی ہیں اور عشق ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔

کلکتے کے اس نغز گو شاعر کے یہاں فکر کی گہرائی اور گیرائی نہیں ملتی، نہ ہی فلسفہ اور تصوف کی پر پیچ گتھیاں شعر کے سانچے میں ڈھلی ہیں۔ شمس ایک خالص غزل گو شاعر تھے اور فن اور تغزل کا دامن ان کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹا اور اسی نقش پا پر چلتے رہے جو میر اور داغ نے چھوڑے تھے۔ ان کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے

سہ رونے لگے وہ زار زار سوئے مزار دیکھ کر
دھل گئے دل کے سب غبار مجھ کو غبار دیکھ کر

وحشت کا کہنا ہے کہ جب کبھی شمس اپنی یہ غزل ترنم سے پڑھتے تھے تو سامعین پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔

شمس کا دیوان سنہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا نیشنل لائبریری کلکتہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ تقریباً دو سو صفحات میں ان کی غزلیں، رباعیات اور قصیدے پھیلے ہوئے ہیں۔

شمس کی رباعیاں، قطعات اور قصیدے پھیکے پھیکے سے ہیں کیونکہ وہ غزل کے شاعر تھے جس کا دل گداختہ غزلوں میں سما گیا ہو۔ بعض غزلیں رکیک اور مبتذل ہونے کے باوجود فن سے بیگانہ نہیں، اور یہ عیب تو داغ، امیر مینائی

جرأت اور ناسخ کے یہاں بھی ہے۔

شمس کے کلام کے بغور مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو اپنی شاعری میں سمیٹنے کی کوشش کرتے تو ہندوستان کے منفرد اور بڑے شاعروں کی صف میں آسانی سے جگہ پا سکتے تھے لیکن ان کے مزاج عاشقانہ اور جذبات والہانہ نے انھیں اپنے گرد و پیش کی کراہتی اور سسکتی بلکتی زندگی کو محسوس کرنے کی بھی مہلت نہیں دی اور غزل کی رنگین خیالی دنیا میں بھٹکتے رہ گئے۔

ان کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں ۔

عمر بھر ناز اٹھائے ہیں تمہارے ہم نے
لاش اٹھاؤ مری یہ بھی تمہیں منظور نہیں

آتی ہے یاد مجھ کو شمس لاش کسی غریب کی
وقتِ سحر بجھی ہوئی شمع مزار دیکھ کر

اثر چشم فسوں ساز نہ پوچھ
شعبدہ باز میرے ہوتے ہیں

دل حسینوں کو نہ دینا اے شمس
یہ دغاباز برے ہوتے ہیں

وطن سے نکلا جو باہر قدم
مری بے کسی ہم سفر ہو گئی

ہم اور شکوۂ غمِ ہجراں غلط غلط
افسوس ہے کہ آپ کا ایسا خیال ہے

خوبانِ روزگار کے پڑتے ہو پاؤں شمس
کچھ اپنی آبرو کا بھی تم کو خیال ہے

شمس کا انتقال ۲۶ اپریل ۱۹۰۵ء میں ہوا، اور ان کی موت کے بعد کلکتہ کے شاعروں کی محفل بہت دنوں تک سوگوار اور سونی رہی۔

شیب چندر کرمکار

شیب چندر کرمکار بنگال کے سنار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انیسویں صدی میں بنگال کے اکثر خاندان نے فارسی زبان کے ساتھ اردو کی بھی خدمت کی ہے۔ شیب چندر کرمکار کے آبا و اجداد کا پیشہ سونے چاندی اور دوسری دھاتوں سے زیورات تیار کرنا تھا۔ شیب چندر کرمکار نے اپنا آبائی پیشہ اختیار نہیں کیا بلکہ انگریزی تعلیم حاصل کی اور ڈاکٹری کی سند لی۔ وہ کیمسٹری کے پروفیسر بھی تھے اور کلکتہ کے میڈیکل کالج میں ۱۸۳۵ء میں ان کا تقرر ہوا تھا۔

۲ نومبر ۱۸۳۵ء کے سماچار درپن اخبار کی اشاعت میں میڈیکل کالج کے قیام کے متعلق چھوٹی سی خبر شائع ہوئی تھی۔

"ہمیں اس خبر سے مسرت ہوئی ہے کہ ہندوستان میں ڈاکٹری کی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے ایک کالج قائم کیا جا رہا ہے اس کالج میں بابو شیب چندر کرمکار کا تقرر بحیثیت کیمسٹری پروفیسر ہوا ہے۔[1]"

شیب چندر کرمکار پروفیسر تھے اور سائنس ان کا محبوب مضمون تھا۔ بنگلہ زبان کے ساتھ انھیں اردو زبان بھی عزیز تھی۔ انھوں نے اردو کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔

---

[1] دیکھئے سماچار درپن۔ اشاعت ۲ نومبر ۱۸۳۵ء

بابو شیب چندر کرمکار نے ۱۸۴۱ء میں معدنیات کے بیان میں ایک مختصر رسالہ تصنیف کیا تھا۔ اس وقت سائنس اور جغرافیائی معلومات کی کتابیں اردو زبان میں شاذ شاذ ہی ملتی ہیں اس لحاظ سے کرمکار کے رسالہ در بیان معدنیات کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا

اس کتاب میں سونا چاندی، ہیرے جواہرات، تانبہ اور جستہ کے متعلق بہت سی دلچسپ اور مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ بابو شیب چندر کی یہ کتاب بھی چھپ نہ سکی۔ اس کا خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے رسالہ در بیان معدنیات شروع ہوتا ہے۔

"سب اشیا مفرد یا مرکب ہیں۔ مفرد مثلاً سونا چاندی جستہ تانبا وغیرہ۔ اور مرکب ہے پیتل، یہ بنا ہے تانبہ اور جستہ سے"۔ اس کے بعد مختلف عنوان دئے گئے ہیں، پہلا بیان آکسیجن گیس کا، اس کی خاصیت، ترکیب اور ہائیڈروجن گیس کی مفید باتیں درج ہیں۔

بلاشبہ کرمکار کی یہ اردو تصنیف کی ادبی حیثیت نہیں۔ انیسویں صدی کے ایک بنگالی نے اردو میں یہ کتاب ترتیب دی جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں اردو بنگال کے گھر گھر میں مقبول تھی۔

محمد علی داؤد ناداںؔ

محمد علی داؤد ناداں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ جنوبی ہند کے مختلف شہروں میں قیام کرنے کے بعد رنگون چلے گئے۔ وہاں سے لوٹے تو ٹالی گنج کلکتہ میں انھیں پناہ ملی اور شہید سلطان ٹیپو کے وارثوں نے ان کی سرپرستی کی۔ ناداں نے ٹالی گنج میں انتقال کیا۔ ان کے خاندان والے بہت دنوں تک ٹالی گنج میں رہے۔

قیام کلکتہ کے دوران میں شہید سلطان کے بھتیجے نواب غلام علی کے ایما پر ناداں نے چار کتابیں تالیف کیں جن میں گل باغ بہار یعنی منظوم قصہ گل بکاؤلی کو اپنے زمانہ میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ دوسری مثنوی نظم بہار ہے۔ ان کی دیگر دو کتابیں ظہور اسمائے الٰہی اور طرز عاشق و معشوق ہیں۔ ظہور اسمائے الٰہی چار طویل داستانوں کا مجموعہ ہے جن میں کوئی نیاپن نہیں اور عاشقانہ کہانیوں کے اعتبار سے نام مناسب نہیں۔ ناداں نے کتاب نواب غلام محمد کو نذر کی تھی۔

گل باغ بہار تاریخی نام ہے۔ یہ کتاب ۱۲۶۱ھ میں تالیف ہوئی۔ اس میں ناداں نے عزت اللہ بنگالی کی بہار دانش اور مذہب عشق کا ذکر کیا ہے ناداں نے نہال چند لاہوری کی مشہور تالیف مذہب عشق کو سامنے رکھ کر لکھا ہے ان کی یہ مثنوی شاہ زین الملوک کے حال سے شروع ہوتی ہے ؎

تھا پورب کے شہروں میں اک بادشاہ | کہ تھا وہ شہنشاہ گیتی پناہ
یہ کہتے ہیں زین الملوک اس کا نام | سبھی امر سے تھا یہ مقصد تمام
کہ قدرت سے حق کی تھے فرزند چار | یہ علم و فضل میں تھے وہ آشکار
سوا ان کے اک اور پیدا ہوا | کہ شمس و قمر جس پہ شیدا ہوا

گل باغ بہار میں گل بکاؤلی کی کہانی ہے جو ان سے پہلے زبان زد خاص و عام ہو چکی تھی اور اسی قصہ کی بنیاد پر پنڈت دیا شنکر نسیم نے اپنی معرکہ آرا مثنوی گلزار نسیم لکھی۔ ناداں کی مثنوی بے کیف اور بے رنگ ہے۔ اس میں وہ زور برجستگی، سلاست اور فصاحت نہیں جو سحر البیان اور گلزار نسیم میں ہے۔
ناداں کی دوسری کتابوں کا مطبوعہ یا خطی نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔

سید مُرشد علی القادری

یوں تو بنگال میں کئی صوفی شاعر اور ادیب گذرے ہیں ان صوفیوں اور اولیا کرام کی اردو کے لئے مساعی جمیلہ اور خاموش خدمات کو اردو ادب اور زبان کی تاریخ کبھی بھلا نہیں سکتی ہے۔ ان بزرگوں کے عقیدت مندوں کا وسیع حلقہ تھا جن میں مقامی لوگوں کی اکثریت ہوتی تھی۔ ان صوفیا کرام کا تعلق براہ راست بنگال سے نہ تھا۔ یہ عرب اور ایران کے مختلف مقامات سے ہجرت کرکے ہندوستان میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ انھیں مقدس اور بزرگ ہستیوں کی ایک نسل شہر منگل کوٹ[1] میں آباد ہوگئی تھی۔ منگل کوٹ اس وقت علم و ادب، تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ اس شہر میں بغداد کے پیران پیر حضرت غوث الاعظم سید محی الدین قادری جیلانی کی ایک نسل آباد ہوگئی تھی۔ اسی نسل سے حضرت سید شاہ مہر علی القادری المعروف حضرت اعلیٰ حضور کے تیسرے صاحبزادہ جناب سید مرشد علی القادری تھے۔ جن کو اردو ادب اور شعر و شاعری سے بڑا شغف تھا اور جن کی بدولت اردو زبان اور شاعری ان کے مریدوں میں مروج ہوئی اور بنگال کے

---

[1] منگل کوٹ مرشد آباد سے پچیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے پہلے یہ مشہور شہر تھا اور شہر بغداد سے بھی زیادہ اہمیت اسے حاصل تھی۔

کئی اضلاع میں یہ زبان صرف پھیلی ہی نہیں بلکہ اسے قبول عام کی سند ملی اور اب تک اس کے گہرے نقوش پنڈوا، مرشد آباد، جہانگیر نگر، گوڑ، مدنا پور، منگل کوٹ، ہگلی سیرام پور وغیرہ میں ملتے ہیں۔

حضرت اعلیٰ حضور یعنی حضرت سید شاہ مہر علی القادری مدنا پور میں آباد ہو گئے تھے۔ مدنا پور ان کی ماں کا وطن تھا اور اس سرزمین سے ان کو بے پناہ محبت تھی۔ مدنا پور میں سید شاہ مہر علی القادری کے گھر ۲۷ رمضان المبارک شب قدر ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۰ جولائی ۱۸۵۳ء کو ایک عظیم المرتبت صوفی حضرت سید شاہ علی عبدالقادر شمس القادر المعروف سید شاہ علی القادری نے جنم لیا۔ [۵] سید مرشد القادری کے اندر بھی وہی صفات اور خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں جو ان کے آباؤ اجداد میں پائی جاتی تھیں۔ انکی بھی بیشمار کرامات ہیں۔ وہ بھی ایک اشارے میں مریضوں کو اچھا کر دیتے تھے۔ پریشان، مایوس اور شکستہ دلوں کی مشکلیں آسان کرتے تھے۔ ٹھکرائے ہوئے لوگوں کو گلے لگاتے تھے، انکی کرامتوں، فیاضیوں اور دریا دلی اور ہمہ گیر محبت کی وجہ سے ان کے مرید صرف بنگال کے گوشہ گوشہ میں ہی پھیلے ہوئے نہیں تھے بلکہ ہندوستان کے اکثر صوبوں اور شہروں میں ان کے عقیدت مندوں کا ایک ہجوم تھا۔

حضرت شاہ مرشد علی القادری وجیہہ اور شکیل تھے ان کے چہرے میں نورانی کشش تھی۔ ان کی آنکھیں نیلی جھیل کی طرح گہری تھیں۔ گویا علم و معرفت کا سمندر ہوں۔ حضرت مرشد علی القادری کی تمام زندگی زہد و تقویٰ اور عبادت میں گذری۔ ان کے عقیدت مندوں کا کہنا ہے کہ حضرت مرشد علی القادری اس قدر نیک، اس قدر

۵۔ ہمارے حضور کی مختصر سوانح حیات صفحہ

کشادہ دل۔ اس قدر خدا ترس اور عظیم بزرگ تھے کہ اپنی زندگی میں کبھی بھی آپ نے کسی کے دل پر چوٹ نہ پہونچائی۔ مدنا پور سے آپ ہجرت کر کے کلکتے چلے آئے تھے اور ۲۲ گارڈ تر لین (خانقاہ شریف لین) میں مستقل سکونت اختیار کر لی جہاں بنگالہ کے دور دراز علاقوں سے ہر فرقہ کے لوگ بھاری تعداد میں ان کے پاس آتے۔ ان کے معتقد ہوتے اور ان سے فیض اٹھاتے رہے۔

حضرت مرشد علی القادری بچپن ہی سے تنہائی، خلوت نشینی اور خدا کی یاد میں غرق رہنے کے عادی تھے۔ وہ اکثر دنیاوی الجھنوں سے دور گھنے جنگلوں میں چلے جاتے۔ صبح وشام اپنے معبود کی عبادت۔ پرستش اور یاد میں مستغرق رہتے۔ کھانے پینے کی بھی ان کو سدھ بدھ نہ رہتی۔ بچپن سے ہی ان میں غیر معمولی ذہانت کا نشان ملتا تھا۔ چھوٹی سی عمر میں ہی عربی اور فارسی کی دقت طلب اور پیچیدہ عبارتوں کو اس طرح سمجھا دیتے اور ان کی توجیہہ و تشریح اس انداز سے کرتے کہ بڑے بڑے عالم و فاضل انگشت بدنداں رہ جاتے۔ مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی معنوی ان کو حفظ تھی ان کی یادداشت اتنی اچھی اور تیز تھی اور حافظہ اتنا قوی تھا کہ عربی اور فارسی کلام اور تخلیقات کی مشکل سے مشکل عبارت کو حرف بہ حرف زبانی سنا دیتے تھے۔

حضرت مرشد القادری کو اردو فارسی اور عربی زبان اور ادب سے عشق کی حد تک پیار تھا۔ وہ فارسی اور اردو کی نادر کتابوں اور قلمی نسخوں کے حصول کے لئے بے چین رہتے تھے اور جہاں کہیں بھی انھیں اردو فارسی اور عربی کے نادر مخطوطات ملتے انھیں کسی بھی قیمت پر حاصل کر لیتے تھے اور یہ نادر مخطوطات انکے ذاتی کتب خانہ کتب خانہ قادریہ[۱]

---

[۱] خانقاہ شریف لین میں یہ کتب خانہ موجود ہے اور سجادہ نشین کے اہتمام میں ہے

میں ابتک محفوظ ہیں۔ انھی کتابوں میں حضرت مرشد علی القادری کا اردو دیوان مناقب حضرت غوث اعظم بھی محفوظ ہے

حضرت مرشد علی القادری اردو کے اچھے خاصے صوفی شاعر تھے۔ ان کے ایک مرید اور معتقد عبدالغفار صاحب اپنی کتاب ہمارے حضور کی مختصر سوانح حیات میں ان کی اردو شاعری اور عربی اور فارسی کی علم دانی کے متعلق لکھتے ہیں :-

"وہ اپنے زمانے میں عربی اور فارسی کی علم دانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے تخیل کی بلندی اور پاکیزگی زبان کی سلاست اور روانی اور شاعرانہ انداز کی وجہ سے ان کی تخلیقات کی چمک دمک کے آگے دوسری تخلیقات ماند پڑجاتی ہیں۔ انھوں نے اردو فارسی اور عربی میں بہت سارے مضامین لکھے حضرت غوث کی مدح میں ان کا اردو دیوان "اسرار تصوف" اور رموز عارفاں کا شاہکار ہے۔ انکی شاعری الہامی ہے جو انسان کی خدا تک رسائی کیلئے زینہ بنی ہے۔ الخ"

حضرت مرشد علی القادری کی پوری زندگی چونکہ عبادت پرہیزگاری اور زہد و تقویٰ میں گذری اس لئے ان کی تصنیفات و تخلیقات پر بھی اتقاء اور مذہب کا گہرا رنگ چڑھا ہے۔ چونکہ وہ خود خدا ترس نیک دل، علم دوست اور صوفی تھے لہذا ان کی شاعری بھی صوفیانہ رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ ان کے مناقبہ میں رموز عرفان اور اسرار تصوف نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی وہی نقوش عارفانہ ملتے ہیں جو فارسی کے صوفی شاعر مولانا عطار اور مولانا رومی نے بنائے تھے۔ انھی جذبات احساسات اور خیالات کی عکاسی ہوتی ہے جو ایران کے صوفی شاعروں کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

حضرت مرشد القادری بھی شاعری میں مرزا نوشہ غالب کی طرح دو تخلص کرتے تھے۔ عاصی اور جمال۔ اور ان کا دیوان جس کا عنوان حرز جان عارفاں فی مناقب سبحانی المعروف بہ دیوان حضرت جمال ہے۔ چودہویں صدی ہجری کے اوائل میں ہی چھپ گیا تھا۔ دیوان کے دیباچہ میں لکھا گیا ہے

دیوان حضرت جمال از تصنیفات شریف غوث زماں وقطب دوراں مالک درقاب اہل عرفاں شہنشاہ ولایت سیدنا مولانا وقدوتنا الی اللہ حضرت ابوالارشاد سید شاہ علی عبدالقادر شمس القادری المعروف بہ سید شاہ مرشد علی القادری المتخلص بہ عاصی وجمال رحمت اللہ باہتمام احقر محمد غنی حیدرآروی در مطبع ستارۂ ہند کلکتہ طبع گردید۔۔"

افسوس ہے کہ دیوان کے کسی صفحہ پر سنہ اشاعت نہیں لکھا گیا ہے مگر چونکہ حضرت جمال کا وصال سنہ ۱۹۰۱ء میں ہوا۔ اور چوں کہ پورے دیوان میں حضرت غوث پاک کی مدح اور عارفانہ اشعار ہیں۔ اس لئے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنا دیوان سفر بغداد کے بعد اپنی زندگی کے آخری ایام میں مرتب اور تصنیف کیا ہوگا۔ اس لئے اس کی اشاعت سنہ ۱۳۰۱ھ اور سنہ ۱۳۱۸ھ کے درمیان ہی ہوئی ہو۔

حضرت مرشد علی القادری نے اس دیوان کے علاوہ سفر بغداد کے متعلق نثر میں بھی ایک کتاب "سفرنامہ بغداد" لکھی تھی۔ لیکن اس وقت نہ تو اس کا قلمی نسخہ موجود ہے اور نہ ہی چھپی ہوئی کتاب۔ اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ چودہویں صدی کے بنگال کے اس صوفی شاعر کی یہ کتاب چھپی بھی تھی یا نہیں

دیوان شروع ہوتا ہے ؎

پڑھ کے بسم اللہ مطلع میں لکھا نامِ خدا
نامِ حق نامہ کا عنوان بن گیا نامِ خدا

حضرت جمالؔ کی شاعری میں کس حد تک تصوف، الوہیت اور معرفت کے فلسفے اور عارفانہ تجلیاں کوندتی ہوئی نظر آتی ہیں اس کا اندازہ ان کے نمونۂ کلام سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے ؎

ہجر کی بادِ خزاں سے بوستانِ دہر میں — ہو نہ ویرانہ کبھی دل کا گلستاں یا خدا
موت سے بڑھ کر ہے زحمت فرقتِ محبوب کی — صدمہ جانکاہ ہے دوری جاناں یا خدا

بکھرنا کیا تھا اس رخسار پر زلفِ پریشاں کا
گھٹا نے چادرِ شبگوں سے گویا مہر کو ڈھانکا

چراغِ عشق جو اس سرو قد کا دل میں روشن ہے
دکھاتا ہے تماشہ آنکھ کو سرو چراغاں کیا

کوئی سیمہ سمجھتا ہے کوئی زنار کہتا ہے — عقیدہ ہے اسی گیسو سے شیخ و برہمن کا
برسوں رہے تصورِ جاناں سے ہمکنار — کیا خوف ہم کو کنجِ لحد میں فشار کا
روتا ہے دل لہو رنگیں کی یاد میں — سنتا ہے جب بہار میں نالہ ہزار کا
وصل سے مجھکو مزہ دیتا ہے ہجر اس حور کا — یادگارِ زلف ہے عالم شبِ دیجور کا

چمن میں رنگ و بوئے گل نہ اترائے پھریں کیونکہ
اڑایا ہے ڈھنگ ہر اک تمہارے رنگ و بو کا

ہجر کی رات سے کم ہوگا بہت روزِ جزا — کیونکر اس شب کا وہ دن مدِ مقابل ٹھہرا

بارکوہِ غم سے میرے بیٹھ جائے گی زمیں
نالہ سنکر پھٹ پڑے گا آسمانِ کوئے دوست

گر آپ دیکھ لیں نگہہ لطف سے اِدھر بن جائیں گے مرے بگڑے ہوئے کام ہر طرف

حضرت جمالؔ و عاصیؔ کے دیوان سے یہ اشعار بطور نمونہ مشتے از خروار سے دئے گئے ہیں۔ تصوف اور معرفت سے متعلق ایسے اشعار کی ان کے دیوان میں کمی نہیں ہے۔

حضرت مرشد علی القادری کو حضرت غوث پاک سے دلی لگاؤ اور عقیدت تھی انھوں نے حضرت غوث پاک سے اپنی بے پناہ محبت کا جابجا اظہار کیا ہے ؎

عاصیؔ نے غوث پاک کی الفت میں جان دی قدسی اس کا جنازہ اٹھاتے تو خوب تھا

حضرت غوث پاک کے مزار کی زیارت کی خاطر آپ نے بغداد کا سفر کیا تھا۔ گرچہ وہ تمام عمر کلکتہ، مدنا پور اور بنگال کے مختلف اضلاع میں رہے لیکن انکی روح ہمیشہ بغداد کی گلیوں میں بھٹکتی رہی۔ حضرت جمالؔ کے دو صاحبزادے تھے۔ ایک حضرت ارشد علی القادری اور دوسرے ارشاد علی القادری المتخلص بہ جمیلؔ۔ حضرت ارشاد علی القادری بھی اپنے باپ کی طرح شاعر اور ادیب تھے۔ ان کو اردو فارسی شاعری سے عشق تھا۔ کلکتہ اور بنگال میں اردو زبان کے فروغ میں انھوں نے بھی بڑا حصہ لیا۔ کئی لائبریریاں ان کی عنایات سے فیضیاب ہوتی رہیں۔ خانقاہوں کے کتب خانوں میں اردو اور فارسی کی قیمتی اور نادر کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے ارشاد علی القادری جمیلؔ پُر مغز اور زود گو شاعر تھے۔ وہ بھی صاحبِ دیوان ہیں لیکن چند وجوہات کی بنا پر ان کی زندگی میں دیوان شائع نہیں ہو سکا۔ لیکن دیوان

جمیلؔ کا قلمی نسخہ کتب قادریہ میں موجود ہے۔ دیوانِ جمیلؔ میں صرف مناقب نہیں بلکہ عارفانہ غزلیں حمد اور نعت بھی ہیں۔ ان کی عارفانہ غزلوں سے ان کے ایک اچھے غزل گو شاعر ہونے کا نشان ملتا ہے۔ ان کا کلام صوفیانہ شاعری میں ایک اضافہ ہے

حضرت مرشد علی القادری کے بڑے صاحبزادے ارشد علی القادری کا جوانی میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی وفات ۱۳۱۲ھ میں ہوئی جس کی تصدیق حضرت جمالؔ کے اس مصرعہ سے ہو جاتی ہے۔ ع

جواں سال ارشد علی بودہ' جواں مرد جواں مرد آہ

حضرت مرشد علی القادری کو اپنے بڑے بیٹے سے بے پناہ محبت تھی۔ اس لئے اپنے جواں سال بیٹے کی موت کا غم برداشت نہ کر سکے اور چھ سال بعد ہی ، ۲ شوال ۱۳۱۹ھ مطابق ، فروری ۱۹۰۱ء یا ۲ پھاگن ۱۳۰۷ (بنگلہ) کو انتقال پر ملال ہوا۔ اور مدناپور میں اپنے باپ کی بغل میں دفن ہوئے

راجہ کرشنا دیب

راجہ کرشنا دیب کا آبائی وطن مرشد آباد تھا لیکن ان کا خاندان کلکتے میں منتقل ہو گیا تھا اور مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ راجہ کرشنا دیب کے والد کا نام نابا کرشنا تھا۔ وہ ۱۷۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ راجہ کرشنا کو شروع سے ہی شعر و شاعری کا ستھرا مذاق تھا اور سن کے ساتھ ان کی شاعری سے دلچسپی بھی بڑھتی گئی۔ راجہ کرشنا دیپ نے اردو اور فارسی کے شاعروں اور ادیبوں کی بھی سرپرستی کی۔ اور بنگالیوں میں اردو کو مقبول و مروج کرنے میں ان کا نمایاں حصہ رہا۔ گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ راجہ کرشنا دیپ کا ۱۸۲۴ء میں انتقال ہوا لیکن ان کے مشہور بنگلہ اخبار سماچار درپن کی ۳۰ر اگست ۱۸۲۳ء میں انکی موت کی خبر شائع ہوئی۔

"ہم نہایت رنج و غم سے یہ المناک خبر شائع کرتے ہیں کہ مہاراجہ کرشنا بہادر ۱۵ر اگست ۱۸۲۳ء بروز منگل دوپہر کے وقت اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے[۵]"

راجہ کرشنا اردو کے علاوہ بنگلہ زبان کے بھی اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ انھوں نے راجہ خاندان کی ایک مختصر تاریخ 'کل پردیپ' لکھی' لیکن ان کی اردو تصنیف کا حال نہیں ملتا۔ راجہ جنم جے مترا ارمان نے تذکرۂ نسخۂ دلکشا میں ان کے

---

۵ دیکھیے بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات صفحہ ۱۸۹ مطبوعہ کلکتہ

چند اشعار نمونتاً درج کیے ہیں ؎

گر شب کو نہ تم پاس مرے آؤگے صاحب　　تو ہمکو سحر تک نہ یہاں پاؤگے صاحب
منظور ہے ہر طرح فنا کرنا ہمارا　　کیونکر نہ قسم غیر کی تم کھاؤگے صاحب
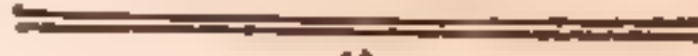
راجہ رام موہن رائے

رام موہن رائے بنگال کے ایک ایسے سپوت ہیں جنھوں نے بنگال کی سماجی ثقافتی اور سیاسی تبدیلیاں لائیں۔ رام موہن رائے ایک تحریک تھے جس کا دور رس اثر صرف بنگالیوں پر ہی نہیں بلکہ پوری ہندوستانی قوم پر مرتب ہوا۔

راجہ رام موہن رائے کے آبا و اجداد نواب مرشد کے دربار سے وابستہ تھے اور بنگلہ اور فارسی زبان میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ اس ماحول میں راجہ موہن رائے نے ۱۷۷۲ء میں آنکھ کھولی اور اپنے عالم باپ رام کانتا رائے سے ابتدائی تعلیم و تربیت پائی، راجہ رام موہن رائے نے عظیم آباد میں عربی اور فارسی کے علوم و فنون سیکھے اور پھر سنسکرت کی تعلیم کے لئے بنارس چلے گئے اور سنسکرت پر قدرت حاصل کی۔

رام موہن رائے باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے اندر حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کے دل میں غلامی کی زنجیر کاٹنے کا جذبہ موجزن رہتا۔ ایک آزاد اور خوش حال ہندوستان کا سانچہ ان کے ذہن میں تیار ہوا تھا، لیکن سانچہ میں عمل کا رنگ وہ اس لئے بھر نہ سکے کہ دلی سلطنت کی ناقابل شکست دیوار کی بہت سی اینٹیں نکل چکی تھیں جو چند برسوں کے بعد ہی گر گئیں اور دلی سلطنت کے کھنڈر پر انگریزوں نے اپنی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

راجہ رام موہن رائے مفکر اور ریفارمر بھی تھے۔ انھوں نے ۱۸۲۸ء میں برہمو سماج مسلک کی بنیاد ڈالی۔ برہمو سماج کے اصول لوگوں کو اسقدر پسند آئے کہ بنگال میں ان کا مسلک مقبول ہوا اور پھیل گیا۔ انکے عقیدتمندوں اور پیروؤں کا حلقہ وسیع ہے۔ قوم و ملک کے اس بے لوث خادم نے ہندوستان کی سماجی اقتصادی اور ثقافتی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں لائیں اور زندگی کے ساٹھ سال گذارنے کے بعد لندن میں ۱۸۳۳ء میں دنیا سے رخصت ہوئے۔

راجہ رام موہن رائے نے اپنی ساری زندگی قومی اصلاح اور ادبی خدمات کے لئے تج دی تھی۔ وہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ بنگلہ، سنسکرت، اردو اور فارسی میں انھیں دستگاہ حاصل تھی۔ انگریزی زبان کے علاوہ فرانسیسی اور کئی زبانیں جانتے تھے۔ بنگلہ، سنسکرت، اردو اور فارسی میں کئی مشہور کتابیں لکھی ہیں۔ اردو اور فارسی میں بھی انھوں نے کتابیں، رسالے اور اخبارات ترتیب دئے۔ اپنی مقبول ترین کتاب تحفۃ الموحدین تالیف کی۔ یہ کتاب فارسی میں ہے اور اس کا نادر خطی نسخہ مولانا آزاد کالج کلکتہ کے کتب خانے میں زمانہ برد ہونے سے بچ رہا ہے۔

تحفۃ الموحدین میں ان کے مسلک وضاحت کی گئی ہے۔ وہ ایک خدا پر یقین و ایمان رکھتے تھے۔ ویدانت اسلام اور صوفیائے کرام کے سلوک اور تصوف کا ان پر گہرا اثر ہوا تھا۔ یہ کتاب کئی بار چھپی اور مقبول ہوئی۔ اس کا دیباچہ رام موہن رائے نے عربی میں قلمبند کیا ہے۔ چونکہ رام موہن رائے کو وحدانیت پر ایمان تھا لہذا انھوں نے برہمن ہوتے ہوئے بھی بت پرستی پر

بھرپور وار کیا ہے۔ اور ان کے مسلک برہمو سماج نے بت پرستی کے طلسم کو اگر ختم نہیں کیا تو اس کا زور بہت کم کر دیا ہے۔ اور سرسید احمد کی طرح کٹر پنڈتوں اور برہمنوں کے خلاف تنہا جنگ کی اور کامیاب ہوئے۔

صحافت رام موہن رائے کی حب الوطنی اور سرفروشی کے بے پناہ جذبے نے انھیں ایک نڈر اور بے باک صحافی بننے میں مدد دی۔ ۱۲ر اپریل ۱۸۲۲ء میں ان کے مشہور اخبار 'مراۃ الاخبار' کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔[1] رام موہن رائے نے یہ اخبار عیسائی مشنریوں کے تبلیغی پروپگنڈے کی کاٹ کے لئے نکالا تھا۔ اور مغربی تہذیب میں رچی بستی ہوئی ہندوستانی زندگی کو نئی مشرقی تہذیب کی طرف موڑنے کے لئے بہت عمدہ کام کیا۔ ۱۸۲۳ء میں آزادی تحریر پر پہلا وار ہوا۔ اور پریس پر قانونی گرفت سخت کر دی گئی تو راجہ رام موہن رائے نے ایک نڈر اور بے باک صحافی کی طرح حکومت کی پابندیوں کے خلاف احتجاج کیا۔ مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام پر یہ احتجاج بے اثر ثابت ہوا۔ انھوں نے تاجدار برطانیہ کے نام ایک خط لکھا جس میں انھوں نے آزادی تحریر پر سے سخت پابندیوں کو اٹھانے کی اپیل کی مگر ان کی یہ اپیل سوارت نہ ہوئی۔ حکام کے خلاف جنگ لڑنے کے باعث ان کے اخبار مراۃ الاخبار کی مقبولیت روز بروز بڑھنے لگی۔ انھوں نے ہی بے باک اور بے لاگ صحافت کی داغ بیل ڈالی اور صحافت کے وقار کو بلند کیا۔

راجہ موہن رائے عربی اور فارسی کے علاوہ اردو کے بھی دلدادہ تھے لیکن

---

[1] تاریخ بنگال۔ برندرناتھ چودھری

اردو میں انکی کوئی تصنیف نہیں ملتی۔ راجہ موہن رائے کے کتب خانہ کے علاوہ کلکتے کے تمام بڑے کتب خانوں کو کھنگالنے کے باوجود ان کی کوئی کتاب نہیں ملی۔ گارساں دتاسی ان کے گہرے دوست تھے۔ انھوں نے تذکرہ شعرائے اردو میں لکھا ہے کہ رام موہن رائے نے ویدانتا کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ اور جام جہاں نما کی اردو اشاعت میں ویدانت فلسفہ پر ان کے کئی عمدہ اور جامع مضامین شائع ہوئے تھے۔

سنہ ۱۸۳۳ء میں راجہ موہن رائے دنیا سے چل بسے اور ان کے ساتھ ایک تحریک اور ایک عہد ختم ہوا۔ لیکن ان کی مذہبی اور ثقافتی اصلاح کی تحریک نے بنگال کی سماجی اور مذہبی زندگی پر گہرا اثر چھوڑا۔
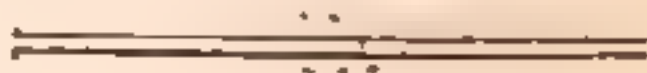
لوئس ڈی کاسٹا
لب التواریخ

لوئیس ڈی کاسٹ عیسائی تھے اور کلکتے میں ان کا انتقال بھی ہوا لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اردو کے اس عیسائی ادیب کا مفصل حال کہیں نہیں ملتا۔ اور اس کی ابتدائی زندگی کی کوئی ایسی کڑی سخت جستجو اور تلاش کے باوجود نہیں مل سکی جو اسکی جائے پیدائش، ابتدائی تعلیم اور اردو سے اس کے بے پناہ شغف کے اسباب معلوم کرنے کا ذریعہ بنتی۔ اس مصنف اور شاعر کا جستہ جستہ حال اس کی تاریخی کتاب "لب التواریخ" اور جام جہاں نما کی بوسیدہ فائلوں میں چھپی ہوئی اردو اور فارسی کی غزلوں سے معلوم ہوتا ہے۔

لوئیس ڈی کاسٹا کو کلکتے کی اینگلو انڈین سوسائٹی میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ وہ برطانوی حکومت میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ وہ صوبہ جات بنگالہ بہار اور اڑیسہ کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے جیسا کہ لب التواریخ کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے۔

"لوئیس ڈی کاسٹا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس متعلقہ صوبجات بنگالہ و بہار و اڑیسہ نے حکیم مولوی عبدالمجید صاحب کی اعانت سے شہر کلکتہ میں ترجمہ کیا۔"

ایک اعلیٰ سرکاری افسر ہونے کی وجہ سے کلکتہ کی اعلیٰ سوسائٹی میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی، چونکہ اینگلو انڈین طبقہ کی دشواریوں اور مشکلات کو رفع کرنے کی

انھوں نے حتی المقدور کوشش بھی کی تھی اس لئے ان میں ڈی کاسٹا کو بڑی مقبولیت ہوئی۔

ڈی کاسٹا کی لب التواریخ ان کی اپنی تصنیف نہیں ہے بلکہ مشہور مؤرخ جناب الگزینڈر ٹٹلر (TYTLER) کی مشہور تصنیف (ELEMENTS OF GENERAL HISTORY) کا ترجمہ ہے۔ ٹٹلر کی کتاب اپنے عہد کی مشہور اور مقبول تصنیف تھی۔ جو دو جلدوں میں کئی سو صفحات پر پھیلی ہوئی تھی۔ دو جلدیں ترتیب دینے کے بعد ٹٹلر کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد ڈاکٹر ایڈورڈ نورس (Edward Norris) نے تیسری جلد مکمل کی جس کا اسلوب پہلی دو جلدوں کے اسٹائل اور اسلوب سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ یہ کسی دوسرے شخص کی تصنیف نہیں معلوم ہوتی ہے۔

ٹٹلر کی اس کتاب کا ترجمہ لوئیس ڈی کاسٹا نے ایک ہندوستانی عالم حکیم عبدالمجید کی معاونت سے کیا ہے کتاب کا ترجمہ ۱۸۲۹ء میں مکمل ہوا تھا اور بمبئی نیٹو ایڈوکیشن سوسائٹی کی طرف سے بڑے اہتمام سے کلکتہ کے چرچ مشن پریس (امہرسٹ اسٹریٹ) میں چھاپی گئی اور کلکتے ہی سے شائع کی گئی۔

لب التواریخ، اردو کی ایک قدیم ترین تاریخی کتاب ہے اور اس کا مؤلف بھی ہندوستانی نہیں بلکہ ایک عیسائی ہے جسے اردو زبان سے گہرا لگاؤ اور دلی وابستگی تھی۔ لوئیس ڈی کاسٹا نے اپنی کتاب کے ترجمہ اور تالیف کے اسباب دیباچے میں خود بیان کئے ہیں۔

"ٹٹلر کی جنرل ہسٹری کو ہندوستانی زبان میں ترجمہ کرتے وقت میرے سامنے

صرف یہ مقصد اور معیار تھا کہ نفسِ مضمون کی اہمیت برقرار رہے اور مورخ کے وقار کو بھی دھچکا نہ لگے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر میں نے ترجمہ میں انحراف نہیں کیا ہے بلکہ حتی المقدور کوشش اس بات کی کی ہے کہ مورخ اور مصنف کے اسٹائل اور اسلوب کی خصوصیات برقرار رہیں۔ اس کے لئے میں نے اس کتاب میں کوئی غیر مانوس لفظ یا متروک ترکیب کے استعمال سے پرہیز کیا ہے اور انھیں الفاظ تراکیب اور اصطلاحات کا استعمال کیا ہے جو لغت میں ملتے ہیں یا قابل اور مستند ادیب استعمال کرتے ہیں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ حکیم مولوی عبدالمجید صاحب نے ترجمہ میں میری اعانت کی۔ ان کے اشتراک اور تعاون کے بغیر میں اپنے کام کے ساتھ پورا پورا انصاف نہیں کرسکتا تھا۔"

خاتمہ پر لوئیس ڈی کاسٹا کے دستخط ہیں اور تاریخ ۸ اکتوبر ۱۸۲۹ء دی گئی ہے۔

لبُ لتواریخ کی پہلی جلد کے دیباچہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوئیس ڈی کاسٹا نے ٹٹلر کی تاریخ کی افادیت اور اہمیت کے پیشِ نظر اس کے ترجمہ کی زحمت اٹھائی تھی۔ اس کے ساتھ حکیم عبدالمجید محنت نہ کرتے تو ایک مفید اور دلچسپ تاریخ اردو میں منتقل نہ ہوتی۔ ٹٹلر کی جنرل ہسٹری دو ضخیم جلدوں کے ۱۲۰ ابواب میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا ترجمہ صرف دو مختصر جلدوں میں کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ لوئیس کاسٹا نے مورخ اور مصنف کے اسلوب اور طرزِ نگارش کو برقرار رکھ کر دو ضخیم جلدوں کا ترجمہ دو جلدوں میں کر کے دریا کو کوزہ میں بند کردیا ہے۔ بلاشبہ ایک عیسائی ادیب کا یہ بڑا کارنامہ ہے اور ساتھ ہی اردو ادب

اور زبان پر اس کا بڑا احسان ہے۔

لب التواریخ کی دوسری جلد کا مقدمہ ڈی کاسٹا کے معاون و مددگار حکیم عبدالمجید نے لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"علم تواریخ کی تحصیل کہ بہر نوع (عاصی پرمعاصی عبدالمجید کہتا ہے) مفید جمہور انام ہے ہر فن کے صاحب مذاق کے لئے لازم ہے کیونکہ آدمی تجربہ سے اکتساب کمال کرتا ہے سو وہ زمانہ کے حوادث کی دریافت پر موقوف ہے اس لحاظ سے ہمیشہ سلاطین نامدار اور علمائے ذی اقتدار اس فن کی کتابوں کی تشہیر و ترویج میں کوشش کرتے آئے ہیں۔ جمیع امرا ان کتابوں کو حرز جان اور ان مصنفوں کو عزیز جانتے رہے۔ ان میں سے حکیم سکندر ٹطر کا مجموعہ جامعہ کہ شہرۂ آفاق زمین و زمن کا ہے الخ"

آگے چل کر حکیم عبدالمجید لکھتے ہیں کہ اس شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ڈی کاسٹا نے کیا۔

"سخن وری میں لاثانی، ذہن وذکا میں فایق احقاق حق سے کما حقہ واقف عالی جناب اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولس لوئیس ڈی کاسٹا صاحب نے ترجمہ زبان انگریزی سے محاورہ اردو میں کیا اصلی کے ساتھ بے کم و کاست اگرچہ نہایت دشوار تھا تاہم مترجم ممدوح نے بڑی نزاکت سے کیا ہے ایسے لباس میں جلوہ گر کیا ہے کہ یہ کتاب مسمیٰ بہ لب التواریخ علمائے محققین اور فضلائے مدققین کی نگاہ میں باعتبار حسن ترکیب الفاظ گلزار ہمیشہ بہار ہے الفاظ کی رنگینی صفحہ عنبریں پر ریاحین رنگارنگ کی مانند بہار آرائی میں مصروف اور فصاحت کی بلبلیں

نغمہ سرائی میں مشغول ہیں۔ . . . "

اس عہد کی رسم و روایت کے مطابق حکیم عبدالمجید نے دو تاریخی قطعات بھی درج کئے ہیں جن سے ہجری سال ۱۲۶۵ھ اور عیسوی سال ۱۸۴۹ء نکلتے ہیں۔

لب التواریخ اردو میں اپنی نوعیت کی مفید، دلچسپ اور معلومات افزا کتاب ہے جس میں ادبی نزاکتوں کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔ بلاشبہ لوئیس ڈی کاسٹا نے ترجمہ میں عربی الفاظ بکثرت استعمال کئے ہیں لیکن وہ اس لئے قابل معافی ہیں کہ ٹلر کی ضخیم جلدوں کا ترجمہ انھوں نے صرف دو جلدوں میں اختصار سے کیا ہے اور تیسری جلد جو دو سو صفحات پر مشتمل ہے اس کا ترجمہ بھی چند صفحات میں کر دیا ہے۔ مترجم نے دریا کو کوزے میں بھرا ہے۔ اگر عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال نہ کئے جاتے تو مطالب و مقاصد کا بیان عمدگی اور خوش اسلوبی سے نہ ہو سکتا تھا۔

لوئیس ڈی کاسٹا نے کتاب کے شروع میں تاریخ کے فن اور علم پر زبردست عالمانہ اور ناقدانہ مقدمہ لکھا ہے۔ مقدمہ میں تاریخ کی مکمل اور جامع تعریف لکھی ہے اور بتایا ہے کہ تاریخ سے کیا فائدے ہیں۔ تاریخ کے مطالعہ کے بغیر انسانی علم مکمل نہیں ہو سکتا ہے اور ماضی کے سماجی، تہذیبی اور سیاسی حالات کا علم نہیں ہوتا۔ تاریخ ملل گذشتہ حالات کا آئینہ ہوتی ہے۔ اس میں ماضی اپنے ہر رنگ اور ہر روپ میں نمایاں ہوتا ہے۔ لب التواریخ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف بادشاہوں کا ہی ذکر نہیں ہے بلکہ مختلف مملکتوں کی تہذیب، ثقافت اور

سماجی زندگی حقیقی رنگ میں نظر آتی ہے۔ آفرینش دنیا سے لیکر شاہ جارج سوئم کے عہد تک کے حالات ملتے ہیں۔ یونان، عرب، روس، یورپ کے ممالک، افریقہ غرض کہ ہر جگہ کی سلطنتوں اور وہاں کی سماجی اور ثقافتی زندگی کا حال ایمانداری سے بیان کیا گیا ہے۔ شاعروں، ادیبوں، مصوروں، دانشوروں اور دیگر فنکاروں کے حالات مورخ نے اس خوبصورت اور دلچسپ پیرائے میں بیان کئے ہیں کہ قاری ان میں ڈوب جاتا ہے اور جب تک وہ باب ختم نہیں ہو کتاب ہاتھ سے نہیں چھوٹتی ہے۔

لب التواریخ کی پہلی جلد تاریخ متقدمین پر مشتمل ہے۔ اس میں سب سے پہلے دنیا کے قدیم ترین باشندوں کا ذکر ہے پھر قدیم روایات، شرائع، رسوم وصوم اور رسم کا حال دلچسپ انداز میں بیان ہوا ہے مصریوں، اہل فونیقی یعنی اہل غور کا احوال، کے بعد یونان کی مکمل تاریخ لکھی گئی ہے۔ اسپارٹا، ایتھنز ڈرامے، اور دیگر یونانی ریاستوں کے درمیان برتری کے لئے جنگ کی دلکش تصویریں ملتی ہیں۔ پھر یونانی شعرا، ادبا اور مصوروں مورخوں کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس عہد کی عظیم ثقافتی اور سماجی زندگی پر تفصیلی بحث بھی ہے۔ روما سلطنت، بازنطینی حکومت، کارتیج، سسلی اور بابل کی پرانی زندگی کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ لب التواریخ جلد اول شروع ہوتی ہے۔

"جہاں کی ابتدا کے لوگوں کا احوال ضبط کرنا مشکل ہے ہم اس مادے کے ذکر میں خبر معتبر کی طرف محتاج ہیں۔ لیکن جب کہ آدمی بتدریج ادب میں ترقی پکڑتا

ہے اور علم تاریخ بھی دن بدن بکار آمد ہوتا جاتا ہے، ویسا ہی تاریخ کی تحقیقات بھی بڑھتی ہیں اور اس کے مواد بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ بہت سے خیالات اس وقت کے یاد آتے اور وضع اصلی کی نسبت جو کہ قبل طوفان نوح کے تھے باندھے گئے ہیں لیکن چونکہ یہ باتیں یقینی نہیں ہیں بلکہ قیاسی ہیں اس لئے تواریخ میں آنہیں سکتی ہیں —— بلکہ مفید بھی نہیں ہیں۔"

دنیا کی ابتدا اور آفرینش کے متعلق مدلل بحث کے بعد شرائع کا ذکر دلچسپ انداز میں کیا گیا ہے۔

سب ملکوں کی ابتدائی شریعتوں میں بیاہ کی شریعت ہے کیونکہ تقرر نکاح کا محض اجماع کے ساتھ ہم عصر ہے۔ جمیع اقالیم کے پہلے سرداروں نے بیاہ کے احکام مقرر کئے اور اوائل کے شرعوں میں نکاح کی ترغیب ہمیشہ رہا کرتی تھی... برائیوں اور جاہلوں کی روک تھام کے لئے شرایع اور احکامات سخت تھے کیونکہ اس کے بغیر جاہلوں اور ان پڑھوں سے نبٹا نہیں جاسکتا تھا[1]... الخ

اس طرح دنیا کے مختلف جگہوں کے شرایع، قوانین، روایات اور رسوم کی تاریخ لکھی گئی ہے۔ ان کی تاریخ لب التواریخ میں ۵۰ یا ۶۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ان ابواب کے خاتمہ کے بعد مصریوں اور یونانیوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ مصر اور یونان دو عظیم ممالک ہیں۔ ان کی روایات، تہذیب اور ثقافت دنیا کے لئے مثال ہیں اور مصری اور یونانی تہذیب کے چراغ سے دوسری قوم کی تہذیب کے چراغ جلے اور تاریکی کا سینہ چھلنی ہوا، اور روشنی پھیلی۔

---

[1] لب التواریخ ص۷

لب التواریخ کے مطابق اہل مصر علم ساخت و علم جراثقال اور علم ہیئت میں بہت دخل رکھتے تھے۔ منطقۃ البروج کو انھوں نے بارہ برجوں میں تقسیم کیا ہے انھیں اسی زمانہ میں زمین کی گردش کا کچھ حال معلوم تھا۔

یونان کے ثقافتی، سماجی اور سیاسی حالات کے تذکرہ کے دوران میں یونان کے مؤرخین اور شعراء کے احوال بھی بیان کئے گئے ہیں "یونان کے اکھاڑوں میں نہ فقط ورزش اور کشتی کا اشغال تھا بلکہ ترقی ذہن و تحریص مباحثۂ علمی کی بھی ترغیب دی جاتی تھی، وہ اکھاڑے شعراء اور حکما اور مؤرخین کے مجمع تھے"۔

آگے چل کر نظم و نثر کا موازنہ کیا گیا ہے۔ جمیع اقوام میں نظم کو نثر کی نسبت قدامت زیادہ تر ہے۔ ذہن بشری میں مفہوم و قیاس بہ نسبت عقل کے پیش قدمی کرتے ہیں۔ فیرسیدس، ایکروسکا اور کادمس میٹکا قدیم نثار یونان تھے اور ان کا زمانہ ساڑھے تین سو برس بعد (HOMER) ہومر کا تھا۔ ان کے اگلے شعراء کے رہے سہے نوشتے (جیسے کہ لینن اور قیس وغیرہ) بہت ہی مشتبہ ہیں۔ گمان کیا گیا ہے کہ ہومر کا زمانہ تخمیناً ۹۰۰ برس قبل مسیح کا تھا۔ اور وہ کوچہ گرد قوال (SINGER) تھا اور اس نے ابتدا میں ابیات متفرقہ اور حدی غزلیں اور گریز لکھیں۔ سننے میں آیا ہے کہ لیکرگس نے انھیں یونان میں داخل کیا لیکن پسٹرٹیس نے تخمیناً ۵۴۰ برس قبل مسیح کے ابتدا علماء پر مفوض کیا کہ ہومر کی ابیات منتشر کو مرتب کریں۔ اس لئے الیڈا اوڈسی کے اشعار مکمل ہم تک پہونچے

پہلی جلد روم عہد بازنطینی حکومت کے زوال پر ختم ہوتی ہے۔ دوسری جلد عرب اور سر اسپین یعنی مسلمانوں کی مملکت کے بیان سے شروع ہوتی ہے، ترکون

پرتگالیوں، اسپانیہ، اسکاٹوں، دولت عثمانی اور سلطنت ایران کے علاوہ ہندوستان کی تاریخ بے حد دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہے جس میں بیلی صاحب کا تصور اقوامِ ایشیا کی بنیاد دقتوں کی بابت بہت دلچسپ ہے۔ ۱۸۲۹ء میں لب التواریخ کی صرف دو جلدیں شائع ہو سکی تھیں۔ ایک سال بعد ۱۸۳۰ء میں لب التواریخ کی جلد سوم شائع ہوئی۔ تیسری جلدیں برطانیہ اور آئرلینڈ کی تاریخ ملکہ این کی وفات کے وقت سے شروع کی گئی ہے۔ برطانیہ کے ذکر کے ساتھ یورپ کے مختلف ممالک جیسے بلجیم، آسٹریا، فرانس کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

"لب التواریخ" ایک دلچسپ کارآمد اور مفید کتاب ہے۔ اسکی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ یہ اس وقت ترتیب دی گئی جب اردو نثر ترقی کے آزمائشی دور اور خطرناک نشیب و فراز سے گذر رہی تھی۔ اس میں کلام نہیں کہ اس کی زبان مشکل ہے، عربی فارسی کے الفاظ کے بے موقع بکثرت استعمال کی وجہ سے عبارت پیچیدہ اور گنجلک ہو گئی ہے۔ اور تعقید لفظی عبارت کی سلاست اور روانی میں روڑا بن گئی ہے مگر شروع کی دوسری نثری کتابیں خصوصًا تاریخی جیسے تاریخ نادری تاریخ اسلام اور تاریخ شیر شاہی اور تاریخ جہانگیر شاہی بھی ان عیوب اور خامیوں سے پاک نہیں ہیں —— اور ابتدائی دور کی دوسری کتابوں کی طرح لب التواریخ بھی اب تقریبًا نایاب ہو چکی ہے۔

قاضی عبدالحمید حمید

انیسویں صدی عیسوی میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کی برکت تھی کہ شمالی ہندوستان کے اہلِ قلم حضرات اور اپنے عہد کے عظیم شعراکشاں کشاں ہندوستان کے ترقی پذیر کاسمو پولیٹن شہر کلکتہ آئے اور ہندوستان کا یہ مشرقی حصہ بھی شعر و شاعری کا مرکز بن گیا۔ حافظ محمد اکرام منیغم، مرزا جان طپش، مظہر علی خاں ولا، کاظم علی جوان، شیر علی افسوس، مینی مرزا جہاں، انشا، قدرت اللہ قدرت مسکین، واجد علی شاہ اختر، مخلص، رشید النبی وحشت، خالد بنگالی کی شاعری نے بنگال میں اردو ادب اور شاعری کا عام ذوق پیدا کیا۔ اور ان کے بعد بھی مرشد آباد اور کلکتے میں اچھے، کامیاب اور نغز گو شعرا جنم لیتے رہے تھے اور عبدالغفور خاں نساخ ان عظیم اور پرگو شاعروں کی ایک اہم کڑی ہیں۔

نساخ نواب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انگریزوں کی عملداری مستحکم بنیاد پر قائم ہونے کے بعد نوابوں اور جاگیرداروں کی حالت خستہ ہو چکی تھی۔ جاگیردارانہ ماحول دم توڑ رہا تھا لیکن دم توڑتے ہوئے جاگیردارانہ ماحول کی سابقہ خصوصیات بالکل ختم نہیں ہوئی تھیں۔ یہ آمادۂ زوال ماحول اب بھی شاعروں کی خاطر خواہ سرپرستی کرتا تھا۔ نساخ نے ایسے ہی ایک ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ جہاں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ اُس وقت حافظ اکرام منیغم کا

بنگال میں طوطی بولتا تھا۔ نساخ نے ضیغم کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور کچھ دنوں تک اصلاح لینے کے بعد پختہ اور استادِ فن شاعر ہو گئے۔ نساخ صرف ایک اچھے شاعر ہی نہیں تھے بلکہ نثر میں بھی انفرادی مقام رکھتے تھے۔ سخن شعرا ان کا مفید تذکرہ ہے جس میں ہندوستان بھر کے اچھے اور کامیاب شاعروں کا حال اختصار سے دیا گیا ہے اور ان کے چیدہ چیدہ اشعار بھی دئے گئے ہیں۔

نساخ کا بھی حلقہ تلامذہ وسیع تھا۔ بنگال میں ان کی شہرت اس لئے بھی پھیل گئی تھی کہ جب اُردو کے عظیم شاعر غالب اپنی پنشن کا معاملہ طے کرنے کے لئے کلکتے آئے تھے تو نساخ کے بھائی نے ان کی بڑی مدد کی تھی۔ غالب کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور غالب کے ساتھ عقیدت مندانہ برتاؤ کیا تھا۔ ان پر نواب لطیف کا احسان بھی تھا جس کا ذکر غالب نے اپنے کئی خطوط میں کیا ہے اور نساخ کے دیوان "دفتر بے مثال" کی تعریف میں مبالغہ سے بھی کام لیا ہے ـــــ نساخ کے شاگردوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے لیکن ان کے سب سے چہیتے شاگرد مولوی عصمت اللہ انسخ تھے۔ سخن شعرا میں نساخ نے عصمت اللہ انسخ کے علاوہ اپنے دوسرے شاگردوں کا ذکر کیا ہے لیکن دوسرے شاگردوں کو اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہو سکی تھی۔ انہی میں سے پروفیسر قاضی عبدالحمید صاحب حمید ہیں۔ قاضی صاحب کو ان کی تنہائی پسند طبیعت کی وجہ سے وہ شہرت نہیں مل سکی جو عصمت اللہ انسخ یا نساخ کے صاحبزادے ابوالقاسم شمس کلکتوی کو نصیب ہوئی۔ قاضی صاحب ایک عالم ادیب اور مفکر شاعر تھے۔ ان کی کئی تصنیفات شائع ہو چکی ہیں، لیکن

بدقسمتی سے کئی ایک اہم کتابوں کو چھپنا نصیب نہ ہو سکا ہے۔ ان تصنیفات میں ان کا مکمل ردیف وار دیوان بھی شامل ہے جس کا خطی نسخہ ان کی صاحبزادی مقیم کلکتہ کے پاس محفوظ ہے۔

قاضی صاحب کلکتہ کے ایک مشہور محلہ فوجداری بالاخانہ (کیننگ اسٹریٹ) میں پیدا ہوئے۔ قاضی صاحب کا سنہ پیدائش درج نہیں ہے لیکن حضرت وحشت نے ان کی وفات پر ایک قطعہ تاریخ وفات لکھا تھا جس سے ان کی تاریخ وفات سنہ ۱۳۴۱ھ مطابق سنہ ۱۹۲۲ء نکلتی ہے اور چونکہ ان کی وفات ۶۵ یا ۶۶ سال کی عمر میں ہوئی اس لیے ان کی پیدائش سنہ ۱۲۷۶-۷۷ھ مطابق سنہ ۱۸۵۹ء میں ہوئی ہوگی۔

قاضی صاحب نے ادبی و علمی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ قاضی صاحب کے دادا مولوی شفاعت اللہ صاحب جیسور ضلع (جو اس وقت مشرقی پاکستان میں ہے) کے تعلقدار تھے اور "چانک فورٹ" (بارکپور - ۲۴ پرگنہ) میں ایک افسر بھی تھے۔ مولوی شفاعت اللہ کی کئی صاحبزادیاں تھیں لیکن ایک ہی بیٹا تھا۔ مولوی صاحب نے اپنے بیٹے کا نام میر محمود اللہ رکھا تھا۔ اور ان کی تعلیم و تربیت کے لئے دو مشہور استاد رکھے تھے۔ یہی میر محمود اللہ قاضی صاحب کے والد تھے۔ میر محمود اللہ عربی اور فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ مسٹر جان گل کرسٹ نے فورٹ ولیم کالج کے عربی و فارسی شعبہ میں میر محمود اللہ کو درس و تدریس کے علاوہ تالیف ترجمہ کے لئے رکھا تھا۔ میر محمود اللہ نے عربی زبان کی کئی کتابیں ترتیب بھی دی تھیں۔ لیکن اردو زبان میں ان کا کوئی ادبی کارنامہ موجود نہیں ہے۔

قاضی حمید صاحب کی ابتدائی تعلیم کلکتہ کی مشہور درس گاہ مدرسہ عالیہ میں ہوئی

مولوی شہاب الدین سہسرامی ان کے استاد تھے جن کو سلسلۂ چشتیہ سے ارادت تھی استاد کا اثر قاضی صاحب پر بھرپور ہوا تھا۔ ان کو بھی خاندانِ چشتیہ سے عقیدت و ارادت تھی۔

اکتساب علم کے بعد ۱۸۸۱ء میں قاضی صاحب نے جادو پور کے ایک معزز زمیندار اور قاضی قضاۃ سید فرخ حسین (جو شاہزادہ محمد شریف دہلوی کی اولاد تھے) کی سب سے بڑی بیٹی سے شادی کی جن سے دو اولادیں ہوئیں ایک لڑکا، ایک لڑکی۔ لڑکا عنفوانِ شباب ہی میں داغ مفارقت دے گیا جس کا غم قاضی صاحب کو تا زیست رہا۔ بیٹی اب تک بقید حیات ہیں۔

قاضی صاحب نے بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح درس و تدریس کو اپنا پیشہ بنایا رپن کالج (سریندر ناتھ کالج) میں اپنی موت تک شعبۂ اردو فارسی کے صدر رہے وہ کالج میں مقبول و ہر دلعزیز پروفیسر مانے جاتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا انداز دلکش تھا۔ پڑھاتے وقت وہ علم و ادب کی دنیا میں کھو جاتے تھے۔

۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں کلکتے میں قاضی صاحب کا انتقال ہوا۔ طوطیِ بنگالہ حضرت رضا علی وحشت نے جن کو قاضی صاحب سے گہرا لگاؤ تھا قطعۂ تاریخ وفات لکھا ہے

ماتمِ مرگِ حمید نکتہ داں	کرد غمگیں خاطرِ برنا و پیر
خامۂ وحشت پے سالِ وفات	زد رقم عبدالحمید بے نظیر
	۱۳۴۱ھ

قاضی صاحب کی قبر تانتی بگان کی پرانی مسجد کے احاطہ میں ہے جس کا اب نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔

قاضی صاحب کو بنگال کے پہلے بڑے شاعر عبدالغفور خاں نساخ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ بلاشبہ قاضی صاحب نساخ کے مشہور شاگرد عصمت اللہ آنسخ سے کہیں بہتر اور کامیاب شاعر تھے لیکن انسخ کی طرح مشہور نہیں ہو سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خاموش اور تنہا پسند واقع ہوئے تھے۔ مرنجاں مرنج قسم کے آدمی تھے ان کی طبیعت کا میلان ہنگامہ پسند نہیں تھا۔ وہ ادبی جنگ وجدال سے بھی کوسوں دور بھاگتے تھے۔ اپنے استاد عبدالغفور خاں نساخ سے دلی ارادت اور والہانہ محبت رکھتے تھے۔ جب نساخ کا انتقال ہوا تھا تو وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے۔ ان کی وفات پر دو قطعاتِ تاریخ سپردِ قلم کئے تھے ؎

روز جمعہ چاردہ تاریخ بود از ماہِ جون ۔۔۔ شد بہ کلکتہ بپا ہنگامۂ محشر نما

اوستادِ مشفق و غمخوارِ جانِ دردمند ۔۔۔ اہلِ دل، اہلِ ہنر، اہلِ سخن، اہلِ سخا

بست از دارِ غم و رنج و محن رختِ رحل ۔۔۔ شد خراماں شادماں سوئے گلستانِ لقا

عیسوی تاریخ فوت او رقم کردم حمید ۔۔۔ مولوی عبدالغفور اہلِ جاہ وادا

ہجری تاریخ کے قطعہ کا آخری شعر درج ہے

سالِ فوتش گفت در ہجری سرِ دانش ۔۔۔ شاعرِ جنت مکان، نیک نام

قاضی صاحب گو بنگالی تھے، تین پشت سے ان کا خاندان بنگال میں آباد تھا لیکن اس کے باوجود وہ زبان پر قدرت کامل رکھتے تھے۔ ان کی غزلوں، نظموں اور چھوٹی چھوٹی مثنویوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ زبان و بیان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کی غزلیں شگفتہ، نظمیں پرمعنی اور رواں اور مثنویاں دلکش ہوتی تھیں۔ ان کی زبان کی پختگی اور اندازِ بیان میں شگفتگی اور چاشنی مثنویوں کی خامیوں

اور عیوب پر پردہ ڈال دیتی تھی۔ لطافت اور نازک خیالی ان کے کلام میں رچی بسی تھی جوان کو اپنے دور کا منفرد اور استاد فن کا درجہ دیتی تھی۔

قاضی صاحب کے قلمی دیوان میں غزل کا حصہ بھاری ہے۔ غزل میں تصوف کی بجلیاں بھی کوندتی ہیں اور عشق کی سرمستیاں بھی۔ ان کی غزلیں تصوف اور عشقیہ مضامین کا امتزاج ہیں۔ لیکن غالب کی طرح تصوف کا رنگ غالب ہے بلاشبہ ان کی عشقیہ غزلوں میں میر کا سوز اور غالب کی سی معنیٰ آفرینی نہیں ہے لیکن بھرپور تغزل ہے۔ داغ کی شوخیاں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ غفور خاں نساخ ان کے استاد تھے لیکن استاد کا رنگ انھوں نے قبول نہیں کیا تھا۔ ان کے زمانے میں داغ کی شاعری کا شہرہ تھا اور چونکہ قاضی صاحب کو داغ کی "صحبت یارانہ" میسر ہوئی تھی اس لئے ان پر داغ کا گہرا اثر تھا۔ داغ جب کلکتے آئے تھے تو قاضی صاحب نے ان کے ساتھ اپنی بے پناہ عقیدت اور ارادت کا اظہار کیا تھا اور ان کی آمد پر قطعہ تاریخ بھی کہا تھا ؎

سوئے کلکتہ آمد مرکب داغ چگویم ز اوصاف کمالش

پئے عام مسیحی ہاتف غیب مکرر گفت تسلیمات سالش

قاضی صاحب کی شاعرانہ طبیعت کے لئے داغ کی مختصر صحبت جلا ثابت ہوئی۔ داغ کے کلام نے تو ان کو متاثر کیا ہی تھا لیکن "ہم بزمی" نے ان کی طبیعت اور شاعری پر بھی گہرا اثر چھوڑا۔ قاضی صاحب کے بعد کے کلام میں داغ کا رنگ نمایاں اور گہرا ہوتا چلا گیا تھا۔ وہی شوخی، وہی نزاکت، اظہار عشق میں وہی بے باکی جا بجا نظر آتی ہے ؎

جس کی زلفوں کی پریشانی تھی مجھ کو ناگوار　　اس نے میری خاک کو کیونکر پریشاں کر دیا

نہ کام صبر ہی آیا نہ اختیار آیا　　وہی ہوا جو پسند مزاج یار آیا

محشر کی دھوم سنتے تھے دنیا میں ہم مگر　　ہنگامہ کہاں تری رفتار کی طرح

اے حمید اس دشمن ایماں کی الفت اب تو چھوڑ　　مدتوں کی بت پرستی سا لہا کا فر رہا

جس سے وہ خوش ہو وہی اپنا طریقہ ہے حمید　　کفر سے مجھ کو سروکار نہ ایماں سے غرض

قاضی صاحب کے ان اشعار میں ایک بدمست اور مدہوش شاعر کا دھڑکتا ہوا دل ملتا ہے۔ عشق کے اظہار اور جذبات کی ترجمانی میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں ملتا۔ ایسا لگتا ہے کہ عشق میں سرشار کسی شاعر نے اپنا دل جو محبت سے معمور ہے کاغذ کے صفحات پہ بکھیر کر رکھدیا ہو۔ لیکن عشقیہ مضامین کے علاوہ ان کی غزلوں میں تصوف اور معرفت کی جلوہ ریزیاں بھی ہیں دنیا کی بے ثباتی، حرماں نصیبی اور پسپائی کی تصویریں بھی ملتی ہیں ؂

عشق میں نام و نشاں باعث حرماں ہے حمید　　بے نشاں ہیں وہی جو نام و نشاں رکھتے ہیں

آ گئی یاد مجھے کشتیٔ امید اپنی　　جب شکستہ کوئی تختہ لب ساحل دیکھا

خبر نہ دی، بے خبر گئے سب، گئے ہیں ایسے کہ مر گئے سب
خدا ہی جانے کدھر گئے سب، نشاں نہیں گرد کارواں کا

میرا اٹھنا اس منزل کا نشاں ہو جائے گا　　میر اگر ہونا دلیل کارواں ہو جائے گا

پیری میں گر زمانہ موافق ہوا تو کیا
وہ ولولہ، وہ دل، وہ طبیعت کہاں ہے اب

لوٹا ہی ہم نے یاں بھی غم کی داد　　تھا مجھے روز قیامت کا گھمنڈ

قاضی صاحب نے نظموں اور غزلوں کے علاوہ مثنویاں اور رباعیاں بھی لکھی ہیں لیکن ان کی مثنویاں "رنگِ فصاحت" نہیں رکھتی تھیں۔ ان کی مثنوی "نجم بختیاری" دوست کی خوشامد میں لکھی گئی ہے۔ ایک بڑے رئیس کو خوش کرنے کے لئے۔ اس میں وہ زورِ بیان نہیں ہے جو اردو کی دوسرے درجہ کی مثنویوں میں پایا جاتا ہے لیکن ان کی مثنوی سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کو منظر نگاری میں کمال حاصل تھا۔ مثنوی کے آغاز میں ہگلی کے اشنان گھاٹ کا سماں باندھا گیا ہے۔ گھاٹ پر بنگالی دوشیزاؤں کا ایک ہجوم ہے۔ بنگالی دوشیزاؤں کی بل کھاتی ہوئی پریشان زلفیں، دھانی ساڑیوں کے پلّو، ان سے رونق اور گھما گھمی گویا آکاش کی اپسرائیں اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ دھرتی پر اتر آئی ہیں۔ نہانے کے بعد گھاٹ پر ان ہوش ربا دوشیزاؤں کی گھبرائی گھبرائی نظریں شرم سے ان کا سمٹنا سکڑنا، اٹھلانا مسکرانا اور شرمانا سب کچھ شاعری کے سانچے میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ ڈھل جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں ؎

عجب دریائے ہگلی کی ہے تقدیر — کسی دریا کی کب ایسی ہے تقدیر
عجب مجمع ہے دریا کے کنارے — غضب مجمع ہے دریا کے کنارے
قیامت ہیں ادائیں مہ وشوں کی — ادائیں ہیں بلائیں مہ وشوں کی
نہا کر کچھ اٹھے ہیں کچھ کھڑے ہیں — کمر پر گیسوئے پیچاں پڑے ہیں
کسی کی نگاہیں سوئے مشتاق — کسی کی آنکھیں صورت جوئے مشتاق
کبھی ترچھی نظر سے دیکھنا کچھ — کبھی خوف و خطر سے دیکھنا کچھ

قاضی صاحب کے دیوان کا نام "خمخانۂ جاوید" ہے۔ یہ ۱۳۲۰ھ میں ترتیب

پایا تھا۔ کلیات میں غزلوں کے علاوہ رباعیات، قصیدہ اور قطعات بھی ہیں۔ غزلوں کا حصہ حمد سے شروع ہوتا ہے۔ حمد طویل ہے۔ ۲۷ یا ۲۸ اشعار ہیں۔ قاضی صاحب اپنا دیوان مرتب کر کے حیدرآباد گئے تھے۔ ان کی تصنیفات پر ان کو انعام بھی ملا تھا۔

قاضی صاحب کی کئی تصنیفات چھپ چکی ہیں لیکن "خم خانۂ جاوید" شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکا۔ "خم خانۂ جاوید" کی طرح "خزینۂ رحمت"، "نجم سنجیتا ری" اور "نہر البلاغ" بھی چھپ نہ سکی تھیں۔ ان کے قلمی نسخے قاضی صاحب کے رشتہ داروں کے پاس محفوظ ہیں۔

ان کے کلام کا پہلا مجموعہ "مہر انتخاب" چھپ چکا ہے۔ مہر انتخاب کی اشاعت کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ مجموعہ سنہ ۱۲۹۹ھ میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ بالکل ابتدائی دور کی چیزوں پر مشتمل ہے اس لئے کلام میں جا بجا ناہمواری، زبان اور فن میں ناپختگی نمایاں ہے۔ اور انداز بھی فرسودہ ہے۔ بعد کے کلام میں جن کا نشان تک نہیں ملتا۔

"مناجات الاخبار" سنہ ۱۳۱۶ھ میں شائع ہوئی۔ اس کے قبل سنہ ۱۳۱۴ھ میں قاضی صاحب کی ایک مفید کتاب "خازنِ ترانہ" شائع ہوئی تھی۔ "خازنِ ترانہ" رباعیوں کے اوزان و بحور سے متعلق رسالہ ہے۔ اس رسالہ میں عروض کی تمام خصوصیات سے بھی مفصل بحث کی گئی ہے۔ قاضی صاحب کا یہ ایک علمی و ادبی کارنامہ ہے۔

"نہر البلاغ" سنہ ۱۳۱۹ھ میں ترتیب دی گئی لیکن یہ بھی شائع نہ ہو سکی

یہ ایک طویل تاریخی نظم ہے جو مولانا شبلی نعمانی کی کلکتہ میں آمد پر لکھی گئی اور جس میں ندوۃ العلوم اور علوم اسلامیہ کی مدح سرائی کی گئی ہے۔

قاضی صاحب نے ان کے علاوہ بنگال میں اردو شاعروں کا تذکرہ بھی لکھنا شروع کیا تھا لیکن موت کی وجہ سے اس کام کو پورا نہ کر سکے۔ شاید دو چار شاعروں کا ذکر ہی لکھ پائے تھے۔

قاضی صاحب کی یہ بدنصیبی ہے کہ ہندوستان کیا کلکتہ میں بھی بہت ہی کم تعلیم یافتہ حضرات ہیں جو ان کو شاعر اور ادیب کی حیثیت سے جانتے ہوں قاضی صاحب کی طرح بنگال کی خاکستر میں اور بھی ایسی چنگاریاں چھپی ہوئی ہیں لیکن ان چنگاریوں کو خاک کے ڈھیر سے نکالنے کا کام پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔

علی حیدر نظم طباطبائی

علی حیدر یاور جنگ سنہ ۱۲۷۰ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ عمر کا بیشتر حصہ دکن اور کلکتہ میں گزارا۔ اردو کے مشہور غزل گو شاعر حضرت داغ کے ہمعصر تھے۔ علی حیدر یاور جنگ ابتدا میں حیدر تخلص کرتے تھے۔ حیدرآباد میں مستقل قیام کے دوران میں حیدر سے نظم ہوئے اور ادبی دنیا میں نظم طباطبائی کے نام سے شہرت پائی۔

علی حیدر نظم طباطبائی سے آخری تاجدار لکھنؤ واجد علی شاہ اختر کی جلاوطنی اور مٹیابرج میں مستقل سکونت کے زمانے میں لکھنؤ سے مٹیابرج آئے اور شاہان اودھ کے شاہی مدرسہ میں مدرس اعلیٰ کے فرائض برسوں انجام دیتے رہے۔ تذکرہ غنچہ ارم کے مؤلف نے ان کا مختصر حال لکھا ہے۔

"حیدر، مولوی حیدر علی لکھنوی مقیم مٹیابرج کلکتہ۔۔۔۔ عالمی است فاضل دسخنور لیست کامل اگرچہ اثنا عشری ملت است مگر طبیعی انصاف پسند دارد، وہر گونہ مکالمت فہمیدہ و بہ میزان خرد سنجیدہ می سازد فی الحال مدرس مدرسہ شاہ اودھ کہ در نالی گنج من مضافات کلکتہ مقیم سلطان ٹیپو شاہ میسور واقع است بودہ بآں خوش نالی ورس می دہد۔"[1]

مولوی نجف رام پوری نے یہ بھی لکھا ہے کہ کئی برس تک علی حیدر مٹیابرج میں میں رہے اور جب حضرت داغ دہلوی حیدرآباد سے کلکتے آئے تو ان کے اعزاز میں

---

[1] تذکرہ غنچہ ارم۔ مؤلفہ مولوی نجف رام پوری ص ۸۳

مولوی نجف نے اپنے مکان میں جس مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا اس میں علی حیدر بھی شریک ہوئے تھے اور انھوں نے اپنی مشہور غزل بھی سنائی تھی ۔

دیدہ تر لیجلا اشکوں کی چادر لیچلا | میں جدھر اٹھا بساں موج بستر لے چلا
سامری کی سحر کو پھر زندہ کرنے کے لئے | آکے مٹی تیرے قدموں کی فسوں گر لے چلا
آکے میخانہ میں ہم مستوں کو پہلے لوٹ لے | کس طرف اے ابر دریا بار لشکر لے چلا
دیکھنا صبح شب وصل انکے بالوں کی مہک | مٹھیاں بھر بھر کے باسی ہار عنبر لے چلا[1]
کون آیا ہے چمن میں آج کس کی نذر کو | طوق قمری سے علی طرہ صنوبر لے چلا[2]

دیکھنا یوں پیار کی نظروں سے آتا ہے کسے
آنکھ جس سے لڑ گئی ساتھ اس کو حیدر لے چلا[3]

حیدر یا نظم طباطبائی کئی برسوں تک کلکتے میں رہے اور پھر ۱۸۸۷ء میں حیدر آباد گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ حیدر آباد میں ہی مئی ۱۹۳۳ء میں علامہ طباطبائی کا انتقال ہوا اور وہ ادبی دنیا کو سوگوار چھوڑ گئے۔ ان کی مشہور تصانیف میں دیوان، "تامس گرے کی مشہور نظم کا ترجمہ اور شرح دیوان غالب ہیں۔

---

[1] صوت تغزل، دیوان طباطبائی مطبوعہ ۱۹۳۳ء پہلا مصرع یوں لکھا ہے ع
دیکھنا صبح شب عیش اس کے گیسو کی شمیم

[2] صوت تغزل، پہلا مصرع یوں درج ہے۔ ع ہم رہے محروم حسن و عشق کے دربار سے

[3] صوت تغزل، مقطع درج نہیں ہے لیکن سات اشعار کا اضافہ ہے ص ۳۹، ۴۰

حافظ اکرام احمد ضیغمؔ

کامل فن سخن، ماہر اصناف کلام — کوئی ضیغمؔ سا نظر مجھ کو نہ استاد آیا

سید محمود آزادؔ نے یہ شعر اپنے استاد کی تعریف میں کہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہو کیونکہ حافظ صاحب کے دور میں ہندوستان میں بڑے پایہ کے نامی شاعر بقید حیات تھے۔ پھر بھی بنگال میں ضیغمؔ کی ذات مغتنم تھی کیونکہ انکی بدولت بنگال میں شعر و شاعری کا شوق عام ہوا۔ اور انکے تلامذہ کی کثیر تعداد ہی انکی مقبولیت کی ضامن ہے۔

نساخؔ نے سخن شعراء میں حافظ صاحب کا حال لکھا ہے:

"ضیغم تخلص، جناب حافظ اکرام احمد خلف حافظ قطب الدین مرحوم باشندہ رام پور دا ماد و شاگرد رؤف احمد رأفت سرہندی پیرزادے ہیں۔ پہلے حشمت تخلص کرتے تھے۔ عروض و قوافی و صنائع و بدائع شعری میں فی زمانہ بے مثل ہیں۔ جمیع اصناف سخن پر قادر ہیں۔ شعر ہر مضمون، اور عاشقانہ فرماتے ہیں۔ ہزل اور ریختی اور مرثیہ میں مہمان تخلص کرتے ہیں۔ بہت سے ملکوں کی سیر کی ہے۔ بہت سی زبانوں سے واقف ہیں۔ طب یونانی اور ہندی ڈاکٹری اور بیشتر فنون و ہنر میں کامل ہیں۔ چودہ پندرہ برس کلکتہ میں تھے۔ سات آٹھ برس سے ڈھاکہ میں تشریف فرما تھے۔ کیمیا گر مشہور ہیں ۱۲۹۶ھ میں انتقال کیا[1]"

---

[1] سخن شعرا ص ۲۹۳

نساخ کے اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ حافظ صاحب نے اپنی زندگی کے پندرہ سال کلکتے میں گذارے۔ اس وقت بنگال میں اُردو، فورٹ ولیم کالج کے منشیوں کی بے مثال خدمت کی وجہ سے مقبول ہو چکی تھی مگر کالج میں نثری داستانیں ہی زیادہ تر تالیف ہوئیں اس لئے شاعری پچھڑ گئی تھی۔ طپش اور ضیغم کی شاعری کی مقبولیت کی وجہ سے بنگال میں شاعری عام ہوئی اور بہت سے شاعر ہوئے جن میں مخلص، نساخ، ناسخ اور شمس کو ہندوستان گیر شہرت نصیب ہوئی۔

ضیغم استاد شاعر تھے اور فنی اعتبار سے بہت کم شاعر ان کے رتبہ کے ہوئے مگر وہ بھی غزل کی طلسمی گورکھ دھندوں میں پھنسے رہے۔ اور انکی غزلیں عروض اور قوافی کی پیچیدگیاں سلجھاتی رہ گئیں۔ ان کی غزلیں فکر کی گہرائی و گیرائی سے عاری ہیں اور ان میں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں ہے۔

سخن شعرا میں نساخ نے ضیغم کا خاصہ کلام درج کیا ہے اور ان کی مشہور غزل بھی نقل کی ہے جس کے اشعار مختلف بحروں میں ہیں ؎

جان تیرے غم میں ہی دی اب تو جو کچھ ہو سو ہو — شوخی یہ ہم نے کی اب تو جو کچھ ہو سو ہو
ساقی ہے مینا ہے گل کی بھی آئی ہے فصل — بادہ بھی تھوڑا سا پی اب تو جو کچھ ہو سو ہو
ملنے میں خوبوں کے ضیغم کوئی بچتا ہے جی — سر پہ یہ جو کھوں ہے لی اب تو جو کچھ ہو سو ہو[۵۱]

نساخ نے لکھا ہے کہ "غزل مرقومہ بالا بہت سے بحور و اوزان مختلفہ میں موزوں ہے اور پڑھی جاتی ہے اور یہ بہت بڑی اور مشکل صنعت ہے[۵۲]"۔

سخن شعرا میں ضیغم کے ایک سو اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ انھوں نے اپنا دیوان

---

۵۱ اس غزل میں دس شعر ہیں

۵۲ سخن شعرا ص ۲۹۴

بھی ترتیب دیا ہوگا لیکن اب ناپید ہے۔ ان کے منتخبہ کلام سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ضیغم خالص غزل گو تھے اور انھوں نے بھی روایت سے ہٹ کر اپنی غزل میں کوئی اجتہاد نہیں کیا۔ چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

بچا با ہے تو گرمیٔ داغِ جگر ہٹاؤں — اے مہربان ابھی تو یہ سورج گہن میں ہے

رخ میں ہے گرمیٔ غضب ہر بات میں اعجاز ہے — حسن ہے جلوہ نما رخ کا عجب انداز ہے

ہجر میں تیرے صنم ہر دم ہوں پیتا اپنا خوں — تا لب آیا ہے دم جینا ہے اب مجھ پر زبوں

حور کے غم سے ہے غلمان کے صدمے ضیغم — بعد مردن بھی رہا ہمکو نہ آرام سے کام

نواب سیّد محمد آزاد

نواب سید محمد آزاد بنگال کے مشہور فارسی گو شاعر نواب سید محمود آزاد کے حقیقی بھائی تھے۔ نواب محمود آزاد کے فارسی کلام کا مجموعہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں موجود ہے، وہ اردو کے بھی شاعر تھے اور غالب سے اصلاح لی تھی لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصہ ڈھاکہ میں گذرا۔ ان کا اردو کلام دستیاب نہیں ہے۔

ان کے بڑے بھائی سید محمد آزاد ۱۸۴۷ء میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید اسد الدین حیدر تھا جن کا شمار ڈھاکہ کے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ نواب صاحب نے ابتدائی تعلیم آغا احمد علی اصفہانی سے حاصل کی جو فارسی کے مستند عالم تھے اور "یہ وہی شخص ہیں جن سے مرزا غالب سے برہان قاطع کے بارہ میں معرکے رہے"[1]

نواب آزاد نے انگریزی کی تعلیم گو باضابطہ حاصل نہیں کی لیکن اپنے ذاتی مطالعے سے انگریزی میں خاصی استعداد حاصل کر لی تھی اور انھوں نے کئی انگریزی ناول کے ترجمے بھی کئے جو اب زمانہ برد ہو چکے ہیں۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد نواب صاحب سب رجسٹرار ہوئے اور ترقی کر کے انسپکٹر جنرل رجسٹریشن ہوئے اور حکومت برطانیہ سے انھیں خان بہادر کا خطاب بھی ملا۔ دو بار وہ بنگال کونسل کے رکن منتخب ہوئے اور کامیاب زندگی گذارنے کے بعد ۱۹۱۷ء میں نواب صاحب نے دار البقا کا سفر کیا۔

---

[1] تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، ترجمہ مرزا محمد عسکری ص ۱۰۶۱

نواب صاحب اچھے ادیب تھے، انھوں نے شاعری کی جانب توجہ نہیں دی اور نثر کے میدان کو ہی اپنی فکر کی جولانگاہ بنایا۔ انھوں نے کئی کتابیں ترتیب دیں، لیکن ان میں ان کے مجموعہ خیالات آزاد اور نوابی دربار ناول کو ہی قبول عام نصیب ہو سکا۔ ان کی ایک اور دلچسپ کتاب "نئی لغت" ہے جو ظریفانہ رنگ میں مقفیٰ لکھی گئی ہے۔ اس کو اپنے زمانے میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ نواب آزاد نے ڈراما نگاری پر بھی خاصہ توجہ دی تھی۔ پروفیسر عبدالغفور شہباز[1] خیالات آزاد کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"اس مجموعہ میں جس قدر تحریریں ہیں شوخی ظرافت آمیز ہیں ...... بہت سے ڈرامے (ناٹک) جو اس شخص کے قلم جادو رقم سے مختلف، خوش مضامین پر نکلے متروک النظر کئے گئے اس لئے کہ وہ بجائے خود ایک رسالہ جداگانہ کے مقتضی ہیں۔"

نواب صاحب کی مشہور تصنیف نوابی دربار ہے جس میں پرانے زمانے کے خستہ حال اور فاقہ مست نواب کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔ یہ ناول سے زیادہ ڈراما ہے۔ اس میں ڈرامائی انداز کی وجہ سے بلا کا زور پیدا ہو گیا ہے اور قصہ نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ طنز و مزاح کا اعلیٰ نمونہ بھی۔

---

[1] پروفیسر شہباز کا مفصل حال دوسری جلد میں شامل ہے

اردو صحافت

اردو نثر کا جنم بھوم کلکتہ ہے۔ اردو صحافت کا پودا بھی نثر کے اس جنم بھوم میں اگا بڑھا اور پھیلا۔ چھاپے خانے کی ایجاد کے بعد اخبارات کی اشاعت شروع ہوئی۔ عیسائی مشنری نے تبلیغی کام کے لئے انگریزی اور بنگلہ زبانوں میں رسالے نکالے۔ عیسائی مشنریوں کی کاٹ کے لئے سماچار درپن نکالا گیا۔ یہ ہندوستانی زبان کا پہلا اخبار ہے جو بنگال میں شائع ہوا۔ اس کے قبل انگریزی زبان میں ہیکی گزٹ ۱۷۸۰ء میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا تھا۔ لیکن اردو کا سب سے پہلا اخبار جام جہاں نما مارچ ۱۸۲۲ء میں یہاں سے نکلا۔ چونکہ اردو نثر اس وقت خام تھی اور ابتدائی منزل میں تھی لہذا جام جہاں نما کو قبول عام کی سند نہ مل سکی اور اس کے مدیر ہری ہردت منشی اور سداسکھ نے فارسی میں نکالنا شروع کیا۔ لیکن ضمیمہ اردو میں ہی نکلتا رہا۔

جام جہاں نما کو اردو صحافت میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے اردو صحافت کی ایک الگ راہ متعین کرنے میں اس اخبار کا حصہ ہے جام جہاں نما میں ملکی خبریں جو دلچسپ ہوتی تھیں نمایاں جگہ پاتی تھیں۔ نوابوں، جاگیرداروں اور زمینداروں کے مقدمات کی دلچسپ روداد بھی تفصیل سے دی جاتی تھی۔

جام جہاں نما کے سنہ اشاعت میں اختلاف ہے اکثر مورخین کا خیال ہے

کہ یہ اخبار پہلے فارسی زبان میں جاری ہوا۔ سجن لال صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ

"جام جہاں نما (فارسی) ۲۸ مارچ ۱۸۲۲ء کو جاری ہوا اور اردو کا ضمیمہ ۲۹ مارچ ۱۸۲۲ء سے جاری ہو کر ۱۸۲۴ء میں بند ہو گیا اور دوبارہ ۱۸۲۵ء میں شائع ہوا۔[1]"

سجن لال صاحب نے سنی سنائی باتوں پر اعتماد کر کے ایسا لکھ دیا ہے کیونکہ ۲۸ مارچ ۱۸۲۲ء میں جام جہاں نما کی پہلی اشاعت اردو میں ہوئی تھی اس کے ایڈیٹر ہری دت اور منشی سدا سکھ تھے اور یہ سرکار۔ دڈ کلکتے سے شائع ہوتا تھا

کلکتہ جرنل نے ۸ مئی ۱۸۲۲ء کی اشاعت میں جام جہاں نما میں تبدیلیوں سے متعلق ایک اشتہار چھاپا ہے۔

"ہمارے مشتہرین حضرات نوٹ فرمالیں کہ ہندوستانی زبان کا اخبار "جام جہاں نما کی جو کچھ عرصہ سے جاری ہوا ہے اور جس کے چھ شمارے نکل چکے ہیں زبان میں تبدیلی لائی جا رہی ہے"۔

ظاہر ہے کہ ہندوستانی زبان فارسی نہیں ہو سکتی ہے اور اس سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ ابتدا میں جام جہاں نما اردو میں شائع ہوا پھر فارسی میں اور کچھ دنوں کے بعد پھر اردو میں اس کا ضمیمہ شائع ہونے لگا۔ یہ اخبار ۱۸۳۸ء تک شائع ہوتا رہا۔ اور اس کو اردو صحافت میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

---

[1] دیکھئے اسلامک کلچر بابت جنوری ۱۹۴۸ء

دارالسلطنت جام جہاں نما کے بعد بھی کلکتہ گائیڈ، مناظر الاخبار، سلطان الاخبار جاری ہوئے لیکن یہ اصل میں فارسی کے اخبار تھے اردو کا ایک صفحہ ضمنی ہوتا تھا اور ابتدا میں اردو بنگال کے شرفا میں بہت زیادہ مقبول نہیں ہوئی تھی۔ ادبی زبان فارسی تھی۔ لہذا ان اخباروں کو مقبولیت اور شہرت نصیب نہ ہو سکی۔ ۱۸۸۰ء میں کلکتہ سے ایک مشہور اخبار دارالسلطنت جاری ہوا جو آٹھ سال تک چلتا رہا۔ اور اسے قبولِ عام کی سند بھی ملی۔ اس اخبار کے شمارہ نمبر ۸ ، ۷ بابت ، اکتوبر ۱۸۸۵ء سے پتا چلتا ہے کہ دارالسلطنت ۱۸۸۰ء میں جاری ہوا تھا۔ پہلے صفحہ پر اشتہارات ہوتے تھے۔ شادی، بیماری اور علاج کے متعلق پہلے صفحہ پر اشتہارات پھیلے ہوئے ہیں۔ اخبار کے اشتہار کے مطابق دارالسلطنت ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ چہار شنبہ اور شنبہ کو بلا درخواست کسی کے پاس نہیں جاتا تھا۔ دو آنے کے ٹکٹ کی ترسیل پر نمونہ بھیجا جاتا تھا۔ اس میں مختلف خبروں کے علاوہ مفید اور معلومات افزا مضامین بھی چھپتے تھے۔ چھپائی کا فن ابتدائی مرحلہ میں تھا۔ اخبار کی چھپائی ناقص اور لیتھو کی تمام روایتی برائیوں کے مطابق تھی۔ بعض خبریں اور مضامین پتھر کی ہی نذر ہو گئے تھے۔ اور پڑھے نہیں جاتے تھے۔

اس اخبار کے مالک و مہتمم محمد احسان اللہ تھے۔ صفحہ ۲ پر پہلے کالم میں "اخبارات برقی" کے عنوان سے اہم خبروں کا خلاصہ درج ہوتا تھا۔ نمونہ درج ہے۔

"شملہ ۱۳ اکتوبر، تنجور کے اسٹیشن ماسٹر غلام محی الدین صاحب کو عالیجناب وائسرائے ہند بہادر نے خان بہادر کا خطاب دیا ہے۔

لندن ۔ روسی اخبارات کے بیان سے معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ روس نے
پرنس الگزینڈر کو معزول کرنے کا عہد کر لیا ہے ۔"
ایک صفحہ میں صرف تین کالم ہوتے تھے ۔ دوسرے کالم میں اداریہ ہوتا
تھا ۔ پانچویں صفحہ پر انگریزی اخبارات کے ترجمے درج ہوتے تھے ۔ کلکتہ ایک
مستقل کالم تھا ۔ اس عنوان کے تحت کلکتہ کی دلچسپ اور سنسنی خیز خبریں
شائع کی جاتی تھیں ۔
"جس عورت نے اپنے دو مہینے کے حرامی بچے کو درخت کے نیچے پھینک دیا تھا ۔
وہ سشن سپرد ہو گئی ۔"
ایک کانسٹبل کو پاؤ بھر شکر چوری کرنے کے جرم میں نو مہینے کی سخت سزا
ہوئی ۔ یہ سزا نہایت عبرت دلانے والی ہے کیونکہ جب محافظ چور ہوں تو
چوروں کا کیونکر پتا چلے ۔"
سلطان الاخبار کئی برسوں تک جاری رہا ۔ پھر مالی دشواریوں کی وجہ
سے بند ہو گیا ۔ سلطان الاخبار کے بعد کلکتہ گزٹ ، اردو اخبار اور ایسے بہت سے
اخبار جاری ہوئے اور بند ہوئے ۔ انیسویں صدی میں بنگال میں دراصل فارسی
زبان سرکاری زبان کی حیثیت کھو جانے کے باوجود تعلیم یافتہ طبقہ میں مقبول تھی
اس لئے اردو عوامی زبان تو بن سکی ، شرفا اور امرا میں مقبول نہیں ہوئی تھی ۔
بیسویں صدی میں جب اردو شاعری کو بنگال میں قبول عام کی سند ملی
اور شرفا اور امرا کے گھروں میں داخل ہوئی تو اردو نثر بھی عام ہوئی اور صحافت
نثر کو مروج کرنے کا پہلا زینہ تھی ۔ بیسویں صدی میں اردو صحافت کو نیا رنگ

اور نیا روپ "الہلال" نے دیا۔ مولانا ابوالکلام آزادؔ اس کے مدیر اور روحِ رواں تھے۔ الہلال نے تحریک آزادی کو آگے بڑھانے اور ہندوستانی قوم کی بے حس رگوں میں حریت و آزادی کی لہر دوڑا دی۔ الہلال کی طاقت بے پناہ تھی۔ حکومت برطانیہ نے اس کی آواز کو دبانے اور طاقت کو توڑنے کے لئے طرح طرح کی پابندیاں لگائیں لیکن مولانا آزاد کا قلم شعلہ اگلتا رہا۔ اور بنگال میں اردو صحافت نے بھی ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ الہلال کے بعد بے شمار اخبارات اور رسالے بنگال سے شائع ہوئے۔ چونکہ بیسویں صدی کا یہ مقالہ احاطہ نہیں کرتا ہے لہذا یہاں اتنا ہی لکھدینا کافی ہے کہ انیسویں صدی میں اردو صحافت کا جو پودا ۱۸۲۲ء میں لگایا گیا تھا، بیسویں صدی میں تناور درخت بن کر وہ پھل پھول رہا ہے اور آج بھی کلکتے سے آزادؔ ہند، روزانہ ہند، عصر جدید، آبشار، امروز اور بہت سے دوسرے اخبارات و رسالے شائع ہو رہے ہیں اور اردو صحافت کے معیار کو بلند کرنے میں اپنا اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں۔

لہ بیسویں صدی کے اردو ادب کا ذکر دوسرے حصے میں تفصیل سے کیا گیا ہے جس کی ترتیب مکمل ہو گئی ہے اور طباعت کا کام عنقریب شروع ہو رہا ہے۔ دوسرے حصے میں ان تمام اخبارات کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے ——— مؤلف

تمـــــــــــــــــــــام شد

اشاریۂ اشخاص وکتب

اشاریۂ اشخاص

ب

خ

س

ش

کھ

گ

ی

اشاریۂ کتب

پ

ت

Prof. Mujibur Rahman,

B.A., W. B. E. S.,

HEAD OF THE DEPT. OF PERSIAN.

MAULANA AZAD COLLEGE. CALCUTTA.

پروفیسر جاوید نہال (ام۔ ان۔ حسن ہاشمی) نے " بیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" لکھ کر اردو ادب پر احسان کیا ہے۔ انہوں نے سخت عرق ریزی۔ جفاکشی اور تحقیق اور تلاش کے بعد بنگال کے بہت سے ایسے شاعروں اور آدمیوں کو منظر عام پر لایا ہے جو اب تک قعر گمنامی میں پڑے تھے ان کی اس تحقیقی کتاب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ کیسی کیسی چنگاریاں بنگال کی خاکستر میں دبی ہوئی ہیں۔

پروفیسر موصوف کی یہ کتاب مفید دلچسپ اور معلومات افزا ہے اور ارباب علم و دانش کے لئے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

پروفیسر مجیب الرحمن

صدر شعبۂ فارسی مولانا آزاد کالج کلکتہ

Abbas Ali Khan (Bekhud)
M A., W. B. E. S

HEAD OF THE DEPARTMENT OF
ARABIC, PERSIAN AND URDU,
MAULANA AZAD COLLEGE, CALCUTTA.
AND
LECTURER, CALCUTTA UNIVERSITY.

۷۸۶

پروفیسر نہال حسن ہاشمی معروف بہ جاوید نہال طالبعلمی ہی کے زمانے سے لکھنے پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں یعنی " ثریا کئی قدیم ہیں دود چراغ کے
اُن کے افسانے اور مقالے ملک کے موقر رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں - لیکن کتاب زیر نظر " انیسویں صدی میں بنگال کا اُردو ادب " ان کا ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے - دنیائے ادب اردو میں بنگالہ کے گرانقدر خدمات کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر تحقیق و تلاش کی روشنی میں منظر عام پر پیش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں -

پروفیسر ہاشمی کا اردو ادب پر احسان ہے کہ انہوں نے اپنی تحقیق و تلاش سے اس میں نمایاں اضافہ کیا ہے - زبان رواں دواں بیان دلکش اور مضمون کے اعتبار سے متین و سنجیدہ ہے -

اُمید ہے کہ اُردو اور ادب اردو کے چاہنے والے اس گراں قدر خدمت کی قدر کرینگے - میں تہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں - پروفیسر موصوف ماشاءاللہ ابھی جوان سال ہیں - خدا اُنکی عمر میں برکت دے کہ آئندہ اُن سے بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں -

عباس علي خان بيخود

Head of the Department.

DEPARTMENT OF SUNNI THEOLOGY
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH

٧٨٦

اردو ادب میں اضافہ

اردو زبان و ادب کی ترقی میں بنگال کا جو حصہ رہا ہے وہ بہت اہم اور شاندار ہے لیکن اردو ادب کے طلبا اور بہت سے اساتذہ بھی فورٹ ولیم کالج کے سوا اس سے کم واقف ہیں اس بنا پر عزیز مکرم جاوید نہال کی کتاب جو در حقیقت ڈی لٹ کا مقالہ ہے بڑی قابل قدر اور لائق تحسین ہے کہ موصوف نے چھ برس کی محنت اور تحقیق و تلاش کے بعد انیسویں صدی میں بنگال میں اردو ادب کا ایک ایسا مرقع بنا کر پیش کیا ہے جو جامع بھی ہے اور مبسوط بھی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کوئی ماخذ ایسا نہیں ہے جس سے انہوں نے مدد نہ لی ہو تحقیق کے ساتھ تبصرہ اور تنقید بھی ہے جس پر اعتدال فکر اور سنجیدگی رائے کا عنصر غالب ہے۔

امید ہے کہ ارباب علم و ادب لائق مصنف کی محنت و کاوش کی قدر کریں گے اور طلبا اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

دستخط

سعید احمد اکبر آبادی

Abdur Rafu M.A.
DEPARTMENT OF MODERN INDIAN LANGUAGES (URDU)
THE UNIVERSITY OF CALCUTTA

40B, TALTALLA LANE,
CALCUTTA-16.

Date........................19

۷۸۶

پروفیسر جاوید نہال کی گرانقدر تصنیف "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" اپنی افادیت کے اعتبار سے اردو زبان کے آغاز و ارتقا سے متعلق نشان راہ کی حیثیت رکھتی ہے پروفیسر موصوف نے بنگال میں اردو کے نشو و نما کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے قاری کو بنگلہ زبان، بنگلہ کلچر اور اسکے تاریخی اور سماجی پس منظر سے بھی متعارف کرنے کی کوشش کی ہے اور بڑی عرق ریزی سے ان لفظوں کی ایک فہرست مرتب کر دی ہے جو بنگلہ زبان نے اردو سے مستعار لئے ہیں جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بنگالہ کی سرزمین میں اردو کی جڑیں کتنی گہری ہیں اور دو زبانیں اور دو کلچر کس طرح ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں اس سے قبل بھی اس موضوع پر کتابیں لکھی جاچکی ہیں جو تشنہ ہیں اور صرف ابتدائی خاکے ہی ملتے ہیں لیکن پروفیسر جاوید نہال نے اس ضمن میں تحقیق ترتیب اور مواد فراہمی کے سلسلے میں جو کاوش کی ہیں وہ انہی کا حصہ ہیں انہوں نے مضمون کو وسعت بخشی ہے امید ہے کہ مختلف امتحانات میں شریک ہونے والے طلبہ کے لئے یہ کتاب مفید ہوگی زبان و بیان اور سے الگ تنقید کے اعتبار سے یہ کتاب اپنی مثال آپ ہے

پروفیسر عبدالرؤف

ضمیمہ

۲

واجد علی شاہ اختر

واجد علی شاہ اختر ۱۸۲۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ بیس سال لکھنؤ کی حسین فضا اور رنگین جنت میں گزارے، واجد علی شاہ کا لکھنؤ ادب، شاعری رقص وسرود اور رنگارنگ محفلوں کا گہوارہ تھا، اور وہاں کی زندگی میں زوال آمادہ مغلیہ سلطنت کے دبدبے، عظمت وسطوت اور خوش حال زندگی کی آخری تصویر دیکھی جا سکتی تھی۔

واجد علی شاہ کی سرپرستی، دریادلی اور فیاضی کی وجہ سے فن کاروں کی نہ صرف قدر ہوئی، بلکہ پوجا بھی، اسی حوصلہ افزائی اور قدردانی کی وجہ سے لکھنؤ میں، ملک کے ہر حصے سے کامیاب اور ذی شعور فن کار سمٹ آئے تھے۔ خود واجد علی شاہ اختر میں ایک ساتھ ہی گوناگوں خوبیاں یک جا ہوگئی تھیں۔

رئیس احمد جعفری نے اپنی کتاب 'واجد علی شاہ اور ان کا عہد' میں لکھنؤ کے اس آخری تاجدار کی بھرپور شخصیت کی دل آویز تصویر کھینچی ہے۔

"واجد علی شاہ قدرت کی طرف سے غیر معمولی دماغ لے کر آئے تھے۔ وہ بیک وقت صاحبِ تاج وتخت بھی تھے اور اقلیم سخن کے شہریار بھی، وہ آرٹسٹ وفن کار بھی تھے، وہ مصنف ومولف بھی۔ وہ نثار بھی تھے اور شاعر بھی، وہ شگفتہ طبع بھی تھے اور بذلہ سنج بھی تھے اور جودت فکر ونظر کے سرمایہ دار بھی۔ وہ ماہر موسیقی بھی تھے اور رقص کے اقدام پسپائی، حرکت، جنبش اور اعضا کے توڑ موڑ کے فن پر بھی ماہرانہ نگاہ رکھتے تھے وہ عاشق صادق بھی تھے، اور رند

لاابالی بھی ہے۔"

واجد علی شاہ کی اس رنگا رنگ شخصیت میں مقناطیسی خاصیت تھی جو ہر فن کے باکمال لوگوں کو ان کے دربار میں کھینچ لے آتی تھی اور جب لکھنؤ کا سہاگ فرنگیوں کے ہاتھ لٹا اور مغل تہذیب تباہ و برباد ہوئی تو واجد علی شاہ کی ارضی جنت بھی لکھنؤ سے کلکتے منتقل ہو گئی۔ انگریز حاکموں نے اس فیاض اور علم دوست تاجدار کو تاج و تخت سے محروم کر دیا۔ اور جلا وطن بھی۔ انہیں لکھنؤ کی عزیز گلیاں ہمیشہ کے لیے چھوڑنی پڑیں۔ اور لکھنؤ کے شہر میں ویرانیاں ٹوٹ پڑیں، لیکن کلکتے کی یہ خوش بختی ہوئی کیوں کہ لکھنؤ کی تباہی کے بعد موچی کھولا یعنی مٹیا برج میں ایک نئے چھوٹے سے لکھنؤ نے جنم لیا۔۔۔

واجد علی شاہ پر انگریزوں کی ستم رانیاں، اور لکھنؤ کی تباہی کے تصور سے ہی دلوں میں شدید نفرت کی لہر اٹھتی ہے۔ ان کے عہد کے ایک مورخ نے لکھا ہے کہ

"گورے ہاتھیوں پر بیٹھے گولیاں برساتے چلے جاتے تھے۔ عبادت خانہ کو تک نگاہ کی، راستے میں جو سامنے آیا شکار کیا۔ مسجد فخر الحسین میں کھانا کھایا ہے"

اور دوسری جگہ اسی مورخ نے تحریر کیا ہے کہ

"جب دولت خانہ کو درست حسب دیکھا، مسمار کر دیا، بادشاہ باغ ۳۵ لاکھ

سے واجد علی شاہ اور ان کا عہد، رئیس جعفری صہ ١٢

ے قیصر التواریخ جلد دوم ص

میں تیار ہوا تھا، ۵ ۲ ہزار میں راجہ کپور تھلہ نے مول لیا۔ دل آرام کی کوٹھی بھی یک راجہ نے خرید لی[1] "

لکھنؤ کی اس تباہی کے ساتھ واجد علی شاہ کو تینتیس سال کی عمر میں بنگال کی مرطوب آب و ہوا میں دن گزارنے پڑے۔ واجد علی شاہ کو لکھنؤ کے اُجڑنے کا غم ہمیشہ رہا جو ان کے دل کو جلاتا رہا، اس آگ میں موم کی شمع کی طرح تمام عمر پگھلتے رہے، ایک شکستہ دِل، مجبور اور محبوس شاہ کو ادب و شاعری اور رقص و سرود کی رنگین محافل میں پناہ ملی، اور اس نے بہت سی کتابیں تالیف و تصنیف کیں اور اردو اُردو ادب میں اَنمٹ نقوش چھوڑ گئے، ــ

واجد علی شاہ نے اپنا اور اپنے عہد کی مشہور و معروف شخصیتوں کا حال اپنی کتاب بنی میں درج کیا ہے۔

"یہ فقیر راقم و مصنف و مولف سراپا تقصیر پندرہ برس کے سن میں والد جنّت مکانی نے ولی عہد اور وزیر کیا اور پچیس برس کے سن میں بلا صدور ظلم و نا انصافی و بے آزار رعیت بے سبب تخت سے محروم کیا گیا۔ بتیس برس سے کلکتہ محلہ موچی کھولی ٹیا برج میں قیام ہے، پچاس برس کا سن ہوا، ۲۶ مہینے فورٹ ولیم میں ناحق قید رہا، پچاس ۵۰ برس کے سن میں اتنی جلدیں کتابوں کی تصنیف کیں،

اختر ملک، افسانۂ عشق، ارشاد خاقانی، ایمان بحر الہدایت، بحر الفت، بحر مختلف، کتاب بنی، تاریخ مذہب، تاریخ ممتاز، تاریخ خلوص، تاریخ فراق،

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۳۵۷

تاریخ ممتاز، تاریخ غزالہ، تاریخ نوا، تاریخ جمشیدی، تاریخ دہر، تجلّی عشق، جوہر عروض، حزن اختری، دریائے تعشق، دستور واجدیہ، دفتر پریشاں، دفتر مبارک دفتر ہمایوں، دلہن، سخن اشرف، شعاع فیض، صحیفۂ سلطانی، صوت المبارک عشق نامہ، قمر مضمون، کلیات اختر، گلدستۂ عاشقاں، مسودات مرثیہ، ماہی نامہ مرقع فرح، مباحثہ بین النفس والعقل، ناجو، نظم ارشد، نصائح اختری، ہیبت حیدری، مجموعہ واجدیہ وغیرہ"

یہ سب کتابیں واجد علی شاہ کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھیں، مگر آج ان میں دو چار ہی زمانہ برد ہونے سے رہ گئی ہوں گی۔

واجد علی شاہ نے جلاوطنی کے بعد مٹیا برج میں بھی ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزاری اور غم و آلام کو شکست دینے کی خاطر ادب و شاعری کے علاوہ رقص و سرود کی رنگین مگر پر فریب دنیا میں پناہ لی، — اور اپنی زندگی کے تاریک ایام میں بے ساری کتابیں ترتیب اور تالیف کیں۔ اختر شاعر تھے، انہوں نے کئی دواوین ترتیب دیئے، ڈراما اور رہس میں کمال پیدا کیا، وہ باکمال اور نغز گو شاعر تھے، فتح الدولہ برق اور اسیر سے اصلاح لیتے تھے، ایک استاد نے ساتھ چھوڑ دیا، دوسرے نے ہر حال میں شاگرد کا ساتھ دیا، اور ان کے ساتھ ہی برق نے قید میں آخری ہچکیاں لیں جس کی تصدیق واجد علی شاہ نے خود کی ہے۔

"استاد مرحوم بعد انتزاع سلطنت ہمراہ آئے اور زندان قلعہ ولیم میں میرے ساتھ قید ہوئے زندان میں جاں بحق ہوئے۔ دم واپسیں ان کی زبان پر یہ مقطع تھا۔"

برقؔ جو منھ سے کہا تھا وہی کر اٹھے
جان دی آپ کے دروازہ پر اور مر کے اٹھے

اخترؔ کی شاعری بھی لکھنوی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے، انہوں نے جلاوطنی کی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو اپنی شاعری میں سمونے کی کبھی کوشش نہیں کی، ان کی غزلیں بھی روایتی خطوط پر ہی چلتی رہیں۔ ہجر و فراق اور گل و بلبل سے فرضی عشق پر ہی اس کی بنیاد کھڑی ہے۔ ان کے چند اشعار نمونتاً درج ہیں ؂

لگی ہو چوٹ جس کو عشق کی باتوں میں اچھا ہے
زباں خامہ پیدا کیا ہے مومیائی کا

ہر عاشق دل سوختہ دیوانہ ہے اس کا وہ شمع جلی ہے، یہ پروانہ ہے اس کا

رخ اپنا ہم کو دکھلایا تو ہوتا
ذرا سورج کو شرمایا تو ہوتا

اخترؔ اس بے وفا سے ناحق وفا کا دھیان ہے
تو نے یہ کیسا خیالِ خام اے ناداں کیا

لکھنؤ چھوٹنے کا غم ان کے لئے دائمی غم بن گیا تھا۔ قیام کلکتے کے دوران میں بے کسی و بے بسی کی یاد انہیں تلملاتی و تڑپاتی رہتی تھی جس کا اظہار اخترؔ نے ان اشعار میں کیا ہے ؂

زمانہ تھا پسا کرتے تھے گوہر پاؤں کے نیچے
پڑا ہے دھوپ سر پر اور کنکر پاؤں کے نیچے

یہی تشویش شب و روز ہے بنگالہ میں لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا

یوں تو شاہانِ جہاں پر ہے پڑا وقت مگر
ختم ہے اختر بے کس پہ جفائے غربت[1]

واجد علی شاہ اختر کی اکثر کتابیں زمانہ بُرد ہو چکی ہیں۔ مگر ان کا دیوان گلدستۂ عاشقاں جو انہوں نے موچی محل میں ترتیب دیا تھا، باقی ہے۔ یہ دیوان ۱۲۵۵ھ میں چھپ کر مقبولِ انام ہوا، مہتمم مطبع محمدی، منشی محمد حسین نے نہایت اہتمام سے چھاپا تھا، "گلدستۂ عاشقاں" میں واجد علی شاہ کی غزلیں ردیف وار ملتی ہیں، اور یہ خاصہ ضخیم بھی ہے:

یہ غزلیں بلاشبہ رطب و یابس سے خالی نہیں، مگر اسلوب جاندار ہے، اور سلاست، بلاغت اور شگفتگی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

واجد علی شاہ ٹھُمریاں[2] بھی لکھتے تھے اور ان کا دوسرا تخلص جانِ عالم پیا بھی تھا۔ کلکتے میں بے کسی اور غربت ملنگ گزارنے کے بعد مٹیا برج میں منتقل گئے۔ ان کی موت کے بارہ میں شرر لکھنوی نے لکھا ہے کہ

"خفیف علالت کے بعد ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء ۲ محرم ۱۳۰۵ھ کو گھڑی رات گئے انتقال کیا۔ انتقال کے تیسرے دن اپنے تیار کردہ امام باڑے سبطین آباد میں پیوندِ زمین ہوئے، جو مٹیا برج میں واقع ہے۔"

---

[1] کلیات واجد علی شاہ اختر۔

[2] چلو جیو سکھی اب رہس کریں   اختر پیا کے من کو رجھا ئیں

[3] جانِ عالم پیا، شرر لکھنوی

واجد علی شاہ اختر کی وفات کے ساتھ ایک عہد گزر گیا، لیکن ان کی جلا وطنی نے مٹیا برج کو ایک دوامی زندگی عطا کر دی، ان کے ہم رکاب لکھنؤ سے ادیبوں اور شاعروں کا ایک چھوٹا سا لشکر مٹیا برج آیا تھا، جس کے بہت سے سپاہی اختر کی موت کے بعد لکھنؤ لوٹ گئے، ان میں عبد الحلیم شرر لکھنوی قابل ذکر ہیں۔ فسفق اور مائل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں کچھ یہیں کے ہو کر رہ گئے، جنہوں نے اپنے خونِ جگر سے مٹیا برج میں شاعری کی شمع کو روشن رکھا۔

شیخ الٰہی بخش تبسّم

شیخ الٰہی بخش تبسّم بھی واجد علی شاہ اختر کے ہمراہ کلکتہ آئے اور مٹیا برج میں مستقل سکونت اختیار کر لی، واجد علی شاہ سے وابستہ رہے ' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے کی ہوا راس نہیں آئی، اور ان کو مٹیا برج میں وہ شہرت نصیب نہ ہو سکی جو دوسرے شاعروں کو نصیب نہ ہوئی۔
عبدالغفور خاں نسّاخ نے سخن شعرا میں ان کا مختصر حال بھی نہیں لکھا ہے۔
تبسّم کے معاصر، مولوی بخت رام پوری نے تبسّم کا حال اختصار سے لکھا ہے اور غنچۂ ارم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تبسّم بھی شعر و ادب کی دنیا میں کافی مشہور تھے۔ تبسّم چوں کہ اہل سنت سے تعلق رکھتے تھے، لہٰذا ان کو مٹیا برج میں کوئی خاص جگہ نہ مل سکی۔ تذکرہ غنچۂ ارم کے مؤلف کا کہنا ہے کہ
"چوں کہ مٹیا برج میں اہل تشیع کی کثرت ہے، لہٰذا غربت کی زندگی گزار رہے ہیں، صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ تبسّم صاحب اہلِ سنت والجماعت سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے ہمیشہ صراطِ مستقیم پر گامزن رہے [1]"
تبسّم منشی مظفر علی اسیر سے اصلاح لیتے تھے، تذکرۂ غنچۂ ارم میں ان کی کئی غزلیں درج ہیں، تبسّم کے کلام کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خالص غزل گو شاعر تھے اور ان کے یہاں بھی کوئی چونکا دینے والا یا کھلکتا ہوا شعر

---

[1] تذکرہ غنچۂ ارم نامی فارسی عبارت کا ترجمہ ص ۷

نہیں ملتا، چند اشعار نمونتاً درج ہیں ؎

نہ کیوں کر ہو لقب عیار تیرا | وفا ہوتا نہیں اقرار تیرا
پھنساتا ہے ہزاروں مرغِ دل کو | یہ دامِ گیسوئے خمدار تیرا

مل چکے مٹی میں کبھی ہم ہو چکے برباد بھی | اب کہاں یہ خاک اے چرخ ستمگر لے چلا
بعد مرنے کے دکھایا رنگ اپنا عشق نے | قبر پر میری وہ گل پھولوں کی چادر لے چلا
اے تبسم جب ہوا درپیش دُنیا سے سفر | میں نہ تکیہ لے چلا کوئی نہ بستر لے چلا

ہر لحظہ نہ کہہ وصل کو اون سے تبسم
دلوائے گی تعزیر یہ تقریر کسی وقت

تبسم کا انتقال مٹیا برج میں ہوا، اور وہیں وہ پیوند زمین ہوئے۔

فتح الدولہ برق

برق واجد علی شاہ اختر کے اُستاد تھے، اُن کو اپنے شاگرد سے بے پناہ محبت تھی جب واجد علی شاہ جلاوطن ہوئے تو ضعیف العمری کے باوجود برق نے اپنے محسن اور چہیتے شاگرد کا ساتھ نہ چھوڑا اور اختر کے ساتھ کلکتے چلے آئے اور فورٹ ولیم کے قلعہ میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔

برق تخلص تھا، ان کا نام بخشی الملک مرزا محمد رضا خاں تھا وہ امام بخش

ناسخ کے نامور شاگرد تھے۔

برق بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ نئی نئی تشبیہات اختراع کرنے میں
ان کو کمال تھا، مگر افسوس ہے کہ شاہی دربار کے رنگین ماحول نے انہیں بھی دنیا کی
تلخیوں کو محسوس کرنے نہیں دیا، اور ان کی شاعری بھی گل و بلبل کنگھی چوٹی اور بانکے
چتون کے گورکھ دھندوں میں اُلجھی رہ گئی اور لکھنؤ کی روایتی حدود سے باہر نہ ہوئی۔
برق کے مشہور شاگردوں میں جلال اور سحر ہوئے ہیں۔

ناسخ نے اپنے تذکرے میں برق کا حال اختصار سے لکھا ہے۔
"برق تخلص فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا خاں بہادر خلف کاظم علی وہاں کے
شاگرد ناسخ واجد علی شاہ کے ہمراہ کلکتہ میں آئے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں یہیں وفات پائی
شعر خوب کہتے تھے۔ صاحب دیوان گزرے ہیں[1]

ناسخ نے برق کے بارہ اشعار بھی سخن شعرا میں دیئے ہیں ۔

یاد مژگاں آشنائے بحر فرقت ہے مجھے
مغتنم دریا میں تنکے کا سہارا ہو گیا

کچھ پستی نصیب سے اپنے عجب نہیں	بدلے جبیں کے خطِ تقدیر پاؤں میں
قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو	دیکھ لینا مجھے تم موسمِ گل آنے دو
ہے کشتِ آیۂ رحمت ہوں غنیمت جانو	سال بھر روز لگاتی ہے جھڑی میری آنکھ
دیکھئے حالتِ دل درد سے کیا ہوتی ہے	روح ناکام شبِ فرقت سے فنا ہوتی ہے

---

[1] سخن شعرا ناسخ ص ۶۴

میں جو روتا ہوں تو کہتے ہیں مجھے ہنس ہنس کے

جو کرے عشق یہی اوس کی سزا ہوتی ہے

اودی کرتی لال کچین اور اوس پہ سنہری گوٹ لگی

ابر سے نکلا چاند کا ٹکڑا برق کے دل پہ چوٹ لگی[1]

برق نہ صرف بڑے غزل گو شاعر تھے بلکہ ایک عظیم اور مخلص انسان بھی۔ واجد علی شاہ کی جلاوطنی کے وقت بہت سے لوگوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا، امیر لکھنوی جو اختر کے استاد تھے، ان کو بھول گئے، لیکن برق کی غیرت مند طبیعت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ شاگرد کا ساتھ دکھ کی گھڑی میں چھوڑ دیں اور قید میں ہی مرکر انہوں نے اپنے آپ کو زندۂ جاوید بنا دیا!

گلشن الدولہ بہار

گلشن الدولہ مرزا علی بہادر بہار لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری لکھنؤ کی ادبی فضا میں نکھری، اور واجد علی شاہ اختر کے ساتھ لکھنؤ سے شاعروں کا جو کارواں کلکتے آیا تھا، اس میں بہار بھی شامل تھے۔ بہار نے اپنی زندگی کے بقیہ ایام مٹیا برج میں گزارے۔ تذکرۂ غنچۂ ارم کے مؤلف مولوی نجف رام پوری نے لکھا ہے۔

---

[1] سخن شعرا النساخ ص ۹۳

"بہار گلشن الدولہ مرزا علی بہادر لکھنؤ مولد مٹیا برج کلکتہ مسکن ہے.... الخ"[1]
بہار کا لکھنؤ کے باکمال اور استادِ فن شاعروں میں شمار ہوتا تھا، اکثر
تذکرہ نویسوں نے بہار کا ذکر کیا ہے، لیکن قیامِ کلکتہ کے دوران میں، ان
کی زندگی گمنامی کی دبیز چادر میں لپٹی رہی۔ بہار حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ
کی محبت میں ان کے ہمراہ کلکتہ آئے اور بہت دِنوں تک مٹیا برج میں مقیم رہے،
مولوی نجف نے لکھا ہے کہ "ایسے صاحبِ کمال لوگوں کی وجہ سے کلکتہ کی تقدیر
جاگ اٹھی تھی، ورنہ کہاں کلکتہ اور کہاں ایسے صاحبِ کمال حضرات! ان
ہی صاحبِ کمال لوگوں نے کلکتہ کو باغ جنت بنا دیا تھا اور کلکتے کی ادبی
دنیا ان حضرات کے احسان سے ہمیشہ دبی رہے گی[2]"

بہار راسخ العقیدہ شیعہ تھے، اور مرثیہ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے، لیکن
اس کے باوجود وہ روشن خیال اور روشن ضمیر تھے، بہار نے حضرت محمد صلعم کی شان
میں ایک زبردست اور اثر انگیز نعت لکھی ہے جو ادبی دنیا میں بے حد
مقبول ہوئی۔

بہار نغز گو اور پُرگو شاعر تھے اور کئی اصنافِ سخن میں دست گاہ کامل
رکھتے تھے، ان کی غزلیں شگفتہ اور دِل میں اُتر جانے والی ہیں اور فن کا نہ
چابک دستی کا بہترین نمونہ بھی۔ بہار نے مراثی بھی لکھے، اور حمد و نعت بھی تاریخ

---

[1] تذکرہ غنچۂ ارم مطبوعہ ۱۲۹۵ھ ص ۴ ۵
[2] ایضاً ،، فارسی عبارت کا ترجمہ

قطعات بھی تحریر کئے اور نظمیں بھی لیکن ان کا اپنا رنگ غزلوں میں نمایاں ہوتا ہے اور دوسرے اُستاد فن شاعروں کی طرح بہار نے بھی غزل میں جدت پیدا کی، نادر تشبیہات، استعارے اور کنایوں کے برمحل استعمال نے ان کو لکھنؤ اسکول کے اساتذہ میں منفرد مقام عطا کیا۔

قیام مٹیا برج کے دوران میں بہار مشاعرے کی محافل میں بھی شریک ہوتے تھے۔ مولوی علی نجف رام پوری نے حضرت داغ کے اعزاز میں مشاعرے کی جو محفل منعقد کی تھی اس میں انہوں نے بڑی کامیاب غزل سُنائی تھی جو یہاں نقل کی جاتی ہے ؎

غزل

حسن کا نٹے گل عارض پر جو بو جائے گا — سبز خط پنکھڑیاں پھول کی ہو جائے گا

دیکھئے دور سے جوش آنسوؤں کے دریا کا — آج مجھکو ہی ادبل کر ڈبو جائے گا

زرع آخرت انسان کے لئے دُنیا ہے — وہی اُگے آئے گا جیسا کو بو جائے گا

شام سے نیند نہیں آئی مرے پہلو میں — کیا خبر تھی کہ نصیب آج ہی سو جائے گا

ہجر کی صبح پہ مرتے نہیں مرنے والے — آج کی رات جو ہونا ہے وہ ہو جائے گا

دل ہے آب آب گناہوں پہ خدا خیر کرے — یہ بھی بھیگے ہوئے دامن کو بھگو جائے گا

ہاتھ دھوئیے نہ مرے خون میں مہندی مل کر — آپ کا نام رنگ حنا نام ڈبو جائے گا

فتنۂ حشر سے تو شوخ ہے بچپن اوس کا — اب جوانی میں جو ہونا ہے وہ ہو جائے گا

اے بہار اس چمن عمر کی دو دن ہے بہار
پھر کوئی پھول نہ کانٹے کوئی بو جائے گا

سخن شعرا میں نساخ نے بہار کا حال اختصار سے لکھا ہے،

بہار تخلص مرزا علی رضا کو تخلف مرزا جانی علی بیگ لکھنوی شاگرد رشک کربلا کی بھی زیارت کی ہے۔ راقم نے ان کو کلکتہ کے مشاعروں میں دیکھا ہے۔ صاحب دیوان ہیں۔ نساخ نے ان کے کئی اشعار بھی نقل کئے ہیں[۱]

یاد کرتے ہیں سبک قافلے والے مجھکو | میں جو بچھڑا ہوں تو آواز درا آتی ہے
ایک میں ہوں سربازار ذلیل و رسوا | ایک وہ ہیں جنھیں گھر بیٹھے حیا آتی ہے

بہار کی شاعری بھی لکھنوی روایت کے مطابق ہے۔ انہوں نے دل کی شاعری کی اور فن و الفاظ کے طلسم میں کھوئے رہے۔ بہار کے آخری ایام پر پردہ پڑا ہوا ہے، واجد علی شاہ کی موت کے بعد بہار غالباً لکھنؤ لوٹ گئے۔

منشی عبدالکریم ابد

منشی عبدالکریم ابد بھی لکھنؤ میں پیدا ہوئے، لکھنؤ کی فضا میں ہی ان کی شاعری پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ ابد نے حکیم سید محمد سجاد دلوہانی کے آگے زانوئے تلمذ کیا، لکھنؤ کی تباہی کے بعد واجد علی شاہ کے ساتھ ابد بھی کلکتے آگئے تھے، ان کے متعلق مؤلف غنچۂ ارم نے لکھا ہے

"ابد منشی عبدالکریم یکے از احباب بے ریا و مخلصان با صدق و صفا، مؤلف اگرچہ لکھنوی اصل است مگر از زمانہ ممتد مقیم کلکتہ بودہ[۲]"

---

[۱] سخن شعرا نساخ ص ۷۹

[۲] تذکرۂ غنچۂ ارم ص ۵۶ - ۵۷

آبد شاعر سے زیادہ مخلص انسان اور ہمدرد دوست تھے، کلکتے میں
ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اور ان کی نیک طبیعت، رواداری اور عجز و انکسار
نے کلکتے کی ادبی محافل میں ان کی اپنی ایک الگ جگہ بنا دی تھی۔ آبد کا حافظہ
بہت تیز تھا، وہ کلکتے کے مشہور اخبار 'حبل المتین' اور 'جام جہاں نما' سے
وابستہ رہے، اور ان اخبارات میں نظموں کے حصے کی دیکھ بھال ان کے سپرد
تھی، آبد کو نعتیہ اشعار کہنے میں بھی ملکہ تھا اور انہوں نے اپنی نعتیہ نظموں کو ایک
مجموعہ کی شکل میں شائع کیا تھا، جو اب زمانہ بُرد ہو گیا، ان کے چند اشعار
بطور نمونہ مشتے از خروارے درج کئے جاتے ہیں ؎

دیکھا کافر نے بھی جب محبوب سبحاں کی طرف
اوس کا دِل مائل ہوا توحید یزداں کی طرف

بھول جائے وہ بہار باغ جنت کو آبد
دیکھے رضواں گر مدینے کے گلستاں کی طرف

چمکا دے الٰہی مری تقدیر کسی وقت
حضرت کی دکھا دے مجھے تصویر کسی وقت

A Land Mark in the History of Urdu Literature.

The Development of Urdu Language and Literature in West Ben-gal (1800-1900) by Prof M.N.Hasan Hashmi is a landmark in the History of Urdu Literature. Historians of Urdu so far con-fined the development of this language in this region to the ac-tivities associated with the Fort William College under the guid-ance of John Gilchrist, but this book has opened up yet undis-covered vistas and has disinterred and retrieved Urdu from the so far unexpected quarters of West Bengal.

Delhi, Lucknow Lahore & Hyderabad no doubt played a vital role in the progress of Urdu during the nineteenth century and no-body ever tried to explore the silent yet important contributon made by West Bengal to this living and life-giving language of India, but Prof. Hashmi's researches have accorded a very pro-minent and a proud place to West Bengal in the field of Urdu Literature. The Education Dept. of West Bengal, to which Prof. Hashmi belongs, should take a note of it and appropriately re-ward the author with due recognition. The appearance of this book will necessitate a re-writing of the history of Urdu Lite-rature and essentially need an additional chapter about its tr-ends and strides in West Bengal. I appreciate the pains under-taken by Prof. Hashmi and congratulate him for ably harness-ing the facts he has discovered which otherwise were liable to be consigned to oblivion.

The book is sure to open up portals of furthar studies in the subject for future research scholars to supplement and comple-ment the book so as to bring it up-to-date. This book is a pioneer in the field as hitherto no such intensive and compre-hensive a venture was undertaken by any scholar and this book is sure to prove a beacon-light to teachers and students of Urdu both. It provides an excllent reading even to a laymaa. No communal bias has been allowed to enter into the treat-ment of the subject and the claim of secularism and universal popularity and approbation of the Urdu Language has been fully vindicated by the learned author.

Dr. HIRA LALL CHOPRA
M. A. (Lahore), D. Litt. (Teheran)
PUNJAB UNIVERSITY GOLD MEDALIST
MEDALIST OF THE IMPERIAL IRANIAN GOVT.
LECTURER, CALCUTTA UNIVERSITY.

IN THE NAME OF ALLAH THE

MOST BENEFICENT AND MERCIFUL

انگریزی کتابوں کی فہرست

This page printed at :

Amolia Art Press

104 Lower Chitpur Road, Calcutta 1

Phone: 44-2107